ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

نقصان کیا ہے ــــــــــــــ
وقت پر عمل کرنے سے چوک جانا

جنوری ۱۹۸۹ شمارہ ۱۴۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/

کتاب	
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

کتاب	
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

Title	Price
God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۶ جنوری ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 397333, 611128

قرآن کا فیصلہ

قدیم مدینہ (یثرب) میں یہودی بھی آباد تھے اور غیر یہودی (مشرک) بھی۔ اس زمانہ میں یہودیوں کا یہ حال تھا کہ جب یہودی اور غیر یہودی آپس میں لڑتے، جب ایک یہودی دوسرے یہودی پر ظلم کرتا تو ان کے رہنما غیر جانبدار بنے رہتے۔ ایسے مواقع پر انھیں خدا کا یہ حکم یاد نہ آتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی جان، مال یا آبرو پر حملہ کرے تو اس کو اس سے روکو اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھو جب تک باہمی زیادتی کی یہ برائی معاشرہ سے ختم نہ ہو جائے۔ مگر اس قسم کا کوئی واقعہ جب یہودی اور غیر یہودی کے درمیان ہوتا، مثلاً ایک غیر یہودی (مشرک) کسی یہودی کی جان و مال پر تعدی کرتا تو فوراً تمام یہودی بیدار ہو جاتے۔ یہودی علما اپنے حجروں سے نکل پڑتے اور یہودی لیڈر پُرجوش تقریریں شروع کر دیتے۔ اب ان کو آسمانی شریعت کی وہ تمام ہدایتیں یاد آجاتیں جو جان اور مال اور آبرو کے احترام کے لیے دی گئی ہیں۔

یہ دوسرا کام اگرچہ تمام تر خدائی شریعت کے حوالے سے کیا جاتا، مگر قرآن میں جب ان کی اس روش پر تبصرہ کیا گیا تو انھیں اس بظاہر دینی عمل پر کسی قسم کا کوئی کریڈٹ نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس ان کے لیے دردناک سزا کا اعلان کیا گیا۔ کہا گیا کہ یہودی اور یہودی کے درمیان زیادتی کے معاملہ میں تم کو کتابِ الٰہی کا حکم یاد نہیں آتا مگر یہودی اور غیر یہودی کے معاملہ میں تم کتابِ الٰہی کا نام لے کر پُرشور تحریک چلاتے ہو۔ یہ دو عملی قابلِ انعام نہیں، قابلِ سزا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں، ان کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ انھیں دنیا میں رسوائی ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب (البقرہ ۸۵)

قرآن کی یہ آیت موجودہ زمانہ کے مسلم علما اور مسلم رہنماؤں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آج مسلمانوں کے درمیان ہر جگہ باہمی زیادتی کے واقعات ہو رہے ہیں۔ زیادتی اور ظلم کی کوئی قسم ایسی نہیں جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف جائز نہ کیے ہوئے ہو۔ مگر مسلم علما اور مسلم رہنما ان کے بارہ میں بالکل غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ البتہ اگر کہیں کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف زیادتی کر دے تو تمام علما اور تمام رہنما فوراً اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی روش خدا کے نزدیک صرف ایک قابلِ سزا جرم ہے، نہ کہ کوئی دینی عمل جس پر آدمی کو انعام دیا جائے۔

زندگی کی تعمیر

اگر آپ جنوری ۱۹۸۹ میں ہوں تو دسمبر ۱۹۸۹ کی منزل تک پہونچنے کے لیے آپ کو بارہ مہینہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۵ بار گھومے گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ آپ کا ایک سال پورا ہو اور آپ تکمیلِ سال کے مرحلہ تک پہونچ سکیں ——— کتنی زیادہ معلوم ہے یہ حقیقت۔ مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس معلوم بات کو جانتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان بار بار اقدام کرتے ہیں اور بار بار ناکام ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام کے مذکورہ تقاضے پورے نہیں کرتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو بات جاننی ہے وہ یہی ہے۔ انھیں اپنے بارہ میں اس حقیقت کو جاننا ہے کہ وہ تاریخ کے آغاز میں ہیں، وہ تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ جو شخص راستہ کے ابتدائی سرے پر کھڑا ہوا ہو، وہ درمیانی فاصلہ کو طے کیے بغیر راستہ کے انتہائی سرے پر نہیں پہونچ سکتا۔

یہ اس دنیا کا ایک عالم گیر قانون ہے۔ مگر اس عالم گیر قانون کو مسلمانوں کے رہنما ملت کی تعمیر کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ عملاً پہلے مہینہ میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں۔ وہ بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے ہوئے نظر آئیں۔ واقعہ کے اعتبار سے وہ اپنے سفر کے آغاز میں ہوتے ہیں اور ایسے انتہائی الفاظ بولتے ہیں گویا کہ وہ درمیانی راستہ طے کیے بغیر اپنی آخری منزل پر پہونچ گیے ہیں۔

یاد رکھیے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں۔ ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینا ہے جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔ ان کے اندر وہ شعور بیدار کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو نا جانیں۔ ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔

یہ سارے کام جب قابلِ لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے، اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لیے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے، نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔

بیعت الرضوان

بیعت الرضوان (٦ ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لیے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لیے۔

قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کو اپنے یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہوگیا کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی۔ اسی بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ، جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انھوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی۔ بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں (ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یبایعنا علی الموت ولکن بایعنا علی اَن لا نَفِرَّ) چنانچہ ابن قیم نے اس کے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں: فبایعوہ علیٰ ان لا یفروا)

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے۔ اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی

کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے۔ اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کر لیں گے، خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لیں۔

حضرت عثمان بن عفان جب مکہ گیے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے وہاں گیے تھے۔ بین اقوامی رواج کے مطابق، سفیر کا قتل اعلانِ جنگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب یہ خبر ملی کہ قریش نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو قدرتی طور پر آپ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قریش اب آخری طور پر آمادۂ جنگ ہو چکے ہیں، وہ کسی حال میں صلح اور امن کا معاملہ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ اس خبر نے وقتی طور پر صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ابتدائی صورت حال کے مطابق، آپ کے سامنے صلح یا جنگ میں انتخاب (Choice) کا مسئلہ تھا۔ اس وقت آپ نے جنگ کو چھوڑ کر صلح کا انتخاب فرمایا تھا۔ مگر قتلِ سفیر کی خبر نے ظاہر کیا کہ اب فرار یا جنگ میں سے کسی ایک صورت کے انتخاب (Choice) کا مسئلہ درپیش ہے۔ یعنی قریش کسی حال میں بھی صلح پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے عدمِ فرار، اور بصورتِ جارحیت دفاع کی بیعت لی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو پھر دوبارہ آپ جنگ کو چھوڑ کر صلح پر راضی ہو گیے، حالاں کہ یہ صلح آپ کو دشمن کی یک طرفہ شرطوں پر کرنی پڑی۔

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمہارے لیے اگر انتخاب (Choice) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر تمہارے لیے انتخاب (Choice) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو، خواہ یہ صلح فریق ثانی کی یک طرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیوں کہ حدیبیہ (۶ ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (۱ ھ) میں اسی طرح کی صورت حال میں آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

عمل کا رخ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں سے کہو کہ ان لوگوں کو معاف کردیں جو خدا کے دنوں کی امید نہیں رکھتے۔ تاکہ اللہ قوموں کو اس کا بدلہ دے جو وہ کر رہے تھے (قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ لیجزی قوما بما کانوا یکسبون)

یعنی جو لوگ اللہ کی پکڑ سے نہیں ڈرتے جب وہ خدا سے بے خوف ہو کر اہل اسلام کے خلاف ظالمانہ کارروائی کریں تو اہل اسلام کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان کے خلاف جوابی کارروائی کرنے یا ان سے انتقام لینے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس کام کو انھیں خدا کے اوپر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا سے بے خوف ہو کر جو لوگ ظلم کریں، ان کو صرف خدا ہی ضروری سزا دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں مسلمانوں کے اوپر صبر ہے اور اللہ کے اوپر جرم کے مطابق مجرم کی سزا۔

اس حکم کا مطلب بے عملی یا انفعالیت نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم کے مقابلہ میں سپر اندازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ عمل کے رخ کو متعین کرنا ہے۔ یعنی ایسے موقع پر اہل اسلام کو جوابی کارروائی کے رخ پر متحرک ہونے کے بجائے ایجابی رخ پر عمل کرنے میں سرگرم ہونا چاہیے۔

انسان کا کام اپنی ذاتی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ خدا کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عمل کے مطابق، انھیں اس کا بدلہ دے۔ ایک شخص خدا کے دین کی دعوت لے کر اٹھے، اور کچھ لوگ اس کے ساتھ برا سلوک کریں، تو اس وقت داعی دو چیزوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ لوگوں کے آزار کو برداشت کرتے ہوئے اپنی دعوتی ذمہ داری کو بدستور جاری رکھے۔ دوسرے یہ کہ وہ دعوتی عمل سے غافل ہو کر لوگوں کو سزا دینے یا ان سے انتقام لینے کے لیے دوڑ پڑے۔ پہلا طریقہ خدا کے حکم کے مطابق ہے اور دوسرا طریقہ خدا کے حکم کے خلاف۔ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کام کے لیے خدا ان کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان دوسری قسم کی روش کو اختیار کریں تو وہ دہرا مجرم بن جاتے ہیں۔ انھوں نے خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرے یہ کہ ان کے اپنے لیے کرنے کا جو اصل کام تھا اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔

مومن کے عمل کا رخ ہمیشہ خدا کی طرف ہوتا ہے اور غیر مومن کے عمل کا رخ ہمیشہ انسان کی طرف۔

اپنی غلطی

ایک صاحب کا حال مجھے معلوم ہے۔ وہ نہایت تندرست تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اچھا ذہن عطا کیا تھا مگر وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے جو کام بھی کیا وہ ناکامی پر ختم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ اسی حال میں وہ ایک روز سڑک پر ایک جیپ سے ٹکرا گیے۔ اس حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی ناکامی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو کامیابی کے راستہ میں استعمال نہیں کیا۔ اپنی ناکامی کا ذمہ دار وہ ہمیشہ دوسروں کو قرار دیا کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات کے سوا کوئی بھی شخص نہیں جس کو واقعی طور پر ان کی ناکامی کا ذمہ دار بتایا جا سکے۔

انھوں نے تعلیم کے لیے اسکول میں داخلہ لیا۔ مگر وہ میٹرک تک پہونچے تھے کہ انھیں پالیٹکس سے دل چسپی ہو گئی۔ چنانچہ دسویں درجہ کے امتحان میں وہ فیل ہو گیے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم آگے جاری نہ رہ سکی۔ انھوں نے ایک دکان شروع کی مگر اس کا کوئی مقرر وقت نہ تھا۔ جس وقت چاہتے وہ اپنی دکان کھولتے، اور جب چاہتے اس کو بند کر دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دکان ختم ہو گئی۔ انھوں نے ایک ملازمت کی۔ وہ ملازمت ان کے مفروضہ معیار سے کم تھی۔ چنانچہ وہ مستقل جھنجلاہٹ میں مبتلا رہتے اور اکثر اپنے مالک سے لڑ جاتے۔ آخر کار مالک نے عاجز آکر انھیں ملازمت سے نکال دیا۔ وغیرہ

اسی طرح وہ مختلف کام کرتے رہے اور ہر کام بے انجامی پر ختم ہوتا رہا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی شکایت کرتے رہتے ——— فلاں متعصّب ہے، فلاں نے عناد کی وجہ سے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے۔ فلاں مجھ کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح وہ اپنی ہر ناکامی کو دوسروں کے اوپر ڈالتے رہے۔ وہ ساری زندگی دوسروں کو غلط ثابت کرتے رہے، مگر آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود غلط ہو کر رہ گیے۔

دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانا بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ اس کی قیمت بہت مہنگی دینی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی بربادی ہمیشہ باقی رہے۔ اس عالم اسباب میں وہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔

موجودہ سماج

انڈین اکسپریس (۲۴ نومبر ۱۹۸۸) میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اول پر بتایا گیا ہے کہ دہلی کی ایک ۲۶ سالہ عورت پرویش کو اس کی ساس پرسا رانی نے مار ڈالا۔ اس نے اپنی بہو کے اوپر مٹی کا تیل انڈیل دیا اور پھر آگ لگا دی۔ صرف اس لیے کہ پرویش نے سسرال والوں کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے میکے سے دس ہزار روپیہ لا کر انھیں دے۔ اگلے دن دوبارہ انڈین اکسپریس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول پر یہ سرخی ہے:

Another dowry victim

خبر کے مطابق دہلی کی ۲۶ سالہ عورت اروین رانا کو اس کے سسرال والوں نے مار ڈالا۔ دوبارہ وجہ یہی تھی کہ سسرال والوں کے جہیز کے مطالبہ کو اس نے پورا نہیں کیا تھا۔ اس قسم کی خبریں ہر روز اخبارات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پولس ان اموات کو جہیز کی موت (Dowry death) کہتی ہے۔ جہیز کی خاطر موت کے بڑھتے ہوئے واقعات کی بنا پر راجیہ سبھا میں اس کی بابت سوال اٹھایا گیا۔ وزارت داخلہ کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر پی چدمبرم نے ہندستان ٹائمس (۲۵ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق جو اعداد و شمار بتائے، وہ یہ ہیں:

۱۹۸۵ میں	۹۹۹ موتیں
۱۹۸۶	۱۳۱۹
۱۹۸۷	۱۷۸۶

ہندستان کا موجودہ سماج جس وحشت و بربریت کی سطح کو پہونچ چکا ہے، یہ اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں وہ خونخوار بھیڑیوں کا سماج ہے نہ کہ شریف انسانوں کا سماج۔ ایسی حالت میں فرقہ وارانہ فسادات پر چیخ پکار کرنا یا ان کے خلاف مذمت کے بیانات دینا، ایک ایسا فعل ہے جو احمقانہ ردعمل کے سوا کسی اور خانہ میں جانے والا نہیں۔ ایسی حالت میں کسی سمجھ دار آدمی کے لیے بچاؤ کا راستہ صرف ایک ہے۔ وہ انسان نما حیوانوں کے ساتھ اعراض کرے۔ ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کا واقعہ پیش آئے تب بھی وہ مشتعل نہ ہو۔ کوئی آدمی حیوان سے نہیں لڑتا۔ حیوان سے اعراض کیا جاتا ہے نہ کہ جنگ۔

مذہب اور سیاست

مذہب کیا ہے۔ مذہب ان روحانی قدروں اور انسانی اصولوں میں جینے کا نام ہے جن کو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے۔ مذہب کا پہلا اصول توحید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقت ایسی ہے جو سب سے اوپر ہے جو سب سے بالا ہے، اور وہ خدا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے۔ وہ اس سے گھمنڈ کا جذبہ چھین لیتا ہے جو تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔

مذہب کا دوسرا اصول مساوات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ مذہب کا یہ اصول انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی اونچ نیچ کو مٹا دیتا ہے۔ خواہ وہ دولت اور عہدہ کی وجہ سے ہو، یا رنگ اور نسل کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے۔ اس مذہبی عقیدہ کے مطابق تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ سب کو ایک مشترک خاندان کی طرح مل جل کر رہنا چاہئے۔

مذہب کا تیسرا بنیادی اصول عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی تعلقات اور آپس کے لین دین میں ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے آدمی کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ کرے۔ جس طرح ترازو ٹھیک ٹھیک تولتا ہے اسی طرح انسان کو بھی ٹھیک ٹھیک تولنا چاہئے۔ انسان کا ہر معاملہ اسی طرح درست ہونا چاہئے جس طرح ترازو کی تول بالکل درست ہوتی ہے۔

یہی مذہب کی اصل حقیقت ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مذہب درحقیقت کچھ قدروں اور کچھ پیمانوں کا نام ہے۔ وہ ایک فرد کو سوچ اور مزاج کے اعتبار سے، خاص طرح کا انسان بناتا ہے۔ ایسا انسان جو دنیا میں تواضع کی نفسیات کے ساتھ جئے۔ جو سچائی کے آگے جھک جائے۔ جو تمام انسانوں کو اپنا سمجھے، جس کو کوئی انسان غیر نظر نہ آئے۔ جو دوسرے انسان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے ساتھ چاہتا ہے۔ جو اپنے آپ کو بھی اسی پیمانہ سے ناپے جس پیمانہ سے وہ دوسروں کو ناپنا چاہتا ہے۔

اس طرح مذہب انسان کی زندگی کو جانوروں کی زندگی سے الگ کر دیتا ہے۔ جانور صرف ایک ہی بات کو جانتے ہیں۔ اور وہ ان کا فائدہ ہے۔ وہ اپنے غرض اور فائدہ کے سوا کسی اور چیز سے واقف نہیں۔ مگر مذہبی انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ مذہبی انسان کی زندگی کچھ قدروں اور کچھ اصولوں

کے تابع ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہش پر نہیں چلتا۔ بلکہ اپنے عقلی فیصلے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو حق کے مطابق کرنا چاہئے۔ اور وہ نہیں کرتا جس کا کرنا حق کے مطابق اس کے لئے درست نہیں۔

مذہب کی اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کا تعلق سیاست سے کیا ہے۔ وہ چیز جس کو آجکل سیاست کہا جاتا ہے اس سے مذہب کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بالواسطہ طور پر مذہب کا تعلق سیاست سے اسی طرح ہے جس طرح اس کا تعلق دوسری تمام انسانی سرگرمیوں سے ہے۔

ایک شخص جو صحیح معنوں میں مذہبی ہو اور مذہب کو اس کی روح کے اعتبار سے اپنائے ہوئے ہو وہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی داخل ہوگا اس کا مذہب بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں مذہبی انسان کا رویہ ہوگا۔ مثلاً وہ سڑک پر چل رہا ہو تو وہ ٹریفک کے اصولوں کی پوری پابندی کرتا ہوا چلے گا۔ وہ کسی سروس میں ہو تو وہ حسب قاعدہ اپنی پوری ڈیوٹی انجام دے گا۔ وہ تاجر ہو تو اس کی تجارت لوٹ اور دھوکہ بازی کی تجارت نہیں ہوگی بلکہ دیانت داری کی تجارت ہوگی۔ ایک سچا مذہبی انسان خود اپنے اندرونی جذبے کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی رہے بااصول انسان کی طرح رہے۔ وہ کسی بھی حال میں بے اصولی اور خود غرضی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

یہی معاملہ سیاست کا بھی ہے۔ ایک مذہبی انسان سیاست میں بھی، براہ راست یا بالواسطہ طور پر داخل ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں بھی وہ اپنے مذہبی مزاج کے تحت اپنا سیاسی عمل کرے گا نہ کہ مذہبی مزاج کو چھوڑ کر۔ اس کی سیاست دوبارہ بااصول سیاست ہوگی نہ کہ مصلحت پرستی کی سیاست۔ وہ سیاسی مواقع کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے استعمال کرے گا نہ کہ قوم اور ملک کو لوٹنے کے لئے۔ وہ اپنی سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ نہیں بولے گا۔ بلکہ اپنی غلطیوں کا کھلے طور پر اعتراف کرے گا، خواہ اس اقرار کی قیمت اس کو یہ دینی پڑے کہ وہ سیاسی عہدہ یا سیاسی اقتدار سے محروم ہو جائے۔

ایک شخص سیاست میں مذہب کا نام لے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک خود غرض سیاست داں ہو اور مذہب کا نام صرف اس لئے استعمال کر رہا ہو کہ اس کے ذریعہ سے عوام کو دھوکہ دے۔ وہ اپنی خود غرضی کی سیاست چلائے اور ظاہر یہ کرے کہ وہ مذہب کی سیاست چلا رہا ہے۔

مشہور مثل ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب کے نام پر چلائی جانے والی سیاست کو بھی اس کے نتیجہ کے اعتبار سے جانچنا چاہئے۔ اگر یہ سیاست اخلاق اور انسانیت کی فصل اگا رہی ہو تو وہ مذہبی لوگوں کی سیاست ہے۔ اور اگر اس کے نتیجہ میں باہمی ٹکراؤ اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو تو یقینی طور پر وہ استحصالی سیاست ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر کہا جائے کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری، تو یہ الفاظ بے معنی معلوم ہوں گے۔ لیکن اگر ہم لفظ بدل دیں اور یوں کہیں کہ مذہبی آدمی کی تجارت یا مذہبی آدمی کی ڈاکٹری، تو پھر یہ الفاظ بے معنی معلوم نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری کسی چیز کا نام نہیں۔ مگر مذہبی آدمی کی تجارت واقعۃً ایک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنی سوچ اور اپنے ذہن کے اعتبار سے مذہبی ہو۔ ایسا آدمی جب تجارت کرے گا تو اس میں وہ اپنے مذہبی اصولوں کا لحاظ کرے گا۔ مثلاً وہ گاہک کو دھوکا نہیں دے گا۔ وہ لین دین میں خیانت نہیں کرے گا۔ وغیرہ۔ اس طرح اس کی تجارت مذہبی آدمی کی تجارت بن جائے گی۔

اسی طرح ایک شخص سچا مذہبی ہو، اس کے بعد وہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ اپنے مریضوں کو صرف پیسہ لوٹنے کا ذریعہ نہیں سمجھے گا۔ بلکہ وہ ان کا ہمدرد ہوگا۔ وہ ان کو صحیح دوا دے گا۔ وہ ان کا خیر خواہ بن کر ان کا علاج کرے گا۔ اس طرح کا اعلیٰ سلوک اس کی ڈاکٹری کو ایک مذہبی انسان کی ڈاکٹری بنا دے گا۔

گویا مذہب عملی اعتبار سے مذہبی انسان کا نام ہے۔ اگر واقعۃً کسی سماج میں مذہبی انسان ہیں تو ان کے مذہبی عمل سے سماج میں مذہبی ماحول پیدا ہوگا۔ اور اگر ایسے انسان نہ ہوں جو واقعی معنوں میں مذہبی ہوں تو ایسا سماج مذہبی سماج نہیں بن سکتا، خواہ وہاں مذہبی نعرہ لگانے والوں کی بھیڑ اکٹھا ہو، خواہ وہاں مذہب کے نام پر کتنے ہی ہنگامے جاری ہوں۔

مذہبی تجارت حقیقۃً مذہبی انسان کی تجارت کا دوسرا نام ہے۔ مذہبی انسان کے بغیر وہ تجارت وجود میں نہیں آسکتی جس کو مذہبی تجارت کہا جاسکے۔ اسی طرح اگر مذہبی سیاست کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔ حقیقی مذہبی انسان کے بغیر حقیقی مذہبی سیاست کا کوئی

وجود نہیں۔

جو لوگ مذہب کی اس حقیقت کو نہیں جانتے وہ "مذہبی حکومت" بنانے کا نعرہ لگاتے ہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ "مذہبی انسان" بنانے کی کوشش کی جائے۔ "مذہبی حکومت بناؤ" کا نعرہ ایک بے معنی نعرہ ہے جو صرف سماجی جھگڑے اور قومی فساد میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "مذہبی انسان بناؤ" کا مشن چلایا جائے تو سماج میں جھگڑا گھٹے گا اور فساد ختم ہوگا۔

"مذہبی تجارت" اگر کوئی چیز ہو تو وہ مذہبی انسان کی تجارت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی انسان کے بغیر مذہبی تجارت کے کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح "مذہبی سیاست" اگر کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔

سچے مذہبی انسان کی روش ہی کسی سیاست کو مذہبی رنگ دیتی ہے۔ اگر سچے مذہبی انسان نہ ہوں تو مذہبی نعرے بازی یا مذہب کے نام پر ہنگامہ آرائی سے کوئی سیاست مذہبی سیاست نہیں بن سکتی، خواہ اس قسم کی کوشش میں ہزاروں سال لگا دیے جائیں۔

مذہب اور سیاست یا سیاست اور مذہب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سیاست کو مذہب کے لئے استعمال کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جائے۔ پہلی صورت مذہب کے مطابق ہے اور انسانیت کے لئے رحمت ہے۔ جب کہ دوسری صورت سراسر مذہب کے خلاف ہے اور انسانیت کے لئے ایک سماجی عذاب سے کم نہیں۔

مذہب کے بارے میں خاص طور پر مشرقی ملکوں میں لوگ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اگر مذہب کے نام پر کوئی اشو کھڑا کیا جائے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس بنا پر خود غرض سیاستداں اپنی لیڈری کو نمایاں کرنے کے لئے اس کو سب سے زیادہ آسان سمجھتے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں" جیسا کوئی نعرہ بلند کریں اور لوگوں میں اِدھر سے اُدھر تک آگ لگا دیں۔ اس آگ کی روشنی میں لیڈر کا اپنا چہرہ تو خوب روشن ہو جاتا ہے مگر عام انسان اس کی آگ میں جھلس کر رہ جاتے ہیں۔

صحیح سیاست اور غلط سیاست کو ناپنے کا ایک بہت کھلا ہوا معیار ہے۔ جو سیاست محبت کی بنیاد پر اٹھائی جائے وہ سچی سیاست ہے۔ اور جو سیاست نفرت کی بنیاد پر اٹھا جائے وہ جھوٹی سیاست۔

اب چونکہ مذہب تمام انسانوں سے محبت اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے اس لئے جب کوئی سچا مذہبی انسان سیاست کے میدان میں آئے گا تو وہ انسانوں کی محبت کی بنیاد پر اپنی سیاسی تحریک چلائے گا۔ وہ سیاست میں ان اعلیٰ انسانی قدروں کو شامل کرے گا جو مذہب کا روح اور خلاصہ ہیں مثلاً بے غرضی، اصول پسندی، انصاف، استحصال سے بچنا، حقوق سے زیادہ ذمہ داریوں کا خیال، وغیرہ۔

اس کے برعکس اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ وہ نفرت اور تشدد کی سیاست چلانا چاہتا ہے تو یقینی طور پر وہ مذہبی نہیں ہے۔ وہ مذہب کو صرف اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ کیوں کہ مذہب اور نفرت یا مذہب اور تشدد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

مذہب اور سیاست کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے محبت اور سیاست کا لفظ۔ محبت سے بھرا ہوا دل، خواہ وہ سیاست کے پلیٹ فارم پر ہو یا اور کسی پلیٹ فارم پر، کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس انسان کے اندر مذہب کی روح اتری ہوئی ہو وہ کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کرے گا، خواہ وہ سیاست کے میدان میں ہو یا کسی اور میدان میں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو نشر کیا گیا۔

"ہمارا مقصد مسجد والے اعمال کو زندہ کرنا ہے" تبلیغی جماعت کے لوگ جب یہ بات کہتے ں تو عام لوگوں کو بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مبت بڑی بات ہے، بلکہ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ "مسجد والے اعمال" کو اگر کسی جامع معنی ین نہ لیا جائے تو اس میں دین کی ساری حقیقت آجاتی ہے۔

مسجد والے اعمال کیا ہیں۔ مسجد والے اعمال یہ ہیں کہ آدمی کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو انسانی شعور ہی انسانی عمل کی بنیاد ہے۔ انسان کا خارجی عمل اس کے اندرونی شعور ہی کا خارجی ظہور ہوتا ہے۔ مسجد اسی ربانی شعور کی تعمیر کا مرکز ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا کوئی شعوری مرکز ہوتا ہے۔ ہر آدمی گویا کسی نہ کسی "مسجد" پر کھڑا ہوا ہے۔ دوسرے لوگ غیر خدائی مسجد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلمان وہ ہے جو خدائی مسجد کے اوپر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔

ایک سیاح جس نے دنیا کے اکثر حصوں کا سفر کیا ہے، لکھتا ہے کہ مختلف ملکوں کے سفر کے دوران میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ قدیم زمانہ کے بڑے بڑے قلعے کھڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں اس قسم کے مناظر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ہر مسلم شہر میں عالیشان مسجدیں ضرور ہیں جن کے اونچے مینار دور سے ان کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ غیر مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں اگر ان کے قلعے ہیں تو مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں ان کی مسجدیں۔

یہ فرق دونوں قسم کے لوگوں کے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ غیر مسلم قوموں کا اعتماد مادی اسباب پر تھا، اس لئے انھوں نے قلعے اور حصار کھڑے کئے۔ اس کے برعکس مسلم قوموں کے عقیدہ کے مطابق ان کا اعتماد اللہ پر تھا۔ اس لئے وہ جہاں پہنچے، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں بنائیں۔

مسجد، محدود معنوں میں، صرف عبادت گھر نہیں، وہ اسلام کے حق میں خدائی قلعہ ہے۔ مسجدیں اسلامی دنیا کی نگہبان ہیں۔ مسجد کے ذریعہ اسلام اپنی حیثیت کو زمین پر قائم کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم ہوتا ہے
ایک حدیث میں مسجد کو اللہ سے ڈرنے والوں کا گھر کہا گیا ہے (المساجد بیوت المتقین)

ان اپنے آپ کو اپنے رب کی چھاؤں میں محسوس کریں۔ وہاں سے دینی معرفت کی غذا لے کر باہر
نیا کی طرف لوٹیں۔ خود اسلام پر قائم ہوں اور دوسرے بندگان خدا کو اسلام پر قائم رکھنے کی
شش کریں۔

مسجد ایک قسم کا دار الاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کی تربیت گاہ
۔ وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ وہ اسلام کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز ہے
ب اسلام زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً
دت گاہ، مدرسہ، دار القضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافر خانہ، مقام مشاورت
لامی و تبلیغی مرکز وغیرہ۔

مصر میں جب بنی اسرائیل کے لئے زمین تنگ ہوگئی تو حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو مسجد بنالو
س ۔ ۸۷) اس سے معلوم ہوا کہ حالات جب اہل ایمان کو پسپا کرتے کرتے ان کو آخری جائے پناہ
ر تک پہنچا دیں تو اس وقت ان کا گھر ہی جدوجہد کا میدان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے گھروں کو مسجد کی
رت دے کر وہاں اپنے کو صبر و نماز کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ وہ اعتماد علی اللہ اور تعلق مع اللہ
اپنا مستقبل تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مسجد اہل ایمان کے لئے صرف در و دیوار کا مجموعہ نہیں۔ وہ اپنے
ب سے لپٹنے کے لئے تنہائی کا ماحول ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کا مزاج پیدا کرنے لئے مقام تربیت ہے۔
سجد اس بات کا نشان ہے کہ اہل ایمان کا قافلہ خواہ کتنا ہی پیچھے دھکیل دیا جائے، اس کے لئے ہر
ل میں ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز موجود رہتا ہے۔ اس آخری قلعہ کو کسی حال میں کوئی ان سے چھین نہیں
تا۔

اسی کے ساتھ مسجد کا ایک عمل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسجد کی دنیا میں خدا پرستی اور آخرت پسندی
ماحول پیدا کر کے دوسری قوموں کے افراد کو موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ و مشاہدہ
ریں۔ اور اس بات سے آگاہی حاصل کریں کہ ان کے رب کی مرضی ان کے بارہ میں کیا ہے اور موت
بعد خدا کی عدالت میں ان سے کس قسم کا سوال کیا جانے والا ہے۔ مسجد کی یہ دعوتی اور تبلیغی حیثیت
رآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

• اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے امان کا طالب ہو تو اس کو اپنے پاس آنے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے (توبہ ۶)

معلوم ہوا کہ اسلام کا گھر، مسلمانوں کے لئے عبادت اور اصلاح کا مقام ہونے کے ساتھ، دوسری قوموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا مرکز بھی ہے۔ یہ جس طرح اسلام کے سکھنے کی جگہ ہے، اسی طرح وہ اسلام کے پھیلنے کا نقطہ بھی ہے۔ یہاں خدا کا دین استحکام حاصل کرتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے سفر کو بھی جاری کرتا ہے۔ یہ اسلام کا سمندر بھی ہے اور اس کا بھاپ اٹھنے کا مقام بھی۔

مسجد کے اندر تبلیغ کی تاثیر اور تبلیغ کی عظمت تاریخ سے ثابت ہے۔ مغل قبائل نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا، اور اس کے بڑے حصہ میں اسلام کے نشانات کو مٹا ڈالا۔ مگر اسلام کے انھیں کھنڈروں سے اسلام دوبارہ ایک تسخیری طاقت بن کر ابھرا۔ مغلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وہی مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کر دیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔

آج اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے، اس کے جواب کی صورت یہ ہے کہ مسجد کو اس کے پورے معنوں میں زندہ کیا جائے۔ ایک عرب عالم ڈاکٹر حسین مونس کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں:

ان الاسلام اليوم يخوض معركة	آج اسلام کو ایک جنگ کا سامنا ہے اور اس
والمساجد من اهم اسلحتنا فيها	میں مسجدیں ہمارا نہایت اہم ہتھیار ہیں۔

الوعی الاسلامی (کویت)، رجب ۱۳۹۳ھ، صفحہ ۶۰

حکیمانہ طریقہ

معین الدین صاحب (پیدائش ۱۹۵۶) بگہا (ضلع چمپارن) کے رہنے والے ہیں۔ ۴ اگست ۱۹۸۸ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ بتایا جو بے حد سبق آموز ہے۔

بگہا کی جامع مسجد کا نام جامعہ انوار ہے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کی رات کو کسی شخص نے خنزیر کاٹ کر اس کا سر مسجد کے اندر سائبان والے حصہ میں ڈال دیا۔ صبح کے وقت جب لوگ نماز فجر کے لئے آئے تو نماز کی ادائگی کے بعد ایک شخص (ارمانی خاں) نے اس کو دیکھا۔ اس وقت بگہا کے امیر تبلیغ حاجی اسرار الحق صاحب حسب معمول نمازیوں کو بیٹھا کر تعلیم کر رہے تھے۔ ارمانی خاں نے واقعہ کی خبر دی تو وہ فوراً اٹھ کر مقام واردات پر آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ واقعۃً خنزیر کا کٹا ہوا سر مسجد کے اندر پڑا ہے۔

حاجی اسرار الحق صاحب جو الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، انھوں نے شور وغل کرنے کے بجائے یہ کیا کہ فوراً اس کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹھالیا۔ پھر موذن کے ہمراہ وہ تیزی سے اس کو لے کر باہر نکلے اور لے جاکر بیت الخلا، کے کنوئیں (بورنگ) کے اندر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ مسجد میں آئے اور پانی سے اچھی طرح دھو کر مسجد کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد حاجی صاحب ڈاکٹر ایم یو خان سے ملے۔ انھوں نے حاجی صاحب کی کارروائی سے اتفاق کیا۔ دونوں مقامی تھانہ میں گئے۔ وہاں انھوں نے پولیس کو پورے واقعہ کی خبر دے دی۔ تھانہ والوں نے حاجی صاحب کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے اوپر پہاڑ اتنا بڑا بوجھ تھا، آپ نے اس کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔

بگہا کے مہتر خنزیر پالتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ پولیس والے مہتروں کی بستی میں گئے اور ان کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تاہم اصل مہتر جس نے کسی کے کہنے پر یہ کارروائی کی تھی، وہ رات ہی کو بھاگ کر نیپال چلا گیا۔

معین الدین صاحب نے بتایا کہ خبر سن کر بڑی تعداد میں مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے اور انھوں نے حاجی صاحب کو برا بھلا کہا۔ مگر ساری بستی کے ہندوؤں نے ان کی تعریف کی۔ مثلاً ایک ہندو دکاندار نے کہا کہ حاجی صاحب نے وہ کام کیا ہے جو مہان آدمی کیا کرتا ہے۔ انھوں نے

سیکڑوں آدمیوں کو ہتیا ہونے سے بچایا۔ ایک اور ہندو نے کہا کہ جس شخص نے مسجد میں خنزیر ڈالا وہ بہت گرا ہوا انسان ہے۔ جو شخص عبادت خانہ کو گندا کرے اس سے زیادہ برا آدمی اور کوئی نہیں۔ وغیرہ۔

حاجی صاحب نے اعراض اور حکمت کے طریقہ کو اختیار کر کے پوری بستی کو تباہی و بربادی سے بچالیا۔ اگر وہ خنزیر کو دیکھ کر مشتعل ہو جاتے تو یقینی طور پر فساد کی نذر ہو جاتا۔

معین الدین صاحب سے میں نے پوچھا کہ اس معاملہ میں عام مسلمانوں کا ردعمل کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خبر پھیلی تو مسلمان ادھر اُدھر سے آکر مسجد میں جمع ہونے لگے۔ گیارہ بجے تک ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں آچکے تھے۔ وہ لوگ سخت غصہ میں تھے اور حاجی اسرار الحق صاحب کے اوپر بری طرح برس رہے تھے۔ کچھ لوگ برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کچھ باقاعدہ گالی دے رہے تھے۔ ساری باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ تم بزدل ہو، تم پست ہمت ہو۔ تم نے کیوں خنزیر کو غائب کیا۔ اگر وہ ہمارے پاس موجود ہوتا تو آج ہم انھیں بتادیتے .....

میں نے کہا کہ یہ بزدلی اور بہادری کا وہ معیار ہے جو مسلمانوں کی قومی شریعت میں پایا جاتا ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار اس سے مختلف ہے۔ خدا کی شریعت کا معیار حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے:

عن ابی هریرة، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لیس الشدید بالصرعة. انما الشدید الذی یملك نفسه عند الغضب (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقتور وہ نہیں ہے جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے۔ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

مذکورہ حدیث بہادری کا یہ معیار بتاتی ہے کہ آدمی غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہو۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ اشتعال میں نہ آئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک بہادری یہ ہے کہ کوئی شخص اگر غصہ دلانے والا فعل کرے تو وہ بھڑک کر اس سے لڑنا شروع کر دیں۔ مسلمان ایسے واقعات کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً فریق مخالف سے لڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ اس کو شرعی نگاہ سے دیکھیں تو وہی کریں جو مذکورہ حاجی صاحب نے ایسے موقع پر کیا۔

مسائل ملت

فرد ملت کے مسائل کا جو حل ہے، وہی خود ملت کے مسائل کا حل بھی ہے۔ ملت کا ایک فرد اپنی ذاتی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح مجموعہ افراد جس کا نام ملت ہے، اس کے مسائل بھی اس کی اپنی کوششوں سے حل ہوں گے۔ کوئی دوسرا اس کے مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

اس دنیا میں ایک بھائی کبھی دوسرے بھائی کے لئے نہیں کماتا۔ کوئی رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لئے لڑائی نہیں لڑتا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے۔ اس لئے ہر شخص پہلی فرصت میں "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر اپنی زندگی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ ملت کا سوال سامنے آتے ہی تمام لوگ بالکل دوسرے انداز سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملت کے مسائل کا تعلق خود ملت سے نہیں بلکہ دوسروں سے ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے، انتظامیہ سے ہے، فلاں فلاں متعصب جماعتوں اور گروہوں سے ہے وغیرہ۔

کوئی کہتا ہے کہ ملی مسئلہ کے ذمہ دار فلاں فلاں سرکاری افسر ہیں، اس لئے ان افسروں کو معطل کراؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ حکمراں پارٹی اس کی ذمہ دار ہے، اس لئے الکشن میں اس پارٹی کے امیدواروں کے خلاف ووٹ دے کر انھیں شکست دو۔ کوئی کہتا ہے کہ متعصب جماعتیں اس کی ذمہ دار ہیں، اس لئے اخبار نکال کر ان کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کرو۔

یہ باتیں مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔ اور اس غلطی کے سب سے بڑے ذمہ دار مسلمانوں کے نام نہاد رہنما ہیں۔ یہ رہنما اپنے ذاتی مسائل کو تو ہمیشہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملی مسائل کے بارے میں پرجوش تقریریں کرکے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رہے ہیں۔ وہ ملت کے اندر تعمیر کے بجائے احتجاج کا ذہن بنا رہے ہیں۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ملت کے افراد کو باشعور بنایا جائے۔ ان کے اندر اخلاقی اوصاف پیدا کئے جائیں۔ دوسروں کے خلاف بیان دینے اور تقریر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ایک تاثر

ایک مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک مسلمان شاعر نے اپنے نعتیہ کلام سے حاضرین کی
سمع کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک قطعہ پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ احد اور احمد دونوں
ایک ہیں۔ یہ صرف "م" کا پردہ ہے جس کی وجہ سے دونوں بظاہر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔
جب حشر برپا ہوگا اور حقیقتیں کھلیں گی تو یہ پردہ ہٹ جائے گا، اور پھر دونوں اس طرح ایک
ہو جائیں گے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہوگا۔ ایک شعر یہ تھا:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے ۔ خدا کون ہے، مصطفیٰ کون ہے

اسی طرح ایک مسلمان مقرر کا یہ حال تھا کہ جب وہ تقریر کرتے تو اپنی تقریر سے پہلے یہ جملہ
کہتے: "سب کا خدا خدا ہے، میرا خدا احمد" یہ دونوں شعر غالی بدعتی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔
مگر جو لوگ بظاہر اس بدعت سے پاک ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑی بدعت میں مبتلا ہیں۔ بدعتیوں
نے پیغمبر کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے اکابر کو۔ ایک اگر اپنے اس
عقیدہ کو زبان قال سے دہرا رہا ہے تو دوسرا زبان حال سے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں بلکہ انسان پرست
ہیں۔ ان میں سے کوئی پیغمبر کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہیں اور کوئی غیر پیغمبر کو۔ کوئی اپنے اکابر کی عظمتوں میں
کھویا ہوا ہے۔ کسی کو اپنے رہنماؤں کا قد اتنا بڑا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے آگے خدائی بلندیاں
بھی چھوٹی ہوگئی ہیں۔ کسی کا یہ حال ہے کہ اس کو اپنے بزرگ اتنے زیادہ مقدس نظر آتے ہیں کہ ان پر
خالص علمی اور دینی تنقید کرنا بھی کفر و فسق سے کم نہیں۔ حتی کہ ان کے خلاف زبان کھولنا اتنا بڑا جرم ہے
کہ اس کے بعد آدمی کی جان اور مال اور آبرو سب ان کے لئے مباح ہو جائے۔

اگر حقیقت وہی ہو جو قرآن میں بیان کی گئی ہے تو قیامت لوگوں کے تصور سے کتنا زیادہ مختلف
ہوگی، لوگ کن کن برائیوں میں گم ہیں، مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک خدا کے سوا
کسی کو کوئی بڑائی حاصل نہ تھی۔ شاعر کا شعر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ عین درست ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے ۔ کہ تھی بات کیا، ہم نے سمجھا تھا کیا

غور طلب

یونانی مائتھالوجی میں ایک لعنت زدہ بادشاہ ہے جس کا نام سیسی فس (Sisyphus) ہے۔ اس کو دیوتاؤں نے یہ سزا دی کہ وہ ایک بھاری پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھے اور اس کو آخری چوٹی پر پہونچائے۔ وہ پتھر کو لے کر پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ مگر اس پر ایک مزید لعنت ہے۔ چنانچہ جب وہ چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس سے چھوٹ کر نیچے کی طرف لڑھک پڑتا ہے۔ بادشاہ دوبارہ نیچے اترتا ہے اور دوبارہ پتھر کو لے کر اوپر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ مگر دوبارہ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہونچتا ہے تو پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر جاتا ہے۔ یہی صورت بار بار پیش آتی ہے اور بادشاہ کبھی پتھر کو لے کر چوٹی تک نہیں پہونچ پاتا۔ اس بنا پر اس کی لعنت بھی اس سے رفع نہیں ہوتی :

In Greek mythology, there is a tragic legend of Sisyphus who was awarded the punishment of rolling a huge stone up a hill to the top. But there was an additional curse on him that just before reaching the top, the stone would constantly roll down and his everlasting labour would begin again and again.

"بالاکوٹ کے معرکہ" کے بارہ میں ایک مسلمان مصنف لکھتے ہیں کہ " اس معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لیے رونق تھے۔ انسانیت اور اسلام کے باغ کا ایسا عطر مجموعہ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ کو وہ بالاکوٹ کی مٹی میں مل گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی"

موجودہ زمانہ میں جو بڑی بڑی مسلم تحریکیں اٹھیں، ان کے احوال پڑھیے تو تقریباً بلا استثناء ہر ایک کے یہاں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ ہم تو کامیابی کی چوٹی کے بالکل قریب پہونچ گیے تھے۔ مگر عین وقت پر فلاں شخص کی سازش نے سارا معاملہ بگاڑ دیا اور کفر والحاد کا قلعہ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان تحریکوں کا یہ بیان ایک قاری کو اس شبہہ میں ڈالتا ہے کہ کہیں موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا معاملہ وہ تو نہیں جو یونانی دیومالا میں سیسی فس کا بتایا گیا ہے۔

برائے اعزاز

ہندستان کی سابق خاتون وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ لگایا۔ اس کے لئے انھوں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ ہوائی جہازوں پر سارے ملک کے دورے کئے۔ مگر اندرا گاندھی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ ملک کے غریبوں کے لئے کوئی حقیقی عملی کام کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ انھیں ملک کا وزیر اعظم بنا رہا تھا، جب کہ غریبی ہٹانے کے خاموش عمل میں نتیجہ اس کے برعکس نکلتا۔ وہ وزارت عظمیٰ کی کرسی بھی کھو دیتیں اور اس کے ساتھ موجودہ ملی ہوئی عزت اور عظمت بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا بہت جوش ہے۔ مگر انھیں صرف اس خدمت سے دلچسپی ہے جو انھیں مقام اعزاز پر بٹھانے والی ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کی ایسی خدمت جس میں کوئی اعزاز نہ ملے بلکہ وہ ساری قوم کے درمیان نکو بن کر رہ جائیں، ایسی خدمت سے اور ایسے میدان میں سرگرم ہونے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (البقرہ ۹)

یہ خود فریبی کی بدترین قسم ہے۔ یہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو خادم اسلام اور خادم ملت کی حیثیت سے نمایاں کر رہے ہیں۔ مگر ان کا یہ تضاد ان کی اصل حقیقت کو بتا رہا ہے کہ وہ اعزاز کے مقامات پر تو خوب متحرک ہوتے ہیں مگر جہاں دنیوی اعزاز ملنے کی امید نہ ہو وہاں بے حس اور غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ انسانوں کو وقتی طور پر غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہیں، مگر وہ اللہ عالم الغیب کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ انھیں جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کرے گا نہ کہ ان کے ظاہر کے اعتبار سے۔

جوابی مذہبیت

مئی ۱۹۲۲ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہئے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لئے حاصل کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقۃً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے نہ کہ حقیقۃً خدا اور رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جغرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لئے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں ——— ایسی تمام کارروائیاں بلاشبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پائی ہوں۔ اس کا رکنا خدا کے لئے ہوتا ہو اور ٹھہرنا خدا کے لئے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کشمکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسن خاتمہ تک نہ پہنچے۔

فطرتِ انسانی

یہاں ہم دو تصویریں نقل کر رہے ہیں۔ دونوں بظاہر سجدہ کی تصویریں ہیں۔ مگر یہ "فطرت" کا سجدہ ہے نہ کہ "شریعت" کا سجدہ۔ یہ دونوں امریکہ کے دو کھلاڑیوں کی تصویریں ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ نازک موقع آیا جب کہ انھوں نے فطرت کی سطح پر اس گہرے احساس کا تجربہ کیا جس کو مذہب کی اصطلاح میں "عبودیت" کہا جاتا ہے۔ اس احساس سے مغلوب ہو کر وہ زمین پر گر پڑے اور سجدہ کی حالت میں جا کر اپنے اندرونی جذبہ کی تسکین حاصل کی۔

10 THE TIMES OF INDIA, TUESDAY, JUNE 26, 1984

Carl Lewis kisses the track after winning the 200 meters at the recent U.S. Track and Field trials. With victory Lewis assured himself of a crack at Jesse Owens' record of four gold medals at the Berlin Olympics in 1936. Lewis had earlier qualified for the 100 meters, the long jump and the 4 x 100 meters relay. AP.

سجدہ فطرت انسانی کی طلب ہے۔ اس طلب کا حقیقی جواب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے جھکا دے۔ مگر انسان اپنی بے خبری کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری دوسری چیزوں کے آگے جھکاتا ہے، جو چیز صرف ایک خدا کا حق ہے اس کو وہ غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

پہلی تصویر امریکی کھلاڑی کارل لیویس کی ہے۔ لاس اینجلس میں دوڑ کا عالمی مقابلہ ہوا۔ اس میں ۲۲ جون ۱۹۸۲ کو کارل لیویس نے اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد کارل لیویس کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصویر کا عکس ہم مقابل کے صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر میں کارل لیویس بالکل سجدہ کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے۔ جس پٹری پر دوڑ کر اس نے یہ مقابلہ جیتا تھا، اس پٹری کے لئے اس کے دل میں عقیدت اور احسان مندی کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ پٹری پر اپنی پیشانی رکھ کر وہ سجدہ میں گر پڑا۔

یہ ایک تازہ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ انسانی فطرت میں کس طرح یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ وہ کسی کو اپنا محسن سمجھے اور اس کے آگے اپنے بڑھے ہوئے جذباتِ عقیدت کو پیش کر سکے۔

یہ مثال وہ تھی جب کہ احساس شکر کے تحت آدمی زمین پر گر پڑتا ہے۔ اب دوسری مثال لیجئے جس میں احساس عجز نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ زمین پر اپنا سر رکھ دے۔ یہ مثال ۲۹ سالہ جان میک انرو کی ہے۔ وہ امریکہ کے رہنے والے ہیں۔ وہ ۱۹۸۱ سے بیڈمنٹن کے عالمی چیمپین تھے۔ ۲۴ جون ۱۹۸۸

THE HINDUSTAN TIMES, NEW DELHI, SATURDAY JUNE 25 1988
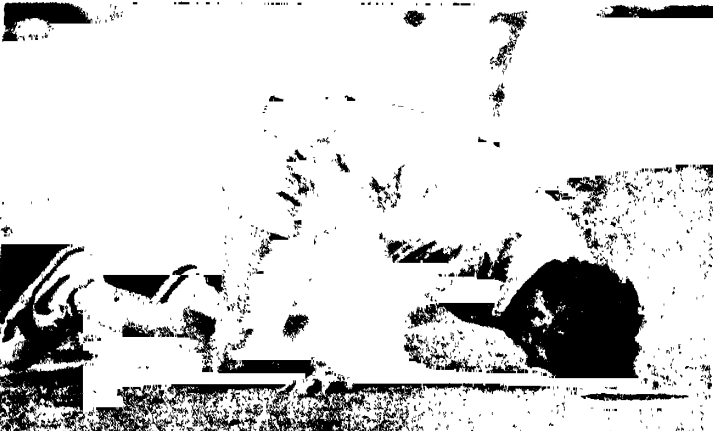
DOWN AND OUT ... Former champion, John McEnroe is floored in his match against Wally Masur of Australia in the Wimbledon championships on Thursday. Wally Masur won 7-5, 7-6 (7-5), 6-3. — PTI photo.

کو ان کا مقابلہ آسٹریلیا کے ۲۵ سالہ والی ماسورے لندن میں ہوا۔ اس مقابلہ میں جان میک انرو کو شکست ہوئی۔ ان کی عالمی چیمپین کی حیثیت ختم ہوگئی (ہندستان ٹائمس، ۲۵ جون ۱۹۸۸)

جان میک انرو پر اس واقعہ کا زبردست اثر پڑا۔ تاہم انھوں نے اپنی شکست کی ساری ذمہ داری خود قبول کی۔ انھوں نے کہا کہ میں بالکل بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کر سکا۔ اس نے مجھے بیمار بنا دیا:

I couldn't even do the basics.
It almost made me sick.

اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس میں جان میک انرو کی ایک تصویر بھی شامل ہے۔ اس تصویر میں سابق چیمپین بالکل سجدہ کی حالت میں زمین پر گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل انسانی عجز کا اعتراف ہے۔

یہ دونوں جذبات (احساسِ شکر اور احساسِ عجز) انسانی فطرت کے نہایت گہرے جذبات ہیں۔ اس دنیا میں انسان کبھی پاتا ہے اور کبھی کھوتا ہے۔ کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام۔ انسان جب کامیاب ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کامیابی کو کسی کا عطیہ قرار دے کر اس کا شکر ادا کرے۔ اسی طرح جب وہ ناکام ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہاں کوئی اور طاقت ہے جو سب کے اوپر ہے۔ یہ جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس قادرِ مطلق کے آگے جھک جائے۔

یہ جذبات انسانی فطرت کے نہایت گہرے جذبات ہیں۔ کوئی بھی انسان ان سے خالی نہیں۔ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب۔ انسانی فطرت کا علمی مطالعہ کرنے والے ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ جذبات انسانی فطرت میں اس طرح پیوست (Interwoven) ہیں کہ ان کو کسی بھی طرح انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جذبہ دراصل خدا کی پرستش کا جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا مرجع حقیقۃً وہ ہستی ہے جو انسان کی خالق ہے۔ یہ جذبہ اس لیے ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے۔ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کرے وہ اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دے۔

مگر انسان فطرت کے راستے سے انحراف کرتا ہے۔ جو چیز خدا کو دینا چاہئے وہ اسے دوسروں کو دیتا

ہے۔ اسی کا دوسرا نام شرک ہے۔ آدمی اگر اپنے فطری جذبات کا مرجع ایک خدا کو بنائے تو یہ توحید ہے اور اگر وہ ان کا مرجع کسی دوسری زندہ یا مردہ چیز کو بنائے تو یہ شرک ہے۔ توحید انسانی فطرت کا صحیح استعمال ہے اور شرک انسانی فطرت کا غلط استعمال۔

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا "خدا" بنائے۔ حقیقی خدا چوں کہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لیے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا سمجھ لیتا ہے۔ جو کچھ خدا کو دینا چاہئے وہ اسے غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ انسانی فطرت کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف خارجی حالات ہیں جو انسان کی صورت گری کرتے ہیں۔ مگر جدید تحقیقات اس نظریہ کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ایک امریکی تحقیق کا حوالہ دیتے ہیں جس کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے :

NATURE BEATS NURTURE

Karl Marx and Sigmund Freud were wrong about human nature. Contrary to their view, inherited qualities are far more important than upbringing in determining personality, a team of psychologists has concluded. In an eight year study at the University of Minnesota involving 350 pairs of twins, 44 of them identical, the scientists found that the influence of genes was clearly victorious in the 'nature versus nurture' dispute. The results of their research will be seen as refuting Marxist dogma that insists that man can be 'remade.' 'In particular, we found that the tendency to believe in traditional values and the strict enforcement of rules is more an inherited trait,' said one of the researchers, Dr David Lykken.

The Hindustan Times, Sunday Magazine, January 4, 1987.

کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ انسانی فطرت کے بارے میں غلطی پر تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کے برعکس، انسانی شخصیت کی تشکیل میں تربیت کے مقابلہ میں اندرونی پیدائشی صفات کہیں زیادہ اہم ہیں۔ نفسیاتی ماہرین کی ایک ٹیم نے اس نتیجہ کا اعلان کیا ہے۔ منی سوٹا یونیورسٹی کے تحت کیے جانے والے ۸ سالہ مطالعہ میں، جس میں ۳۵۰ توأم جوڑے شامل تھے، اس میں ۴۴ بالکل یکساں قسم کے تھے، سائنس دانوں نے پایا ہے کہ جینز کا اثر فطرت بمقابلہ تربیت کی بحث میں واضح طور پر غالب رہا۔ ان کی تحقیق کے نتائج مارکس کے اس مفروضہ کی تردید ہیں، جس کا شدت سے یہ دعوی

ہے کہ انسان کو دوبارہ بنایا جاسکتا ہے ۔ ریسرچ ٹیم کے ایک شخص ڈاکٹر ڈیوڈ لکن نے کہا کہ ہم نے یہ پایا ہے کہ روایتی قدروں میں عقیدہ اور قانون کے سختی سے نفاذ کا رجحان زیادہ تر پیدائشی صفات کا نتیجہ ہے ۔

مذکورہ واقعہ اور اسی طرح کے دوسرے واقعات سے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک برتر ہستی (خالق) کے آگے سپردگی کا جذبہ ایک فطری اور حقیقی جذبہ ہے ۔ اگر وہ غیر فطری اور غیر حقیقی ہوتا تو اس کو اب تک ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جدید نسل ایسے حالات میں پرورش پاکر نکلی ہے جب کہ اس کے ہر طرف لامذہبیت اور بے خدا تہذیب کا چرچا تھا ۔ اس کے باوجود نئی نسل میں یہ مذہبی نفسیات مسلسل طور پر باقی رہی ، وہ کسی طرح ختم نہ کی جاسکی ۔

سیول (کوریا) میں ستمبر ۱۹۸۸ میں کھیلوں کے اولمپک مقابلے ہوئے ۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں روزانہ باتصویر رپورٹیں آرہی تھیں ۔ انھیں میں سے ایک تصویر وہ تھی جو ۳۰ ستمبر کے اخبارات میں شائع ہوئی ۔ آپ ٹائمس آف انڈیا (۳۰ ستمبر ۱۹۸۸) کا صفحہ ۱۰ دیکھیں ۔ وہاں ایک عورت آپ کو عین نماز کی حالت میں نظر آئے گی ۔ یعنی وہ حالت جو نماز کے خاتمہ پر کسی نمازی کی ہوتی ہے ۔ اس تصویر میں مذکورہ عورت بالکل نماز کی ہیئت میں دونوں پاؤں توڑ کر بیٹھی ہوئی ہے ۔ اور اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر منھ کے پاس اس طرح کیے ہوئے ہے جیسے وہ نماز سے فارغ ہو کر دعا میں مشغول ہو ۔

یہ کوئی نمازی عورت نہیں ہے ۔ یہ کیلی فورنیا کی ایک ۲۷ سالہ کھلاڑی خاتون ہے جس کا نام فلارنس گریفتھ جائنر (Florence Griffith-Joyner) ہے ۔ ۲۹ ستمبر کو ۲۰۰ میٹر کی دوڑ میں اس نے گولڈ میڈل حاصل کیا ۔ اور دنیا کی تیز ترین عورت (Fastest woman) قرار دی گئی ۔ اس کامیابی کی خبر نے اس کی اندرونی ہستی کو بے قرار کر دیا ۔ وہ ابھی اپنے کھیل کے لباس ہی میں تھی کہ وہ زمین پر گر پڑی ۔ وہ بے اختیارانہ طور پر نمازی کی ہیئت میں بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کرنے لگی اور اس کے سامنے اظہار جذبات میں مشغول ہو گئی ۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک اظہار ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک محسن اور منعم کا تصور نہایت گہرائی کے ساتھ چھپا ہوا ہے ۔ آدمی کو جب کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کا اندرونی جذبہ بے اختیارانہ طور پر چاہنے لگتا ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے ۔ وہ اس احسان کو حقیقی

محسن کے خانہ میں ڈال دے۔

بے چین روح

بلیر فاولر (پیدائش ۱۹۲۱) امریکہ کے ایک راکٹ انجینئر ہیں۔ وہ اعلیٰ قابلیت کے ان انجینئروں میں شامل تھے جن کی کوششوں نے آخر کار سیٹرن راکٹ کی شکل اختیار کی۔ جنوری ۱۹۸۶ میں بلیر فاولر چند دن کے لیے نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے تاج پیلس (ہوٹل) میں ہندستان ٹائمس کے نمائندہ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی اب ایک مکمل تبدیلی سے دوچار ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی ایک کامیاب میڈیکل ڈاکٹر تھیں۔ اور وہ خود اپنے کیریر کی چوٹی پر پہونچ چکے تھے کہ دس سال پہلے دونوں نے اپنا اپنا کام یک لخت چھوڑ دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں شہر سے باہر کیلی فورنیا کے ایک معمولی فارم میں چلے گیے۔ یہاں وہ دونوں بالکل سادہ قدیم دیہاتی انداز میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکڑی کاٹتے ہیں۔ لکڑی کی آگ پر خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ہیں۔ وہ مشینی دنیا سے بھاگ کر فطرت کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اس سادہ زندگی پر بالکل خوش ہیں۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا۔ مسٹر بلیر فاولر کے الفاظ میں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارا علم جتنا ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہم کو اپنی جہالت کا احساس ہوتا ہے:

As our knowledge grows the more one
gets convinced that he is ignorant.

انھوں نے علم کی دنیا میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مگر آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ ان کا ہر اگلا قدم صرف جہالت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسانی علم آدمی کو حقیقی علم تک نہیں پہونچاتا۔

مزید یہ کہ مذکورہ سائنسی ماحول میں ان کو روحانی سکون حاصل نہ تھا۔ بلیر فاولر کو ایک ایسے احاطہ میں کام کرنا پڑتا تھا جس کے چاروں طرف چار فیٹ کی مضبوط دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہائیڈروجن گیس کو رقیق ہائیڈروجن میں تبدیل کریں۔ اس کے لیے بڑے سخت حالات میں کام کرنا پڑتا ہے نیز ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گیس کا ذخیرہ پھٹ نہ جائے۔ یہ صورت حال ایک مستقل ذہنی تناؤ کا باعث بنی رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سے کمتر کوئی چیز انسان کو سکون عطا نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ سائنسی علوم ہوں یا مادی اور مشینی ترقیاں۔

Total change

NEW DELHI, Jan. 27 — "As our knowledge grows the more one gets convinced that he is ignorant" says Blair Fowler, an aero-jet engineer who worked on the first liquid propulsion rocket in the United States that ultimately became the Saturn rocket with several million pounds thrust.

On a brief holiday in India, Mr. Fowler told this correspondent at the Taj Palace, New Delhi that his life had now undergone a total change. At the peak of his career ten years ago he and his wife, who too had a prosperous medical practice, simply gave up their jobs and money and retired to a Californian ranch "to work with our bare hands"

Mr Fowler holds out his hands, now toughened and also rough by physical work like wood cutting, carpentry, blacksmithy, etc. "When I was in the rocket propulsion group my hands had become soft through constant paper work designing and redesigning."

At 65, Mr Fowler looks quite young and strong. "We do a lot of wood cutting for firewood in our home which is heated by log fire". There is a furnace and forge also in his ranch where he hammers iron into shape like the blacksmiths used to do in the olden days.

Looking back at the development in rocketry which now has put man on the moon and done several extraordinary things, this aero-engineer recalls the way they worked to develop the liquid hydrogen and oxygen burning rocket motor under Theodore Von Carman, a well known rocket expert.

There were no electronic instruments at that time even though they had to work with pumps with speeds of 40,000 rpm. Kryogenics, the science of supercooling, was still in its infancy. How liquid hydrogen and oxygen would behave was also not known.

They worked behind three feet concrete walls and lived in constant fear of explosion. In fact there was one such explosion "but we escaped". To obtain even a few litres of liquid hydrogen, repeated cooling using liquid nitrogen and dripping techniques under high vacuums had to be utilised. "We learnt later that the Soviet scientist Kapista was also developing these engines parallely." Subsequently, Mr Fowler worked on nuclear rocket, development but the project was given up as unpracticable.

Why did he and his wife give up their practice and money to go back to ranch life? He says: "Though we were quite well off, we were not living, each one busy in his own work. We did not have time to talk to each other. Today we are a happy couple as we share our work. My wife kneads the dough and bakes the bread and we have much time for mutual communication."

Mr Fowler is very much influenced by Gandhian thinking like hard physical work and its elevating nature, the need for man to be self-sufficient and simple living. He thinks that there is lot of sense in that philosophy.

The Hindustan Times, January 28, 1986

جدید انسان

امریکہ کے ایک کروڑپتی کے بارہ میں ایک خبر پڑھی۔ خبر کا عنوان تھا اکتا کر جان دیدی (Bored To Death) اس عنوان کے نیچے خبر کے الفاظ یہ تھے :

> The millionaire was tired, weary and bored. He called for his Lincoln continental limousine, got in, and said to the chauffeur: "James, drive full speed over the cliff. I've decided to commit suicide."

کروڑپتی تھکا ہوا تھا۔ وہ افسردہ اور اکتایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی قیمتی کار منگوائی۔ اس کے اندر بیٹھا۔ اور شوفر سے کہا "جیمز، ڈھلوان کے اوپر پوری رفتار سے گاڑی دوڑاؤ۔ میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا ہے" (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ فروری ۱۹۸۵)

جن لوگوں کے پاس پیسہ کم ہو وہ بہت سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مسائل وہی ہیں جو پیسہ کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ان کے پاس پیسہ زیادہ آجائے تو ان کے تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح پیسہ کی کمی کے مسائل ہیں اسی طرح پیسہ کی زیادتی کے بھی مسائل ہیں۔ جس شخص کے پاس پیسہ کی افراط ہو جائے اس کے پاس مسائل کی بھی افراط ہو جاتی ہے حتی کہ اس کو سکون کے ساتھ رات کے وقت سونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں پرسکون زندگی کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو مذہب کی زبان میں قناعت کہا جاتا ہے یعنی جو کچھ خدا نے دیا ہے اس پر صابر و شاکر رہنا۔ عدم اطمینان در اصل عدم قناعت کی نفسیاتی قیمت ہے، جو ہر اس آدمی کو بھگتنی پڑتی ہے جو خدا کی تقسیم پر راضی نہ ہو۔

عام انسان صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا مصرف یہ ہے کہ وہ دولت کمائے۔ حالانکہ اگر دولت کمانا سب کچھ ہو تو دولت مند آدمی کبھی کسی مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ زندگی کا علم حاصل کیا جائے۔ آدمی کو جینا آجائے تو وہ ہر حال میں سکون کے ساتھ جی سکتا ہے خواہ اس کے پاس کم پیسہ ہو یا زیادہ پیسہ۔

مٹانے کے بعد بھی

۹ ستمبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں اخبار نیشنل ہیرالڈ کی گولڈن جوبلی کی تقریب تھی۔ اس موقع پر وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ایک تقریر کی۔ چوں کہ انھیں دنوں ملک میں ہتک عزت بل کے خلاف ایجی ٹیشن چل رہا تھا، کچھ لوگ مذکورہ تقریب میں بھی پہنچ گئے اور وہاں انھوں نے ہتک عزت بل کے خلاف نعرے لگائے، کیوں کہ وہ لوگ اس بل کو پریس کی آزادی ختم کرنے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔

اسی دن شام کو دوردرشن (T.V.) پر حسب معمول وزیر اعظم کی باتصویر خبر نشر کی گئی۔ اس نشریہ کے دوران مظاہرہ کرنے والوں کی تصویریں اور ان کے نعرے بھی دوردرشن دیکھنے والوں کے سامنے آگئے۔ یہ وزیر اعظم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر کو ایک سرکاری حکم جاری کیا گیا جس کے تحت دوردرشن کے کیمرہ یونٹ کے تین آدمی (من موہن سنگھ، جیون ڈوگرہ، ڈی کے ڈے) زیر عتاب آگئے۔ اول الذکر دو کو جے پور بھیج دیا گیا اور تیسرے صاحب کا شعبہ تبدیل کر دیا گیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، وزیر اعظم کے دفتر کی طرف سے یہ سخت اقدام اس واقعہ کی بنا پر کیا گیا کہ دوردرشن میں ہتک عزت بل کے خلاف نعرے سنائی دے رہے تھے:

. . . the Anti-Defamation Bill slogans
were heard over Doordarshan.

ایک شخص جس کو صرف "ٹیلی وژن" کی آواز (و) اور تصویروں کا علم ہو وہ وہی کرے گا جو وزیر اعظم نے کیا۔ مگر جو شخص اس حقیقت کو جانے کہ ہر انسانی آواز ٹیلی وژن پر ریکارڈ ہونے سے پہلے خدا کے کائناتی ریکارڈ پر ثبت ہو چکی ہے، وہ اس قسم کی کارروائی کو طفلانہ سمجھے گا، کیونکہ ٹیلی وژن ریکارڈ پر مٹانے کے بعد بھی اس کا علم ہے کہ گا ——— نعروں کی آواز تو اب بھی سنائی دے رہی ہے۔ ٹی وی کی نسل سے تصویروں کو مٹانے کا کیا فائدہ، کائنات کی وسیع تر فلم پر تو تمام تصویریں بدستور موجود ہیں۔

نقصان در نقصان

مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات ۱۹۵۷) مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک مسلمان عالم کا نام لے کر کہا کہ وہ عربی زبان پر نہایت عمدہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور فلاں عرب سفارت خانہ میں کام کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کو ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے اپنے مدرسہ میں بلاؤں۔ مگر میں ان کو سفارت خانہ والی تنخواہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں اپنے مدرسہ کے لیے ان کو حاصل بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات چالیس پہلے کی ہے۔ اب یہ صورت حال چالیس گنا سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ آج ہماری تمام بہترین صلاحیتیں اغیار کے قبضہ میں ہیں۔ مسلم اداروں کو ان کا کوئی حصہ حاصل نہیں۔

تیسری دنیا (Third world) کی اصل کمزوری یہ ہے کہ اس میں سب تیسرے درجہ کے لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنے اعلیٰ درجہ کے افراد تھے، اور جو اونچی تعلیم پائے ہوئے تھے، وہ ملینوں (Millions) کی تعداد میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ان کو زیادہ پیسہ اور زیادہ بہتر مواقع حاصل ہیں۔ یہی تمام مسلم قوموں کا حال ہے۔ اور یہی غیر مسلم اقوام کا حال بھی۔

ہندستان اور پاکستان کے مسلم اداروں کو دیکھیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی اچھی نہیں۔ ان اداروں میں کام کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے وہاں پایا جاتا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ذہن تقریباً سب کے سب بیرونی ملکوں میں چلے گیے۔ اب صرف کم تر صلاحیت کے لوگ باقی رہ گیے ہیں جو مسلم اداروں کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور جن اداروں میں کمتر صلاحیت کے لوگ بھرے ہوئے ہوں ان کی کارکردگی کا معیار کمتر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ کام ہمیشہ اعلیٰ آدمی کرتے ہیں۔ جب اعلیٰ آدمی ہی نہ رہیں تو اعلیٰ کام کیسے ہو سکتا ہے۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے اکابر سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک مغربی اقوام کو سب سے بڑی لعنت بتاتے رہے ہے۔ انھوں نے ملت کے تمام بہترین وسائل اس محاذ پر لگا دیے کہ ان بیرونی اقوام کی غلامی سے ملت کو رہائی دے سکیں۔ مگر جب

ناقابل بیان قربانیوں کے بعد بیرونی قومیں ہمارے ملکوں سے واپس چلی گئیں تو اب یہ حال ہے کہ ہمارے تمام بہترین افراد اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر خود مغربی ملکوں میں پہونچ گئے اور اب وہ انھیں قوموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو فخر سمجھ رہے ہیں جن کو ان کے اکابر نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی لعنت قرار دیا تھا۔ کیسے عجیب تھے یہ اکابر اور کیسے عجیب ہیں اکابر کے یہ اخلاف۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان ترقی اور کامیابی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو انسان کے اندر سے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی کے رہناؤں نے اگر ایسا کیا ہوتا کہ جن بے شمار وسائل کو وہ مغربی قوموں کے خلاف لڑائی میں استعمال کرتے رہے ان کو وہ خود اپنے ملک کی علمی اور تمدنی ترقی میں استعمال کرتے تو دردناک مہاجرت کا یہ واقعہ، کم از کم اتنے بڑے پیمانہ پر ہرگز پیش نہ آتا۔ ایسی صورت میں حوصلہ مند افراد خود اپنے ملک میں وہ مواقع پالیتے جن کو استعمال کر کے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کر سکیں۔

تیسری دنیا میں آزادی عمل کے مواقع نہ ہونا۔ اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کا فقدان، اپنے حوصلوں کے مطابق ترقی کے راستہ میں بڑھتے رہنے والے حالات کی غیر موجودگی، یہ وہ چیزیں ہیں جو اس واقعہ کو ظہور میں لا رہی ہیں جس کو مشرقی ذہن کا مغربی دنیا کی طرف نکاس (Brain drain) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی حالات بے حد نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار پیچیدگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اصلاحی کام کرنا الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ اجتماعی زندگی میں نعروں کی سیاست لے کر کھڑے ہو جائیں وہ یا تو حد درجہ غیر سنجیدہ ہیں یا حد درجہ نادان۔

حقیقت بے نقاب

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے "اجودھیا مارچ" کی تحریک طوفان کی طرح اٹھی اور غبارہ کی طرح پھٹ گئی۔ بظاہر یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اطمینان کی بات یہ ہے کہ جو غبارہ پھٹا، وہ نام نہاد مسلم قیادت کا غبارہ تھا۔ ملت ابتدائی طور پر قائدین کا ساتھ دینے کے بعد آخر کار ان سے الگ ہو گئی، اور اس طرح وہ ان قائدین کے فتنہ سے بچ گئی جو اس کو حوالۂ آتش کرکے اپنے جھوٹے قیادتی چہرہ کو روشن کرنا چاہتے تھے۔

بابری مسجد کا قضیہ بہت پرانا ہے۔ وہ تقسیم (۱۹۴۷) کے قبل سے چلا آرہا ہے۔ تاہم پر امن تدبیر کے دائرہ سے نکل کر ایجی ٹیشن کے دائرہ میں داخل ہونے کا دور ۱۹۸۷ کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کی بازیابی کے نام پر ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کو ریپبلک ڈے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ یہ اس معاملہ میں غیر پر امن انداز اختیار کرنے کا آغاز تھا۔ تاہم یہ لغو اقدام اخباری گرمی پیدا کرنے کے بعد آخر وقت میں واپس لے لیا گیا۔

اس کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو "لاکھوں" مسلمانوں کی ریلی نئی دہلی (بوٹ کلب) میں جمع ہوئی۔ یہاں نہایت اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں اور "بابری مسجد لیکے رہیں گے" جیسے پرجوش نعرے لگائے گئے۔ (ملاحظہ ہو الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴) لیڈروں نے اپنی دھواں دھار تقریروں کے دوران اعلان کیا کہ وہ مارچ کرکے اجودھیا جائیں گے اور مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۸۷ کی میٹنگ میں دو مارچ کا فیصلہ کیا گیا:

۱. قائدین کا منی مارچ   ۱۲ اگست ۱۹۸۸

۲. مسلم عوام کا لانگ مارچ   ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸

اعلان کے مطابق دونوں مارچ فیض آباد سے شروع ہو کر اجودھیا کی بابری مسجد پر ختم ہونے والا تھا۔ پہلا مارچ تقریباً پانچ سو کی تعداد میں قائدین اور مسلم نمائندوں پر مشتمل ہوتا اور دوسرے مارچ میں سارے ملک کے مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں فیض آباد میں جمع ہوتے اور وہاں سے یلغار کرتے ہوئے اجودھیا پہنچتے اور بابری مسجد میں داخل ہو جاتے۔

مگر ملائم منی مارچ ہو سکا اور نہ لانگ مارچ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادھر مسلم قائدین کی طرف سے اجودھیا مارچ کا اعلان ہوا۔ دوسری طرف رام جنم بھومی مسئلہ درپیش تھی، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد جیسی انتہا پسند ہندو تنظیمیں متحرک ہوگئیں۔ مسلمانوں کے چیلنج نے ان کو نئی زندگی دے دی۔ انھوں نے کھلے طور پر کہنا شروع کیا کہ اگر مسلمانوں نے اجودھیا مارچ کیا تو انھیں اجودھیا پہنچنے سے پہلے کچل دیا جائے گا۔ اس کے بعد مسلم قائدین کی طرف سے یہ بہانہ نکال کر ۱۲ اگست کے مارچ کو ملتوی کر دیا گیا کہ مرکزی حکومت اس معاملہ میں دلچسپی لے رہی ہے، اور وہ دونوں فریقوں سے بات چیت کر کے اس مسئلہ کا ایسا حل نکالنا چاہتی ہے جو دونوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

قومی آواز (۲۷ ستمبر ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں بابری مسجد تحریک کی مرکزی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ رابطہ کمیٹی نے موجودہ حالات کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو لاکھوں مسلمانوں کا جو عوامی مارچ ہونے والا تھا، اس کو ابھی ملتوی کر دیا جائے۔ البتہ اسی تاریخ (۱۴ اکتوبر) کو قائدین تحریک کا وہ مارچ ہوگا جو اس سے پہلے ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو کیا جانا طے تھا۔

بابری مسجد تحریک کے نام نہاد لیڈر مسلسل یہ اعلان کرتے رہے کہ "اجودھیا مارچ ضرور ہوگا" مثلاً قومی آواز (۸ اکتوبر ۱۹۸۸) کے مطابق، بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کنوینر نے اعلان کیا کہ "مارچ کو ملتوی کرنے یا ختم کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" اس کے ساتھ انھوں نے کہا کہ "رابطہ کمیٹی نے وزیر اعلیٰ اترپردیش نرائن دت تیواری سے تحریری درخواست کی ہے کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والے مسلم رہنماؤں کو تحفظ مہیا کریں" (قومی آواز، ۸ اکتوبر ۱۹۸۸، صفحہ ۱)

بابری مسجد تحریک کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی طرف سے ایک اخباری اعلان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

"کچھ اخبارروں کے ذریعہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اجودھیا مارچ، جس میں ملک کے طول و عرض سے رضا کار حصہ لینے والے ہیں، ملتوی ہوگیا ہے۔ اجودھیا مارچ ملتوی نہیں ہوا ہے، اور اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ تمام ریاستی و ضلع اور شہر ایکشن کمیٹیوں سے اپیل ہے کہ وہ اجودھیا مارچ کی تیاری جاری رکھیں۔ محلے محلے، مسجد مسجد، رضا کاروں کا اندراج جاری رہے۔ اور قصبہ بہ قصبہ، محلہ بہ محلہ ٹولیاں بنائی جائیں۔ اور ان کے مصارف سفر کے لئے وسائل جمع کئے جائیں۔ ریل یا بس

سے فیض آباد ۱۳ اکتوبر تک پہنچنے کا پروگرام بنایا جائے" (سہ روزہ دعوت، یکم اکتوبر ۱۹۸۸)

بابری مسجد تحریک کے قائدین ۱۴ اکتوبر سے پہلے مسلسل یہی خبر نشر کرتے رہے کہ اجودھیا مارچ ۱۴ اکتوبر کو ضرور ہوگا، وہ ختم یا ملتوی ہونے والا نہیں۔ اس طرح کے اعلانات اور تقریروں نے کٹر ہندوؤں کو مزید ابھارا۔ انھوں نے مارچ کو ناکام کرنے کے لئے جوابی منصوبہ بنانا شروع کیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے مجوزہ مارچ سے پہلے ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو یوپی میں ایک بند منایا۔ یہ بند مجوزہ اجودھیا مارچ کے خلاف تھا۔ اس موقع پر جگہ جگہ اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس کے نتیجہ میں تشدد بڑھا اور یوپی کے کئی مقامات (مظفرنگر، علی گڑھ، بہرائچ، جھانسی کھتولی، فیض آباد، گوپال گنج وغیرہ) میں فساد ہوگیا۔ اس میں بہت سے مسلمانوں کی جانیں گئیں اور انھیں زبردست مالی نقصانات ہوئے۔

نام نہاد قائدین کی طرف سے بدستور یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ اجودھیا مارچ ضرور ہوگا۔ اس کے ساتھ بار بار حکومت سے یہ مطالبہ بھی جاری تھا کہ وہ مارچ میں حصہ لینے والوں کے لئے تحفظ فراہم کرے۔ مگر حکومت نے تحفظ کی یقین دہانی کرنے سے عملاً انکار کر دیا۔ اس کے برعکس حکومت نے کہا کہ آپ لوگ اپنا مارچ ملتوی کر دیں۔ ہم دونوں فریقوں سے بات چیت کرکے کسی متفقہ حل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

مسلم قائدین بار بار یہ اعلان کر چکے تھے کہ اجودھیا مارچ مجوزہ تاریخ کو ضرور ہوگا، وہ کسی بھی حال میں رکنے والا نہیں۔ مگر ایک طرف انھوں نے دیکھا کہ حکومت ان کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایسی حالت میں مارچ کرنا، اپنے آپ کو فریق ثانی کی جارحیت کے حوالے کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

دوسری طرف ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہندوؤں کی کٹر جماعتوں نے جو بند منایا، اس کے نتیجہ میں یوپی کے مختلف علاقوں میں خوں ریز فسادات ہوئے۔ نیز اسی قسم کے دوسرے سخت اسباب نے ظاہر کر دیا کہ اب اگر اجودھیا مارچ کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف تشدد کا ہونا یقینی ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر خود مسلم عوام بھی مارچ میں اپنی دلچسپی کھو چکے تھے۔ موت کے اس سفر میں شرکت کرنے کے لئے وہ پرجوش نہیں رہے تھے۔

واضح علامات کی بنا پر قائدین نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں اگر وہ مارچ کرتے ہیں تو انھیں مسلم

عوام کی حمایت حاصل نہ ہو سکے گی۔ وہ دوطرفہ طور پر بیار و مددگار ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ مسلم قائدین نے دوبارہ عافیت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اجودھیا مارچ کی تاریخ سے ایک دن پہلے اس کے التوا و صحیح تر لفظ میں خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

التوا کی آزمودہ تدبیر اختیار کرکے مسلم قائدین نے اپنی جان بچالی۔ مگر ۸ اکتوبر کے بندھ کے نتیجہ میں جو تشدد پیدا ہوا اس میں سیکڑوں مسلم خاندان بربادی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ بابری مسجد کا مسئلہ بدستور شدید تر انداز میں باقی رہا۔ وہ مسلمانوں کی قبروں کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کر سکا۔

اجودھیا مارچ کی تاریخ سے کچھ پہلے میں نے ایک عام قسم کے مسلمان سے پوچھا: کیا اجودھیا مارچ ہوگا اس نے جواب دیا: "مولانا صاحب، جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے" مطلب یہ تھا کہ اب جب کہ اجودھیا مارچ کرنا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے تو کون ہوگا جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے گڑھے میں ڈالے۔

مسلم عوام شروع میں اپنی سادگی اور ناسمجھی کی بنا پر "قائدین تحریک" کے ساتھ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائدین کے جلسوں کی بھیڑ بڑھا کر وہ بابری مسجد کے مسئلہ کو حل کر لیں گے۔ مگر آخر میں انھیں نظر آیا کہ قائدین کی حقیقت پر شور ڈھول کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ بابری مسجد کی طرف اقدام کرنے سے وہ صرف اپنے جان و مال کو کھوئیں گے، اصل مسئلہ جیسا ہے بدستور ویسا ہی پڑا رہے گا۔ اس قسم کا مارچ صرف ملت کی بربادی میں اضافہ کرے گا نہ کہ اس کی آبادی میں۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد، اگرچہ تاخیر سے، مسلم عوام مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ ان کے رویہ سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مارچ ہونے کی صورت میں وہ قائدین تحریک کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اب "قائدین تحریک" اپنے آپ کو میدان میں اکیلا پا رہے تھے۔ "لاکھوں عوام" کی مفروضہ بھیڑ دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی جو ان کی تقریروں پر نعرہ لگائے اور اس طرح ان کی شان قیادت میں اضافہ کرے۔ بے بسی اور تنہائی کا یہ منظر دیکھ کر انھوں نے الفاظ کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو اخبار میں بھیج کر راتوں رات مارچ کے التوا کا اعلان کر دیا۔

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ یہ لطیفہ اجودھیا مارچ کے نعرہ پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔ مدینہ کے سفر (مارچ ۱۹۸۴) میں میری ملاقات ایک فلسطینی نوجوان سے ہوئی۔ ان کا نام مصطفیٰ شاور تھا۔ وہ

تعلیم کی غرض سے مدینہ میں مقیم تھے اور نہایت دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔

مصطفی شاور نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک حاکم تھا۔ اس کا ایک اونٹ تھا جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اور کھیتوں اور باغوں میں بہت نقصان کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ پریشان ہو کر اپنے خطیب (امام مسجد) کے پاس گئے اور کہا کہ اس کا کچھ علاج کیجیے۔ خطیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ تم سب جمع ہو کر میرے ساتھ چلو۔ میں حاکم کی قیام گاہ پر پہنچ کر اس کو بلاؤں گا۔ جب حاکم باہر آئے گا تو میں بلند آواز سے کہوں گا: یا حاکم جَمَلَکَ (اے حاکم تمہارا اونٹ) اس کے جواب میں تم لوگ پیچھے سے آواز لگانا: اِمْنَعْهُ عَنَّا (اس کو ہم سے روک دے)

خطیب صاحب روانہ ہوئے اور جوش میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ شروع میں گاؤں کے لوگ بھی ان کے پیچھے تھے۔ مگر ساتھ ہی ان پر حاکم کا خوف طاری تھا۔ چنانچہ ایک ایک کر کے وہ راستہ میں چھٹنے لگے۔ یہاں تک کہ سب کے سب خاموشی سے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ آخر میں خطیب صاحب کے سوا کوئی اور باقی نہ رہا۔ خطیب صاحب جوش میں بڑھتے ہوئے حاکم کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں دروازہ کھٹکھٹایا۔ حاکم باہر آیا تو اس کو دیکھ کر خطیب صاحب نے حسب قرارداد بلند آواز سے کہا: یا حاکم جملک ان کا خیال تھا کہ گاؤں والے ان کے پیچھے ہیں اور وہ سب مل کر امنعہ عنا کا نعرہ لگائیں گے۔ مگر ان کی امیدوں کے خلاف پیچھے سے کوئی آواز نہ آئی۔ وہ بار بار یا حاکم جملک کہتے رہے مگر پیچھے کوئی نہ تھا جو اس دوسرے جملہ کو دہرائے۔ حاکم نے پوچھا کہ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اب خطیب صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس صورت حال سے وہ گھبرا اٹھے۔ انھوں نے اپنے سابقہ نعرے کو بدل دیا اور حاکم سے کہا: یحتاج الی الناقۃ (وہ اونٹنی چاہتا ہے) یہ کہا اور فوراً واپس روانہ ہو گئے۔

تقریباً یہی حال بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اجودھیا مارچ کے نعرہ کا ہوا ہے۔ نام نہاد قائدین نے اعلان کیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے دو مارچ (۱۲ اگست، ۱۴ اکتوبر) کریں گے انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں میں کہا تھا کہ ملک بھر سے لاکھوں مسلمان "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کا نعرہ لگاتے ہوئے اجودھیا پہنچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر وہاں جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔

اس کے بعد حالات میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ اجودھیا مارچ لوگوں کو خونی مارچ دکھائی دینے لگا۔ مسلمان عام طور پر یہ کہنے لگے کہ اجودھیا مارچ تو موت کی طرف مارچ ہے۔ ہم کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مروائیں۔ اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کرنے کے لئے بے فائدہ اجودھیا مارچ کریں۔

اب قائدین تحریک کا وہی حال ہوا جو مذکورہ امام کا ہوا تھا۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو انھیں "لاکھوں کا مجمع" کہیں دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے نعرہ کو بدل دیا۔ اب وہ اجودھیا مارچ کی اپیل کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مسجدوں میں جا کر دعا کرو۔ مسلمان تو صرف خدا کی طرف مارچ کرنے والا ہوتا ہے، انسانوں کی طرف مارچ کرنے سے اسے کیا کام۔

اس پر میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ قائدین اگر یہی بات شروع سے کہتے تو یقیناً ان کے الفاظ کی قیمت تھی مگر اب ان کے ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ اب اس قسم کے الفاظ ان کی بدترین نا اہلی کا اشتہار ہیں، نہ کہ ان کی اہلیت اور لیاقت کا ثبوت۔

میری ڈائری میں ۱۴ فروری ۱۹۸۶ کے تحت یہ الفاظ درج ہیں:

آج جمعہ کا دن تھا۔ بابری مسجد تحریک کے لیڈروں کی پکار پر آج "یوم بابری مسجد" منایا گیا دہلی اور یوپی کی مسجدوں میں پرجوش تقریریں ہوئیں۔ میں نے آج دہلی کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب آج معمول سے زیادہ پرجوش نظر آرہے تھے۔ وہ بلند آواز سے تقریباً چیخنے کی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

"ہم اپنی گردنیں کٹوا دیں گے۔ ہمارے اوپر چاہے ٹینک چلا دئے جائیں اور توپ کے گولے برسائے جائیں۔ مگر ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری مسجدوں پر قبضہ کیا جائے اور ان کی بےحرمتی کی جائے" وغیرہ وغیرہ۔

نماز کے بعد مسجدوں سے جلوس نکالے گئے۔ لال کنواں (دہلی) میں جلوس نے شدت اختیار کر لی پولیس نے گولی چلائی جس سے دو مسلم نوجوان مر گئے۔ اسی طرح یوپی کے بعض اور مقامات پر گولی چلی اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایک دن کے لئے ہنگامہ کرنے اور یک طرفہ نقصان اٹھانے کے بعد مسلمان خاموش ہو گئے۔ اور بابری مسجد بدستور "رام جنم بھومی مندر" بنی رہی۔

اس دن کا تجربہ دیکھ کر میری زبان پر ایک جملہ آگیا تھا جو بعد کو الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے صفحات پر شائع ہوا۔ وہ جملہ یہ تھا ——— بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

قربانی کے نام پر بربادی

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے نام نہاد قائدین کی تحریک اپنے اصل مقصد میں تو ایک فی صد بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے لئے انتہائی سنگین مسائل پیدا کر دئے۔ ایک مسلم اخبار نے "دہشت کے مارے مسلمان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "پورا ملک فرقہ واریت کی گھناؤنی آگ کی لپیٹوں میں ہے۔ نفرت، غصہ، انتقام اور کشیدگی سے مل کر جو ماحول بن رہا ہے، اس نے معصوم، بے قصور اور امن پسند انسانوں کے لئے باعزت اور باہمت طور پر زندہ رہنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا ہے (ہجوم، ۱۸-۲۴ نومبر ۱۹۸۸)

یہ حالات اگرچہ سخت افسوسناک ہیں۔ مگر ان کا مثبت فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا شروع کیا ہے۔ اب وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان حالات کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود اپنے آپ پر ہے۔ ان حالات کو پیدا کرنے والے وہ نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جو قربانی کے نام پر مسلمانوں کو بربادی کی راہوں میں دوڑاتے رہے۔

ماضی میں جذباتی سیاست کی نمائندگی کرنے والے ایک مسلم اخبار نے لکھا ہے کہ "اس میں قصور کچھ ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ ہمارے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ نہیں رہا۔ ہم نے مسئلہ کو تدبیر کے بجائے جذباتی انداز سے حل کرنے کی غلطی کی ..... یہ جدوجہد اشتعال انگیز بیانات اور تقریروں سے سر ہونے والی نہیں ....." چڑھ جا بیٹے سولی پہ" کا عمل سودمند ثابت ہونے والا نہیں (ندائے ملت، ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸)

یہ اطمینان کی بات ہے کہ جذباتی سیاست کے سنگین نتائج دیکھنے کے بعد مسلمان اب اس سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" اور "چڑھ جا بیٹے سولی پہ" جیسے نعروں پر احمقانہ قربانی کے ایک سو سال ضائع کرنے کے بعد اب ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ یہ نیا طرز فکر انھیں نام نہاد قائدین سے دور کرے گا، اور قائدین سے دوری ہی کا دوسرا نام منزل سے قریب ہونا ہے۔

الٹا نتیجہ

بابری مسجد کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک مکمل طور پر الٹا نتیجہ برآمد کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ اس کا یہ خطرناک نتیجہ نکلا ہے کہ ہندوؤں کے کٹر عناصر پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو کر باہم متحد ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کے لئے سنگین تر بن خطرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

۴ نومبر ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ میں بھوپال ایئرپورٹ پر دہلی کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوپال کے ایک باشندہ مسٹر راج تیواری (عمر ۵ سال) نے اپنا ایک ذاتی تجربہ مجھے بتایا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں ۲۲ اگست ۱۹۸۸ کو ویسٹ بنگال کے شہر بانکورا (Bankura) جانا پڑا۔ وہاں وہ پشپک ہوٹل میں ٹھہرے، اس کے بغل میں ایک مندر تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مندر کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے:

ضلع شیوسینا کاریالیہ، پچھمی بنگال

راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں اس بورڈ کو دیکھ رہا تھا کہ تقریباً ، سال کا ایک بوڑھا بنگالی وہاں آگیا۔ راج تیواری صاحب چونکہ بنگلہ زبان جانتے تھے اس لئے اسی زبان میں اس سے گفتگو ہوئی۔ بنگالی نے پوچھا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ راج تیواری صاحب نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مندر کے بازو میں یہ کیا لکھا ہے کیسی۔ بنگالی نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ اس کے بعد بنگالی نے کہا کہ اندر آؤ۔ وہ راج تیواری صاحب کو اندر ایک کمرہ میں لے گیا جو دفتر کی مانند تھا اور کچھ لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔ اس بنگالی کا نام پنکج مکرجی تھا۔

یہاں دیوار پر بہت سے ہندو لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مثلاً شیواجی، رانا پرتاپ، ساورکر، ہیڈگوار، وغیرہ۔ یہ تمام تصویریں دو فٹ چوڑی اور دو فٹ لمبے سائز میں تھیں۔ ان کے درمیان ایک زیادہ بڑی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی جو دو فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی تھی۔ بقیہ تصویریں نصف حصہ جسم کی تھیں مگر بڑی تصویر سر سے پاؤں تک پورے قد کی تھی۔

راج تیواری صاحب نے غور کر کے اس تصویر کو پہچانا تو وہ سید شہاب الدین کی تصویر تھی۔ انھوں نے مذکورہ بنگالی سے پوچھا کہ سید شہاب الدین کی تصویر یہاں کیوں لگی ہوئی ہے۔ وہ تو آپ کے دشمن ہیں۔ مذکورہ بنگالی نے جواب دیا کہ بیٹے، یہ ہمارا دیوتا ہے۔ جو کام ہمارے دوسرے لیڈر ہزار

ں بھی نہ کر سکے، اس کو بھگوان شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں کر دیا۔ سیکڑوں سال سے سوئے
و شہاب الدین نے ڈیڑھ سال میں جگا دیا۔ ہم تو ان کا مندر بنائیں گے اور ان کی پوجا کریں گے۔

مسٹر راج تیواری نے یہ قصہ ۱۲ نومبر کی شام کو ۲ بجے مجھے بھوپال ایرپورٹ پر لکھوایا اور اس کے
پنے دستخط کئے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ کوئی شخص اس بات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہے تو وہ میرے
انکورہ چلے۔ میں اس کو یہ چیز وہاں دکھاؤں گا۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ مسٹر راج تیواری کی یہ رپورٹ انوکھی نہیں۔ چنانچہ ہفت روزہ ندائے
لکھنؤ) نے اپنے اداریہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ میں لکھا ہے کہ "ایک بڑے ہندو لیڈر کے گھر
ایک ہندو دوست گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ شہاب الدین صاحب کی ایک بڑی تصویر دیوار
وئی ہے۔ پھول کی مالا بھی چڑھا رکھی ہے۔ ان کے ہندو دوست کو سخت تعجب ہوا کہ شہاب الدین
واس گھر میں کیسے۔ انھوں نے بہت تعجب سے پوچھا کہ یہ فوٹو آپ کے یہاں کیسے۔ انھوں نے جواب
شہاب الدین ہمارا محسن ہے۔ اس نے ہندو قوم کو متحد کر دیا۔ دراصل یہی ہوا۔"

ایسے کھلے ہوئے نشانات ظاہر ہونے کے بعد بھی اگر مسلمان اپنے دوست اور اپنے دشمن کو نہ
ں تو ان سے زیادہ نادان قوم دنیا میں اور کوئی نہ ہوگی، نہ حال میں اور نہ ماضی میں۔

دینِ کامل

مولانا وحیدالدین خاں

دینِ کامل

از مولانا وحیدالدین خاں

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کرکے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

صفحات ۳۶۸ ہدیہ ۴۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

۱۔ فرینکفرٹ (جرمنی) میں ۵-۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کو چالیسویں بک فیر ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بطور نمائش رکھی گئیں۔ اس کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے کتابچہ میں صفحہ ۲۱ پر کیا گیا ہے۔

۲۔ آل انڈیا سنیاسی کانفرنس ۲-۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی (اجمل خاں پارک) میں ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے منتظمین کی دعوت پر ۲ اکتوبر کے اجلاس میں شرکت کی اور ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے بارہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ صدر اسلامی مرکز کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کا حل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تلخی کو ختم کیا جائے اور حل رخی (Solution-oriented) پالیسی کو اپنایا جائے۔

۳۔ تہران میں دوسری انٹرنیشنل بک فیر ۱۷ نومبر سے ۲ دسمبر ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف حصوں میں "اسلامک کلچر اینڈ سویلائزیشن" پر چھپنے والی کتابوں کی عالمی نمائش کی گئی۔ نمائش کے علاوہ یہاں کتابوں کی فروخت کا بھی انتظام تھا۔ اس موقع پر نمائش کے ذمہ داروں کی طرف سے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بھی برائے نمائش رکھی گئیں۔

۴۔ مسیحی مرکز ویٹیکن کے تحت روم میں ایک کانفرنس ہوئی جس کا عنوان تھا:

International meeting for peace

یہ کانفرنس ۲۵ اکتوبر سے ۲۹ اکتوبر تک روم (اٹلی) میں ہوئی۔ اس انٹرنیشنل کانفرنس میں صدر اسلامی مرکز کو شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا اور انھیں اس موقع پر ایک مقالہ "اسلام اور امن" کے موضوع پر پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ صدر اسلامی مرکز اور ان کے مساعد کے لیے دو ٹکٹ بھی آچکے تھے۔ نیز روم سے بار بار ٹیلی فون آتے رہے کہ ضرور اس میں شرکت کریں۔ مگر بعض اتفاقی اسباب کی بنا پر صدر اسلامی مرکز اس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ اس موقع پر پیش کرنے کے لیے جو انگریزی مقالہ تیار کیا گیا تھا، اس کی کاپی ویٹیکن کے ذمہ داروں کے پاس بذریعہ ڈاک روانہ کر دی گئی۔

۵۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر، اسلامک سوسائٹی آف آرینج کاؤنٹی، امریکہ) نے الرسالہ

(انگریزی) پڑھنے کے بعد ایک خط مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۷ روانہ کیا ہے ۔ اس میں وہ اس کے بارہ میں اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

I am very impressed with the content and style of Al-Risala. This is, to my knowledge, one of the best Dawa magazines published anywhere in the world. May Allah bless you and your efforts.

۶۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو شام سات بج کر ۴۵ منٹ پر نشر کی گئی ۔ اس تقریر کا عنوان تھا : مذہب اور سیاست ۔ تقریر کا مقررہ وقت ۱۰ منٹ تھا ۔

۷۔ امریکی ادارہ "انٹرنیشنل ریلیجس فاؤنڈیشن" اور اسلامی مرکز کے تعاون سے عرفان انیس عمر صاحب نے جولائی ۔ اگست ۱۹۸۸ میں اسپین کا سفر کیا ۔ اولاً انھوں نے اسپین میں نوجوانوں کی کانفرنس میں شرکت کی جس میں ۵۰ ملکوں سے تمام بڑے مذاہب کے نمائندے آئے ہوئے تھے ۔ کانفرنس کے دوران مختلف لوگوں سے اسلام کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور ان کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر دیا گیا ۔ شرکاء میں بہت سے ایسے افراد تھے جو اب تک نہ کسی مسلمان سے ملے تھے اور نہ اسلام کی بابت جانتے تھے ۔ اس موقع پر انگریزی الرسالہ اور اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اسلام کے تعارف کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں ۔ اس سفر میں میڈرڈ ، قرطبہ ، غرناطہ ، اشبیلیہ ، تولیدو وغیرہ مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا اور ہر جگہ اسلامی مرکز کا تعارف کرایا گیا ۔ واپسی میں عرفان انیس صاحب جنیوا کے اسلامک سینٹر میں بھی گئے ۔ یہاں کے لوگ الرسالہ سے اور اسلامی مرکز کے مشن سے واقف تھے ۔ ان لوگوں سے تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں اور اسلامی مرکز کی مطبوعات ان کی لائبریری کے لیے پیش کی گئیں ۔

۸۔ صنعاء (یمن) میں ایک اسلامی کانفرنس ۲۹ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۸۸ ہوئی ۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی ۔ اس کا مفصل سفرنامہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا ۔

۹۔ کابل (افغانستان) میں ایک بین اقوامی سیرت کانفرنس ۲۳-۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہوئی ۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر ایک

مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔ سفر کی روداد آئندہ الرسالہ میں شائع ہوگی۔

۱۰۔ پاکستان کی حکومت کے تحت ۱۹۸۸ میں سیرت پر ایک عالمی مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں غیر ملکی زبانوں کا پہلا انعام صدر اسلامی مرکز کی کتاب (پرافٹ آف ریوولیوشن) کو ملا۔ اس کی خبر پاکستان کے انگریزی روزنامہ ڈان (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸) نے ان الفاظ میں دی ہے :

The award of 2,000 dollars for the best seerat book in foreign languages was won by an English book — *Muhammad: The Prophet of Revolution* — written by Maulana Wahiduddin Khan.

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : ایک سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس رسالہ سے پہلے میرا ذہن ہندستان کے تمام مسلمانوں ہی کی طرح تھا۔ مگر آپ کی تحریروں کا کرشمہ کہہ لیں کہ میرے سوچنے کا انداز اب بالکل بدل گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا، تبھی ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ورنہ تنزل کے علاوہ کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں۔ "میدان عمل" کافی پسند آیا (ایم بی پیرزادہ، سعودی عرب)

۱۲۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : میری رہائش گاہ کراچی میں ہے۔ ایک دن میں اپنے دوست کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کا نام " اللہ اکبر" تھا۔ ان سے کتاب لے کر میں نے دو صفحے پڑھے۔ پھر ان سے کہا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔ انھوں نے کہا کہ فرمائیے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کتاب کی قیمت اگر میں آپ کو دے دوں تو کیا یہ کتاب آپ مجھے دیدیں گے۔ وہ صاحب راضی ہوگیے۔ وہ کتاب میں گھر لے آیا اور ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ اور آپ کی تمام کتابیں جو کراچی میں دستیاب ہیں وہ بھی خرید کر پڑھ ڈالیں۔ ایک صاحب سے الرسالہ (شمارہ ۱۴۱) بڑی مشکل سے لیا اور اس کو بھی پڑھ ڈالا۔ یہ رسالہ بے انتہا پسند آیا۔ مجھے آپ کی کتابوں اور الرسالہ پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ان کو پڑھنے سے مجھے بہت فائدے ہوئے ہیں۔ (شیخ محمود خاں، کراچی ۲۹)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۷ فروری ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق رضؓ کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باطل کو مار و اس کی طرف سے چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنہ)

الوعی الاسلامی، کویت، جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ، جنوری ۱۹۸۷ء

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات شر اور باطل کے بارہ میں خاموش رہ جانا اور اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرنا ہی اس کو ختم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس صمت عن الباطل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ محض ذاتی بغض کی بنا پر آپ کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلاتے ہیں اور بیہودہ مضامین شائع کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر آپ ان کا جواب دیں تو آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے۔ ایسی باتوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا جواب نہ دیا جائے۔ قدیم مثل ہے کہ "کتے" بھونکتے رہتے ہیں، ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ آپ "ہاتھی" والا کردار اداکیجئے، شرپسندوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک شخص آپ کے اوپر کیچڑ پھینکتا ہے۔ آپ کے گھر میں گندگی ڈال دیتا ہے۔ اب اگر آپ مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگیں تو آپ نے اس کے مقصد کو پورا کیا۔ آپ کی اشتعال انگیز کارروائی اس کو مزید موقع دے گی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے آپ کے خلاف مکمل فساد برپا کر دے گا۔ لیکن اگر آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس کے بم کو ناکارہ کر دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہی بات ایک اور انداز سے فرمائی ہے جس کو قرآن میں اعراض کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اعراض کا مطلب ہے اوائڈ کرنا، نظرانداز کرنا۔ اعراض محض ایک سلبی فعل نہیں وہ ایک ایجابی کارروائی ہے۔ وہ خود ایک طاقت ورعمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں نظرانداز کرنا دفع شر کی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہوتی ہے۔ جہاں سب سے بڑی کارروائی یہ ہوتی ہے کہ سرے سے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

تین منٹ

۹ ستمبر ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ ویت نام ایر لائنز کا ایک روسی ساخت کا ہوائی جہاز ہنوئی سے اڑا۔ اس کی پہلی منزل بینکاک تھی جہاں اس کو ڈون مونگ (Don Muang) ایرپورٹ پر اترنا تھا۔ اس جہاز میں عملہ کے پانچ افراد سمیت کل ۸۱ مسافر تھے جن میں گیارہ ہندستانی باشندے شامل تھے۔

جہاز بینکاک کے قریب پہنچ کر نیچے آنے لگا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہمارا جہاز بینکاک کے ہوائی اڈہ پر اترے گا۔ جن مسافروں کی منزل بینکاک تھی، ان کے چہروں پر ایک نئی روشنی چمک اٹھی۔ ہر ایک چشم تصور میں ان لوگوں کو دیکھنے لگا جو ہوائی اڈہ پر مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ذہن میں اپنے اس گھر کا نقشہ آگیا جہاں پہنچ کر وہ اپنے لوگوں کے درمیان خوشی اور سکون کے لمحات حاصل کرے گا۔

یہ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ اس وقت بینکاک میں شدید بارش ہو رہی تھی۔ جہاز کو ہوائی اڈہ تک پہنچنے میں صرف تین منٹ باقی تھے کہ زبردست کڑک چمک ہوئی۔ ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ عین اس وقت جہاز پر بجلی گر پڑی جب کہ وہ بینکاک ایرپورٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جہاز میں فوراً آگ لگ گئی۔ وہ ہوائی اڈہ کے قریب دھان کے کھیت میں گر پڑا۔ جہاز کے ۷۵ مسافر اسی وقت ہلاک ہو گئے۔ چھ مسافر جھلسی ہوئی حالت میں زندہ بچے جو اس وقت اسپتال میں زیر علاج ہیں (ہندستان ٹائمس ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸)

اس طرح کے واقعات در اصل خدا کی نشانی ہیں۔ وہ چند آدمیوں کی مثال کی روشنی میں تمام آدمیوں کا حال بتلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انجام "بینکاک" کے مسافروں کا ہوا، وہی انجام تمام انسانوں کا ہونے والا ہے۔ ہر آدمی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آنے والا ہے کہ اس کے "جہاز" پر عین اس وقت موت کی بجلی گر پڑے جب کہ وہ اپنی منزل سے صرف تین منٹ کے فاصلہ پر ہو۔

کامیابی کا ٹکٹ

موجودہ زمانہ میں کامیابی حاصل کرنے کی سب سے زیادہ یقینی تدبیر تعلیم ہے۔ جن لوگوں نے اس راز کو جان لیا ہے وہ اس سے زبردست فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

۱۔ امریکہ میں ہر سال ایک تعلیمی مقابلہ ہوتا ہے جس میں پورے ملک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ اس میں امریکہ کے چھ ممتاز سائنسی طلبہ (Top 6 science students) کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ میں جب اس قسم کے چھ ممتاز ترین امریکی طلبہ کا انتخاب کیا گیا تو اس میں ایک ہندستانی لڑکی کیشانی بھوشن کا نام بھی شامل تھا۔ اس کو بالڈون کالج (Mary Baldwin College) سے ایک ہزار ڈالر ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے گا (ہندستان ٹائمس ۳۰ اگست ۱۹۸۷)

۲۔ دہلی کے ۲۱ مارچ کے اخبارات میں ایک خبر تھی۔ انڈین اکسپریس (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا تھا کہ ہندستانی لڑکا امریکہ کے سائنسی مقابلہ میں ٹاپ کرتا ہے:

Indian boy tops in US science competition

۳۔ امریکہ میں مختلف قسم کے سائنسی مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک خاص مقابلہ وہ ہے جس کو ویسٹنگ ہاؤس سائنسی صلاحیت جانچ (Westinghouse Science Talent Search) کہا جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ میں اس کا ۴۷ واں سالانہ مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں جو طالب علم اول آیا وہ ایک ہندستانی طالب علم تھا جس کا نام چیتن نانک ہے۔ اس کو ۲۰ ہزار ڈالر سالانہ تعلیمی وظیفہ دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی مزید تعلیم بحسن وخوبی جاری رکھ سکے۔ ماضی میں ویسٹنگ ہاؤس مقابلہ میں کامیاب ہونے والے پانچ طالب علموں نے بعد کو نوبیل انعام حاصل کیا۔

تعلیم موجودہ زمانہ میں کامیابی کا ٹکٹ (Ticket to success) ہے۔ تعلیم کے ڈگری والے نظام نے کامیابی کے اس زینہ کو ہر آدمی کے دروازہ تک پہونچا دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ محنت ہے۔ آدمی اگر محنت اور دانش مندی کے ساتھ اس امکان کو استعمال کرے تو ہر جگہ وہ اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کر سکتا ہے، خواہ وہ امریکہ ہو یا ہندستان یا اور کوئی ملک۔

محرومی کے بعد بھی

الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۸) میں کناڈا کے کھلاڑی بن جانسن (Ben Johnson) کا قصہ چھپ چکا ہے۔ دوڑ کے عالمی مقابلہ میں اس نے اول درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل اس سے چھین لیا گیا۔ مزید اس کے بارہ میں یہ سخت فیصلہ کیا گیا کہ وہ اگلے دو سال تک کھیل کے مقابلوں میں حصہ نہ لے سکے گا۔ بن جانسن کے لیے یہ اس کی زندگی کا شدید ترین حادثہ تھا۔ تاہم اس نے "ظالم ججوں" کے خلاف احتجاج میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے از سر نو اپنی تیاری کا منصوبہ بنایا۔

اٹلی کے ٹیلی وژن نیٹ ورک نے نومبر ۱۹۸۸ میں بن جانسن کا ایک باتصویر انٹرویو اس کی رہائش گاہ (ٹورانٹو) پر لیا جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایک سو میٹر دوڑ کے عالمی چمپین بن جانسن نے ٹیلی وژن کیمرہ کے سامنے روتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جان بوجھ کر کھیل کے اصولوں کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ تاہم وہ اپنی تیاری جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ بارسلونہ (اسپین) میں ۱۹۹۲ میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں واپس آنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا عالمی ریکارڈ ٹریک پر ۱۳ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا۔ بظاہر وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ سیول اولمپک کے بعد پیش آنے والے مشکل لمحات کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انٹرویو لینے والے مسٹر گیانی منولی (Gianni Minoli) نے کہا کہ شوٹنگ کا کام پانچ منٹ تک روک دینا پڑا۔ کیوں کہ بن جانسن اپنی سسکیوں پر قابو نہیں پا سکے تھے۔

بن جانسن نے بتایا کہ ٹریک پر واپس آنے کے لیے وہ ہفتہ میں چھ دن چار گھنٹے روزانہ ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آجکل میرا کام صرف دوڑنا ہے۔ بیٹھے رہنے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ مقابلہ میں حصہ لوں۔ انھوں نے میرا سونے کا تمغہ مجھ سے لیا ہے نہ کہ میری رفتار:

They have taken away my gold medal, not my speed.

چھیننے والا ہمیشہ آپ کی کوئی چیز چھینتا ہے نہ کہ خود آپ کو۔ آپ کا وجود اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ پھر بھی آپ کو حاصل رہتا ہے۔ اس حاصل شدہ متاع کو استعمال کیجئے، اور پھر ہر محرومی کے بعد آپ اپنی ایک نئی تاریخ بنا سکتے ہیں۔

پہلا قدم

نیل آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چاند کا سفر کیا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو انھوں نے ایگل نامی چاند گاڑی سے اتر کر چاند کی سطح پر اپنا قدم رکھا۔ اس وقت زمین اور چاند کے درمیان برابر مواصلاتی ربط قائم تھا۔ چاند پر اترنے کے بعد انھوں نے زمین والوں کو جو پہلا پیغام دیا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا قدم ہے، مگر انسانیت کے لئے یہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for man, but one giant leap for mankind.

آرم اسٹرانگ کا مطلب یہ تھا کہ میرا اس وقت چاند پر اترنا بظاہر صرف ایک شخص کا چاند پر اترنا ہے۔ مگر وہ ایک نئے کائناتی دور کا آغاز ہے۔ ایک شخص کے بحفاظت چاند پر اترنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان کے لئے چاند کا سفر ممکن ہے۔ یہ دریافت آئندہ آگے بڑھے گی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ عام لوگ ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ تک اسی طرح سفر کرنے لگیں جس طرح وہ موجودہ زمین کے اوپر کرتے ہیں۔

ہر بڑا کام موجودہ دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے۔ ابتداءً ایک فرد یا چند افراد قربانی دے کر ایک دریافت تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانی سفر کے لئے ایک نیا راستہ کھولتے ہیں۔ یہ ابتدائی کام بلاشبہہ انتہائی مشکل ہے۔ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کے ہم معنی ہے۔ مگر جب یہ ابتدائی کام ہو جاتا ہے تو اس کے بعد سارا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اب ایک ایسا کشادہ راستہ لوگوں کے سامنے آجاتا ہے کہ انسانی قافلے بڑی تعداد میں اس پر سفر کر سکیں۔

کسان جب زمین میں ایک بیج ڈالتا ہے تو وہ گویا زراعت کی طرف ایک "چھوٹا قدم" ہوتا ہے تاہم اس چھوٹے قدم کے ساتھ ہی کسان کے زرعی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ اس کے کھیت میں ایک پوری فصل کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یہی طریقہ تمام انسانی معاملات کے لئے درست ہے، خواہ وہ زراعت اور باغبانی کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ۔

زبان کی طاقت

المتنبی (۳۵۴ - ۳۰۳ ھ) مشہور عرب شاعر ہے۔ وہ کوفہ میں پیدا ہوا۔ اور بغداد میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس اگر گھوڑا اور مال نہیں ہے جس کو تم اپنے محبوب کو ہدیہ کر سکو، تو تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا حال اگر تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو تمہاری گویائی تمہارا ساتھ دے گی:

لاخیلَ عِندكَ تُھدیھا ولامالُ   فلیُسعِدِ النطقُ إن لم تُسعِدِ الحالُ

گویائی (نطق) اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ یہ انسان کے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو ہر دوسری طاقت پر بھاری ثابت ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور ہتھیار سے زیادہ موثر۔ اس کے ذریعہ مفتوح اپنے فاتح کو جھکا سکتا ہے اور مغلوب اپنے غالب کو زیر کر لیتا ہے۔

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۸۷۲) نہایت ذہین آدمی تھے۔ گفتگو میں کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ پر جلال شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ زندگی میں صرف ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میں کسی شخص کے مقابلہ میں بالکل لاجواب ہو گیا۔ اس کا ایک فقرہ میری ساری ذہانت پر بھاری ثابت ہو گیا اور میرے لیے چپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

حافظ حامد حسن علوی کچھ معزز لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک فقیر عورت آگئی۔ اس نے کہا "بابا کچھ دیدے" وہ لوگ متوجہ نہیں ہوئے تو عورت نے اپنے سوال کو کئی بار دہرایا۔ حافظ صاحب مرحوم کو عورت کا بار بار سوال کرنا گفتگو میں بے جا مداخلت محسوس ہوا۔ انھوں نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا بہت بیوقوف ہے۔ اس کے بعد عورت نے کہا: "ہاں بابا، غریب بیوقوف ہی ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر عورت چلی گئی حافظ صاحب مرحوم اس کے جملہ کی تاب نہ لا کر خاموش ہو گیے۔ اس کے بعد وہ اس مجلس میں کچھ بول نہ سکے۔ بعد انھوں نے کہا: اب تک کوئی شخص مجھے لاجواب نہ کر سکا تھا، اس غریب عورت نے مجھے لاجواب کر دیا۔

آپ کے پاس اگر کچھ نہ ہو، تب بھی آپ کے پاس ایک چیز ہے۔ اور وہ خدا کی دی ہوئی قوتِ گویائی ہے، اپنی گویائی کو استعمال کیجیے۔ اس بے کچھ سے آپ اپنے لیے سب کچھ پا سکتے ہیں۔

مجرم کون

ایک آدمی کو گلاب کا پھول توڑنا تھا۔ وہ شوق کے تحت تیزی سے ایک کراس کے پاس پہونچا اور جھٹکے کے ساتھ ایک پھول توڑلیا۔ پھول تو اس کے ہاتھ میں آگیا، مگر تیزی کے نتیجہ میں کئی کانٹے اس کے ہاتھ میں چبھ چکے تھے۔ اس کے ساتھی نے کہا کہ تم نے بڑی حماقت کی۔ تم کو چاہئے تھا کہ کانٹوں سے بچتے ہوئے احتیاط کے ساتھ پھول توڑو۔ تم نے احتیاط والا کام بے احتیاطی کے ساتھ کیا اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہارا ہاتھ زخمی ہوگیا۔

اب پھول توڑنے والا غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ سارا قصور تو ان کانٹوں کا ہے۔ انھوں نے میری ہتھیلی کو اور میری انگلیوں کو خون آلود کیا، اور تم اُلٹا مجھ کو مجرم ٹھہرا رہے ہو۔ اس کا ساتھی بولا: میرے دوست، یہ درخت کے کانٹوں کا معاملہ نہیں، یہ نظامِ قدرت کا معاملہ ہے۔ قدرت نے دنیا کا نظام اسی طرح بنایا ہے کہ یہاں پھول کے ساتھ کانٹے ہوں۔ میری اور تمہاری چیخ پکار ایسا نہیں کر سکتی کہ اس نظام کو بدل دے۔ پھول کے ساتھ کانٹے کا یہ نظام تو بہر حال اسی طرح دنیا میں رہے گا۔ اب میری اور تمہاری کامیابی اس میں ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے بچنے کی تدبیر تلاش کریں۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ کانٹوں سے بچ کر پھول کو حاصل کریں۔ کانٹوں میں نہ الجھتے ہوئے پھول تک پہونچنے کی کوشش کریں۔

پھول کے ساتھ کانٹے کا ہونا کوئی سادہ بات نہیں، یہ فطرت کی زبان میں انسان کے لیے سبق ہے۔ یہ نباتاتی واقعہ کی زبان میں انسانی حقیقت کا اعلان ہے۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا تعارف ہے۔ جس کے مطابق موجودہ دنیا کو بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں وہی اقدام کامیاب ہوتا ہے جو اعراض کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بنایا گیا ہو۔

جہاں بچنے کی ضرورت ہو وہاں الجھنا، جہاں تدبیر کی ضرورت ہو وہاں ایجی ٹیشن کرنا صرف اپنی نالائقی کا اعلان کرتا ہے۔ خدا نے جس موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہو، وہاں اُلجھنے کا طریقہ اختیار کرنا خود اپنے آپ کو مجرم بنانا ہے، خواہ آدمی نے دوسروں کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

نادر مثال

انگریزی ہفت روزہ گارجین میں ایک خبر چھپی ہے جس کا عنوان ہے —— ایک ریاضی داں جس نے ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ کے انعام کو رد کر دیا:

The mathematician who turned down a £150,000 prize

فرانس کے ریاضی کے داں الگزنڈر گرا تھنڈیک (Alexandere Grothendieck) جن کو اس سے پہلے متعدد سائنسی اعزازات مل چکے ہیں، ۱۹۸۶ میں انھیں سویڈن کی رائل اکاڈمی نے کرافورڈ انعام (Crafoord prize) انعام دیا جو نوبل انعام کے برابر معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس اعزاز کے ساتھ ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ (تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ) کی رقم بھی شامل تھی۔ مگر فرانسیسی سائنسداں نے اس انعام کو لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے انکاری خط میں اس کا تین سبب بتایا ہے۔ اول یہ کہ مالی اعتبار سے مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انعام کے اس طریقے سے مجھے اتفاق نہیں کہ غیر مشہور لوگوں کو نظر انداز کر کے صرف کچھ مشہور لوگوں کو اعزازات دئے جاتے رہیں۔ تیسری وجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> The work which has earned for me the Royal Academy's kindly attention goes back 25 years to a period when I was part of the scientific community. I quit this community in 1970. Now in the past two decades, the ethics of the scientific profession have become so degraded that wholesale plundering of ideas has become almost the general rule among scientists. It is at any rate tolerated by all, including the most glaring and iniquitous cases. Under the circumstances, agreeing to play along with the practice of granting prizes and rewards would also be endorsing a spirit and a development in the scientific world that I see as deeply unhealthy. It is this third reason which in my view is by far the most serious.
>
> *Guardian Weekly*, Manchester, May 15, 1988

وہ تحقیق جس نے مجھے رائل اکیڈمی کی عنایت سے سرفراز کیا ہے، وہ ۲۵ سال پہلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت میں سائنٹفک کمیونٹی کا ایک حصہ تھا۔ میں نے اس کمیونٹی کو ۱۹۷۰ میں چھوڑ دیا۔ اب پچھلے ۲۰ برسوں میں سائنسی پیشہ کی اخلاقیات میں اتنا زیادہ تنزل آچکا ہے کہ افکار کی قزاقی اب سائنس دانوں کے درمیان تقریباً عام بات ہے۔ اس صورتحال کو آج تمام لوگ برداشت کر رہے ہیں۔

حتی کہ بے انصافی کے انتہائی کھلے ہوئے واقعات میں بھی۔ ان حالات میں انعام دینے کے عمل میں تسرت پر راضی ہونا، سائنسی دنیا میں ہونے والے ایک ایسے عمل کی تصدیق کرنا ہے جس کو میں بہت زیادہ غیر صحت مند سمجھتا ہوں۔ یہی تیسری چیز ہے جو میری نظر میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔

انعام کی رقم کو اپنی ذات کے لئے نہ لینا بجائے خود کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مدر ٹریسا کو بہت سے بڑے بڑے مالی انعام بشمول نوبل انعام ملے۔ مگر انھوں نے ان تمام انعامات کو معذوروں کے ادارہ کو دے دیا۔

مگر فرانسیسی سائنس داں نے جس چیز کا ثبوت دیا ہے وہ انتہائی نادر ہے۔ یہ اصول پسندی کی خاطر خود اپنی کمیونٹی کا ناقد بننا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی گروہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس گروہ کے لوگوں میں بے اصولیاں دیکھتا ہے مگر وہ ان پر گرفت نہیں کرتا۔ وہ ان کو غلط جانتے ہوئے انھیں برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے کے بعد میں اپنے گروہ سے کٹ جاؤں گا۔ اور اپنے گروہ سے کٹنا اس دنیا میں اپنے آپ کو بے زمین بنا لینا ہے۔

یہ اصول پسندی کی اعلیٰ ترین قسم ہے کہ آدمی اپنے گروہ کی غلطیوں پر چپ نہ رہ سکے۔ حتی کہ اپنی اس اصولی حیثیت کی حفاظت کے لئے وہ اپنے گروہ کی طرف سے ملنے والے مفادات سے اپنے آپ کو محروم کر لے۔

ایسے لوگ آپ کو بے شمار ملیں گے جو غیر کمیونٹی کے خلاف بولنے کے مجاہد بنے ہوئے ہوں۔ مگر وہ شخص کہیں نظر نہیں آتا جو خود اپنی کمیونٹی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ غیر کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے سے لیڈری ملتی ہے۔ جب کہ اپنی کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے والا اپنے ماحول میں نکو بن جاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی قیادت کو بھی کھو دیتا ہے۔

خلافِ زمانہ تحریک

انگریز جب انیسویں صدی میں ہندستان آئے، اس وقت یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انگریزوں نے طے کیا کہ فارسی کے بجائے انگریزی کو یہاں کی سرکاری زبان بنائیں۔ وہ اپنے فیصلہ میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ انگریزی نے نہ صرف سرکاری زبان کی جگہ لے لی، بلکہ یہی زبان پورے برصغیر ہند میں عوامی رابطہ کی زبان بن گئی۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو ملک کے لیڈروں نے اعلان کیا کہ آزاد ہندستان کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ حتی کہ انھوں نے نئے ہندستان کے لیے جو دستور بنایا، اس میں ایک باضابطہ دفعہ کے تحت یہ طے کر دیا کہ پندرہ سال کے بعد انگریزی کو ختم کرکے ہندی کو دیوناگری رسم خط میں ملک کی قومی اور سرکاری زبان بنا دیا جائے گا۔ مگر آزاد ہندستان کے لیڈروں کو اس میں مکمل ناکامی ہوئی۔ آج بھی انگریزی زبان پوری قوت کے ساتھ ملک میں رائج ہے۔ وہ بدستور پورے ملک میں عوامی رابطہ کی زبان بنی ہوئی ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ برٹش راج ایک شاہی راج تھا، ہندستان کا موجودہ راج ایک عوامی راج ہے۔ آج جو کچھ ہوتا ہے عوام کے چاہنے سے ہوتا ہے۔ عوام نے انگریزی کو ختم کرنا نہ چاہا، اس سبب قانون سازی کے باوجود انگریزی اس ملک سے ختم نہ ہو سکی۔

ملک کے سیاسی نظام میں یہ ایک بنیادی تبدیلی تھی جو آزادی کے بعد پیش آئی۔ مگر ہمارے تمام لیڈر، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پچھلی نصف صدی سے اپنی ساری قیادتی دوڑ حکمرانوں کی طرف لگائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ حرکت (Anachronism) ہے۔ وہ عملاً دورِ عوام میں ہیں، مگر اپنی سوچ کے اعتبار سے وہ ابھی تک دورِ بادشاہت میں جی رہے ہیں۔ قدیم زمانہ کی طرح اب بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تمام مسائل حکمرانوں کے حل کرنے سے حل ہوں گے۔ حالاں کہ یہ صرف تاریخ اور سیاست سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اگر وہ تاریخ کی تبدیلیوں کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ آج عوامی سیاست کا دور ہے، آج مسائل کا سرچشمہ عوام ہیں نہ کہ حکمراں۔

مسلم رہنما اگر اس راز کو پالیتے تو وہ اپنی کوششوں کا رخ اکثریتی عوام کی طرف کر دیتے۔ مگر اس حقیقت سے بے خبری کی بنا پر وہ صرف حکمرانوں کی طرف دوڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار کوششوں اور قربانیوں کے باوجود آج تک مسلمانوں کے مسائل میں سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔

اپنے لیے کچھ دوسرے کے لیے کچھ

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الرسالہ میں مسلمانوں کو بزدلی اور پسپائی کا سبق دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اسلام نے جہاد و قتال کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے پرجوش طور پر بولتے ہوئے کہا : شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں مسلمان قرآن کے جس حکم کے مخاطب ہیں وہ صبر و اعراض ہے۔ اسی لیے میں خود اس پر عامل ہوں اور مسلمانوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔ آپ کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے جہاد و قتال کا وقت ہے تو پھر اس کار ثواب میں آپ کیوں نہیں شریک ہو جاتے۔ آپ کے خیال کے مطابق، آج ساری دنیا میں بہت سے جہاد کے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ پھر بسم اللہ کر کے ان میں سے کسی میدان میں کود پڑیے۔ اور لڑ کر شہید ہو جائیے۔

انھوں نے کہا کہ میں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے اور اس کے تحت اصلاحی تقریریں کر رہا ہوں، کیا یہ جہاد نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ خود تو تقریر کے میدان میں جہاد کر رہے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو جنگ و قتال کے میدان میں جہاد کے لیے اتارنا چاہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم رہنما قول و عمل کے اسی تضاد میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود زبان چلائیں گے اور دوسرے مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم تلوار چلاؤ۔ خود اپنے بچوں کو کانونٹ میں پڑھائیں گے اور دوسری طرف بیانات شائع کریں گے کہ جامعہ ملیہ ایکٹ (۱۹۸۸) میں جامعہ کے اسلامی کردار کو ختم کر دیا گیا ہے۔ خود اپنے معاملات ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ حل کریں گے اور مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم خدائی فوجدار ہو اس لیے جہاں اپنے خلاف کوئی بات دیکھو لڑ جاؤ۔ اپنی ذاتی زندگی میں عدل و انصاف پر قائم نہ ہوں گے اور نعرہ لگائیں گے کہ ساری دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرو۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو ذو القلبین اور ذو الوجہین کہا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس کو دو عملی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا کردار اللہ کی نظر میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : کیا تمہارا یہ حال ہے کہ تم لوگوں سے نیک کام کرنے کے لیے کہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں (البقرہ ۴۴)

تیر بہدف نسخہ

بابری مسجد تحریک کی نام نہاد قیادت نے پر جوش تقریروں کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو "قائدین کا مارچ" ہوگا۔ وہ فیض آباد سے چل کر اجودھیا پہونچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس اعلان کا ردعمل فریق ثانی پر ہوا۔ اور ہندو فرقہ پرست تنظیمیں پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسلم قائدین نے اگر مذکورہ تاریخ کو اجودھیا مارچ کیا تو ہم سوگنا طاقت کے ساتھ ان کی طرف مارچ کریں گے۔ پہلے بظاہر یہ دکھائی دیتا تھا کہ اجودھیا کی طرف مارچ قیادت کی طرف مارچ ہے۔ مگر بعد کو نظر آیا کہ اجودھیا مارچ قبرستان کی طرف مارچ ثابت ہوگا۔ چنانچہ نام نہاد قائدین نے ایک عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیا۔

اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ یہ مارچ ضرور ہوگا اور اب اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ بار بار اعلان کیا گیا کہ مارچ مذکورہ تاریخ کو ہو کر رہے گا۔ کسی بھی وجہ سے وہ رکنے والا نہیں۔ مگر اس کے بعد انتہا پسند ہندو عناصر نے اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ مجوزہ اجودھیا مارچ کو نہ صرف بزور روکیں گے بلکہ وہ مارچ میں شرکت کرنے والوں کو ایسا "سبق" پڑھائیں گے کہ آئندہ وہ اس قسم کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔ اب قائدین کو اپنے سامنے موت نظر آنے لگی۔ چنانچہ دوبارہ بالکل آخر وقت میں اس کے التوا کا اعلان کر دیا گیا ——— لفظ کا کریڈٹ لینے والے عمل کا کریڈٹ لینے میں ناکام رہے۔

اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مارچ کے بھیانک نتائج سے مسلم قائدین تو بچ گئے مگر مسلم عوام اس سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ پورے یوپی میں ان کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز علی گڈھ، مظفر نگر، کھتولی اور فیض آباد وغیرہ میں باقاعدہ فسادات پھوٹ پڑے جن میں مسلمانوں کو ناقابل بیان جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک ہی مشترک خطرہ سے قائدین تحریک کس طرح مکمل طور پر بچ گئے اور پیروانِ تحریک کیوں کر عین اسی خطرہ کا شکار ہوگئے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ قائدین کا

یہ ہے کہ لفظی تقریریں کرو، مگر جب عمل کا وقت آئے تو ایک خوبصورت عذر بیان کرکے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اس کے برعکس پیروان تحریک اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو تقریر کی جائے اس کے مطابق عمل بھی ضرور کیا جائے۔

ایسی حالت میں میں مسلم عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے قائدین کی ادھوری پیروی کرنے کے بجائے ان کی مکمل پیروی کریں۔ مسلم عوام اگر چاہتے ہیں کہ جس طرح ان کے قائدین کی جان و مال پوری طرح محفوظ ہے اسی طرح ان کی اپنی جان و مال بھی پوری طرح محفوظ رہے تو اس کا نہایت سادہ سا حل یہ ہے کہ ـــــ قائدین کے کیے کو کرو، ان کے کہے کو بالکل نظر انداز کر دو۔

علی گڈھ کی مثال

فرقہ وارانہ فساد کی حقیقت کیا ہے اور اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علی گڈھ کی مثال لیجیے۔ علی گڈھ کے مسلمان قائدین تحریک کے لفظوں سے (نہ کہ عمل سے) متاثر ہو کر بابری مسجد تحریک کے مسئلہ پر زبردست جوش و خروش دکھا رہے تھے۔ اس کے جواب میں وہاں کے ہندو بھی پوری طاقت سے ابھر آئے۔ ۸ اکتوبر کو بجرنگ دل، ہندو پریشد اور رام جنم بھومی مکتی سنگھرش سمتی کی جانب سے یک روزہ علامتی ہڑتال ریاست گیر پیمانہ پر ہوئی۔ ایسے نازک مواقع پر مسلم قائدین اپنا "مارچ" ملتوی کر دیتے ہیں مگر علی گڈھ کے مسلمانوں نے اس کے برعکس اپنا "مارچ" جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تناؤ اور اشتعال بڑھتا چلا گیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو صبح ۹ بجے سے آر ایس ایس کے رضا کار اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے تمام شہر کی دکانوں کو زبردستی بند کرا رہے تھے۔ ریلوے روڈ، سبزی منڈی اور بڑا بازار میں انھوں نے مسلم اقلیت کی دکانوں کو بھی طاقت کے بل پر بند کرا دیا۔ تاہم صرف دکانوں کو بند کرانے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بند دکانوں کے اوپر بینر لگا دیے جن پر علی گڈھ کے بجائے "ہری گڈھ" لکھا ہوا تھا۔

مسلمانوں کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ انھوں نے ان بینروں کو اپنی دکانوں سے اتار دیا۔ اب بجرنگ دل اور آر ایس ایس کے رضا کاروں کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی کارروائی کریں۔ اور مسلمانوں نے بینر اتار کر وہ کارروائی کر دی۔ چنانچہ فوراً وہ تخریب کاری پر اتر آئے۔ چند منٹوں کے اندر خنجر زنی، لوٹ مار، آتش زنی اور فائرنگ کا

ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس فساد میں مسلمانوں کو جان و مال کا جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی تفصیل قومی آواز کی رپورٹ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہندو فرقہ پرستوں کے ان "کاغذی" بینروں کو مسلمان اگر اپنی دکانوں کے اوپر سے خود نہ اتارتے تو یقینی طور ہوا کے جھونکے انھیں اتار دیتے۔ قدرت کا نظام زیادہ بہتر طور پر وہ کام کر دیتا جس کو مسلمان نہایت کمتر انداز میں انجام دینا چاہتے تھے۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری اور نظام خداوندی کے بارہ میں اپنی بے یقینی کی بنا پر اس کا انتظار نہ کر سکے کہ قدرت کی طاقتیں متحرک ہو کر جھنڈوں اور بینروں کے اس کوڑے کو صاف کریں۔ انھوں نے مشتعل ہو کر خود یہ کام کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتہائی غیر ضروری طور پر آگ اور خون کی نذر کر دیے گئے۔

ہندستان کے فسادات کے سلسلہ میں اصل مسئلہ مسلمانوں کی یہی مشتعل مزاجی ہے نہ کہ اغیار کی اشتعال انگیزی۔ کیوں کہ مقابلہ کی اس دنیا میں اشتعال انگیزی کے واقعات تو بہر حال ہوں گے، اور ہندستان ہی میں نہیں، بلکہ ہر جگہ ہوں گے، حتی کہ مسلم ملکوں میں بھی۔ ہم ان کے وجود کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو ان کے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ اور وہ تدبیر ہے ——— اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی یہی بے صبری ہے۔ فریق ثانی نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ کچھ چیزیں ہیں جن پر مسلمان فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہر مسلمان کا کوئی "ہری گڈھ" ہے۔ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ہو، فوراً "ہری گڈھ" کا نعرہ لگا دو۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہوگا کہ مسلمان بھڑک اٹھیں گے اور پھر ان کے خلاف متشددانہ کارروائی کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان "ہری گڈھ" پر بھڑکنا چھوڑ دیں، اس کے بعد تمام فسادات بے زمین ہو کر اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یقینی حل

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا بلاشبہ یقینی حل ہے۔ مگر یہ حل "انتظامیہ" کے پاس نہیں ہے۔ یہ خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان جس روز اس حقیقت کو جان لیں گے اسی دن اس ملک سے فرقہ وارانہ فسادات اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ (Competition) کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوڑ رہا ہے۔ ہر ایک دوسرے کو پیچھا کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لازماً ٹکراؤ کے مواقع پیش آتے ہیں۔ مذکورہ قانون فطرت کی بنا پر وہ ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آئیں گے خواہ وہ دسویں صدی ہو یا بیسویں صدی، خواہ وہ ہندستان ہو یا پاکستان۔ غرض کہیں بھی مقابلہ اور مسابقت کی یہ حالت ختم ہونے والی نہیں۔ ہم مقابلہ کی حالت کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا سکتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کا واحد نسخہ وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔

ہندستان کے ہندو فرقہ پرستوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کمزوری دریافت کر رکھی ہے۔ یہ کمزوری ہے ان کا اشتعال کے موقع پر مشتعل ہو جانا۔ جن مواقع پر قرآنی حکم کے مطابق اعراض کرنا چاہیے وہاں دوسروں سے الجھ جانا۔ یہ گویا مسلمانوں کا کمزور مقام (Vulnerable point) ہے۔ اسی کمزور مقام سے فریق ثانی ان پر "حملہ" کرتا ہے اور مسلمانوں کی بے شعوری کی بنا پر ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

ایک واقعہ

ایک صاحب نے ایک شہر کا واقعہ بتایا جو ۱۹۸۸ میں پیش آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شہر میں ہندو فرقہ پرست عناصر نے تین روزہ جلسہ کیا۔ اس میں ایک بہت بڑا بک اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ اس اسٹال پر دوسرے دل آزار لٹریچر کے ساتھ ستیارتھ پرکاش اور رنگیلا رسول جیسی کتابیں بھی رکھی گئیں۔ مسلمانوں نے ان کتابوں کو دیکھا تو ان کے اندر سخت غصہ اور اشتعال پیدا ہوا۔ انھوں نے فوراً ایک جوابی جلسہ کیا جس میں تقریباً ۵ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ مقررین نے پر جوش تقریریں کیں۔ پورا مجمع غصہ اور اشتعال سے بھر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہاں سے اٹھ کر سیدھے ہندوؤں کے اجتماع میں جائیں گے اور وہاں شامیانہ کو توڑیں گے اور کتابوں کو جلا ڈالیں گے۔

عین اس وقت ایک سنجیدہ مقرر اسٹیج پر آیا اس نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ تقریر مسلمانوں کے مجمع پر ٹھنڈی بارش بن کر برسی۔ اور ہندو اجتماع کے لیے ایک ایسا شعلہ ثابت ہوئی جس نے براہ راست مداخلت کے بغیر ان کے سارے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

مقرر نے کہا کہ اپنی بات کو میں علامہ اقبال کے ایک لطیفہ سے شروع کرتا ہوں۔ اس لطیفہ کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور اس سے واقعۃً سبق لے سکیں تو وہ آپ کے لیے اس قسم کے تمام فسادات اور شرارتوں کا تیر بہدف علاج ہے۔

لاہور میں علامہ اقبال کے محلہ میں زیادہ عمر کے ایک صاحب تھے جو اکثر علامہ اقبال سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے پوچھا کہ چڑھونی کی حقیقت کیا ہے۔ کیسے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی ایک لفظ (مثلاً کریلا) سے چڑھنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس سوال کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا یہاں تک کہ وہ صاحب واپس چلے گیے۔

اگلے دن علامہ اقبال نے اپنے ملازم کو ان صاحب کے گھر یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ ان سے آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم نے جا کر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلے تو اس نے کہا کہ علامہ اقبال نے آم کا اچار مانگا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ملازم کو رخصت کر دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ دو گھنٹہ کے بعد علامہ اقبال نے دوبارہ ملازم سے کہا کہ ان کے یہاں جاؤ اور آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم گیا اور دوبارہ ان کو علامہ اقبال کا پیغام پہونچایا۔ انھوں نے کسی قدر تیزی کے ساتھ کہا کہ میں نے تم کو بتا دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ علامہ اقبال ہر دو گھنٹہ کے بعد اس آدمی کو مذکورہ صاحب کے پاس آم کا اچار مانگنے کے لیے بھیجتے رہے اور ملازم ہر بار سخت تر لہجہ میں مذکورہ صاحب کا جواب لے کر واپس آتا رہا۔

یہاں تک کہ آخری بار جب ملازم ان کے یہاں گیا تو ان کی شدت غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ انھوں نے آستین چڑھا کر ڈنڈا اٹھایا اور ملازم کو مارنے کے لیے دوڑے۔ اب ملازم آگے آگے بھاگ رہا ہے اور وہ صاحب ڈنڈا لیے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

محلہ کے لڑکوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ پوچھ گچھ کرنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ یہ آم کے اچار کا قصہ تھا۔ اب "آم کا اچار" مذکورہ صاحب کی چڑھونی بن گئی۔ اور محلہ کے لڑکوں کو بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ صاحب جب بھی گھر سے باہر نکلتے، لڑکے ان کے پاس آکر کہتے "آم کا اچار"۔ یہ کہہ کر لڑکے بھاگتے اور وہ بزرگ لڑکوں کے پیچھے دوڑتے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے یہ کیا کہ وہ ڈنڈا لے کر باہر نکلنے لگے۔ جب بھی وہ گھر سے نکلتے ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا

ضرور ہوتا۔ لڑکے آم کا اچار کہہ کر بھاگتے اور یہ ڈنڈا اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے دوڑتے۔ اسی حالت میں ایک روز ایسا ہوا کہ تیز بھاگتے ہوئے وہ ایک گڑھے میں گر پڑے اور ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مہینوں کے علاج کے باوجود ان کی ہڈی درست نہ ہو سکی۔ جس ڈنڈے کو انھوں نے لڑکوں کو مارنے کے لیے بنایا تھا۔ وہ ان کی سہارے کی لاٹھی بن گئی جس کو ٹیک کر وہ چلتے تھے۔ وہ اسی حالت پر باقی رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

مقرر نے مسلمانوں کے مذکورہ جلسہ میں جب یہ لطیفہ سنایا تو مسلمانوں کا جوش اچانک ہنسی میں تبدیل ہوگیا۔ مقرر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ فریق ثانی نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کچھ چیزوں کو ہماری چڑھونی بنالیا ہے۔ مثلاً خاص طرح کے نعرے لگانا، خاص طرح کے مضامین شائع کرنا، وغیرہ وہ لوگ ہم کو چڑھاتے ہیں اور ہم چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ہم شعوری طور پر اس بات کو جان لیں کہ فریق ثانی جو کچھ کرتا ہے وہ دراصل چڑھونی کا معاملہ ہے اور چڑھونی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر چڑھئے تو وہ چڑھونی ہے، اور اگر نہ چڑھئے تو اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ وہ ایسا پٹاخہ ہے جو پھسپھسا کر رہ گیا۔

میں مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ یہ طے کر لیں کہ فریق ثانی خواہ آپ کو کتنا ہی چڑھائے اور خواہ کیسی ہی چڑھونی آپ کے خلاف استعمال کرے، آپ کسی حال میں بھی نہیں چڑھیں گے۔ آپ ہمیشہ ایسی چیزوں سے اعراض کر کے گزر جائیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ فسادات کی ساری عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔

فسادات کے خلاف اس تیر بہدف نسخہ کا پہلا کامیاب تجربہ خود مذکورہ شہر میں ہوا۔ وہ مسلمان جو اپنے جلسہ گاہ سے اٹھ کر فریق ثانی کے جلسہ میں جاتے۔ وہاں ان کی کتابوں کو جلاتے اور پھر زیادہ بڑے پیمانہ پر خود جلائے جاتے، ان کا موڈ بالکل بدل گیا۔ ایک کہانی جو المیہ پر ختم ہوتی وہ اچانک طربیہ کی صورت میں بدل گئی۔

اس کے بعد مسلمان ٹھنڈے ہو کر سیدھے اپنے گھروں کو چلے گیے۔ مسلمانوں کا اس طرح لوٹنا فریق ثانی کے جلسہ پر بجلی بن کر گرا۔ مسلمانوں نے ان کی کتابوں سے کوئی دل چسپی نہیں لی اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پہلے ہی اس کو خریدنے والے نہ تھے۔ ان کا وسیع پنڈال بھی آدمیوں سے خالی

رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین دن کا اجتماع دو ہی دن میں ختم ہو گیا۔ تمام کتابیں اور تمام دل آزار لٹریچر غیر فروخت شدہ حالت میں گاڑیوں میں لاد کر واپس گیا تاکہ دوبارہ ردی خانہ میں جاکر فروخت ہو۔

یہ فسادات کو ختم کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ یقینی طور پر ہر قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا قاتل ہے۔ میری رائے ہے کہ مسلمان اس واقعہ کو آڈیو ٹیپ یا ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کر کے تیار رکھیں اور جہاں بھی فرقہ وارانہ فساد کا اندیشہ ہو فوراً وہاں پہونچ کر وہاں کے لوگوں کو سنائیں یا اس کی تصویریں دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد فسادات کا سلسلہ اس طرح ختم ہو جائے گا جیسے جلتی آگ پر پانی ڈالا جائے اور وہ بجھ کر رہ جائے۔

ذہنی فاصلہ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۱ میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے جو غالباً حضرت ابراہیم کے سو سال بعد پیدا ہوئے۔ ان کے مخاطب مدین کے لوگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اہل مدین قدیم زمانہ میں بحر احمر کے عرب ساحل پر آباد تھے۔ پیغمبر کا انکار کرنے کے بعد وہ ایک شدید زلزلہ میں تباہ کر دئے گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شعیب نے جب اپنی قوم کو خدا کے دین کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ (قالوا یا شعیب ما نفقہ کثیراً مما تقول (ہود ۹۱) حضرت شعیب علیہ السلام کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے (روح المعانی)، آپ واضح اور موثر انداز میں کلام کرنے کی خصوصی صلاحیت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ آپ کے مخاطب (اہل مدین) حضرت ابراہیمؑ کو مانتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں حضرت ابراہیم سے مل جاتا تھا۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ حضرت شعیب نے جب دین توحید کی بات ان کے سامنے پیش کی تو انھوں نے کہہ دیا کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی نسل گزرنے کے بعد وہ حضرت ابراہیم کی اصل تعلیمات سے دور ہو چکے تھے۔ ان کی سوچ وہ نہ رہی تھی جو خدا کے پیغمبروں کی سوچ ہوتی ہے۔ اس طرح حضرت شعیب اور اہل مدین کے درمیان ایک قسم کا ذہنی فاصلہ (Intellectual gap) پیدا ہو چکا تھا۔ یہی چیز تھی جو ان کے لئے پیغمبر کی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

جو لوگ غیر اللہ کی بڑائی میں جی رہے ہوں وہ اللہ کی بڑائی والی باتوں میں اپنی ذہنی غذا نہیں پاتے۔ جو لوگ دنیا کے فائدوں میں کھوئے ہوئے ہوں انھیں آخرت کے فائدہ کی بات بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ جو لوگ صرف اپنی عقل سے سوچنا جانتے ہوں وہ وحی کی رہنمائی کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو لوگ قریب کی صرف چھوٹی مصلحتوں کو دیکھ پاتے ہوں، وہ ان عظیم تر مصلحتوں کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں جو مستقبل بعید کے پردہ میں چھپی ہوئی ہوں۔

اسی طرح جو لوگ نفرت کی نفسیات میں جیتے ہوں وہ محبت کے پیغام کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ جو لوگ صرف لڑائی اور ٹکراؤ کی زبان جانتے ہوں ان کے لئے صبر اور اعراض کی حکمتوں تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ جو لوگ صرف انسانی عقل سے سوچنا اور رائے قائم کرنا جانتے ہوں وہ ان باتوں کو جاننے اور سمجھنے سے عاجز رہتے ہیں جن کا جاننا اور سمجھنا ربانی عقل کے بغیر ممکن نہیں۔

قال اللہ، قال الرسول

قرآن میں منکرین حق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ــــــ اور انھوں نے شروع کیا تم سے پہلی بار (وَهُمْ بَدَؤُكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ، التوبہ ۱۳) مفسرین نے اس کی تشریح میں یہ قول نقل کیا ہے کہ البادئ اظلم (شروع کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

عن ابی هريرة، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قلت لصاحبك يوم الجمعة انصت والامام يخطب فقد لغوت (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو، تو تم نے لغو کام کیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو آدمی آپس میں لڑجائیں تو ان میں سے جس شخص نے ٹکراؤ میں پہل کیا ہے، وہ زیادہ بڑا ظالم قرار پائے گا۔ اجتماعی زندگی میں اختلاف یا شکایت کے مواقع آتے ہیں۔ مگر ایسے مواقع پر آدمی کو پرامن تدبیر پر رکے رہنا ہے۔ اس کے لیے کسی حال میں یہ جائز نہیں کہ وہ حد کو پار کرکے ٹکراؤ اور تصادم کے میدان میں داخل ہوجائے۔

اوپر جو حدیث نقل کی گئی، اس سے ایک اور اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک آدمی غلطی کر بیٹھے تو دوسرے آدمی کو چاہیے کہ وہ اس سے اعراض کرے، وہ ہرگز جوابی غلطی نہ کرے۔ جوابی غلطی، ایک غلطی کو دو غلطی بنا دیتی ہے۔ وہ اس برائی میں مزید اضافہ کر دیتی ہے جس کو برداشت نہ کرکے اس کے خلاف اقدام کیا گیا تھا۔

یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کے مطابق آدمی کو پہلی غلطی سے بھی بچنا ہے اور دوسری جوابی غلطی سے بھی۔ کیوں کہ پہلی غلطی کرنے والا اگر ظالم ہے تو دوسری غلطی کرنے والا لاغی۔

اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم کرنے والا وہ ہے جو جارحیت کا آغاز کرے۔ اور سب سے زیادہ لغو کام کرنے والا وہ ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کو ظلم سے بھی بچنا ہے اور لغو کام کرنے سے بھی۔

اسلام اولاً فساد کی پہل کرنے والوں کو روکتا ہے ۔ اور اگر کوئی شخص پہلی نادانی کر بیٹھے تو اسلام کا تاکیدی حکم یہ ہے کہ فریق ثانی ہرگز دوسری نادانی نہ کرے ۔

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے ۔ مسلمان مشتعل ہو کر لڑنے لگتے ہیں ۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے ۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے ۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے ۔ یہ مہاجرین مشتعل ہو کر لڑ پڑتے ہیں ۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے ۔

ان واقعات میں بلاشبہ فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے ۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کو بڑھانے کی ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے ۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر ۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا تھا ۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا ۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے ۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے ۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات بہرحال ہر جگہ پیش آئیں گے ، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک ۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے ۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو ۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ ——— اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلاشبہہ غلطی پر ہے ۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظامِ تخلیق پر راضی نہیں ہوا ۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ، وہی لوگ " پٹرو ڈالر " کے ملکوں میں جا کر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے ۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں ۔

خدائی نشان

ٹائم میگزین ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے —— آسمانوں سے جہنمی آگ:

Hellfire from the heavens

یہ ایک خوفناک ہوائی حادثہ کی رپورٹ ہے جو ۲۸ اگست ۱۹۸۸ کو مغربی جرمنی میں پیش آیا۔ فرینکفرٹ کے قریب ریمسٹین ایربیس (Ramstein Air Base) پر ایک ہوائی مظاہرہ (Air Show) ہو رہا تھا۔ جس میں جدید ترین قسم کے دس فوجی جہاز حصہ لے رہے تھے۔ اس نمائش کا نام دل کے درمیان تیر (Arrow through the heart) رکھا گیا تھا۔ تقریباً ۳ لاکھ (300,000) آدمی اس خصوصی مظاہرہ کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

نقشۂ ذیل کے مطابق، دس جہازوں نے فضا میں اڑ کر دل کی تصویر بنائی۔ یہ سب جیٹ جہاز تھے جو ۴۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جہاز کو پرواز کے دوران الگ ہو کر "دل" کے اندر سے تیر کی مانند پار ہونا تھا۔ جہاز کے ماہر پائلٹ نے حسب پروگرام جہاز کو اڑایا۔ مگر حساب کی معمولی
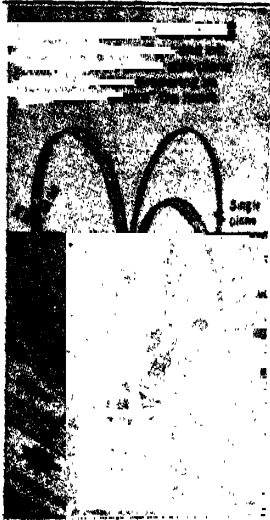
اس نقشہ کو دیکھئے۔ دس ہوائی جہاز ایک ساتھ اڑ کر اوپر پہونچتے ہیں۔ پھر ان میں سے دس جہاز ایک طرف اور ۴ جہاز دوسری طرف جا کر اپنے پیچھے سے لال، سفید اور ہرے رنگ کا دھواں نکالتے ہوئے فضا میں دل کی شکل (یا پان کے پتہ کی شکل) بناتے ہیں۔ ان میں سے ایک جہاز بیچ سے الگ ہو کر پیچھے کی طرف جاتا ہے اور پھر واپس ہو کر "دل" کے اندر سے پار ہو کر باہر نکل جانا چاہتا ہے۔ نیچے "ستارہ" کے مقام پر وہ دوسرے جہاز سے ٹکرا جاتا ہے کیوں کہ مقررہ حساب کے خلاف وہ کسی قدر جلد اور کسی قدر نیچے آگیا تھا۔

غلطی سے یہ جہاز (تیر) دوسرے جہازوں کے مقام اتصال پر چند سکنڈ پہلے پہونچ گیا۔ نیز یہ کہ اس جہاز (تیر) کو دوسرے جہازوں کی سطح پرواز سے کسی قدر بلندی پر اڑنا تھا۔ مگر اس کی سطح پرواز مقام اتصال پر عین وہی ہو گئی جو مقابل کے دوسرے جہاز کی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تیر" فضا سے پار ہونے کے بجائے مقابل کے جہاز سے ٹکرا گیا۔ تینوں جہازوں میں فوراً آگ لگ گئی۔ عام حالات میں فوجی جہازوں کی یہ غیر معمولی نمائش لوگوں کے اندر زبردست جوش و مسرت پیدا کرنے کا سبب بنتی۔ مگر مذکورہ حادثہ کے بعد وہ جہنمی لمحات (Hellish mintues) میں تبدیل ہو گئی۔

یہ جہاز رانی کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک ہوائی حادثہ تھا۔ تین جہازوں کے پائلٹ اپنے جہازوں کے ساتھ فوراً ہلاک ہو گئے۔ نمائش دیکھنے والوں میں تقریباً ۴۰ آدمی جل کر مر گئے۔ زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ یہ حادثہ اتنا اچانک تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ بھی کوئی تماشہ ہے۔ ایک شخص نے کہا :

I thought it was just some kind of special effect.

اس ہوائی مظاہرے کی تصویریں ٹیلی ویژن پر لی جا رہی تھیں۔ چنانچہ شروع سے آخر تک تمام مناظر رنگین تصویروں کی صورت میں ریکارڈ ہو گئے۔ ٹائم کی مطبوعہ تصویروں میں دکھایا گیا ہے کہ جہازوں کے ٹکراتے ہی زبردست آگ لگ گئی۔ جہازوں کے جلتے ہوئے ٹکڑے کھڑی ہوئی کاروں پر گرتے ہیں اور کاریں جلنے لگتی ہیں۔ تماشائیوں کے مجمع کے اوپر آگ سرخ بادل کی طرح امنڈ پڑتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان سے جہنمی آگ کا بہت بڑا گولہ گر پڑا ہو۔

خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ۔ میں چیخ پڑا کہ ہائے خدا۔ میں نے اوپر دیکھا تو وہاں آگ کے سوا اور کچھ نہ تھا :

"I yelled, 'Oh, God,' and looked over my shoulder and saw nothing but fire."

یہ ہوائی مظاہرہ انتہائی تربیت یافتہ فوجی پائلٹ انجام دے رہے تھے۔ منتظمین کو ان کی

بہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہاں کوئی ایمبولنس کار تک موجود نہ تھی۔ وہ اس قسم کے حادثہ کی بالکل امید نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ زخمیوں کو فوری طور پر اسپتال پہنچانے میں سخت مشکل پیش آئی۔

اس انسانی واقعہ میں بہت بڑا خدائی سبق ہے۔ وہ یہ کہ "دل کے درمیان سے تیر" گزارنے کا جو عمل جرمنی کے ہوابازوں نے بہت چھوٹے پیمانہ پر کرنا چاہا اور وہ اس میں ناکام رہے۔ یہی عمل بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر وسیع کائنات میں ہر آن ہو رہا ہے۔ مگر یہاں کسی قسم کا حادثہ پیش نہیں آتا۔

آسمان میں ستاروں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذروں کی تعداد ہے۔ یہ تمام ستارے ہر لمحہ نہایت تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ مگر ان میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ایک کہکشاں جس کے اندر اربوں کی تعداد میں بڑے بڑے ستارے ہوتے ہیں، وہ حرکت کرتی ہوئی دوسری کہکشاں کے اندر داخل ہوتی ہے اور پھر اس کے پار ہو جاتی ہے، مگر دونوں کہکشاؤں کے ستارے آپس میں نہیں ٹکراتے۔

یہ واقعہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کوئی بہت بڑا انتظام کرنے والا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہا ہے۔ ایک انتہاہ قوتوں والا انتظام کار اگر اس دنیا کے پیچھے نہ ہو تو سارا کائناتی کارخانہ اسی طرح تباہ و برباد ہو کر رہ جائے جس طرح جرمنی کی ہوائی نمائش تباہ ہو کر رہ گئی۔

بے خبری

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "آزادیٔ ہند" (India Wins Freedom) کے ۳۰ صفحات مصنف کی وصیت کے مطابق مہر بند کر دیے گئے تھے۔ اب تیس سال پورے ہونے کے بعد وہ چھاپ دیے گئے ہیں۔ ان صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جواہر لال نہرو (سابق صدر کانگرس) کی دو غلطیاں بڑی حد تک تقسیم ہند کا سبب بنیں۔

جواہر لال نہرو سے پہلی غلطی ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد ہوئی۔ یہ الکشن انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہوا تھا۔ اس الکشن میں مسلم لیگ کو پورے ملک میں سخت دھکا لگا تھا۔ صرف دو صوبوں (بمبئی اور یوپی) میں وہ کچھ کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ الکشن کے نتائج سے مسلم لیگ کی علحدگی پسندی کے رجحان پر زد پڑی۔ اس نے کانگرس کے ساتھ وزارت میں شامل ہونے کی پیش کش کی۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ اس کے دو لیڈر، چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو ریاستی کیبنٹ میں لے لیا جائے۔ مگر نہرو نے دونوں میں صرف ایک کو لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ نہرو کی یہ تجویز مسلم لیگ کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ وہ کانگریس کے قریب آکر دوبارہ اس سے دور ہوگئی۔

جواہر لال نہرو کی دوسری سیاسی غلطی وہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۶ میں کی۔ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے کیبنٹ مشن پلان کے تحت متحدہ ہندستان کی تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ دوبارہ تقسیم کے نظریہ سے ہٹ کر متحدہ ہندستان کے نظریہ کے قریب آگئی تھی۔ مگر نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جولائی ۱۹۴۶ میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ کانگریس آئندہ کیبنٹ مشن پلان کو تبدیل (Modify) کر سکتی ہے۔ مسٹر جناح اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ کانگریس سے ہمیشہ کے لیے دور ہوگئے جس کا آخری نتیجہ ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کی صورت میں برآمد ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کیبنٹ مشن پلان آزاد ہندستان کے constitution کی بنیاد تھا۔ اس کو منقسم ہندستان کے بجائے متحدہ ہندستان کے تصور پر بنایا گیا تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ مسٹر جناح نے اس کے بعد کہا کہ اگر کانگریس کیبنٹ مشن کی پابند نہ ہو اور اس کے نقشہ کو دستور ساز

اسمبلی میں اپنی اکثریت کے زور پر بدل دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتیں صرف اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی :

> Jinnah argued that if the Congress did not stick to the plan as accepted and changed the scheme through its majority in the constituent assembly, that would mean minorities would be placed at the mercy of the majority.
> (*Indian Express*, October 30, 1988)

مولانا آزاد کے "تیس صفحات" میں جب میں نے یہ بات پڑھی تو مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آگئی۔ اس آیت کے الفاظ یہ ہیں : كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (کتنے چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آتے ہیں، اللہ کے اذن سے)

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب تھے وہ مسلم لیڈر جن کو نہرو کا بیان معلوم تھا مگر انھیں خدا کا بیان معلوم نہ تھا۔ انھیں اقلیت اور اکثریت کی یہ منطق معلوم تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں تعداد کی کمی انھیں اکثریتی فرقے کے ماتحت بنا دے گی۔ مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اس سیاسی منطق کے اوپر بھی ایک منطق ہے اور وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اکثریت کے اوپر اقلیت کو بالا کر دے۔

اعلان

عمومی دعوت کے لیے انگریزی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ فروری ۱۹۸۴ میں انگریزی الرسالہ جاری کیا گیا تھا۔ پانچ سال سے غیر معمولی خسارہ کے ساتھ اس کو نکالا جاتا رہا ہے۔ مگر قوم کے اندر دعوتی جذبہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کام میں ہمیں کوئی قابل ذکر تعاون نہ مل سکا۔ اب شدید مالی دشواریوں کے باعث انگریزی الرسالہ کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آئندہ اگر حالات سازگار ہوئے تو انشاءاللہ اس کو دوبارہ جاری کیا جائے گا۔

صدر اسلامی مرکز

ایک سفر

نئی دہلی کے افغانی سفارت خانہ سے مجھے ان کا خط موزخہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ملا جس میں فرسٹ سکریٹری کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ افغانستان کی اسلامی وزارت اور وہاں کی مجلس علماء کے اشتراک سے ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔ یہ کانفرنس ۲۲-۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو کابل میں ہوگی۔ مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کروں اور وہاں سیرت کے یونیورسل پہلو پر ایک مقالہ پیش کروں۔ اس دعوت کے مطابق کابل (افغانستان) کا سفر ہوا۔

۲۰ اکتوبر کو صبح پونے پانچ بجے کا وقت تھا۔ فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ کل شام کو "ٹیکسی اسٹینڈ" سے ٹیلیفون پر کہا گیا تھا کہ ہم کو صبح پونے پانچ بجے ایک ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ اس کے مطابق ٹیکسی والا ٹھیک چار بج کر ۴۵ منٹ پر ہمارے گیٹ کے سامنے موجود تھا، نہ ایک منٹ پہلے اور نہ ایک منٹ بعد۔

ٹیکسی والا اپنے پیشہ کے معاملہ میں اتنا زیادہ پابند کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے پیشہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کی چیز بنا رکھا ہے۔ کوئی معاملہ جب آدمی کے لئے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ بن جائے تو اس کے بارہ میں وہ ہر بات کو بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کے لئے اس کی تمام ذہنی اور عملی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ مسلمانوں نے اسلامی دعوت کے معاملہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اسلامی دعوت کے معاملہ میں وہ کردار نظر نہیں آتا جس کا ایک نمونہ ٹیکسی والے کے یہاں ملتا ہے۔

گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا تو سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کی قطاریں مسلسل چلی جا رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر مجھے ۱۹۸۳ کا سفر یاد آیا جب کہ الشیخ علی الحریقی (قاضی شارجہ) مجھے اپنے رہائشی مکان پر لے گئے تھے جو کہ شہر سے تقریباً ۵۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سفر پورا کا پورا ریتیلے میدان میں ہوا۔ دہلی کا سفر اگر سرسبز ماحول میں تھا تو شارجہ کا یہ سفر صحرائی ماحول میں۔ اس دنیا میں "درخت" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر شکر کرے۔ "صحرا" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر صبر کرنا سیکھے۔ آدمی دونوں قسم کی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر وہ ان سے نہ شکر کا سبق لیتا ہے اور نہ صبر کا۔

دہلی میں دو ایرپورٹ ہیں اور دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ ٹیکسی والے نے ہم کو قریب کے

ہوائی اڈہ (پالم ایرپورٹ) پر پہنچا دیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ کابل کا جہاز اگلے ہوائی اڈہ (اندرا ایرپورٹ) سے چلے گا۔ چنانچہ پالم سے واپس ہو کر دوبارہ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔ چوں کہ ہم گھر سے کسی قدر پہلے روانہ ہو گئے تھے اس لئے اس تاخیر سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس قسم کے اتفاقات ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے روانہ ہو۔ تاکہ اگر راستہ میں تاخیر کا کوئی اتفاقی سبب پیش آجائے تب بھی وقت پر اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔

اس تجربہ کے بعد مجھے حضرت ابوہریرہ کی وہ حدیث یاد آئی جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے:

قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ خَافَ أَدْلَجَ وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے وہ رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اور جو رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے وہی (دن میں) اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ سن لو کہ اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے۔ سن لو کہ اللہ کا سودا جنت ہے۔

دنیا کے مقصد کو پانا ہو یا آخرت کے مقصد کو پانا، دونوں ہی میں خصوصی اہتمام کرنا ضروری ہے خصوصی اہتمام کے بغیر نہ دنیا کا مقصد صحیح طور پر حاصل کیا جاسکتا اور نہ آخرت کا۔

جہاز کو مقررہ وقت کے اعتبار سے ساڑھے سات بجے روانہ ہونا تھا۔ تمام مسافر جہاز میں بیٹھے ہوئے اڑان کا انتظار کر رہے تھے کہ آدھ گھنٹہ بعد پائلٹ نے ہوائی جہاز کے ایڈریس سسٹم پر اعلان کیا کہ جہاز کے ایک پہیہ میں پریشر کم پایا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بدلا جارہا ہے۔ آپ اس دیری کے لئے ہمیں معاف کریں گے۔ دیری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جہاز روانہ ہوا تو گھڑی میں ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یعنی اصل مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد ——— دہلی سے کابل تک جہاز کو پہنچنے کے لئے ڈھائی گھنٹہ درکار تھا۔ مگر دہلی میں پہیہ کی اصلاح میں دو گھنٹے لگ گئے۔

جہاز کے ساتھ یہ جو حادثہ پیش آیا، اس کا "جھٹکا" جہاز سے زیادہ جہاز کے مسافروں کو برداشت کرنا پڑا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ چلتی ہوئی سواری پر مسافر کی حیثیت شاک ابزاربر (جھٹکا سہنے والے) کی ہوتی ہے:

Passengers are shock absorbers on moving vehicles.

ایرپورٹ کے اندر داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا گویا ہم ایک اور ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں

ہر چیز کا معیار مختلف تھا۔ ایر پورٹ کے باہر اگر "دیشی ہندستان" کا منظر تھا تو ایر پورٹ کے اندر "بدیشی ہندستان" کا۔ ہر ملک خواہ وہ کتنا ہی غریب ہو، یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے ایر پورٹ کو بین اقوامی معیار پر بنائے۔ "ایر پورٹ" گویا ہر ملک کا ایک تہذیبی جزیرہ ہے۔

ایک سیاح تھوڑے دنوں کے لئے ہندستان آیا۔ اس نے ان مقامات کا سفر کیا جہاں ہوائی جہاز اس کو لے جاسکتا تھا۔ اس نے لال قلعہ اور تاج محل جیسی قابل دید چیزوں کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ اس سیاح کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے ہندستان کے تہذیبی جزیرہ کو دیکھا، وہ وسیع تر ہندستان کو نہ دیکھ سکا۔ ایسی حالت میں عجب نہیں کہ وہ واپس جاکر لکھے: ہندستان کے لوگ بہت خوش قسمت ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوتے ہیں تو وہ لال قلعہ میں رہتے ہیں، اور جب مرتے ہیں تو تاج محل میں دفن ہوتے ہیں ــــــ مصنوعی مشاہدہ اور حقیقی مشاہدہ میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

ہوائی جہاز جب بلند ہو کر فضا میں اڑتا ہے، اس وقت آپ نیچے زمین کی طرف دیکھیں تو زمین کی سطح پر ہر چیز معمولی دکھائی دیتی ہے ــــــ مکانات چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سڑکیں پھیلی ہوئی لکیر کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ سمندروں میں تیرتے ہوئے جہاز دیا سلائی کی ڈبیا معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ وہ صرف ٹیلے ہوں۔ اونچے کھڑے ہوئے درخت پودے کی مانند نظر آتے ہیں۔ وغیرہ۔

میں نے اس منظر کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز "عالم سفلی" سے اوپر اٹھ کر "عالم علوی" میں سفر کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مادی مشاہدہ ایک روحانی حقیقت کی تمثیل ہے۔ مومن کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ اس کا جسم بظاہر عالم سفلی میں ہو، مگر اس کی روح یا اس کا فکری وجود عالم علوی میں سفر کر رہا ہو۔ موجودہ دنیا میں اس طرح اپنے آپ کو بلند کرنا درحقیقت حیات دنیا سے گزر کر حیات آخرت کا تجربہ کرنا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ تجربہ حسیاتی طور پر ہوتا ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں یہ تجربہ واقعی طور پر ہوگا۔

جہاز میں آج کے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات مطالعہ کے لئے موجود تھے۔ اخبار اٹھایا تو ہر ایک کی پہلی سرخی ایک سخت ہوائی حادثہ کے بارہ میں تھی۔ نوبھارت ٹائمز (۲۱ اکتوبر) کی پہلی سرخی یہ تھی:

" دو ویمان دردگھٹنا ؤں میں ۱۶۴ مرے"۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۰ اکتوبر) کی پہلی آٹھ کالمی سرخی یہ تھی :

164 killed as IA, Vayudoot planes crash

یہ ہندستان کی شہری ہوا بازی کی تاریخ میں دوسرا سب سے زیادہ ہولناک حادثہ تھا۔ پہلا شدید تر حادثہ وہ تھا جو ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو پیش آیا۔ ایر انڈیا کا ایک جہاز (کنشکا) ایک بم کے پھٹنے سے تباہ ہوگیا تھا اور بحر اٹلانٹک میں گر پڑا تھا۔ موجودہ حادثہ دو الگ الگ جہازوں کا تھا مگر وہ ایک ہی دن ہوا۔ ایک احمد آباد میں اور دوسرا گوہاٹی میں۔ دونوں موسم کی خرابی کی بنا پر ہوئے۔ احمد آباد میں تباہ ہونے والا جہاز جب ہوائی اڈہ کے اوپر پہنچا تو وہاں فضا میں سخت کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پائلٹ سطح زمین پر دیکھ نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ (۲۰ اکتوبر) کے مطابق جہاز ہوائی اڈہ کے اندر اترنے والی سڑک پر اترنے کے بجائے باہر ایک کھیت میں اتر گیا اور وہاں درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہوگیا :

Instead of landing at the airstrip, it crashed into a field in the outskirts of the city.

اسی طرح چند دن پہلے اخبار کے صفحہ اول پر ایک تصویر تھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا جہاز آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ یہ یوگنڈا کی کمپنی (Ugandan Airlines) کی فلائٹ نمبر ۷۷۵ تھی۔ یہ بوئنگ جہاز لندن سے براستہ روم یوگنڈا جا رہا تھا۔ اس پر عملہ سمیت ۵۲ مسافر سوار تھے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کی شام کو اسے کچھ دیر کے لئے روم کے ہوائی اڈہ پر اترنا تھا۔ اس وقت یہاں شدید کہر چھایا ہوا تھا۔ جہاز کا پائلٹ رن وے کو صاف طور پر دیکھ نہ سکا۔ چنانچہ جہاز ایک پختہ عمارت (Hangar) سے ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی جہاز آگ کا ایک گولا بن گیا۔ بیشتر لوگ اسی وقت ہلاک ہو گئے۔ تقریباً ۲۰ آدمی اس حالت میں اسپتال میں پہنچائے گئے کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور بدن آگ کے اثر سے جھلسا ہوا تھا۔

زندگی حادثات سے اتنی زیادہ بھری ہوئی ہے کہ آدمی اگر حادثات کو یاد رکھے تو اس کے اعصاب پست ہو جائیں اور پھر وہ کوئی سفر یا دوسرا کوئی اقدامی کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ذہن کی وہ صفت ہے جس کو قدیم زمانہ میں فراموشی کہا جاتا تھا، اور موجودہ زمانہ

میں اس کو لاشعور کا معاملہ کہا جاتا ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسان جب رات کو سوتا ہے تو اس کا ذہن خودکار مشین کی طرح ایک خاموش کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ یاد رکھنے کے قابل باتوں کو تو زندہ شعور کے خانہ میں باقی رکھتا ہے۔ اور دوسری تمام باتوں کو دماغ کے پچھلے خانہ (لاشعور) میں ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے ساتھ دن میں ایک سخت واقعہ پیش آتا ہے، شام کو وہ اس حال میں سوتا ہے کہ وہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر صبح کو جب وہ اٹھتا ہے تو دوبارہ وہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی ذہن عام مشینی کمپیوٹر کی مانند ہوتا اور تمام پیش آنے والی باتوں کو یکساں طور پر اپنی یادوں میں لئے رہتا تو انسان کے لئے زندگی گزارنا ہی ناممکن ہو جاتا۔

اخبار میں ایک عبرت انگیز خبر پڑھی جو نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق ۱۷ اگست ۱۹۸۸ کا ہوائی حادثہ جس میں جنرل ضیاء الحق، امریکی سفیر اور دوسرے بہت سے "وی آئی پی" ہلاک ہوئے، اس کے سبب کے بارہ میں امریکہ اور پاکستان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پاکستان مصر ہے کہ یہ تخریب کاری (Sabotage) کا نتیجہ تھا۔ جب کہ امریکی ماہرین جنھوں نے حادثہ کے تمام پہلوؤں کا نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حادثہ کا سبب جہاز میں مشینی خرابی (Mechanical failure) تھا۔ امریکہ نے واقعہ کو صرف ٹکنکل حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ اس کو واقعہ کا صرف وہی سبب دکھائی دیا جو فی الواقع تھا۔ جب کہ پاکستان کو اس حادثہ سے سیاسی اور قومی فائدہ اٹھانا تھا۔ اس لئے اس نے ماہرین کی رپورٹ کی اشاعت کو "عوامی مفاد" کے خلاف قرار دے کر اعلان کر دیا کہ اس کا سبب تخریب کاری تھا۔

امریکی حکام نے تاریخ نگاری کے اصول کو اختیار کیا، پاکستانی حکام نے تاریخ سازی کے طریقہ کو، اور دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز پائی جاتی ہے وہ یہی تاریخ سازی ہے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والے تو شاید تاریخ سازی کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

ملاپ (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸) میں دسہرہ کی مناسبت سے اداریہ تھا: من کا راون کب جلے گا۔ اس میں اڈیٹر نے لکھا تھا کہ "آج دسہرہ کے دن سارا دیش خوشیاں منا رہا ہے۔ کیوں کہ آج کے دن بھگوان رام نے راون روپی برائیوں کو ختم کر کے فتح حاصل کی تھی۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ صرف پتلا ہی جلایا جاتا ہے

اور باقی برائی جوں کی توں قائم رہتی ہے۔

ایک مسلمان اور میلاد النبی کے جلسوں پر تبصرہ کرے تو وہ بھی اس قسم کے الفاظ لکھے گا کہ میلاد النبی کے جشن میں رسول اللہ کے بارہ میں پر جوش تقریریں ہوتی ہیں مگر رسول اللہ کی سنت پر عمل نہیں کیا جاتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں تبصرے بالکل بے فائدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے دسہرہ کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دینی اعتبار سے میلاد النبی کے جشن اور جلوسوں کی کوئی اصل نہیں۔ اس لئے دونوں مبصروں کو سرے سے ان رسموں ہی کو لغو قرار دینا چاہئے۔ ہندو مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ دسہرہ کا میلا ایک تاریخی بدعت ہے، اس لئے اس کو ختم کرو۔ اسی طرح مسلمان مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ "جشن میلاد النبی" ایک دینی بدعت ہے، اس لئے اس کو بند کرو۔ مگر ایسا کہنے کی ہمت نہ ہندو مصلح میں ہے اور نہ مسلمان مصلح میں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسی زبان بولتے ہی وہ اپنی قوم میں نکو بن جائیں گے۔ مگر اصلاح کا کام ہمیشہ نکو بننے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو نکو بننے کا حوصلہ نہ ہو انھیں مصلح کا کریڈٹ لینے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہئے۔

جہاز میں ایک عرب مسافر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک عربی اخبار الوطن (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) تھا۔ یہ کویت سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ایک چھوٹا سا مضمون چوکھٹے میں تھا۔ یہ سوال کے انداز میں تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے: هل تعرفون ما العلاقة بين صمت الانظمة العربية حول تقسيم لبنان و المثل العربي القائل بأن الصمت علامة الرضا۔ یعنی کیا آپ جانتے ہیں کہ لبنان کی تقسیم پر عرب حکومتوں کی خاموشی اور اس عربی مثل میں کیا نسبت ہے کہ خاموشی رضامندی کی علامت ہے۔

الوطن العربی کی ایک اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ عرب دنیا کی آبادی، تازہ اعداد و شمار کے مطابق، ۱۵۶ ملین ہے (۱۵۶ مليونا عدد سكان العالم العربي)۔ یہاں بھی میرا خیال ہے کہ مذکورہ سوال ۱۵۶ ملین عربوں سے کرنے کے بجائے لبنان کے ان مسلمانوں سے کرنا چاہئے جنھوں نے انتہائی نادان سیاست اختیار کرکے وہ صورت حال پیدا کی جو بالآخر تقسیم تک جا پہنچی۔ یہ تقسیم اگر مکمل ہو گئی تو تقسیم کے بعد اس کا جو حصہ مسلمانوں کو ملے گا وہ گویا عرب دنیا کا "بنگلہ دیش" ہوگا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو جب انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۵۱ مجھے لئے ہوئے کابل کی طرف جا رہی

تھی تو مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بیرونی سفر کے دوران میری ملاقات پاکستان کے ایک افسر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے پاکستان (کراچی، لاہور) کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی ہے، وہ ایر انڈیا (بین اقوامی ہوائی ادارہ) کے تحت نہیں ہے، بلکہ انڈین ایر لائنز (ملکی ہوائی ادارہ) کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا نے ابھی تک ہم کو ایک مستقل ملک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا، وہ ہم کو اپنی وسیع تر سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

دوسری طرف انڈیا کا حال یہ ہے کہ میں ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کو نئی دہلی کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ اس میں پاکستان کے قائم مقام سفیر کو چیف گسٹ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ناجنگ معاہدہ (No-war pact) کی انتہائی شدید ضرورت ہے تاکہ دونوں ملک ایک دوسرے کی طرف سے بےفکر ہو کر اپنے ترقیاتی کاموں میں لگ سکیں۔ مگر، ان کے بیان کے مطابق، دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان ناجنگ معاہدہ پر صرف اس لئے اب تک دستخط نہ ہوسکے کہ انڈیا کا اصرار تھا کہ مسودہ میں ایک دفعہ یہ بڑھائی جائے کہ پاکستان کسی بیرونی ملک کو اپنی زمین پر فوجی بیس بنانے کی اجازت نہیں دےگا۔

میرے نزدیک پاکستان اور ہندستان دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا شکار ہیں۔ مگر انڈیا کے بارہ میں پاکستان کا شبہہ بھی غلط ہے اور پاکستان کے بارہ میں انڈیا کا شبہہ بھی غلط۔ یہ شبہات ایسے ہی بےبنیاد ہیں جیسے کہا جائے کہ انڈیا افغانستان کو اپنے ملک کا ایک صوبہ سمجھتا ہے، حتی کہ بنکاک پورٹ بلیر، سنگاپور، مالدیپ وغیرہ کو بھی، کیوں کہ اس نے ان تمام جگہوں پر ایر انڈیا کے بجائے انڈین ایر لائنز کے تحت اپنی ہوائی سروس جاری کر رکھی ہے۔

ایک معاملہ کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھیانک بن جاتا ہے۔ اسی معاملہ کو شبہات سے اوپر اٹھ کر دیکھیں تو وہ معمولی قسم کا ایک سادہ واقعہ معلوم ہوگا۔

"تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز کابل کے ہوائی اڈہ پر اترنے کو تھا: اناؤنسر نے اعلان کیا۔ چند منٹ میں جہاز بالکل نیچے آگیا اور ہوائی اڈہ کی زمین صاف دکھائی دینے لگی۔ اتنے میں اچانک ہوائی جہاز اوپر اٹھنے لگا۔ اس نے فضا میں بلند ہو کر چند چکر لگائے اور پھر کسی قدر تاخیر کے ساتھ ہوائی اڈہ پر اترا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ کچھ نوڈگرانفر ہوائی جہاز کا فوٹو لینے کے لئے رن وے پر آگئے تھے۔ اترنے کی صورت میں چول کمان سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا، اس لئے پائلٹ نے جہاز کا رخ دوبارہ اوپر کی طرف کر دیا۔ اور ہوائی اڈہ کا چند

چکر لگا کر دوبارہ نیچے آیا۔

جانور میں بیک وقت دونوں صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اوپر جا کر دوبارہ نیچے آسکتا ہے، اسی طرح وہ نیچے آکر دوبارہ اوپر کی طرف اٹھ سکتا ہے۔ یہی دو گونہ صفتیں زندگی کے وسیع تر سفر کے لئے بھی درکار ہیں۔ جو لوگ صرف ایک رخ پر بڑھنا جانتے ہوں۔ وہ اوپر جا کر نیچے نہ اتریں، یا نیچے آکر دوبارہ اوپر نہ جا سکیں ایسے لوگ کبھی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہوائی اڈہ پہ اترے تو نظر آیا کہ اوپر ہر طرف فوجی ہیلی کاپٹر اڑ رہے ہیں۔ یہ اہتمام سیکوریٹی کی غرض سے کیا گیا تھا۔ میں نے فضا میں دیکھا تو اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر بار بار کوئی چیز گرا رہے تھے جو باہر آتے ہی آگ کے گولے کی طرح جل اٹھتی تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ سفید دھوئیں کی لکیر کی طرح فضا میں پھیل جاتی تھی۔ یہ واقعہ فضا میں بار بار ہو رہا تھا۔

ایک افغانی سے میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ "پہاڑوں" کی طرف سے لوگ امریکہ کے بنے ہوئے اینٹی ایرکریفٹ مزائل مارتے ہیں جن کو اسٹنگر (Stinger) کہا جاتا ہے۔ ان اسٹنگروں میں یہ صفت ہے کہ وہ گرم چیز کی طرف تیزی سے جاتے ہیں جس رخ پر انھیں پھینکا گیا ہے، وہاں سب سے زیادہ گرم چیز ہوائی جہاز کا انجن ہے۔ چنانچہ وہ انجن کا پیچھا کر کے اس کو مارتے ہیں۔

شروع میں اسٹنگر ہوائی جہازوں کو مار گرانے کا بالکل یقینی ذریعہ تھے۔ مگر اس کے بعد روسیوں نے ایک چیز ایجاد کر کے اسٹنگر کو بڑی حد تک بے اثر بنا دیا ہے۔ اس ایجاد کا نام فش (Fish) ہے۔ فش کوئی کیمیکل ہے۔ جب اس کو ہیلی کاپٹر کے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ بھڑک کر جل اٹھتا ہے۔ یہ جلنے والا مادہ جہاز کے انجن سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اسٹنگر کو اس کی طرف پھینکا جاتا ہے تو وہ جہاز کے انجن کی طرف جانے کے بجائے جلتے ہوئے گرم مادہ کی طرف جا کر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز بچ کر آگے نکل جاتا ہے۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے شخص کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ زیر نشانہ آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ نشانہ کو بے نشانہ کر دے۔ وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو نشانہ بننے سے بچا لے۔ فریق ثانی کے خلاف شور وغل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

آج کل ایک جغرافی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کو جنوبی ایشیا (South Asia) کہا جاتا ہے۔

اس علاقہ میں ہندستان، پاکستان، سری لنکا، عرب اور افغانستان شمار کئے جاتے ہیں۔ افغانستان سے میرا تعلق، ایک اعتبار سے خاندانی ہے۔ میرے مورث اعلی حسن خاں مرحوم ایک افغانی پٹھان تھے۔ جو غالباً ۱۵ویں صدی عیسوی میں اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان چلے آئے۔ اس زمانہ میں افغانستان کے بہ افراد اکثر ہندستان کا رخ کیا کرتے تھے۔

حسن خاں مرحوم چترال کے رہنے والے تھے۔ چترال کا علاقہ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے فتح کیا۔ ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ علاقہ پہلے افغانستان کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ انگریزوں کی ماتحتی میں آیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا حصہ ہے۔

ایک افغانی جرنلسٹ مسٹر سرور سے میں نے کہا کہ میرے افغانی مورث اعلی افغانستان کو چھوڑ کر جونپور (ہندستان) گئے۔ اس وقت وہاں ایک افغان (سلطان شرقی) کی حکومت تھی۔ میرے مورث اعلی کھیتا سرائے کے جنگل میں پہنچے تو وہاں ایک شیر سامنے آگیا۔ ان کے پاس اس وقت صرف ایک تلوار تھی۔ اس تلوار سے انھوں نے شیر کا مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ ان کی اس بہادری کی خبر سلطان شرقی تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس علاقہ میں انھیں جاگیر عطا کی۔

میں نے سرور صاحب سے پوچھا کہ کیا اب بھی افغانستان میں ایسے لوگ ہیں جو تلوار کے ذریعہ شیر کو مار سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کا واقعہ بتایا کہ ایک بار جنگل میں ان کی مڈبھیڑ ایک شیر سے ہوگئی۔ اس وقت ان کے پاس ایک بڑی چھری تھی۔ اسی چھری سے انھوں نے شیر کو مار ڈالا۔ اگرچہ اس مقابلہ میں وہ خود بھی کافی زخمی ہوئے۔

پٹھانوں (افغانی باشندوں) کی تصویر قدیم زمانہ میں "طاقتور بیوقوف" کی تھی۔ پٹھانوں کی بیوقوفی کے بارہ میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ مثلاً ایک پٹھان کی کسی نے دعوت کی اور اس میں اسے برفی کھلائی۔ پٹھان کو برفی پسند آگئی۔ وہ بازار میں نکلا تو چاہا کہ مزید برفی حاصل کرے۔ ایک دکان پر سفید صابن کی ٹکیاں برائے فروخت رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سمجھا کہ یہی برفی ہے اور اس کو خرید لیا۔ گھر پر لا کر کھانا شروع کیا تو وہ بہت بدمزہ تھیں۔ پٹھان منھ بگاڑ بگاڑ کر برفی کے ہم شکل صابن کو کھا رہا تھا۔ ایک شخص گزرا۔ اس کے بعد جو سوال و جواب ہوا وہ یہ تھا:

سوال: آغا چہ می خوری جواب: پیسہ می خورم

شاید پٹھانوں کی اسی بگڑی تصویر کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی شاعر نے پٹھانوں کو "غسال" کے خانہ میں ڈال دیا۔ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مغربیت پر طنز کرتے ہوئے اس نے کہا کہ دین سے ان کی دوری اور علم واقفیت کا یہی انجام رہا تو آئندہ یہ حال ہوگا کہ:

آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

تاہم موجودہ زمانہ میں روس کا افغانستان پر حملہ پٹھانوں کے لئے اس اعتبار سے مفید ثابت ہوا ہے کہ اس نے ان کی سابقہ تصویر بدل دی۔ پہلے اگر ان کی تصویر "طاقتور بے وقوف" کی تھی تو اب ان کی تصویر "طاقتور مجاہد" کی بن گئی ہے۔ اب وہ پوری مسلم دنیا میں ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

افغانوں کی بہادری مشہور ہے۔ یہاں بھی ان کی بہادری کے کئی قصے سننے میں آئے۔ میں نے ایک افغانی نوجوان آصف اللہ شمس (عمر ۳۰ سال) سے پوچھا کہ افغانی لوگ اتنے بہادر اور اتنے نڈر کیوں ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کو بچپن سے اپنے گھر میں اور اپنے ماحول میں یہی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ کوئی افغان لڑکا یا کوئی افغان آدمی اگر بزدلی کی بات کرے تو فوراً اس کو یہ سننے کو ملے گا کہ تم بے غیرت ہو، تم کو شرم نہیں آتی کہ تم افغانی ہو اور تمہارے اندر افغانیت نہیں:

تو بی غیرت ہستی، نی شرمی، افغان ہستی و افغانیت نداری۔

مسٹر سالم علی اور ایک انگریز عالم حیوانات کرنل میننرزاگن (R. Meinertzhagen) چڑیوں کے مطالعہ کے لئے ۱۹۳۵ میں افغانستان گئے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ چند ہفتے وہاں مقیم رہے۔ وہ افغانی چڑیوں کی تلاش میں دور دور کے علاقوں میں نکل جاتے۔ سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنا کھانے پینے کا سامان راستہ پر یا سڑک کے کنارے رکھ دیتے اور اپنی دوربینوں کے ساتھ جنگلوں میں چلے جاتے یا پہاڑوں پر چڑھ جاتے۔ جب وہ لوگ اپنا کام کرکے واپس آتے تو وہ تعجب کے ساتھ دیکھتے کہ ان کا سامان بدستور اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ بکھیوں کے سوا کسی اور نے ان کو نہیں چھوا ہے:

Salim Ali, *The Fall of Sparrow*, 1987, p. 100.

یہ خصوصیت آج بھی افغانیوں میں موجود ہے۔ افغانی آج بھی ایک باکردار قوم ہیں۔ تاہم اسی کے ساتھ جان غیر کو مارنا ان کے یہاں اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ مال غیر کو لینا ناجائز۔

کابل شہر پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔ بلندی سے دیکھیں تو پورا شہر درختوں اور باغوں

سے جو رٹ میں نظر آتا ہے: "فطرت کی دنیا کتنی حسین ہے" اس کو دیکھ کر میں نے سوچا "مگر انسانی دنیا حسین نہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت "پابند" ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان "آزاد" ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کی مخلوقات کا حسن یہ ہے کہ وہ نظام خداوندی کی پابند بن کر رہے۔ فطرت اس کی مکمل پابندی کرتی ہے اس لئے وہ حسین ہے، انسان اس کی پابندی نہیں کرتا اس لئے وہ حسین نہیں۔

خدا نے چاہا کہ انسان کی صورت میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو آزاد ہوتے ہوئے بطور خود اپنے آپ کو نظام خداوندی کا پابند بنا لے۔ وہ آزادانہ پابندی والے حسن کا نمونہ پیش کرے۔ مگر انسان، بہ مستثنیات کو چھوڑ کر، اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آزادی کے باوجود پابندی کا نمونہ اس نے پیش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں درخت حسین ہے، مگر انسان حسین نہیں۔ ایک مفکر کے الفاظ میں: اس دنیا میں ہر چیز حسین ہے، مگر یہاں کی صرف ایک چیز حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

۲۱ اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز یہاں کی مسجد "جامع وزیر محمد اکبر خاں" میں پڑھی۔ یہ مسجد یہاں کی سب سے خوبصورت مسجد بتائی جاتی ہے۔ خطبہ سے پہلے امام صاحب نے فارسی زبان میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اس آیت سے آغاز کیا: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (شما امت بہتر است)۔ انھوں نے کہا کہ امروز حقیقت اسلام بہ دنیا واضح است (آج اسلام کی حقانیت دنیا پر واضح ہے)، مگر ہم خود اسلام کے لئے نہیں اٹھتے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ آج افغان عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ گھر اجڑ رہے ہیں۔ کاروبار برباد ہو گئے۔ حالانکہ اسلام دین ترحم است۔ آخر میں انھوں نے رقت آمیز انداز میں یہ دعا کی:

خدایا اسلام را اتفاق نصیب کن، خدایا اسلام را برادری نصیب کن۔

مسجد میں ایک بات مجھے بہت پسند آئی کہ تمام لوگ صفوں میں مل کر بیٹھے۔ جب جماعت کھڑی ہوئی تو تمام صفیں بیک وقت کھڑی ہو گئیں۔ وہ صورت پیدا نہیں ہوئی جو دہلی میں نظر آتی ہے کہ جماعت کھڑی ہوتے ہی آگے آئیے، آگے آئیے، کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ جو بعض اوقات قرأت شروع ہونے تک جاری رہتی ہے۔ میرے اپنے تجربہ میں دہلی کا مسلمان سب سے زیادہ غیر منظم ہے۔ حتی کہ مسجد کی مقدس فضا میں بھی ایک ہی بے نظمی مسلسل سالہا سال سے جاری ہے، اس میں کوئی کمی یا اصلاح نظر نہیں آتی۔

نماز سے فراغت کے بعد مسجد سے نکلے تو فقیروں کی جماعت دروازہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں بڑی

تعداد میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کے پھٹے کپڑوں اور میلے جسموں کے پیچھے خوبصورت افغان چہرے جھلک رہے تھے۔ تعلیم کی کمی اور معاشیات کی بربادی افغانستان میں اپنی آخری حد کو پہنچ رہی ہے۔ یہاں ہندستانی روپیہ چلتا ہے۔ ایک روپیہ پندرہ افغانی روپیہ کے برابر ہے۔ اس سے یہاں کی اقتصادی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مسجد کے دروازہ کے باہر ایک بوڑھا افغانی انار اور سیب بیچ رہا تھا۔ لکڑی کی پرانی گاڑی کے اوپر ایک طرف پھل تھے اور دوسری طرف ترازو اور اس کے ساتھ پتھر کے باٹ۔ گاہکوں کی آمد سے بے پروا ہوکر وہ ہاتھ میں تسبیح لئے کھڑا تھا اور "سیب لو سیب" یا "انار لو انار" جیسی آوازیں لگانے کے بجائے خاموشی تسبیح خوانی میں مشغول تھا ——— افغانستان میں جہازوں کی گڑگڑاہٹ اور بم کے دھماکوں کے سوا مجھے زندگی ہر جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی۔

افغانستان میں پشتو اور دری، دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایران میں جس زبان کو فارسی کہا جاتا ہے اس کو افغانستان میں دری کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دری اور پشتو زبانیں ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی۔ دو تقابلی فقرے سے اس فرق کو سمجھا جاسکتا ہے:

دری	پشتو
من چای می خورم	زه چای خورم
من خانه دارم	زه کور لرم

کابل میں میرا قیام جس ہوٹل (روم ۳۲۸) میں تھا، اس کو مقامی لوگ اپنی زبان میں میلہ پال ہوٹل کہتے ہیں۔ مگر اس نام کی بنا پر اس کو افغانی ہوٹل سمجھنا ایسا ہی ہوگا جیسے قاہرہ میں "نصر" کار کو دیکھ کر کوئی شخص سمجھے کہ یہ مصری صنعت کی بنائی ہوئی کار ہے۔ مسلم ملکوں میں بہت سی جدید چیزیں ہیں جن کے نام بظاہر مقامی مسلم زبان میں ہوتے ہیں، مگر حقیقۃً وہ خالص مغربی ہوتی ہیں۔

اس ہوٹل کا اصل نام "انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل" ہے۔ یہ دراصل مغربی سرمایہ کے تحت قائم شدہ ایک عالمی تجارتی تنظیم ہے جس کا رجسٹرڈ نام Inter-Continental Hotels ہے۔ اس کے تحت یروشلم سے لے کر نیویارک تک درجنوں شہروں میں ہوٹل قائم ہیں۔ اسی طرح ابوظبی، عمان، قاہرہ، دوبئی، اصفہان، کابل، مکہ، مسقط، ریاض، شارجہ، طائف، تہران، کراچی، لاہور وغیرہ

میں بھی اس کے ہوٹل چل رہے ہیں۔ "ہوٹل" اپنے جدید معنوں میں ایک زبردست انڈسٹری ہے اور موجودہ زمانہ کی دوسری انڈسٹری کی طرح مسلمان یہاں بھی بہت پیچھے ہیں۔

میرے کمرہ کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ کھولا تو ایک افغانی عالم اندر داخل ہوئے۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں عرب انداز کی تسبیح تھی جس پر مسلسل ان کی انگلیاں چل رہی تھیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں مسلمانوں کا حال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر لحاظ سے بہت اچھا (عالی من جمیع الجہات)۔ انھوں نے بتایا کہ صرف کابل میں ۶۱۰ مسجدیں ہیں۔ البتہ دینی درس گاہ صرف ایک ہے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اس طرح اپنا نام بتایا:

حجۃ الاسلام الشیخ محمد عوض صادقی، معین وزارۃ الشئون الدینیہ والاوقاف۔

ایک روز ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ ایک افغانی بھائی بھی تھے۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے کے سامان موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک پیالہ میں شکر کے ڈلے تھے جو چائے میں ڈالنے کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے افغانی بھائی سے پوچھا کہ یہاں عام افغانی کا روزانہ ناشتہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنی ڈبل روٹی میں مکھن لگا رہے تھے۔ وہ اچانک ٹھہر گئے۔ انھوں نے شکر کے پیالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: روٹی اور شکر۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے مزید پوچھا کہ افغانستان میں اتنی زیادہ جہالت ہے۔ افغانی لوگ اپنے بچوں کو پڑھاتے کیوں نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام افغانی کو اپنی روٹی کے لئے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کہ بچوں کو پڑھانا اس کے بس میں نہیں۔ افغانی لوگ بے حد محنتی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس نہایت قیمتی زمینیں ہیں۔ اس کے باوجود افغانی قوم جہالت اور غربت کی شکار ہے۔ میری معلومات کے مطابق امیر امان اللہ خاں کے بعد یہاں کوئی قابل ذکر تعمیری کام نہیں ہوا۔

کابل میں ایک افغانی سے ملا۔ اس نے اپنا نام محمد سرور بتایا۔ وہ مجھ سے قطعاً واقف نہ تھا۔ حتی کہ اس نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ افغانی لوگ امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ امان اللہ خاں کے بارہ میں عام افغانیوں کی عین وہی رائے ہے جو خود میری رائے ہے۔ اس افغانی نے اپنی زبان میں کہا:

آزادی افغانستان توسط امان اللہ خاں غازی در سال ۱۹۱۹ تامین گردید۔ ومردم افغان او را بدیدۂ قدر می نگرند۔ وہیچ کس در افغانستان او را بد نمی بیند۔ وور راہ اعمار افغانستان او بسیار کوشش زیاد نمودہ است۔

یعنی امان اللہ خاں کے ذریعہ ۱۹۱۹ میں آزادی حاصل ہوئی۔ افغانستان کے لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افغانستان میں کوئی بھی شخص ان کو برا نہیں سمجھتا۔ افغانستان کی تعمیر کی راہ میں انھوں نے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ دو تعلیم یافتہ افغانی تھے۔ ایک نے اپنا نام راشد بتایا دوسرے نے کمال۔ میں نے ان سے امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں پوچھا۔ دونوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ پھر ان کے زوال کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ یورپ گئے۔ وہاں انھوں نے جدید تعلیم کو دیکھا اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ واپس آئے تو انھوں نے چاہا کہ افغانستان میں اصلاحات کریں اور جدید تعلیم کو یہاں رائج کریں۔

انھوں نے کہا کہ "ملاؤں" کا طبقہ ان کے خلاف ہوگیا۔ افغانی علماء کی اکثریت ان کو کافر اور بے دین کہنے لگی۔ امیر امان اللہ خاں میں اتنی اعلیٰ خصوصیات تھیں کہ پھر بھی شاید ان کے مخالفین کامیاب نہ ہوتے۔ مگر امیر امان اللہ خاں کی ایک غلطی نے انھیں موقع دے دیا، اور وہ ان کی جلد بازی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ جدید اصلاحات افغانستان میں فوراً نافذ ہو جائیں۔ مثلاً انھوں نے پہلے ہی مرحلہ میں کچھ افغانی لڑکیوں کو نرسنگ کی تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیا۔ اس طرح کا کام اگر وہ رفتہ رفتہ کرتے تو کچھ نہ ہوتا، کیونکہ عوام ان سے خوش تھے۔ راشد صاحب نے بتایا کہ میری ماں نے امیر امان اللہ خاں کو دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ امان اللہ بہت اچھے اخلاق کے آدمی تھے۔ راستہ چلتے ہوئے بے تکلف عوام سے ملتے اور انھیں پیسہ اور تحفہ پیش کرتے۔ ہر ایک سے یکساں طور پر معاملہ کرتے۔

مگر اس وقت افغانی خاندانوں میں پردہ کا بہت شدت سے رواج تھا۔ جب انھوں نے افغانی لڑکیوں کو نرس کی ٹریننگ کے لئے یورپ بھیجا تو "ملاؤں" کو موقع مل گیا۔ انھوں نے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس وقت بھی امان اللہ خاں کی شرافت تھی کہ انھوں نے مخالفین کو دبانے کے لئے پولیس اور فوج کی طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود اپنی قوم کے خلاف مار دھاڑ کریں۔ چنانچہ وہ

از خود ملک چھوڑ کر چلے گئے۔

امیر امان اللہ خاں نے ملکی اشیاء اور رواج دینے کی مہم چلائی۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ملک کا کپڑا پہنو۔ اگر کوئی افغانی یا کوئی افسر بیرون ملک کے کپڑے پہنے ہوئے نظر آیا تو انھوں نے فوراً اس کے قریب جاکر اولاً اس کی تعریف کی اور پھر اپنی جیب سے چھوٹی قینچی نکال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور کہا کہ نمونہ گیریم (ہم تمہارے کپڑے کا ایک نمونہ لے رہے ہیں) اس طرح اس کے کپڑے کو برباد کر دیتے۔

امان اللہ خاں راتوں کو اکیلے گھومتے تھے۔ چوں کہ کابل میں رات کو اکیلے نکلنا منع تھا، ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تاہم امان اللہ خاں نے ناخوش ہونے کے بجائے اس کی فرض شناسی پر اس کو انعام دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے ملک میں تعلیم جاری کی۔ سائنس کی تعلیم کے لئے کچھ لڑکوں کو لندن بھیجا۔ ان افغانی طلبہ کے ساتھ انھوں نے ایک عالم بھی حکومت کے خرچ پر روانہ کیا۔ انھوں نے یہ تاکیدی ہدایت کی کہ ان کے اسکول کے عیسائی لڑکے جب چرچ جائیں تو افغانی لڑکے اس وقت قرآن کی تلاوت کریں (۹۴)

امیر امان اللہ خاں ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۹ تک افغانستان کے حکمراں تھے۔ اس کے بعد ملک میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ یہاں تک کہ انھیں ملک چھوڑ کر باہر چلا جانا پڑا۔ اسی جلاوطنی کی حالت میں ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ کو زیورک میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا خاص الزام ان کے اوپر یہ تھا کہ وہ خلاف شرع طریقے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً وہ چاہتے تھے کہ افغان عورتیں گھر سے باہر نکل آئیں اور بے پردہ ہو کر مردوں کے ساتھ کام کریں۔

مگر یہی پٹھان تھے جنھوں نے اس سے تقریباً سو سال پہلے سید احمد شہید بریلوی کے معاملہ میں اس سے بالکل مختلف روش اختیار کی۔ سید صاحب نے پٹھانوں کے علاقہ میں اسلامی امارت قائم کی اور شرعی قوانین (زکوٰۃ وغیرہ کا قانون) جاری کیا۔ مگر پٹھانوں نے شرعی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی ——— امیر امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کو اگر دینی حمیت یا اسلامی جہاد کہا جائے تو سید صاحب کے خلاف بغاوت کو کیا نام دیا جائے گا۔

بیسویں صدی میں مسلم دنیا کو تین ایسے حکمراں ملے جو واقعی معنوں میں مدبر تھے اور وہ جدید

اور سعودی عرب کے ملک فیصل (۱۹۰۶ - ۱۹۷۵) اور پاکستان کے محمد ایوب خاں (۱۹۰۷ - ۱۹۷۴) مگر تینوں حکمرانوں کو پوری طرح کام کرنے کے مواقع نہ مل سکے۔ ان تینوں کی قاتل، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، موجودہ زمانہ کی نام نہاد اسلامی سیاست تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس "اسلامی سیاست" سے اسلام کو جتنا نقصان پہنچا ہے اتنا کسی اور چیز سے اس کو نہیں پہنچا۔

بعض باتیں قومی امنگوں کے اعتبار سے بہت سنگین معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں باتوں کو اگر خالص حقیقت کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ بالکل مختلف نظر آئیں گی۔ مثال کے طور پر انگریز جب ہندستان پر قابض ہوئے تو وہ مسلسل یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی نوآبادیاتی سلطنت کو افغانستان تک وسیع کر سکیں۔ اس کا مقصد افغانستان پر قبضہ سے زیادہ روسی خطرہ کا دفاع تھا۔ مگر افغانیوں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے انگریز اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہمارے پرجوش رہنما عام طور پر اس واقعہ کو اپنے اور افغانیوں کے فخر کے خانہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ صرف ایک پرجوش نادانی نظر آئے گی۔ انگریز کا معاملہ معروف معنوں میں صرف ایک "بیرونی سامراج" کا معاملہ نہ تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم اور سائنٹفک انقلاب کے ہراول بن کر ایشیا میں داخل ہوئے تھے۔ نیز یہ کہ خود سائنسی انقلاب کی اپنی داخلی منطق کے تحت یہ بھی مقدر تھا کہ نوآبادیاتی اقتدار بالآخر ختم ہو اور قومی اقتدار اس کی جگہ لے لے۔

افغانی لوگوں کا جوش اگر ہوش کے تابع ہوتا اور وہ وقتی طور پر برطانیہ کی سرپرستی کو قبول کر لیتے تو اس کا انھیں زبردست فائدہ ملتا۔ برطانی اقتدار تو یقیناً اپنے وقت پر ختم ہو جاتا۔ مگر افغانستان کو اس "صبر" کی یہ قیمت ملتی کہ آج افغانستان ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا نہ کہ ایک برباد شدہ ملک جیسا کہ آج وہ نظر آتا ہے۔

کانفرنس کا رسمی آغاز ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو ہوا۔ اس کارروائی کو "پریس کانفرنس" کا نام دیا گیا تھا۔ مگر زیادہ صحیح طور پر وہ ایک ملاقات تھی۔ کیونکہ اس موقع پر جو کارروائی ہوئی وہ یہ تھی کہ افغانستان کی وزارت امور اسلامی کے ذمہ داروں نے افغانستان میں اسلام اور اسلامی تعلیم کی حالت کے بارہ میں معلومات بیان کیں۔

۱۔ ایسوسی ایشن فار ہیومن افیرز کے تحت ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار کانسٹی ٹیوشن کلب میں ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا :

Communalism: A threat to national unity

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس سیمنار میں شرکت کی اور اس میں زیر بحث موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ اس سیمنار میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔

۲۔ ایک کانفرنس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے بھوپال کا سفر کیا۔ وہاں ان کے متعدد خطابات ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳۔ صدر اسلامی مرکز کی کتاب (پرافٹ آف ریولیوشن) پر پاکستان کے بین اقوامی ایوارڈ کی خبر ۷ نومبر ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات نے شائع کی۔ اس کو دیکھ کر دہلی کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو زیادہ تر مذکورہ کتاب سے متعلق سوالات پر مشتمل تھا۔ یہ انٹرویو بمبئی کے انگریزی روزنامہ ڈیلی (The Daily) میں ۶ نومبر ۱۹۸۸ کو شائع ہوا ہے۔

۴۔ امریکہ میں ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک عالمی سیرت کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے امریکہ کا سفر کیا اور وہاں کے متعدد اجتماعات کو خطاب کیا۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۵۔ الرسالہ کے مندرجات نہ صرف اردو جرائد میں بلکہ انگریزی اخبارات میں بھی نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقہ میں پھیل رہا ہے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ پاینیر کے شمارہ ۱۱ جون ۱۹۸۸ میں الرسالہ کے ایک مضمون کا خلاصہ بطور خبر حسب ذیل عنوان کے تحت شائع کیا گیا :

Muslim leader's plea for peace

۶۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : "غیر مسلم دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے الرسالہ انگریزی کی ایجنسی لینا چاہتا ہوں۔ گزارش ہے کہ انگریزی الرسالہ کے پندرہ پرچے میرے نام ہر ماہ روانہ کریں"

(کرم حسین خاں، بمبئی) اسلام کے پیغام کی عمومی اشاعت کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی پیروی کرنا چاہیے۔

۷۔ اعزاز مسعود صاحب (بھوپال) نے بتایا کہ ہانگ کانگ سے ایک خاتون مسز افروز افضل بھوپال آئیں۔ یہاں ان کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے دکھائے گیے۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور مستقل مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ اب وہ الرسالہ انگریزی کی خریدار ہیں اور ان کو برابر رسالہ جارہا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ کے ساتھیوں کو کرنا چاہیے کہ باہر سے آنے والوں کو رسالہ دکھائیں اور اس سے متعارف کرائیں۔

۸۔ جناب محی الدین صاحب (بمبئی) نے بتایا کہ ان کے ایک صاحبزادے جس دفتر میں کام کرتے ہیں، وہاں چند کرسچین بھی کام کرتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ کرسچین نے ایک روز کہا کہ میں نے ایک انگریزی میگزین الرسالہ نام کا دیکھا جو دہلی سے نکلتا ہے۔ وہ مجھے پسند آیا۔ بتاؤ کہ بمبئی میں وہ کہاں سے ملے گا۔ اس کے بعد محی الدین صاحب کے صاحبزادے نے انگریزی رسالہ انھیں پہونچانا شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے اس طرح مختلف طریقوں سے الرسالہ لوگوں تک پہونچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لے کر اسے لوگوں تک پہونچانے کی کوشش کریں۔

۹۔ مشتاق احمد کریمی صاحب (مالدہ) الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ وہ اپنے خط ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: ماشاء اللہ اردو، انگریزی الرسالہ اپنی مقبولیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس اطراف کے لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ بعض لوگ عشق کی حد تک گرویدہ ہو گیے ہیں۔

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط ۴ نومبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: اللہ اکبر اور اسلامی زندگی کا مطالعہ جاری ہے۔ بڑی لاجواب کتابیں ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ دنیا میں کوئی اور کتاب نہیں جس کو بار بار پڑھنے سے کبھی بیزاری محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن مجید کے بعد اگر کوئی ایسی کتاب ہے جو لاکھ بار پڑھنے سے اکتاہٹ نہ ہو تو وہ بس آپ کی تصنیفات ہیں۔
(نیر ربانی، بنگلور)

۱۱۔ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں : الرسالہ کا میں اتنا عادی ہوچکا ہوں کہ مہینہ کا انتظار رہتا ہے۔ آج تک میں نے کئی رسالوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن یہ ایک ہی ایسا رسالہ ہے جس نے مجھ کو خرید لیا، میں اس کو خرید نہ سکا۔ میں بھی الرسالہ کی ایجنسی لے کر کار نبوت میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میرے نام ایجنسی شروع کر دیں۔ (ایاز فاروقی، امراؤتی)

۱۲۔ الرسالہ کے ایک قاری اپنا نام ظاہر کیے بغیر لکھتے ہیں : آپ کی عمر دراز ہو اور تندرستی کی دولت حاصل رہے۔ ماہ ستمبر کے الرسالہ میں حدیبیہ کی مثال دے کر معقول واپسی کی افادیت پر جو زور دیا ہے، اسے پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ کسی فارسی شاعر نے کیا اچھا شعر کہا ہے :

تسلیم دل بزور مسخر نمی شود — ایں فتح بے شکست میسر نمی شود

کتنے نادان و ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو اپنے نظریات کے فروغ کے لیے تلوار کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ کاش آپ کی باتوں پر ہمارے مسلمان بھائی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔

۱۳۔ مختلف ملکوں سے برابر ہمیں ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں یہ درج ہوتا ہے کہ الرسالہ ہمیں دیکھنے کو ملا اور بہت پسند آیا۔ اس کو ہمارے نام اعزازی طور پر جاری کر دیں مثلاً ماریشش سے مسٹر نسیم حسین کا خط مورخہ ۲۳ ستمبر، یوگنڈا سے مسٹر عمر داؤد کا خط مورخہ ۲۶ اگست، وغیرہ اسی طرح ملک کے اندر سے بھی الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کے بارہ میں خطوط موصول ہوتے ہیں کہ ہم فی الحال ان کی قیمت ادا نہیں کر سکتے مگر ہمیں ان کے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ اس قسم کے بڑھتے ہوئے تقاضے کے پیش نظر رسالہ اور کتابوں کی بلاقیمت یا رعایتی قیمت پر فراہمی کے لیے ایک سبسڈی فنڈ قائم کیا جارہا ہے۔ جو لوگ اس فنڈ میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنی رقم روانہ فرمائیں۔ چک یا ڈرافٹ کے ذریعہ رقم بھیجنے والے اس کے اوپر اکاونٹ کا نام اس طرح لکھیں : Al-Risala Subsidy Fund

۱۴۔ ایک صاحب اپنے خط ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : الرسالہ کا ہر شمارہ عجیب سی کیفیت پیدا کرتا ہے جسے الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنجناب کو قوم کی رہنمائی کے لیے چن لیا ہے۔ (پروفیسر کلیم احمد۔ ریوا)

۱۵۔ الرسالہ کے مختلف حلقے اپنے یہاں کی خبریں روانہ فرمائیں تاکہ ان کو خبرنامہ میں شامل کیا جاسکے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے وحیتا آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۸ مارچ ۱۹۸۹

فہرست

ماہانہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

ایک تاثر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت متقیوں کے لیے ہے (ھدیٰ للمتقین) زمین سوکھی ہو تبھی اس میں پانی جذب ہوتا ہے، گیلی زمین کبھی پانی کو قبول نہیں کرتی۔ اسی طرح ہدایت بھی صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو ہدایت کا طالب ہو، جو اپنی تلاش کا آدھا راستہ خود طے کر چکا ہو۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی "گیلی زمین" بنا ہوا ہے، کسی کی زمین "سوکھی زمین" نہیں۔ ایسی حالت میں لوگوں کے کھیتوں میں ہدایت کی فصل اُگے تو کس طرح اُگے۔ جب لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو کیسے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہاں ایک روشن سورج چمک رہا ہے۔ جب لوگوں نے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہوں تو کیسے ان کو باخبر کیا جائے کہ یہاں ہرے بھرے درخت حمد الٰہی کے نغمے سنا رہے ہیں۔ جب لوگوں نے اپنا رخ ظاہری رونقوں کی طرف موڑ رکھا ہو تو کیسے انھیں آگاہ کیا جائے کہ ان ظواہر کے دوسری طرف ایک اور اتھاہ دنیا ہے جس میں خدا کی ابدی تجلیات اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔

آج کی دنیا میں کوئی بات کہی جائے تو کس کے لیے کہی جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف الفاظ کی زبان سمجھتے ہوں وہاں معانی کی زبان کا نغمہ کس کے لیے چھیڑا جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگوں کو صرف ظاہری حقیقتوں کا پتہ ہو وہاں چھپی ہوئی حقیقتوں کی پردہ دری کی جائے تو کس کے لیے کی جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف شور و غل کو کام سمجھتے ہوں وہاں خاموش منصوبہ کا راز افشا کیا جائے تو کس انسان کے لیے کیا جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف اپنی ذات کو جانتے ہو وہاں اپنی ذات سے بلند تر حقائق کی پردہ کشائی کی جائے تو کس کے لیے کی جائے۔

آہ وہ دنیا جہاں خدا الگ کھڑا ہوا دیکھ رہا ہو کہ کوئی ہو جو اس کا نغمہ گائے، کوئی ہو جو اس کی حمد کا ترانہ چھیڑے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی شخص بھی خدا کا نغمہ گانے والا نہ ہو۔ جہاں کوئی نہ ہو جو آخرت کی بانسری بجائے، جو فرشتوں کے چھیڑے ہوئے تاروں سے ہم آواز ہو کر حقیقت اعلیٰ کے گیت گائے ——— آج کی دنیا میں انسانوں کے تذکرے ہیں، مگر خدا کا تذکرہ نہیں۔ خدا کے نام پر تیا دت کرنے والے بے شمار ہیں مگر خدا کے لیے تڑپنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

اچھا گمان

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا : انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی خیراً (میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں تو بندہ کو چاہیے کہ وہ میرے بارہ میں اچھا گمان کرے) یعنی وہ میرے متعلق حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے احتمالاتِ شر کے مقابلہ میں احتمالاتِ خیر کو ترجیح دے۔

ایک شخص ایک ادارہ میں ملازم تھا۔ اس کو ادارہ کی طرف سے ایک کمرہ دیا گیا۔ اسی کمرہ میں وہ رہتا تھا اور اسی میں بیٹھ کر وہ اپنا دفتری کام بھی کرتا تھا۔ جب اس کی ماہانہ تنخواہ کا چیک آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ دس روپیہ کے بقدر کم ہے۔ اس نے ادارہ کے ناظم سے اس کا سبب پوچھا۔ ناظم نے کہا کہ یہ کمرہ کی بجلی کا چارج ہے جو تمہاری تنخواہ سے وضع کیا گیا ہے۔ آدمی نے کہا کہ میں جس کمرہ میں رہتا ہوں وہی میرا دفتر بھی ہے۔ ایسی حالت میں بجلی کا خرچ دفتر کے حساب میں جانا چاہیے۔ ناظم نے جواب دیا : تمہارا کمرہ دفتر بھی ہے اور رہائش بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس کو کس کے تابع کیا جائے۔ تم چاہتے ہو کہ رہائش دفتر کے تابع رہے، ہم نے اس کے برعکس دفتر کو رہائش کے تابع کیا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ مذکورہ حدیث کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان تنگ دل ہے۔ اس نے بے رحمی کا معاملہ کرتے ہوئے اپنے کارکن کے موافق پہلو کو اس کے غیر موافق پہلو کے تابع کر دیا خدا ارحم الراحمین ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ وہ اس کی شانِ کریمی سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کے غیر موافق پہلو کو اس کے موافق پہلو کے تابع کر دے گا، اور آخرت میں اس کے ساتھ وہ فیصلہ فرمائے گا جو اس کے حق میں زیادہ بہتر اور زیادہ آسان ہو۔

بندہ کو امید رکھنا چاہیے کہ قیامت میں اس کا رب اس کے بارے میں کہہ دے کہ یہ قابلِ سزا نہیں، قابلِ درگذر ہے۔ وہ اس کی غلطی کو عجز پر محمول کر کے چھوڑ دے گا نہ کہ اس کو سرکشی پر محمول کر کے اسے سزا دے۔ وہ گمان کرے کہ بندہ کے پاس اگر حسنِ عمل کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اس کے بقیہ اعمال نامہ کو اسی ذرہ کے تابع کر دے گا نہ کہ ذرہ کو بقیہ اعمال نامہ کے تابع بنا دے۔

کائنات کا سبق

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان خدا کی حمد کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اور اس کے کلمات کو نمایاں کر رہے ہیں۔ یہ انتظام اس لیے ہے تاکہ انسان ان سے سبق لے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو کائناتی قافلہ کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔

زمین و آسمان کس زبان میں خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ چپ کی زبان میں۔ خدا اپنی کائنات میں چپ کی زبان میں بول رہا ہے۔ وہ واقعات کی زبان میں ہم سے ہم کلام ہے۔ اب جو لوگ صرف شور کی زبان سننا جانتے ہوں، وہ خدا کا پیغام سننے سے محروم رہیں گے۔

درخت کو دیکھئے۔ ایک ہی مکمل وجود ہے مگر اس کی جڑیں نیچے زمین کی طرف جاتی ہیں اور اس کا تنہ اوپر فضا کی طرف بلند ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز میں دو متضاد خصوصیات کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی چونکتا ہو۔ تاکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو سکے۔ اس طرح آدمی کو چوکنا کر کے درخت یہ سبق دے رہا ہے کہ بلندی حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے نچلی سطح پر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرو۔

ہر چیز جو زمین پر کھڑی ہوئی ہو اس کا سایہ ہمیشہ نیچے پڑتا ہے۔ اصل اوپر اور سایہ نیچے کیوں۔ انسان کے اندر کھوج پیدا کرنے کے لیے تاکہ وہ سوچے۔ جب آدمی قدرت کے اس منظر پر سوچے گا تو اس پر یہ کھلے گا کہ زندگی کا سب سے اہم راز یہ ہے کہ ظاہری طور پر خواہ تم کو کتنی ہی بلندی حاصل ہو جائے، اپنے اندرونی وجود کو ہمیشہ متواضع رکھو۔

سمندر کو دیکھئے۔ سمندر کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ مگر یہی سمندر جب اپنے پانی کو بارش کی صورت میں انسانوں کے لیے برساتا ہے تو وہ میٹھا پانی بن جاتا ہے۔ سمندر اور اس کی بارش میں یہ فرق کیوں۔ اس لیے تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر سوچے۔ جب آدمی سوچے گا تو اس پر یہ حقیقت کھلے گی کہ تمہارے سینے میں خواہ تلخ جذبات امنڈ رہے ہوں مگر جب تم اپنے احساسات کو باہر نکالو تو اس کو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی مانند بنا کر نکالو۔

کائنات خدا کا سبق ہے، مگر وہ سبق اس کے لیے جس نے اپنے کان اور آنکھ کو کھلا رکھا ہو۔

قرآن اور عربی زبان

رومن امپائر کے زمانہ میں امپائر کی عام زبان لاتینی تھی۔ تاہم مختلف علاقوں میں لہجوں کا فرق تھا۔ زبان ایک تھی مگر لہجہ کے اعتبار سے وہ الگ الگ انداز میں بولی جاتی تھی۔ چوں کہ لہجہ کے اس فرق کو کسی ایک وحدت میں باندھے رکھنے کا ان کے پاس کوئی طاقتور ادبی معیار موجود نہ تھا، یہ فرق بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ لہجوں کا فرق بالآخر زبانوں کا فرق بن گیا اور مختلف زبانیں وجود میں آئیں جن کو اب رومی زبانیں (Romance languages) کہا جاتا ہے۔

یہی مختلف زبانیں ہیں جن کو موجودہ زمانہ میں فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، پرتگالی، رومانی زبانیں کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یورپ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں مثلاً (Occitan, Catalan, Sardinian, Rhaetian, Creoles) وغیرہ بھی اسی قدیم اصل کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ اس طرح ایک زبان کچھ صدیوں کے بعد ایک درجن زبان بن گئی۔

ایک زبان سے کئی زبان بننے کا یہی واقعہ عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ قدیم زمانہ میں مختلف عرب قبائل کے لہجوں میں زبردست فرق پایا جاتا تھا۔ آج بھی لہجوں کا یہ فرق مختلف عرب علاقوں میں بدستور موجود ہے۔ ایک لہجہ کا آدمی دوسرے لہجہ کے آدمی کی بات کو بمشکل سمجھ سکتا ہے۔

اس واضح فرق کے باوجود تمام عرب علاقوں کی تحریری زبان ایک رہی۔ وہ کئی زبان نہ بن سکی۔ عربی زبان کی وحدت براہ راست قرآن کا کرشمہ ہے۔ یہ تمام تر قرآن کا تاثیری کارنامہ ہے کہ اس نے عربی زبان کو ایک تحریری صورت پر باقی رکھا، اس نے عربی کو باعتبار تحریر، کئی زبان بننے نہیں دیا۔ بولنے کے وقت آدمی اپنے قبیلے کے لہجہ کی پیروی کرتا تھا، مگر لکھنے کے وقت وہ قرآن کی پیروی کرنے پر مجبور تھا۔ اس طرح قرآن کا طاقت ور ادبی معیار ان کے لہجاتی فرق پر اس طرح چھایا رہا کہ اس نے ان کو الگ الگ ہونے سے روک دیا۔

قرآن سے پہلے عرب میں زیادہ تر صرف شاعری کا رواج تھا۔ لوگ اشعار کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اہل عرب کے نزدیک، قرآن سب سے پہلا کلام ہے

جو نثر کی صورت میں سامنے آیا (ان القرآن اول ظاهرة نثرية فنية عند العرب، جوزیف الہاشم، المفید فی الادب العربی)

پروفیسر ہٹی نے قرآن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کی ادبی تاثیر کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ یہ صرف قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ایسا ہوا کہ عربوں کی مختلف بولیاں الگ الگ زبان کی صورت اختیار نہ کر سکیں، جیسا کہ رومی زبانوں کے ساتھ پیش آیا۔ آج ایک عراقی اگرچہ ایک مراکشی کی گفتگو کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے، مگر وہ اس کی تحریری زبان کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ عراق اور مراکش، اور اسی طرح شام، عرب، مصر، ہر جگہ کلاسیکی زبان کی حیثیت سے وہی عربی زبان رائج ہے جس کا ماڈل قرآن نے تیار کر دیا ہے۔ محمدؐ کے وقت عربی نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب موجود نہ تھی۔ اس بنا پر قرآن سب سے قدیم نثری کتاب ہے اور یہی کتاب اول روز سے عربی نثر کا ماڈل بنی ہوئی ہے۔ اس کی زبان میں نغمہ ہے مگر وہ شعر نہیں۔ اس کی پُرنغمہ نثر نے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے کہ تقریباً ہر قدامت پسند عرب ادیب آج تک اہتمام کے ساتھ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, London 1970, p. 127

قرآن نے عربی زبان پر بیک وقت دو ایسے اثرات ڈالے ہیں جس کی مثال کسی بھی دوسری زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک یہ کہ قرآن نے عربی کو نظم سے نثر کی طرف موڑ دیا۔ قرآن سے پہلے عربی دورِ شعر میں تھی، قرآن کے بعد وہ دورِ نثر میں داخل ہو گئی۔

دوسرا بے مثال اثر یہ ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو ایک ایسا اعلیٰ اور آخری ماڈل دیدیا جو گویا عربی زبان کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قرآن کی یہی خصوصی دین ہے جس کی وجہ سے عربی زبان آج بھی اپنی سابقہ صورت میں زندہ ہے، اس کے بغیر عربی کا وہی انجام ہوتا جو دوسری تمام زبانوں کے ساتھ بلا استثناء پیش آیا ہے۔

رہبانیت

ثم قفينا على آثارهم برسلنا وقفينا بعيسى ابن مريم وآتيناه الانجيل وجعلنا في قلوب الذين اتبعوه رأفة ورحمة ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعايتها

(الحدید ۲۷)

پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر اپنے رسول بھیجے اور انھیں کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت رکھ دی۔ اور رہبانیت کو مسیحیوں نے خود نکالا، ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا تھا۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی رضا چاہنا فرض کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

اس آیت میں رہبانیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی خدا کے نام پر دنیا کو چھوڑ دے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات وہی تھیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے دو سو سال بعد ان کے پیروؤں میں بگاڑ آ گیا۔ ان کا ایک طبقہ رہبانیت میں پڑ گیا۔ وہ لوگ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گیے اور دنیوی چیزوں سے بے تعلق ہو کر شدید قسم کی مشقت برداشت کرنے لگے۔ تفصیل کے لیے انسائیکلو برٹانیکا، جلد ۱۲، مقالہ (Monasticism)

ان کا یہ ترکِ دنیا مذہب کے معاملہ میں غلو اور تشدد سے پیدا ہوا۔ ان کو زہد کی تعلیم دی گئی تھی جس کا مطلب نفسیاتی زہد تھا۔ مگر انھوں نے نفسیاتی زہد کے حکم کو جسمانی زہد کا حکم قرار دے لیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں مشغول ہو مگر دنیا کو مطلوب ومقصود نہ بناؤ۔ مگر انھوں نے مطلوبیتِ دنیا کی نفی کو مشغولیتِ دنیا کی نفی کے ہم معنی سمجھ لیا۔ یہی ہے حکم خداوندی کی صحیح رعایت نہ کرنا۔

مومن انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے مگر اس کی توجہ خدا کی طرف لگی رہتی ہے۔ وہ بظاہر مادی کام میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کا ذہن روحانی سطح پر سرگرم رہتا ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو آخرت میں بسیرا لیے ہوئے ہو۔

اپنے خلاف

موجودہ سائنسی زمانہ میں جو نئے ہتھیار ایجاد ہوئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ زہریلی گیسوں کو جمع کر کے ان کے "بم" بنائے گیے تاکہ انھیں دشمن کے اوپر چھوڑ کر اس کو ہلاک کیا جا سکے۔ مگر اب اس قسم کی زہریلی گیسوں کے ذخیرے تباہ کیے جا رہے ہیں، کیوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ خود قابض ملک کے لیے بھی وہ زبردست خطرہ ہیں۔ امریکہ کی ایک خبر (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ جنوری ۱۹۸۹، سکشن ۲) میں بتایا گیا ہے کہ سالوں کے مطالعہ کے بعد امریکی فوج نے طے کیا ہے کہ وہ اپنے ۶۹۴۵۳ زہریلی گیس سے بھرے ہوئے راکٹوں کو تباہ کر دے۔ اس کے لیے ذخیرہ کے مقام پر مخصوص قسم کی بھٹی تیار کی جائے گی۔ ایسے راکٹ امریکہ میں آٹھ مقامات پر موجود ہیں۔ یہ تمام راکٹ بھٹیوں میں ڈال کر تباہ کیے جائیں گے۔

زہریلی گیس کے ان مہلک ہتھیاروں کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ وہ خود قابض ملک کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک ہیں جتنا کسی دشمن کے لیے۔ یہ ہتھیار اگر زیادہ دن تک ذخیرہ رہیں تو وہ اچانک پھٹ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اندر سے کہر کی قسم کا ایک مادہ نکل کر پھیل جائے گا جس کے اندر نہ کوئی بو ہوگی اور نہ وہ دکھائی دے گا۔ مگر اس کے راستہ میں جو چیز پڑے گی سب ہلاک ہو جائے گی:

After years of study, the U.S. army has decided to destroy 69, 453 ageing, sometimes leaking rockets filled with deadly nerve gas and which are now stored in Richmond, Kentucky. It will build a special furnace at the depot to destroy them. There are similar rockets in seven other depots. They too will be burnt in incinerators. These poison gas weapons are now acknowledged to be as much a threat to the possessor as to the potential enemy. If kept too long, they could ignite spontaneously, releasing an odourless, invisible mist that would kill everything in the path.

یہ ایک نشانی ہے جو بتا رہی ہے کہ دوسرے کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ کوئی شخص تخریب کاری کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد اس کے برے نتیجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا، خواہ اس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی حیثیت حاصل ہو، اور خواہ اس نے اپنا تخریبی منصوبہ اعلیٰ ترین سائنسی سطح پر کیوں نہ بنایا ہو۔

مشکل میں آسانی

روایتی طرز کے کولھو میں جب گنا ڈالا جاتا ہے تو اس میں دباؤ کم ہوتا ہے اور اس کے بیلن کے درمیان سے گنا صرف ایک بار گزارا جاتا ہے۔ چنانچہ گنے کا رس تقریباً ۲۵ فی صد نکلے بغیر اس کے اندر رہ جاتا ہے۔ بجلی سے چلنے والے کرشر (Crusher) میں نسبتاً زیادہ دباؤ ہوتا ہے اور گنے کو بیلن کے درمیان سے دو بار گزارا جاتا ہے۔ تاہم یہاں بھی تقریباً ۱۵ فی صد رس اس سے نکل نہیں پاتا۔ بڑی بڑی ملوں میں بہت زیادہ دباؤ ہوتا ہے اور گنے کو چار بار مشینی بیلن کے درمیان سے گزارا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گنے کا تقریباً تمام رس اس سے باہر آجاتا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "دباؤ" کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان کے اندر تخلیقی طور پر بے حساب امکانات رکھ دیے ہیں۔ مگر کسی چیز کے اندر چھپا ہوا امکان صرف اس وقت نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس چیز پر دباؤ پڑے۔ دباؤ جتنا زیادہ شدید ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے اندرونی امکانات باہر آئیں گے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر بے حساب امکانات موجود ہیں۔ ہر انسان امکانات کا ایک لامحدود خزانہ ہے معمول کے حالات میں یہ امکانات انسان کے اندر چھپے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کہ انسان دباؤ کا شکار ہو۔ جب اس کی شخصیت کو نچوڑنے والے عمل سے گزارا جائے۔ تاریخ میں جن لوگوں نے بھی کوئی بڑی ترقی کی ہے وہ وہی لوگ تھے جو اپنے ماحول میں دباؤ کے حالات سے دوچار ہوئے۔ جنھوں نے اِنّ مع العُسر یسراً کے تخلیقی راز کو جانا۔ جنھوں نے زندگی کے میدان میں اس حوصلہ کے ساتھ قدم رکھا کہ وہ عُسر کی زمین سے یُسر کی فصل اگائیں گے

انسانی نگاہ مشکل کو مشکل کے روپ میں دیکھتی ہے۔ ربانی نگاہ وہ ہے جو مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھنے لگے۔

نظامِ خداوندی

گلاب کی نازک شاخ پر ایک خوبصورت پھول کھلا ہوا ہے۔ ایک شخص نے اس کو بے احتیاطی کے ساتھ توڑا۔ اس کی انگلیوں میں کانٹے لگ گئے۔ ان سے خون بہنے لگا۔ اب یہ آدمی اگر گلاب کے درخت کو یا فطرت کو الزام دے تو کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا۔ ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ ایسے موقع پر کانٹے کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ کیوں کہ اس دنیا کا نظام جس اصول کے تحت بنایا گیا ہے اس میں لازماً ایسا ہوگا کہ پھول کے ساتھ کانٹا بھی رہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ کانٹے کو ختم کرنے کی بے فائدہ کوشش نہ کرے بلکہ اپنی بے سمجھی اور نادانی کو ختم کرکے کانٹے سے بچے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسانی زندگی کا نظام خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور خدا نے اپنی مصلحت کے تحت یہاں "پھول" بھی رکھے ہیں اور "کانٹے" بھی۔ یہاں اچھے لوگ بھی ہیں اور برے لوگ بھی۔ یہاں فرشتے بھی ہیں اور شیطان بھی۔

اس نظامِ تخلیق کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مخالف بنیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف سازش کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اشتعال انگیزی کا معاملہ کرے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ حل قرآن کے لفظوں میں، صبر اور اعراض ہے۔ یعنی آدمی انسانی کانٹوں سے بچ کر چلے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی انسانی کانٹا اسے لگ جائے تو وہ صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ ٹکراؤ اور مقابلہ آرائی کا۔

مشہور مثل ہے کہ "کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ کتا اگر کتے پر بھونکے تو دوسرا کتا بھی بھونکنے لگے گا اور اس کو کاٹنے کے لئے دوڑے گا، لیکن کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ بھی کتے کے اوپر بھونکنے لگے یا اس کے خلاف جوابی کارروائی کے لئے دوڑے۔ ایسے مواقع پر کتا کتا ثابت ہوتا ہے اور ہاتھی ہاتھی۔

دنیا میں قدرت نے دو نمونے قائم کر دئے ہیں۔ ایک نمونہ کتے کا ہے اور دوسرا نمونہ ہاتھی کا۔ اب ہر آدمی کے حوصلہ کا امتحان ہے کہ وہ دونوں میں سے کس نمونہ کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

حوصلہ

دہلی کی ایک کالونی وسنت وہار ہے۔ یہاں ایک خاتون کملا دیوی اگروال اپنے بیٹے اور پوتے کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی عمر ۹۹ سال ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنے بستر پر ہی رہتی تھیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک حادثہ ہوا۔ ان کے گھر کے پچھلے دروازے کو کسی طرح کھول کر تین چور ان کے گھر میں گھس گیے۔ گھر کے لوگ بیدار ہو گیے اور چور اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تاہم وہ بوڑھی کملا دیوی کے کمرہ سے نقد اور سامان کی صورت میں دس ہزار کی چیز لے کر فرار ہو گیے۔

چوروں نے کملا دیوی اگروال کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ انھیں مارنے کی کوشش کی۔ تاہم صبح کو وہ مری ہوئی پائی گئیں۔ رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ دسمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، انھوں نے چوروں کی طرف ایک نظر دیکھا اور اچانک صدمہ کی وجہ سے وہ فوراً مر گئیں:

She took one look at the robbers and died of shock

مذکورہ مکان میں کملا دیوی اگروال بھی تھیں اور ان کے بیٹے اور پوتے بھی۔ مگر چور کو دیکھ کر بیٹے اور پوتے کی وفات نہیں ہوئی، البتہ بوڑھی کملا دیوی اچانک ختم ہو گئیں۔ ان دونوں کے درمیان وہ کیا فرق تھا جس کی وجہ سے ان کے انجام کے درمیان فرق ہو گیا۔ وہ فرق ہمت کا تھا۔ بیٹے اور پوتے میں ہمت تھی وہ جھٹکے کو سہہ سکتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ بچ گیے۔ مگر بوڑھی عورت اپنے اندر سہار کی طاقت کھو چکی تھی۔ وہ چوروں کو دیکھتے ہی جاں بحق ہو گئی۔

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو ہمت والا ہو، جو ناخوش گوار حالات کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو اس کا وہی انجام ہوگا جو مذکورہ بوڑھی عورت کا ہوا۔ حوصلہ مندی کمزور آدمی کو طاقت ور بنا دیتی ہے، اور اگر حوصلہ نہ ہو تو طاقت ور آدمی بھی کمزور اور مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

سبب اپنے اندر

سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی چار بڑی حکومتیں قائم تھیں جو دنیا بھر میں مسلم طاقت کا نشان بنی ہوئی تھیں۔ انھیں میں عثمانی خلافت بھی تھی جو بغداد سے الجزائر تک، اور پھر عدن سے ہنگری تک پھیلی ہوئی تھی:

برصغیر ہند میں مغل سلطنت	(Mughal dynasty)
ایران میں صفوی سلطنت	(Safavid dynasty)
مراکش میں علوی سلطنت	(Alawi (Filali) dynasty)
ترکی میں عثمانی سلطنت	(Ottoman Empire)

اٹھارویں صدی کے آغاز سے ان حکومتوں پر زوال شروع ہوا۔ عین اسی وقت سے احیاء و تجدید کی تحریکیں بھی جگہ جگہ شروع ہوگئیں۔ اب ان تحریکوں پر تقریباً تین سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر یہ تحریکیں نہ مذکورہ سلطنتوں کے زوال کو روک سکیں اور نہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوئیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سو سال کے اندر مسلمانوں نے دوبارہ عزت و سربلندی کے مقام کو پالیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے شمار قائدوں اور بزرگوں کی تین سو سالہ جدوجہد بھی ناکامی کی تاریخ کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کر سکی۔

اصل یہ ہے کہ زوال کے پچھلے تمام واقعات زیادہ تر جارحیتِ غیر کے واقعات تھے۔ اس لیے اغیار کے حملہ کا مقابلہ کرکے ابتدائی صورت حال کو دوبارہ بحال کر لیا گیا۔ مگر موجودہ زمانہ کا زوال خود مسلمانوں کے فکری اور ایمانی انحطاط کے نتیجہ میں پیش آیا۔ اب ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے اندر فکری انقلاب اور ایمانی حرارت پیدا کرنے سے اپنی کوشش کا آغاز کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے تمام رہنما بدستور اغیار کے حملوں کو سبب زوال قرار دے کر ان سے بے فائدہ لڑائی لڑتے رہے۔ جب بیج ہی نہ ڈالا گیا ہو تو درخت کہاں سے اُگے گا۔ چنانچہ بے شمار قربانیوں کے باوجود احیاء ملت کا خواب بھی پورا نہیں ہوا۔

پٹرول کے بغیر

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب نے نیا اسکوٹر خریدا۔ یہ "بجاج سپر" تھا جو بہت اچھا اسکوٹر سمجھا جاتا ہے۔ دس سال تک لائن میں رہنے کے بعد یہ قیمتی اسکوٹر انھیں ملا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۳ کی صبح کا واقعہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ مذکورہ پڑوسی اپنے اسکوٹر کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور بار بار پاؤں مار کر اس کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ اسی حال میں کافی دیر ہو گئی۔ یہ بات مجھ کو بڑے اچنبھے کی معلوم ہوئی کہ ایک نیا اور عمدہ اسکوٹر اسٹارٹ نہ ہو۔

اتنے میں ان کا ایک دوست وہاں آگیا۔ وہ اس طرح کے معاملات سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا پٹرول چیک کیا۔ اس نے کہا: "گاڑی میں پٹرول تو ہے نہیں، پھر وہ اسٹارٹ کیسے ہو" اس کے بعد وہ دونوں رزرو پٹرول استعمال کر کے اسکوٹر کو پٹرول پمپ تک لے گئے۔ پٹرول بھرنے کے بعد مذکورہ اسکوٹر سڑک پر اسی طرح دوڑنے لگا جس طرح ایک اچھے اسکوٹر کو دوڑنا چاہیے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی وہی ہوا ہے جو مذکورہ اسکوٹر کے ساتھ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلم رہنما ہیں جو ملت کے احیاء کے لیے اٹھے۔ کسی نے تبلیغی ادارہ قائم کیا، کسی نے حزب اللہ بنائی۔ کسی نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا نعرہ دیا، کسی نے ملی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ مگر مسلم قوم ان آوازوں پر متحرک نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعمیری نقشہ کو چھوڑ دیا اور جذباتی سیاست کی رو میں داخل ہو گئے۔

مسلم رہنماؤں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "پٹرول" کے بغیر "گاڑی" کو چلانا چاہا۔ انھوں نے تعمیر شعور کا کام کیے بغیر عملی اقدام سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ٹھوس تعمیر کا کوئی کام نہ کر سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ پہلے خاموش فکری جدوجہد کے ذریعہ لوگوں کا ذہن بناتے، اس کے بعد عملی اقدام کرتے تو یقیناً انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی۔ ملت کی گاڑی بھی اسی طرح چل پڑتی جس طرح مذکورہ شخص کی گاڑی پٹرول بھرنے کے بعد چل پڑی۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ "مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جاسکے"۔ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمراں جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور نکالنے لگے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مستشرق آلان روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفےٰ کمال الجابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گئے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قاہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گئے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عبقری مہارت رکھتے تھے (خطۃ حربیۃ عالیۃ المستوی تدل علی عبقریۃ صلاح الدین العسکریۃ) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کرلیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چلی گئی۔

فرانسیسی مستشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کر دیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مفلسی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہو گیے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

فقد كان المورخ الفرنسي (جوستاف لوبون) على حق عندما قال جملته المأثورة: لم يعرف التاريخ فاتحاً ارحم من العرب (صفحہ ۱۰۱)	فرانسیسی مورخ گستاؤ لیبان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ رحم دل فاتح نہیں دیکھا

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۹۴۶-۱۸۶۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انسانی برابری اور انسانی اخوت کا وعظ اگرچہ یسوع مسیحؑ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار جس شخصیت نے واقعی معنوں میں ایک عملی معاشرہ قائم کیا، وہ صرف عرب پیغمبر محمدؐ تھے:

H.G. Wells, *The Outline of History* (1920).

پانچ دن

پنڈت جواہرلال نہرو ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہندستان کی سیاست میں انھیں مہاتما گاندھی کے بعد سب سے اونچا مقام ملا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو وہ ملک کے وزیر اعظم بنائے گیے اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وزیر اعظم رہے۔ ملکی اور عالمی سیاست میں انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے ایک پریس کانفرنس کی۔ یہ پریس کانفرنس ۲۲ مئی ۱۹۶۴ کو نئی دہلی میں ہوئی۔ اس پر ہجوم پریس کانفرنس میں جو کارروائی ہوئی اس کا ایک جزء یہ تھا:

The last question however, was, as Nehru himself put it, a leading one. Referring to a recent television interview in which Nehru had said that he was not grooming his daughter as his successor, a correspondent asked whether it was not preferable that he settle the question in his lifetime. Reclining in his chair, a smiling Jawaharlal Nehru replied, 'My life is not going to end so soon.' There were more than 300 journalists present. They thumped their desks and cheered. Jawaharlal went off to Dehra Dun for his last holiday after that press conference.

M.J. Akbar, Nehru: *The Making of India*, 1988, p. 581

پریس کانفرنس کا آخری سوال، جیسا کہ خود نہرو نے کہا، سب سے اہم تھا۔ ایک حالیہ ٹیلی وژن انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں نہرو نے کہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی (اندرا گاندھی) کو اپنے جانشین کی حیثیت سے تیار نہیں کر رہے ہیں، ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ اس سوال کو اپنی زندگی ہی میں طے کر دیں۔ اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر، ایک مسکراتے ہوئے جواہرلال نہرو نے جواب دیا: میری زندگی اتنی جلد ختم ہونے والی نہیں۔ اس موقع پر ۳۰۰ سے زیادہ صحافی موجود تھے۔ انھوں نے اپنی میز پر گھونسا مارا اور بہت خوش ہوئے۔ جواہرلال اس پریس کانفرنس کے بعد اپنی آخری چھٹی منانے کے لیے دہرہ دون روانہ ہوگیے (صفحہ ۵۸۱)

اس واقعہ کے صرف پانچویں دن ۲۷ مئی ۱۹۶۴ کو نئی دہلی میں جواہرلال نہرو کا انتقال ہوگیا۔ نہرو وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ "میری زندگی جلد ختم ہونے والی نہیں"

مگر عین اسی وقت قضا و قدر کا یہ فیصلہ ہو رہا تھا کہ نہرو کی زندگی بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ نہرو کے فیصلہ پر قضا و قدر کا فیصلہ غالب آیا۔

"میری زندگی جلد ختم ہونے والی نہیں" ——— یہی موجودہ دنیا میں ہر آدمی کی نفسیات ہے۔ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی انداز میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کے اور اس کی موت کے درمیان صرف "پانچ دن" کا فاصلہ ہے۔ مگر ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں ابھی جلد مرنے والا نہیں ہوں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ آدمی جس حال میں ہے، وہ اسی حال میں پڑا رہتا ہے، وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہیں کرتا۔

ایک شخص غفلت اور سرکشی کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اگر وہ جانے کہ پانچ دن سے زیادہ اس کی سرکشی چلنے والی نہیں تو وہ سرکشی کو بھول کر اطاعت شعار آدمی بن جائے۔ ایک شخص جھوٹے الفاظ بول کر لوگوں کے درمیان لیڈری کر رہا ہے۔ اگر وہ جانے کہ پانچ دن کے بعد اس کا سارا بھرم کھل جانے والا ہے تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے اور وہ لیڈری کو چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جانے کو پسند کرے۔ ایک شخص نے دوسرے کے مال پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر وہ جانے کی یہ مال اب میرے پاس صرف پانچ دن تک باقی رہنے والا ہے تو وہ مال اس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ بن جائے اور وہ ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سر سے اتار پھینکے۔

ہر آدمی موت کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے، لیکن ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ موت سے بہت دور ہے۔ یہی غلط فہمی سب سے بڑا فساد ہے، اور اس غلط فہمی سے نکلنا سب سے بڑی اصلاح

یہ انسان

لکھنؤ کا ایک قصہ ہے۔ ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں پلیٹ لیے ہوئے چوک پر کھڑی تھی اور یہ آواز لگا رہی تھی: کوئی ثتنجن کھلا دے، کوئی ثتنجن کھلا دے۔

ایک راہ گیر اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پلیٹ ثتنجن سے بھری ہوئی ہے راہ گیر کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب اس کے پاس ثتنجن موجود ہے تو پھر کیوں وہ لوگوں سے ثتنجن کا سوال کر رہی ہے۔ راہ گیر نے عورت سے کہا کہ ماں، تمہارے پاس تو ثتنجن خود موجود ہے، پھر تم کس لیے ثتنجن مانگ رہی ہو۔ عورت نے یہ بات سنی تو بگڑ کر بولی: تم کیسی بات کرتے ہو، ثتنجن کہیں بالائی کے بغیر بھی کھایا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے یہ قصہ سنایا تو اس کو سن کر اچانک میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گیے۔ میں نے سوچا کہ انسان آج بالائی کے بغیر ثتنجن کھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ کل اس کا حال کیا ہوگا جب کہ ثتنجن تو درکنار، درخت کی پتیاں بھی نہ ہوں گی جن سے وہ اپنا پیٹ بھرے، اور گڑھے کا پانی بھی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس دور کرے۔

آج کوئی انسان کم پر راضی نہیں۔ کسی کے پاس چھوٹا مکان ہے تو وہ بڑے مکان پر نظر لگائے ہوئے ہے۔ کوئی ہزار کما رہا ہے تو وہ لاکھ کی فکر میں ہے۔ کوئی ممبر ہے وہ صدر بننے کے لیے دوڑ لگا رہا ہے۔ کسی کو ملکی قائد کا درجہ ملا ہے تو وہ انٹرنیشنل قائد بننے کے لیے بے قرار ہے۔ کوئی پیسہ حاصل کر چکا ہے تو اب وہ شہرت اور جاہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

کوئی شخص "سادہ ثتنجن" پر راضی نہیں، ہر آدمی "بالائی والے ثتنجن" کی طرف چھلانگ لگا رہا ہے۔ آدمی اگر جانے کہ عنقریب موت آکر ساری صورت حال کو بدل دے گی۔ اس کے بعد نہ موجودہ دنیا ہوگی اور نہ موجودہ دنیا کے حالات، تو اس کی سوچ کچھ سے کچھ ہو جائے، وہ آج سے زیادہ کل کی فکر کرنے لگے۔ وہ حرص کو چھوڑ کر شکر کرنے والا بن جائے، وہ خواہشوں کے بجائے ذمہ داریوں کی طرف اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس کا ذہن ذاتی خول سے نکل کر انسانی وسعت کے دائرہ میں کام کرنے لگے۔

ایک آیت

قرآن میں یہود کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ ——— اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں بہت سامال رکھو تو وہ فوراً اس کو ادا کر دے گا۔ اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں ایک دینار رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہیں کرے گا، الّا یہ کہ تم اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ (آل عمران ۷۵)

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے اندر حق اور ناحق کی تمیز پوری طرح زندہ ہو۔ وہ سچ پر قائم ہونا چاہتے ہوں اور جھوٹ سے بھاگنے والے ہوں۔ وہ ہر آن اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھتے ہوں۔ یہ بااصول لوگ ہیں۔ وہ اپنے احساس فرض کے تحت ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔ ان کا حق شناسی کا جذبہ اس کے بغیر مطمئن نہیں ہوتا کہ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کریں۔ وہ کسی حال میں حق سے تجاوز کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔

انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف اپنی خواہش اور اپنے مفاد کو جانتے ہوں۔ وہ چیزوں کو اس اعتبار سے نہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھیں کہ کیا چیز میرے موافق ہے اور کیا چیز میرے خلاف۔

ایسے لوگ کبھی حق کی ادائیگی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور اگر کبھی حق کو ادا بھی کرتے ہیں تو احساس فرض کے تحت نہیں بلکہ حالتِ مجبوری کے تحت۔

✓ ایک انسان وہ ہے جس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے تو وہ اس کو غیر کی مِلک سمجھے اور جب مالک تقاضا کرے تو فوراً اصل مالک کو وہ چیز لوٹا دے۔ یہ معیاری انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کا بڑا اجر ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر امانت کا احساس پوری طرح زندہ نہ ہو۔ تاہم ابھی وہ سرکشی کی حد پر نہ پہنچا ہو۔ ایسا شخص بھی چیز کو اصل مالک کی طرف لوٹاتا ہے مگر بار بار کے تقاضے کے بعد۔ دوسرے انسان کی بدترین قسم ہے جس کو غاصب کہا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ چیز کو نہیں لوٹاتا بلکہ جھوٹے دعوے کر کے غیر کی چیز کو اپنی چیز بتاتا ہے۔ ایسا آدمی گمراہی کی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ ایسے آدمی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

قول وعمل کا تضاد

نئی دہلی میں ۱۶ - ۱۹ جنوری ۱۹۸۹ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی جس میں دنیا بھر کے نمائندے اور دانشور جمع ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا — عالمی شہری کی تیاری:

The Making of an Earth Citizen

اس "عالمی شہری کانفرنس" کا افتتاح ہندستان کے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے کیا تھا۔ وگیان بھون کے ایک ممتاز انٹرنیشنل اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک ایسے نئے عالمی نظام کی تشکیل کرنے کی اپیل کی جس میں ہم سب علاقائی امتیازات سے بلند ہو کر آفاقی شہری بن جائیں۔ کیوں کہ یہ کرۂ ارض کسی ایک قوم کے لیے نہیں، بلکہ یکساں طور پر ہر ایک کے لیے ہے۔ عالمی شہریت کے اصول کو تسلیم نہ کرنے ہی کا نتیجہ وہ خطرناک تفریق اور امتیازات ہیں جو موجودہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور اسی تقسیم کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی عظیم اکثریت اپنے جائز حصہ سے بھی محروم ہے۔ ان مصنوعی فاصلوں کو ختم کرنے کے لیے جنھوں نے انسانی سماج کو مختلف امتیازات کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا ہے، ایک نیا آغاز بالکل ضروری ہے۔ انھوں نے مسز اندرا گاندھی کا یہ قول دہرایا کہ یہ دنیا ایک ہی کنبہ ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۱۷ جنوری ۱۹۸۹)

ہندستان کے لیڈر انٹرنیشنل اسٹیج پر دنیا کے تمام لوگوں کو یکساں شہری حقوق دینے کا وعظ کہتے ہیں، مگر خود اپنا ملک جہاں انھیں اقتدار حاصل ہے، وہاں کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق دینے کے لیے تیار نہیں۔ امتیاز پسند سماج کا حکمراں بن کر وہ بے امتیاز سماج قائم کرنے کی اپیل کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما بھی قول و عمل کے اسی تضاد میں مبتلا ہیں۔ وہ عدل و انصاف پر تقریریں کرتے ہیں اور خود اپنی زندگی کو عدل و انصاف کی پابندی سے آزاد کیے ہوئے ہیں۔ وہ اسٹیج پر احتساب عالم کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انھیں احتساب خویش کی یاد دہانی کرائے تو وہ اس کے دشمن بن جائیں گے۔

تقدس کی پامالی

ایک مسلمان کا مراسلہ قومی آواز (۱۶ دسمبر ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس میں ہندستانی حکومت کی شکایت کی گئی ہے کہ مسلم جماعتوں کی کوشش کے باوجود اس نے "محکمۂ آثار قدیمہ کے تسلط والی مسجدوں میں نماز کی ادائیگی کی اجازت نہیں دی"۔ مراسلہ کا خاتمہ ان جذباتی الفاظ پر ہوتا ہے: "مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان مساجد میں نماز پڑھ سکیں، جب کہ ٹورسٹوں کو آزادی ہے کہ وہ ان مساجد میں جائیں، وہاں کھائیں پئیں، ہنسیں بولیں، ٹرانسسٹروں پر گانے سنیں اور موج آئے تو ان گانوں کی دھن پر رقص بھی کرکے ان مساجد کے تقدس کو پامال کریں" (صفحہ ۶)

اس معاملہ میں مسلم رہنما اب تک صرف حکومت ہند کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھیں خود اپنے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ حکومت ہند کا معاملہ نہیں، بلکہ خود خدا کا معاملہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے (حرمۃ المومن اکرم حرمۃ من الکعبۃ) مومن کی عزت و آبرو اتنی زیادہ قابل احترام ہے کہ کعبہ کے احترام سے بھی اس کا درجہ بڑھا ہوا ہے، عام مساجد تو درکنار۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اور ان کے تمام اصاغر و اکابر مسلسل اس عظیم تر جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

موجودہ مسلمانوں کا حال، تقریباً بلا استثنا، یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی سے انھیں اختلاف یا شکایت ہو جائے تو وہ فوراً اس کی عزت و آبرو کو اپنے لیے حلال سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس مسلمان کی عیب جوئی، اس کے خلاف الزام تراشی، اس کا استہزاء و تمسخر، اس پر جھوٹی تہمت لگانا سب ان کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔ مومن کے تقدس کی پامالی کا یہ کام موجودہ مسلم معاشرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ مگر کوئی ایک شخص نہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ یہاں ہر بہادر عملاً بزدل بنا ہوا ہے ——— مسلمانوں کا یہی جرم ہے جس نے انھیں خدا کی نظر میں معتوب بنا دیا۔ مسلمانوں نے خدا کے دین کے تقدس کو پامال کیا۔ اس کے نتیجہ میں خدا نے لوگوں کو چھوٹ دیدی کہ وہ مسلمانوں کے قومی تقدس کو پامال کریں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خدا کی طرف دوڑنا چاہیے، کسی انسانی حکومت کی طرف دوڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

جرم کی نفسیات

لینن (Lennon) اور چیپ مین Chapman امریکہ کے دو بیٹل سنگر (Beatle Singer) تھے۔
ن کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ کافی مشہور ہو گیا۔ یہ بات چیپ مین کو برداشت نہ ہو سکی۔ اس
ے دل میں لینن کے خلاف حسد کا جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک روز
قع پاکر لینن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق اس قتل کا سبب پیشہ ورانہ رقابت (Professional Rivalry)
ا۔ اس کے بعد چیپ مین کے خلاف مقدمہ چلا۔ قاتل نے اس سلسلے میں عدالت میں اپنا جو بیان دیا،
ں میں اپنی برات ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

> There is something bad within me, and there is something good within me too. When this little bad within me overpowers my goodness, I do bad deeds.

رے اندر کچھ برائی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر کچھ بھلائی بھی ہے، جب میری برائی میری بھلائی پر
الب آجاتی ہے تو اس وقت میں برا کام کر بیٹھتا ہوں۔

قاتل کا یہ جملہ اگر سنجیدہ ذہن کے تحت نکلا ہے تو یقیناً وہ فطرت کی ترجمانی ہے۔ بلا شبہ کچھ
جرم عادی مجرم ہوتے ہیں، ان کو معاف کرنا انسانیت کے اوپر ظلم کرنا ہے۔ مگر بہت سے جرم کرنے والے
ض وقتی جذبہ کے تحت جرم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فطرت زور کرتی ہے۔ اپنے جرم پر انھیں اس
در افسوس لاحق ہوتا ہے کہ ان کا افسوس خود ان کے لئے ایک داخلی سزا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
سلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ غلطیوں کو معاف کرو۔ وقتی جذبہ کے تحت جب ایک آدمی
دئی برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کے بعد اس کے دل میں خود ہی اس کے خلاف شرمندگی اور افسوس کے جذبات
ھر آتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم اس کو معاف کر دیں تو گویا ہم نے اس کے احساس ندامت کو سہارا دیا اور
س کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور دوبارہ ایسی غلطی کرنے سے بچے۔

اسلام میں اگرچہ قتل کی سزا قتل ہے تاہم ایک خاص صورت کے ساتھ اس کو قابل معافی بھی رکھا
گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے ورثاء اگر قاتل سے دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو دیت لے کر چھوڑ دیا
جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے۔

عجیب تضاد

ٹائمس آف انڈیا (سکشن ۲) کے شمارہ ۱۲ جنوری ۱۹۸۹ میں صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی ہے۔ اس تصویر کو ہم عبرت کے لیے یہاں نقل کر رہے ہیں۔ اس تصویر میں جو آدمی ہاتھ باندھ کر اور ننگے پاؤں نیچے زمین پر کھڑا ہوا ہے، وہ ہندستان کی ریاست اتر پردیش کے موجودہ چیف منسٹر مسٹر این ڈی تیواری ہیں۔ اور اوپر جو دبلا اور بوڑھا آدمی اپنا ایک پاؤں ان کے سر پر رکھے ہوئے

توہم پرستی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے

The U.P. chief minister, Mr N.D. Tiwari, being blessed by saint Deoraha Baba at Vrindaban recently. The saint blesses devotees by placing his foot on their heads.

↓

ہے، وہ ایک ہندو مہاتما دیوراہا بابا ہیں ۔

یہ ورندابن (اترپردیش) کا واقعہ ہے۔ باباجی وہاں آبادی سے دور لکڑی کے ایک مچان پر رہتے ہیں۔ اور اپنے عقیدت مندوں کو آشیرواد دینے کے لیے ان کے سر پر اپنا پاؤں رکھتے ہیں۔ جس آدمی کے سر پر وہ اپنا پاؤں رکھ دیں وہ بہت خوش قسمت آدمی سمجھا جاتا ہے ۔

یہ واقعہ علامتی طور پر موجودہ ہندستان کی تصویر ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ وہ ملک کو جدید اصولوں کے مطابق چلائیں گے، وہ اس کو ماڈرن ورلڈ کا ایک حصہ بنائیں گے۔ کاغذی طور پر اگرچہ یہ اعلان کر دیا گیا، مگر یہاں کے تقریباً تمام لیڈر اپنے فکر کے اعتبار سے قدیم توہماتی دور میں پڑے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت دو سمتوں میں دوڑتے رہے۔ ایک طرف سائنس پسندی اور دوسری طرف توہم پرستی۔ دو عملی کی یہی صورت حال ہے جس سے متاثر ہو کر اقبال احمد سہیل نے کہا تھا :

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمتِ سفر نیرنگِ زمانہ کیا کہیے

جلد ہی ملکی آزادی پر پچاس سال پورے ہو جائیں گے مگر طویل مدت اور ہر قسم کے وسائل کے باوجود ہندستان ابھی تک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکا۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ ہندستان کے لیڈر بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں پاتے ۔

شام کو تمام شرکاء کو کابل کے باہر ایک کھلے مقام پر لے جایا گیا۔ یہاں "شہدای راہ انقلاب" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دور تک "اپریل انقلاب" میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مخصوص فوجی آداب کے ساتھ "شہداء" کو پھول (Wreath) چڑھایا گیا۔ میرے لئے یہ منظر نیا تھا۔ مجھے کسی شخص کا یہ قول یاد آیا کہ حکومت کے خلاف مسلح اقدام اگر کامیاب نہ ہو تو وہ بغاوت ہے، اگر کامیاب ہو جائے تو وہ انقلاب ہے۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر نجیب (رئیس جمہوریہ افغانستان) اور دوسرے اعلیٰ حکومتی ذمہ دار اسٹیج پر موجود تھے۔ کارروائی کا آغاز ایک نابینا قاری کی تلاوت سے ہوا۔ انھوں نے سورۂ احزاب کا وہ حصہ پڑھا جس میں یہ آیت ہے: یخشونہ و لا یخشون الا اللہ۔ میں نے سوچا کہ اگر بالفرض آج کوئی نئی کتاب اترے اس میں مذکورہ الفاظ ہوں اور ان کو لے کر کوئی شخص ایک ایسے اجتماع میں ان کی تلاوت کرنے لگے جہاں وقت کے حکمراں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو شاید اس کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ مگر قاری اس قسم کی آیت قرآن سے پڑھتا ہے تو کسی کے اندر کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نیا پیغمبر اس کو زندہ پیغام کے طور پر پڑھے گا، اور نابینا قاری اس کو صرف ایک روایتی قرأت کے طور پر اس کا ترنم کر رہا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام سے مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جو ۲۳ اکتوبر کی شام تک جاری رہا۔ میں نے جو مقالہ پیش کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

The Prophet of Islam: Benefactor of Humanity

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۲۴ اکتوبر کو یہاں کے ٹیلی وژن والوں نے انٹرویو لیا۔ اپنے مرکز کے تعارف کے بعد میں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک اسلام کا مطلب ہے آخرت اورینٹڈ لائف۔ دوسری بات میں نے وہی کہی جو الرسالہ میں بار بار آتی ہے۔ یعنی تصادم کو اوائڈ کرتے ہوئے ممکن دائرۂ عمل میں اپنا کام کرنا۔ اس سلسلہ میں میں نے مزید کہا کہ یہ باتیں میں خاص طور پر افغانستان کے پس منظر میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا مستقل پیغام ہے جس کی میں پچھلے ۳۰ سال سے برابر تبلیغ کر رہا ہوں۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں غالباً ہندستان کا اکیلا شخص ہوں جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ ایک

ہی بات کہتا ہے ۔ ورنہ میری معلومات کے مطابق، ہندستان کے تمام علما اور قائدین اس معاملہ میں ذوالوجہین ہورہے ہیں۔ وہ ہندستان میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر تصادم اور ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں، اور جیسے ہی وہ کسی مسلم ملک کے ہوائی اڈہ پر اترتے ہیں ان کی زبان بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ لوگ باہر کے مسلم ملکوں میں جو بات کہتے ہیں، وہی میں دونوں جگہ کہتا ہوں۔ البتہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ باہر کے مسلم ملکوں کے لئے ان کا ٹیپ دوسرا ہے اور ہندستان کے لئے دوسرا۔

کابل سے ایک فارسی روزنامہ ہیواد نکلتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۸ میں میرا انٹرویو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک فلسطینی جو اسپین میں رہتے ہیں اور اسپینی زبان بخوبی جانتے ہیں، انھوں نے بھی ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں انٹرویو لیا۔ اس کو وہ اسپین کے بعض اخبارات میں شائع کریں گے۔ وہ اسپین ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور بعض اسپینی اخبارات کے نامہ نگار ہیں۔ ان کا نام سعید علمی ہے اور وہ میڈرڈ میں رہتے ہیں۔

سعید علمی صاحب نے اسپین میں اسلام کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں اسلام کی تبلیغ کے مواقع ہیں۔ کیوں کہ موجودہ نظام کے تحت وہاں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ اسپینی زبان میں اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قرآن کا اسپینی ترجمہ کسی مسلمان کے ہاتھ کا کیا ہوا موجود نہیں۔ البتہ ایک ترجمہ ہے اور وہ اسپین کے مسیحی کا کیا ہوا ہے :

لایوجد فی اسبانیا قرآن مترجم الی الاسبانیۃ علی ید مسلمین۔ و لکن یوجد مترجما علیٰ ید مسیحی اسبان۔

ایک صاحب نے پیغمبر اسلام کی عظمت پر مقالہ پیش کیا۔ آپ کے ذریعہ دنیا میں اصلاح اور انقلاب کا جو دور آیا، اس کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ تمام نبیوں سے افضل تھے۔ آپ کا دین دوسرے تمام دینوں کے مقابلہ میں مکمل تھا۔ وغیرہ۔ میں نے ان کے مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بطور واقعہ درست ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ دنیا میں عظیم ترین اصلاحی انقلاب آیا۔ مگر اس کی وجہ افضلیت اور اکملیت نہ تھی جس کو آپ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ نتیجۂ توحید تھا نہ کہ نتیجۂ اکملیت۔

اصل یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں "توحید" کا نتیجہ ہیں۔ توحید ہی ہر قسم کی اصلاح و ترقی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پچھلے دور میں جو انبیاء آئے ان کا دین بھی توحید کا دین تھا۔ انھوں نے بھی اسی توحید کی

دعوت دی جس کی دعوت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ مگر دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کی دعوت صرف فکری اور نظریاتی مرحلہ میں رہی، وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ توحید کی تبلیغ کے باوجود توحید کے عملی نتائج ظہور میں نہیں آرہے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے دعوتِ توحید کو انقلابِ توحید تک پہنچا دیا۔ جب ایسا ہوا تو انسان کو اس کے نتائج ملنا شروع ہوگئے جن سے وہ اب تک محروم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کے درمیان جو فرق ہے وہ نفس دین کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ دین کے اظہار کے اعتبار سے ہے۔

ایک صاحب نے سیاسی انداز میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خاص نشانہ امریکہ تھا۔ اپنی پر جوش تقریر میں وہ ظالم امریکہ، مردود امریکہ اور شیطان امریکہ جیسے الفاظ بے تکلف استعمال کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ انٹر کانٹی ننٹل ہوٹل جس کے وسیع ہال میں یہ تقریر ہورہی ہے، وہ ایک امریکی کمپنی کا بنوایا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ افغانستان کے پاس سارے ملک میں دوسرا کوئی ہوٹل یا ہال نہیں جہاں ایک بین اقوامی سطح کی سیرت کانفرنس شایان شان طور پر کی جاسکے۔ ایسی حالت میں امریکہ کو برا بھلا کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس امریکہ کے نفوذ کا یہ حال ہو کہ اس کو گالی دینے میں جو پیسہ خرچ ہو وہ بھی اسی کی جیب میں جائے، ایسے امریکہ کا مقابلہ عمل کے اسٹیج پر کیا جاسکتا ہے نہ کہ کسی قسم کے لفظی اسٹیج پر۔

ایک بڑے کمرہ میں افغانستان کی اسلامی مطبوعات کی نمائش کی گئی تھی۔ بڑی تعداد میں مختلف موضوعات پر کتابیں موجود تھیں۔ ایک کتاب کا نام تھا: نقش علماء در دعوت به صلح۔ اس کے "نویسندہ" ڈاکٹر عبدالغفور باہر تھے۔ اس کتاب کا موضوع تھا: صلح کی دعوت میں علماء کا رول۔ اس کو عربی میں کہہ سکتے ہیں: دور العلماء فی الدعوۃ الی السلم۔

اس کتاب کا پہلا جملہ یہ تھا کہ یہ واضح بات ہے کہ اسلام کی دعوت عالمی دعوت ہے اور دنیا میں رحمت لانے کے لئے ہے (واضح است کہ دعوت اسلام دعوت جهانی و تامین رحمت است)

یہاں مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جو لوگ عربی یا انگریزی زبان جانتے تھے، ان سے گفتگو کرنا آسان تھا۔ مگر جو لوگ صرف اپنی مقامی زبان جانتے تھے، ان سے براہ راست ربط قائم نہیں جاسکتا تھا۔ ایک موقع پر میرے ساتھ اسی قسم کی "بے بسی" پیش آئی۔ اس تجربہ کے موقع پر بے اختیار مجھے آخرت کی دنیا یاد آگئی۔ میری زبان سے نکلا: آخرت کی دنیا کیسی عجیب دنیا ہوگی۔ وہاں تمام انسانوں سے ایک زبان میں کلام

کرنا ممکن ہوگا۔ وہاں تمام انسانوں کی سطح ایک ہو جائے گی۔ وہاں ہر آدمی حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ وہاں کسی کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ وہ دھواں بکھیر کر فضا کو آلودہ کرے۔ وہاں کسی کو یہ قدرت نہ ہوگی کہ وہ ظلم اور جبر کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہو جائے اور پھر اپنی ذات کو بچانے کی خاطر سارے معاملات کو تہس نہس کر ڈالے۔ وہاں کسی کو یہ موقع نہ ہوگا کہ جھوٹ اور استحصال کی بنیاد پر لیڈر بن جائے۔

آخرت کی دنیا میں ہر چیز اپنی اصل تخلیقی حالت پر ہوگی۔ وہاں ہر آدمی کو اس حد پر ٹھہرنے کے لئے مجبور کر دیا جائے گا جو اس کی واقعی حد ہے۔ وہاں ہر قسم کا مصنوعی فرق مٹ چکا ہوگا۔ موجودہ دنیا اگر انسانی دنیا ہے تو وہ ربانی دنیا ہوگی۔ کیسی عجیب ہوگی یہ آنے دنیا، اور کیسے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو اس معیاری دنیا میں آباد کاری کے لئے منتخب کئے جائیں۔

کانفرنس کی کارروائی کل شام کو ختم ہوگئی۔ اگلی صبح کو میں کابل کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (روم ۳۴۸) میں میز کے سامنے بیٹھا ہوں۔ سورج کی روشنی دیواری شیشہ سے گزر کر کمرہ میں آرہی ہے۔ ذہن میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا نقشہ گھوم رہا ہے۔ اچانک مجھے فارسی کا یہ شعر یاد آیا:

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح   درعمارت گری گنبد اسلاف خود اند

میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ کا نصف حصہ اگر "گنبد اسلاف" کی تعمیر میں مشغول ہے تو بقیہ نصف حصہ "گنبد خویش" کی تعمیر میں۔ جہاں تک "خانۂ شریعت" کی تعمیر کا تعلق ہے، اس سے حقیقی طور پر کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے ایک تاثر طاری ہوا جو ان لفظوں میں ڈھل گیا: اپنے کو اسلامی ظاہر کرنے کے لئے ہر شخص دوڑ رہا ہے، مگر اپنے کو اسلامی بنانے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے، مگر اسلام کی خاطر اپنا جھنڈا گرانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اسلام کے گنبد پر ہر شخص کھڑا ہونا چاہتا ہے، مگر اسلام کی بنیاد میں دفن ہونا کسی کو گوارا نہیں ——— کیسا عجیب ہے وہ اسلام جو سب کچھ ہو مگر اسلام ہی نہ ہو۔

ایک افغانی نوجوان جس نے بی اے کے مرحلہ تک تعلیم حاصل کی ہے، اس سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں ایسے لوگ کتنے ہوں گے جنھوں نے بی اے کیا ہو۔ اس کا جواب تھا کہ سو میں ایک۔ یہی افغانی قوم کی اصل کمزوری ہے۔ وہ بے حد بہادر قوم ہیں۔ مگر بہادری میں وہ جتنا آگے ہیں، تعلیم میں وہ اتنا ہی پیچھے ہیں۔ وہ لوگ جن کو "افغانی مجاہدین" کہا جاتا ہے، وہ ایک درجن تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں،

ہم ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں۔

غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے افغانی مجاہدین ایک بات کو جانتے ہیں، مگر وہ دوسری اہم تر بات کو نہیں جانتے۔ وہ اس بات کو مبالغہ آمیز حد تک جانتے ہیں کہ ان کی شجاعت نے روسی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا ہے۔ مگر وہ اس تاریخی حقیقت سے سرے سے ناواقف ہیں کہ روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی دراصل ایک دور کا خاتمہ ہے۔ یہ ویسا ہی معاملہ ہے جیسے مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی نے انگریزوں کو ہندستان سے نکلنے پر مجبور کیا۔ مگر انگریزوں کا یہاں سے نکلنا اسی کے ساتھ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اب قدیم طرز کا نوآبادیاتی دور (Colonial age) ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔

مجاہدین میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوتے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے اور وقت کی رفتار کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ روسی فوجوں کی واپسی سادہ طور پر صرف واپسی نہیں ہے، یہ اس دور کا خاتمہ ہے جس میں روسی طرز کا تدخل ممکن ہوتا تھا۔ اگر افغانی مجاہدین اس راز کو جانتے تو ان کا طرز کار بالکل بدل جاتا۔ ہتھیار کی طاقت سے انھوں نے خارجی حریف کو زیر کیا تھا، امن کی طاقت سے وہ داخلی حریف پر قابو پا لیتے۔

کابل سے انگریزی کا صرف ایک اخبار نکلتا ہے جس کا نام "کابل ٹائمس" ہے۔ البتہ فارسی (دری) میں بہت سے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اخبار انیس (۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۹) کے ایڈیٹوریل کا عنوان تھا: محمدؐ مصلح کبیر و انسان دوست بزرگ۔ اس میں مولوی عبد الشکور (خطیب مسجد جامع باغ بالا) کی ایک تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس خبر کا عنوان یہ تھا ——— "ما صلح را پیش کش می کنیم"۔ خبر کے مطابق انھوں نے کہا: روایت است در جنگ حدیبیہ باوجود دیگر شرایط گرانی را بالای محمدؐ قبول وار گردیدند، آنحضرت صلح را ترجیح داد۔ زیرا می دانست کہ یک طرف مشرکین از جملہ اقوام او می باشند۔ وطرف دیگر یاران ہمرکابش، پس صلح حدیبیہ را بہ خاطر قطع جنگ وخوں ریزی قبول وار شد۔

برادرکشی کے خاتمہ کے لئے (برائے ختم برادرکشی) افغان مجاہدین سے صلح کی پیش کش کی مزید تفصیل مجھے امریکی میگزین ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) سے ملی۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) نے لکھا ہے کہ افغانستان میں اس وقت ۳۵ سالہ احمد شاہ مسعود کو "شیر پنج شیر" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس افغانی نوجوان نے کابل کے پالی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ پچھلے تقریباً دس سال سے وہ مجاہدین کا استاد بنا ہوا ہے۔ اس کا تعلق افغانستان

کی اسلامی جماعت سے ہے۔

ٹائم نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ نو سال کی جنگ کے بعد افغانستان کی وادی خالی بستیوں اور برباد مکانات کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت جنگ بندی یا مخلوط حکومت تک پر راضی نظر آتی ہے۔ صدر نجیب اللہ جو اس وقت مایوسی کا شکار ہیں، کیونکہ ان کا حامی روس واپس جا رہا ہے۔ حال میں انھوں نے مسعود کو یہ پیش کش کی کہ امن قائم کرنے کے بدلے وہ حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کر لیں:

{President Najibullah recently offered Massoud a choice of top government posts in exchange for peace (p.10).

ٹائم کے بیان کے مطابق، احمد شاہ مسعود نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ موجودہ حکومت کی بے دخلی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ عین وہی غلطی ہے جو اس سے پہلے سید قطب اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کر چکے ہیں۔ سید قطب کو جمال عبد الناصر نے مصر کی وزارت تعلیم کی پیش کش کی۔ مگر سید قطب کو اس سے کم کوئی چیز قبول نہ تھی کہ جمال عبد الناصر کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔ اسی طرح سید ابو الاعلیٰ مودودی کو محمد ایوب خاں نے یہ پیش کش کی کہ حکومت انھیں اعلیٰ ترین وسائل دے گی، وہ ایک انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی قائم کریں اور اس میں اپنی صلاحیتیں لگا دیں۔ مگر دوبارہ سید ابو الاعلیٰ مودودی اس سے کم کسی بات پر راضی نہ ہو سکے کہ محمد ایوب خاں کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں رہنما مصر اور پاکستان میں ممکن تعمیری کام نہ کر سکے، وہ صرف بربادی کی تاریخ چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ افغانی مجاہدین نے اگر اپنے رخ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو یقینی ہے کہ وہ بھی اس دنیا سے اس حال میں جائیں گے کہ ان کے پیچھے ایک برباد شدہ افغانستان کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔ اور اس دنیا سے بہر حال ہر ایک کو جانا ہے۔

افغانی مجاہدین کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی قربانی سے ۱۹۸۸ میں افغانستان میں اس تاریخی عمل کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچایا ہے جو ۱۹۷۳ میں ویت نام میں شروع ہوا تھا۔ ویت نام کو امریکہ نے طاقت کے ذریعہ مسخر کرنا چاہا۔ مگر ویت نامیوں کی ناقابل تسخیر مزاحمت نے امریکہ کو ۱۹۷۳ میں وہاں سے لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ سے ثابت

نہ کوئی قوم خواہ عسکری طاقت میں "سپر پاور" کا درجہ حاصل کرلے وہ محض طاقت کے بل پر کسی قوم کو زیر نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ٹھیک اسی عمل کو سوویت روس نے افغانستان میں دہرایا۔ بعض داخلی اسباب نے ان کو موقع دیا اور اس نے اپنی دیرینہ خواہش کے تحت افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ مگر یہ اقدام ان کے لئے بے حد مہنگا پڑا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں انھوں نے افغانستان سے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اب یہ بات آخری طور پر ثابت ہو گئی کہ بین اقوامی معاملات میں طاقت کو پہلا فیصلہ کن مقام حاصل نہیں۔

افغانستان کی موجودہ سیاست بے حد مخدوش ہے۔ روس اگرچہ اپنی فوجوں کو واپس بلا رہا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ افغانستان میں ایسی حکومت قائم ہو جو کمیونسٹ نواز ہو یا کم از کم اینٹی کمیونسٹ نہ ہو۔ دوسری طرف "مجاہدین" کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان میں سوویت روس کے کسی بھی اثر و نفوذ کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ امریکہ اور پاکستان اس مطالبہ کی تائید کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "مجاہدین" کی جو حکومت ہوگی وہ امریکہ نواز یا پاکستان نواز ہوگی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ "مجاہدین" کی بندوقوں کا رخ جو پہلے روسیوں کی طرف تھا، اب وہ حکمراں افغانی گروہ کی طرف ہو گیا ہے، کیونکہ ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ روسی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کا حل خوش تدبیری اور ایڈجسٹمنٹ ہے۔ مگر بظاہر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دس سال سے مجاہدین کے غیر مصالحانہ تشدد کو سارے عالم اسلام میں جس طرح گلوریفائی کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو ہیرو بنایا گیا ہے، اس کے بعد ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی ان کے لئے ہیرو کے مقام سے اترنے کے ہم معنی ہوگی۔ اور انسان کے لئے بلاشبہہ یہ مشکل ترین کام ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اگر بالفرض روسی اثر و نفوذ افغانستان سے ختم ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ عدم برداشت کا مزاج جو اس وقت روسیوں یا روس نوازوں کے خلاف کام کر رہا ہے وہی خود اپنوں کے خلاف کام کرنے لگے گا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز برداشت ہے، دوسروں کے مقابلہ میں بھی اور خود اپنوں کے مقابلہ میں بھی۔

اس سلسلہ میں لینن کی مثال بہت سبق آموز ہے۔ روس میں زار کے زوال کے بعد ۱۵ مارچ ۱۹۱۷ کو پہلی پراوژنل گورنمنٹ بنی۔ اس میں لینن کی حیثیت صرف اقلیتی ممبر کی تھی۔ اس کا وزیر اعظم شاہی خاندان کے جارجی لووف (Prince Georgy Lvov) کو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد الیگزینڈر کرنسکی (Aleksander Kerensky) کو ایک اہم وزیر کی حیثیت سے اس میں نمبر ۲ کی حیثیت حاصل تھی۔ لینن کی حیثیت یہ تھی کہ وہ بالشویک پارٹی کا ممبر تھا جو اس وقت کی اسمبلی (Soviets) میں ایک اقلیتی گروپ تہائی کی تعداد رکھتی تھی۔

مگر لینن نے انتہائی گہری تدبیروں کے ساتھ اولاً حریف پارٹی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد گہری تدبیروں کے ذریعہ ۶ نومبر ۱۹۱۷ کو ماسکو کی پوری حکومت اپنے قبضہ میں کر لی۔ لینن ابتداءً کمتر پر راضی ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس کا ملک دو بڑی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ افغانی مجاہدین "کمتر" پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں اس لئے مجھے امید نہیں کہ وہ کبھی برتر کو پانے میں کامیاب ہو سکیں گے (EB-16/68)

افغانستان میں اگر آپ افغانی مجاہدین سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین جہاد" ہے۔ اس کے برعکس کابل کے حکمراں طبقہ سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین صلح" ہے۔ بظاہر دونوں اسلام کا لفظ بول رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً دونوں کا مقصد ایک ہے۔ اسلام کو اپنی پالیسی کی تائید کے لئے استعمال کرنا۔ افغان مجاہدین کے لئے جہاد کی آیتیں مفید ہیں اس لئے وہ جہاد کی آیتوں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس حکمراں طبقہ کے لئے صلح کی آیتیں مفید مطلب ہیں اس لئے وہ صلح کی آیتوں کی تلاوت کر رہے ہیں۔

آبزرور (Observer) کے نمائندہ مسٹر آرتھر کنٹ (Arthur Kent) نے افغانستان کے اندرونی علاقوں کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں وہ قندھار گئے۔ اپنے مشاہدات کے بعد انھوں نے جو رپورٹ مرتب کی، اس کو ٹائمس آف انڈیا (۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸) نے نقل کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ افغانستان کے سرسبز علاقے اجڑے ہوئے صحرا کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ تمام بربادیوں کے باوجود افغانستان کا مستقبل غیر یقینی ہے، کیونکہ مجاہدین سات گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ افغانستان کے مستقبل کے نقشہ کے بارہ میں ان کے درمیان اتفاق نہیں۔ افغانی مجاہدین کے پاس "پولیٹیکل لیڈرشپ" نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے

قندھار کے ملا نقیب اللہ سے گفتگو کی۔ آرتھر کنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کا جواب یہ تھا:

When Najib is gone, we will have a council
so that all Afghans can decide who should lead.

صدر نجیب اللہ کے چلے جانے بعد ہم ایک کونسل بنائیں گے تاکہ تمام افغانی مل کر یہ فیصلہ کریں کہ کون ملک پر حکومت کرے ۔۔۔۔۔۔ جہاں دور جد وجہد میں اتحاد نہ ہو، وہاں دور اقتدار میں اتحاد اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے، مگر افغانی لیڈر روس کو اس کی خبر نہیں۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) کی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ میں ایک بات یہ بتائی گئی ہے کہ روسیوں کے بیان کے مطابق، ان کے ۳۱۲ فوجی گم ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ روسی فوجی ہیں جن کو مجاہدین نے گرفتار کر لیا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو از خود بھاگ کر آنے والے (Defectors) ہیں۔ ان میں سے کچھ کو ٹائم کے نامہ نگار ٹی اے ڈیوس (T.A. Davis) نے خود سفر کے دوران دیکھا ہے۔ ٹائم کا بیان ہے کہ ان روسی فوجیوں میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جو مجاہدین کا مذہب ہے اور خود ان کے سابق باپ دادا کا بھی:

Others are converts who have embraced Islam, the religion of their captors and, for many Asian Soviets, of their parents as well (p.12).

روس کا انخلا اگرچہ ابھی افغانستان سے مکمل نہیں ہوا ہے۔ تاہم عملی صورت حال میں اب بنیادی فرق پیدا ہو چکا ہے۔ پہلے افغانی مجاہدین کے تشدد کا نشانہ زیادہ تر روسی فوجیں بنتی تھیں۔ اب ان کے تشدد کا نشانہ خود ان کی اپنی قوم بن رہی ہے۔ پہلے وہ روسیوں کو مارتے تھے، اب وہ "روس حامی افغانیوں" کو مار رہے ہیں۔ مگر اس کو خواہ جو نام بھی دیا جائے، تاہم عملی واقعہ یہی ہے کہ پہلے اگر روس کا خاندان اپنے بیٹوں سے محروم ہو رہا تھا تو اب افغانی خاندان اپنے بیٹوں اور جوانوں سے محروم ہو رہا ہے پہلے اگر روسی ٹینک تباہ ہوتے تھے، تو اب خود افغانیوں کے کھیت اور باغ اور مکان تباہ ہو رہے ہیں۔

دہلی میں جو لوگ پالم کے علاقہ میں یا اس کے قریب رہتے ہیں، ان کے لئے سر پر گھڑگھڑاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی آوازیں روزانہ کا معمول ہیں۔ کابل میں پورے شہر کا یہی حال ہے۔ ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد سے لے کر پورے زمانہ قیام تک رات دن یہ حال تھا کہ فضا میں ہوائی جہاز اڑتے

ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم دہلی اور کابل میں ایک فرق ہے۔ دہلی کی فضا میں اڑنے والے جہاز مسافر جہاز ہوتے ہیں اور کابل کی فضا میں اڑنے والے جہاز جنگی جہاز۔ ایک افغانی سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا:

You know, we are at war.

مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ لوگ جن کو باہر کی دنیا میں "مجاہدین" کہا جاتا ہے، ان کو افغانستان کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک نوجوان (۲۴ سال) کو لیا۔ ان سے میں نے ایسے موقع پر گفتگو کی جب کہ وہاں کوئی ہماری گفتگو کو سننے والا موجود نہ تھا۔ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہاں ان کو مجاہدین تو کوئی نہیں کہتا۔ البتہ یہاں کے لوگوں میں ان کے لئے عام طور پر تین الفاظ رائج ہیں:

اپوزیشن، افراطیون، اشرار

روس ــ افغانستان جنگ پر ایک معلوماتی فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو بی بی سی ٹیلیویژن پر دکھائی گئی۔ اس فلم میں افغانی فوجیوں کے مکالمات ہیں۔ اسی کے ساتھ اس میں روسی فوجیوں کے تاثرات بھی ان کی اپنی زبان میں دکھائے گئے ہیں۔ اس کے مطابق، ایک روسی جنرل نے کہا کہ مستقبل میں اگر کبھی سوویت یونین کو کوئی بین اقوامی مسئلہ طاقت کے ذریعہ حل کرنا پڑا تو وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سو بار اس پر غور کرے گا۔

روسی جنرل نے مزید کہا کہ پچھلے دس سال کی اس جنگ میں بے شمار افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ روس کے ایک اور فوجی افسر نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جنگ خالصتہً ایک سیاسی غلطی تھی، اور اس غلطی کے تمام تر ذمہ دار سابق روسی وزیر اعظم لیونڈ برژنیف ہیں ـــــ برژنیف اگر زندہ ہوتے تو اس سنگین حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام بڑی بڑی سیاسی غلطیاں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب کہ ان کا ارتکاب کرنے والے لیڈر مر جائیں یا وہ اقتدار کی کرسی سے ہٹ چکے ہوں۔

روانگی سے پہلے دہلی میں مجھے سرینگر کا ایک ہفتہ وار اخبار (۷ اکتوبر ۱۹۸۸) ملا۔ اس میں افغانستان سے متعلق ایک مضمون تھا۔ نصف صفحہ میں اصل مضمون تھا۔ اور بقیہ نصف میں حسب ذیل سرخی جلی حرفوں میں درج تھی:

"اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے افغان مجاہدین کی جدوجہد فیصلہ کن مرحلہ میں"

اس میں افغان نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ افغانی نوجوان ایک تختی لٹکائے ہوئے تھے جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا ــــــ قرآن زندہ باد (Long live Qur'an)

خدا کو عرب میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بنانا پڑا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے تمام اصاغر و اکابر ڈھائی دن سے بھی کم عرصہ میں اسلامی حکومت کا قلعہ کھڑا کرنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ مسلمان سیاست کے معاملہ میں اس قدر مضحکہ خیز حد تک جذباتی کیوں ہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ موجودہ لیڈروں نے تقریباً بلا استثناء یہ کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے ایک یا دوسری شکل میں سیاسی لوریاں سنائیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی حساسیت سیاست کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ جاگ اٹھی۔ ۱۹۱۲ میں جب مصطفیٰ کمال اتاترک یونانی فوجیوں کو پسپا کرکے وقتی طور پر سمرنا میں داخل ہوگئے تو برصغیر ہند میں "سمرنا بہار" آگئی۔ اشعار اور مضامین اور تقریروں کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس کا خلاصہ ایک شعر میں یہ ہے:

وہ پہنچا پرچم اسلام پھر ارض سمرنا میں

مگر سمرنا کی فتح کو فتح اسلام سمجھنا جتنا بے معنی تھا، افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کو فتح اسلام سمجھنا بھی اتنا ہی بے بنیاد ہے۔ مگر اقتدار کے لئے مسلمانوں کی جوشش تمنا اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ہر لکڑی پر فتح اسلام کا جھنڈا باندھ دینا چاہتے ہیں، خواہ اگلے لمحہ حالات کا طوفان اس جھنڈے کو گرا کر گہری خندق میں کیوں نہ ڈال دے۔

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ میں مختلف قوموں کے باہمی جھگڑوں کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ جھگڑے زیادہ تر سیاسی جھگڑے کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان "پختون" علاقہ کے لئے جھگڑا۔ ایران اور عراق کے درمیان شط العرب کے لئے جھگڑا۔ پاکستان اور ہندستان کے درمیان کشمیر کے لئے جھگڑا۔ وغیرہ۔ کوئی قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس کو ہر وقت جو کچھ حاصل ہے اس پر قانع ہو کر اپنی تعمیر کا کام کرے۔ ہر قوم اس چیز کے لئے لڑ رہی ہے جو اس کو حاصل نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر حاصل شدہ کے پیچھے دوڑنے میں حاصل شدہ بھی برباد ہو رہا ہے۔

ایک صاحب اخوانی مزاج کے تھے۔ انھوں نے انقلابی اسلام والی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم ممالک کا یہ حال ہے کہ وہاں کا حکمراں طبقہ ایک یا دوسری مغربی طاقت کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ ان مسلم حکمرانوں سے لڑ کر جب تک ان کا خاتمہ نہ کیا جائے، اسلام کو قائم اور غالب نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، بلکہ آپ کی مفروضہ تفسیر اسلام کا ہے۔ آپ لوگوں نے خود ساختہ تفسیر کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل کام اسلام کو ایک قانونی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنا ہے، اور چوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم حکمراں اس قسم کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ ان سے لڑ کر نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جائے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں حکومت پیش کی گئی مگر آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اگر اصل مقصد اقتدار ہوتا تو آپ فوراً اس کو قبول کر لیتے اور اس کے بعد ڈنڈے کے زور پر اسلامی قانون نافذ فرماتے، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض نام نہاد مجاہدین اسلام کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح قلب ہے نہ کہ اصلاح سیاست۔ سیاست کی اصلاح بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے نہ کہ وہی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔

مزید میں نے کہا کہ قرآن میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم اور دوسری طرف ارشاد ہوا ہے کہ ولا ینازعنك فی الامر وادع الیٰ ربك اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کی حکمت یہ ہے کہ اس کو کلمۂ سواء سے شروع کیا جائے نہ کہ کلمۂ نزاع سے۔ موجودہ زمانہ کے مدعیان دعوت نے اپنا کام کلمۂ نزاع سے شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار بربادی کے باوجود انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (حال مقیم واشنگٹن) نے ۱۹۶۲ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ لندن میں تھے۔ لندن یونیورسٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر پدما سرا سے ہوئی۔ وہ ایک ہندستانی خاتون تھیں۔ جو اس وقت لندن یونیورسٹی میں تھیں۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر پدما سرا نے ایک واقعہ بتایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ بنارس اور لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ان کے ڈبہ میں لکھنؤ کی ایک مسلمان عورت بھی تھی جو ایک سیٹ پر اپنی گٹھری رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی معمولی گھر کی ہے۔ غالباً وہ سبزی فروش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار باتھ روم گئی۔

اس کی غیر موجودگی میں ایک سکھوڑے ہوئے مسافر نے اس کی گٹھری ہٹادی اور جگہ بنا کر وہاں بیٹھ گیا۔ مذکورہ عورت جب باہر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی گٹھری ہٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سخت برہم ہوگئی۔ اس نے غصہ میں کہا:

نہ رہی نوابی ورنہ تم کو زندہ دیوار میں چنوا دیتی

یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر سید صاحب نے کہا کہ مسلمانوں سے حکومت چلی گئی، مگر ان کا حاکمانہ مزاج اب تک ان سے نہیں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ سب ان کے اسی مزاج کی قیمت ہے۔ کوئی نعمت آدمی کو ملے تو آدمی کو اس پر شکر کرنا چاہئے، اور جب وہ چھن جائے تو صبر۔ مگر مسلمانوں نے نہ پہلے شکر کیا اور نہ اب وہ صبر کرنے پر راضی ہیں۔

کھانے کی میز پر ایک بار چھ آدمی تھے۔ ان میں سے پانچ عرب تھے۔ صرف میں غیر عرب تھا۔ ایک مصری تھے جو مسلسل بول رہے تھے۔ دوسرے لوگ متکلم کے بجائے زیادہ تر سامع بنے رہے۔ مصری صاحب مجلسی انداز کی باتیں کر رہے تھے، اور طرح طرح کے لطیفے بیان کر رہے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے اس عربی مقولہ کو دہرایا: خیر الکلام ما قل ودل (بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور مدلل ہو) اس مختصر مقولہ پر بھی انھوں نے ایک "مفصل" تقریر کر ڈالی۔

مصری کا مذکورہ مقولہ کو نقل کرنا مقولہ برائے مقولہ تھا۔ کیونکہ ان کا اپنا کلام سراسر اس سے مختلف تھا۔ یہی حال دین کے معاملہ میں بھی اکثر لوگوں کا ہے۔ وہ دین کے موضوع پر تقریر کرتے ہیں۔ مگر یہ سارا معاملہ تقریر برائے تقریر ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی مجلسی آدمی طرح طرح کی باتیں کرے، حالانکہ ان میں سے کسی بات پر بھی اس کا ایمان نہ ہو۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک یورپی ملک سے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامیات سے ایم اے کیا ہے۔ وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ حتی کہ انھوں نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ان سے ایک اسلامی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے نقطۂ نظر سے مختلف نقطۂ نظر پیش کیا اور اس کے حق میں قرآن و حدیث سے دلیلیں دیں۔ میری بات سے ان پر استعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے یہ نہ کہہ سکے کہ آپ کا نقطۂ نظر درست ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی: مگر فلاں فلاں مشہور لوگوں نے تو

ایسا نہیں کہا۔

بیشتر لوگ کسی بات کو اس لئے مانتے ہیں کہ ان کی مسلمہ شخصیت نے ایسا کہا ہے نہ کہ دلیل سے اس طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے اندر سچائی کبھی ذہنی انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن ہمیشہ شخصیتوں کی عظمت میں گم رہتا ہے، وہ حقائق کی عظمت میں گم ہونے کا کبھی تجربہ نہیں کرتا۔

ڈاکٹر اسکندر احمد چودھری بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ آجکل وہ ٹوکیو (جاپان) میں مقیم ہیں۔ وہاں وہ ریڈیو میں بنگالی اناؤنسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسلامک کلچر سوسائٹی جاپان کے ڈائرکٹر ہیں۔

ڈاکٹر چودھری سے جاپان کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے جاپان پر ۱۹۶۷ سے لکھنا شروع کیا جب کہ ہندستان میں جاپان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جواہر لال نہرو اس کو اپنی ناوابستگی کی پالیسی کے خلاف سمجھتے تھے کہ وہ جاپان سے تعلق قائم کریں۔ پچھلے ۲۵ سال میں میں نے جاپان پر اتنے زیادہ مضامین لکھے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک پوری کتاب بن جائے۔ میں نے کہا کہ جاپان سے میری دلچسپی کا سبب ہے "حدیبیہ" کی پالیسی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے میدان میں عالی شان طور پر استعمال فرمایا تھا، اس کو تاریخ میں دوسری بار جاپان نے سیکولر میدان میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر چودھری سے میں نے کہا کہ اس پالیسی کو جاپانیوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ گیاکوتن (Gyakuten) ہے۔ ڈاکٹر چودھری نے گفتگو کے دوران میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جاپانیوں کی خاص صفت جس کی بنا پر انھوں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے، وہ، ایک لفظ میں، حکم کی تابعداری (Submission to authority) کا مزاج ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی بڑی ترقی کے لئے یہ سب سے اہم صفت ہے۔ جاپانیوں میں یہ صفت آخری حد تک پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسر یا حاکم کی بات کو فوراً ماننے پر راضی ہو جاتے ہیں، خواہ وہ انھیں صحیح نظر آئے یا غلط۔ یہ صفت صحابۂ کرام میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ صفت انتہائی حد تک مفقود ہے۔

اور بلاشبہ ان کی موجودہ بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

میں نے ان سے مزید پوچھا کہ جاپان نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے اس کو اقتصادی معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس معجزہ کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مگر جاپانی اس کو معجزہ نہیں کہتے۔ وہ اس کو سخت محنت (Hard work) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر اس کو معجزہ کہا جائے تب بھی اس کا اصل راز ہارڈ ورک ہی ہے نہ کہ کوئی پراسرار چیز۔

ایک پاکستانی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں اور امریکہ کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں زندگی بہت پرسکون ہے۔ مگر وہاں کا سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جو ہماری نسلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے بچے وہاں کے ماحول سے اتنا زیادہ متاثر ہو رہے ہیں کہ اس بات کا شدید اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ ہماری تیسری نسل مسلمان بھی باقی رہے گی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسے لوگ برابر اپنے وطن واپس جانے کو سوچتے رہتے ہیں، مگر اب وطن کا ماحول بھی اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

میں نے کہا کہ امریکہ کا مسئلہ اگر غیر اسلام ہے تو پاکستان میں کچھ لوگوں کی نادانی سے خود اسلام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ میری یہ بات انھیں عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کو زبردستی اسلامائز کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں اسلام تو نہیں آیا، البتہ لوگ اسلام سے متوحش ہوگئے۔ ایک نوجوان اگر جاہل رہ جائے اور جلد تعلیم یافتہ بنانے کے شوق میں آپ اس کو مار مار کر پڑھانا شروع کر دیں تو وہ تعلیم یافتہ تو نہیں بنے گا۔ البتہ تعلیم سے متنفر ہو جائے گا۔ یہی صورت پاکستان کے ساتھ پیش آئی ہے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ یہ ہدایت دی تھی کہ میرے بعد مسلم حکمرانوں سے نہ لڑنا، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ تم دیکھو کہ ان میں بگاڑ آگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا مقصود کوششوں کو روکنا نہیں بلکہ کوششوں کو ڈائورٹ (Divert) کرنا تھا۔ یہی کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اور اسلام کی تاریخ میں اس کی انتہائی روشن مثال محدثین کا طبقہ ہے۔ محدثین کے زمانہ میں حکمرانوں میں بہت بگاڑ آچکا تھا، مگر انھوں نے حکمرانوں سے ٹکرانے کے بجائے اپنے آپ کو حدیث کی خدمت میں لگا دیا۔ اس کے نتیجہ میں حدیث کی جمع و تدوین کا وہ عظیم الشان کام انجام پایا جس کی

اہمیت قیامت تک ختم ہونے والی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ سوسائٹی سے سسٹم بنتا ہے سسٹم سے سوسائٹی نہیں بنتی۔ پاکستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کی سوسائٹی اسلام کے نظام قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسی حالت میں پہلا کام یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر اس کی استعداد پیدا کی جائے۔ یہ کام صرف تذکیر ونصیحت کے ذریعہ انجام پاتا ہے نہ کہ کوڑا مارنے اور سزائیں جاری کرنے سے۔ یہ گفتگو ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہوئی۔

ہم لوگ ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک نیچی میز تھی جس کے اوپر لکڑی کے تختہ کے بجائے سفید مائل سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہ سنگ مرمر افغانستان کی خاص چیز ہے۔ اور جب لاہور میں اقبال کا مقبرہ بن رہا تھا تو اس وقت کے افغانی حکمراں نے اس میں لگانے کے لئے افغانی سنگ مرمر بطور ہدیہ روانہ کیا تھا۔

ایک صاحب اقبال کے فارسی کلام سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ اگر اقبال نہ ہوتے تو موجودہ مسلمان بے حوصلہ ہو کر رہ جاتے۔ میں نے کہا کہ اقبال نے شاعرانہ ترنم تو قوم کو ضرور دیا۔ مگر جہاں تک حوصلہ کا تعلق ہے، ان کے کلام نے برعکس کام کیا ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے سلطان ٹیپو کے بارہ میں کہا کہ وہ ہماری ترکش کا آخری تیر تھا:

ترکش مارا خدنگ آخریں

اس شعر کی روشنی میں دیکھئے تو سلطان ٹیپو کی شکست (بالفاظ دیگر، مسلمانوں کی عسکری قوت کی بربادی) کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے پاس گویا کچھ نہیں رہا۔ یہ تصور کتنی زبردست پست حوصلگی پیدا کرتا ہے۔ انھوں کہا کہ پھر آپ کے خیال میں اقبال کو کیا کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ اقبال کو کہنا چاہئے تھا کہ ٹیپو کی عسکری طاقت ختم ہو گئی تو غم کی بات نہیں۔ اسلام کی دعوتی طاقت زندہ ہے۔ تم اسلامی دعوت کو لے کر اٹھو۔ اور اس کے ذریعہ سے دنیا کو مسخر کرو۔ اقبال اگر یہ بات کہتے تو اس سے مسلمانوں کو رہنمائی ملتی۔ مگر ٹیپو کو "آخری تیر" کہہ کر انھوں نے مسلمانوں کو بے حوصلگی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ ان کی تعلیم پاکستان کے ایک دار العلوم میں ہوئی ہے اور اچھی اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ برابر پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے پاکستان کے ایک واقف کار کے ذریعہ

مل جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ صاحب پورے رسالہ کی فوٹو کاپی کرکے بھی روانہ کر دیتے ہیں۔

انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اکتوبر ۱۹۸۸ کے الرسالہ میں زمین سے محروم (صفحہ ۳) کے عنوان سے جنرل ضیاء الحق مرحوم پر جو مضمون ہے وہ لاجواب ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنرل ضیاء کی موت پر مسلم دنیا کے تقریباً ہر اخبار اور ہر رسالہ نے مضامین شائع کئے ہیں اور ہر رہنما نے اپنے بیانات دئے ہیں، مگر آپ کا مضمون ان سب میں منفرد تھا۔ دوسرے لوگوں نے عام طور پر صرف ضیاء کی تعریف کی ہے۔ ان کو ہیرو بنایا ہے۔ مگر آپ نے اس سے سبق کا پہلو نکالا ہے۔ اور مومن کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ سے عبرت اور نصیحت لے سکے۔

انھوں نے کہا کہ امت پر اس قسم کا سب سے بڑا واقعہ وہ تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام نے ایسا نہیں کیا کہ ہر ایک آپ کی شان میں تعریفی تقریر کرنے لگے اور آپ کو "شہید" یا اسلامی ہیرو ثابت کرنے میں تمام الفاظ صرف کر ڈالے۔ اس کے برعکس انھوں نے اس واقعہ سے موت اور آخرت کی یاد حاصل کی۔ حضرت ابوبکر تشریف لائے اور آپ کی میت کو دیکھا تو قرآن کی یہ آیت پڑھی: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ اسی طرح حضرت عباس نے فرمایا: واللہ الذی لا الٰہ الا ہو لقد ذاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الموت

مذکورہ عالم نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں الرسالہ سنت رسول اللہ کو زندہ کر رہا ہے۔ لوگوں کو قومی دین سے نکال کر خداوندی دین پر لا رہا ہے۔ اس وقت اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔

کمرہ کی جو میز تھی، اس کے سامنے ملا ہوا بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس دوران آئینہ کی طرف نظر گئی تو دکھائی دیا کہ قلم میرے بائیں ہاتھ میں ہے، حالانکہ میں اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ اسی طرح گھڑی دائیں ہاتھ میں دکھائی دی، حالانکہ وہ میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔

ایسا اس لئے تھا کہ آئینہ میں آدمی کی تصویر الٹ جاتی ہے۔ یعنی دایاں رخ بائیں طرف اور بایاں رخ دائیں طرف ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خارجی دنیا کو اپنے فٹ کئے ہوئے شیشہ میں دیکھیں۔ ان کے اپنے مشاہدہ میں ہر چیز الٹی ہوگی اور وہ ان کو الٹی صورت میں بیان کریں گے۔ بظاہر وہ اپنے بیان میں مخلص ہوں گے۔ مگر مخلص ہونے کا لازمی مطلب یہ نہیں

ہے کہ آدمی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ واقعہ کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ ایک چیز باعتبار مشاہدہ کچھ اور ہوتی ہے اور باعتبار واقعہ کچھ اور۔

فجر کی اذان کی آواز آئی۔ گھڑی دیکھی تو ہندستانی وقت کے لحاظ سے گھڑی میں چھ بج رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ دہلی میں آجکل فجر کی اذان تقریباً پانچ بجے ہوتی ہے۔ افغانستان کا وقت، ہندستان کے مقابلہ میں ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندستان "آگے" ہے اور افغانستان اس سے "پیچھے" یہ صرف ایک جغرافی تقسیم کا معاملہ ہے نہ کہ سابق اور مسبوق کا معاملہ۔

نماز میں امام کو آگے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی شخصیت برتر ہے اور دوسرے نمازیوں کی کم تر۔ یہ قیام جماعت کے لئے ایک انتظامی تقسیم ہے۔ کبھی فرق باعتبار جوہر ہوتا ہے اور کبھی فرق باعتبار انتظام۔ جو لوگ جوہری تقسیم اور انتظامی تقسیم کے اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ ایک عظیم الشان غلطی کرتے ہیں۔ جس فرق کو اللہ تعالی نے برائے انتظام رکھا تھا، اس کو افضلیت اور غیر افضلیت کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر دین میں زبردست خرابی پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

۲۵ اکتوبر کو میں نے واپسی کا پروگرام بنایا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے پیغام ملا کہ ۲۵ اکتوبر کی شام کو ڈاکٹر نجیب اللہ (پریسیڈنٹ افغانستان) شرکائے کانفرنس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا نام لے کر خاص طور پر انھوں نے کہا کہ ان سے ملنا بھی ضروری ہے۔ یہ ملاقات یہاں کے صدارتی محل میں ہونے والی تھی۔ میں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ۲۵ اکتوبر کی فلائٹ چھوڑ دوں تو اس کے بعد اگلی فلائٹ مجھے ۲۷ اکتوبر کو ملے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ عذر پریسیڈنٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی فکر نہ کیجئے ۲۶ اکتوبر کو انھیں اسپیشل فلائٹ کے ذریعہ دہلی پہنچا دیا جائے گا۔ مگر اپنے ضروری پروگرام کے تحت میرے لئے مزید ٹھہرنے کا موقع نہ تھا چنانچہ میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۸ کو دہلی واپس آگیا۔

۲۵ اکتوبر کو مجھے انڈین ایئر لائنز سے واپس آنا تھا۔ مگر اس روز کی فلائٹ سے ہماری سیٹ کنفرم نہ تھی۔ میں اور میرے ساتھی دونوں ویٹنگ لسٹ پر تھے۔ ایئر پورٹ پہنچے تو کاؤنٹر پر بتایا گیا کہ تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب اس جہاز سے سفر کی کوئی گنجائش نہیں۔

اتنے میں انڈین ایئر لائنز کے منیجر کسی وجہ سے وی آئی پی لاؤنج میں آگئے جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے

تھے۔ میں فوراً ان سے ملا اور کہا کہ کل مجھے روم جانا ہے، اس لئے آج میرا دہلی پہنچنا ضروری ہے۔ اگر آپ اس جہاز سے ہمیں بھیج دیں تو آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اچھا، میں تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے آفس میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد ایک کلرک آیا۔ اس نے ہم دونوں آدمیوں کا ٹکٹ اور پاسپورٹ مانگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مذکورہ کلرک دوبارہ آیا اور ٹکٹ اور پاسپورٹ کے ساتھ ہمارا بورڈنگ کارڈ بھی ہمارے حوالہ کر دیا۔

انڈین ایئر لائنز کے منیجر جنھوں نے بالکل آخر وقت میں ہمارا یہ کام کیا ان کا نام مسٹر اودے کمار شرما تھا۔ اس کے بعد جب میں ہوائی جہاز میں داخل ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو میرا دل کہہ رہا تھا ——— اگر آدمی اپنے کیس کو جینوئن کیس ثابت کر سکے تو ہر شخص اس کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، خواہ اس کے نام اودے کمار شرما ہو یا محمد اسلام الدین۔

اطلاع

ماہ فروری میں انگریزی الرسالہ کے بارہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مسلسل خسارہ کی وجہ سے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب قارئین کے اصرار اور خواہش کی بنا پر فوری طور پر اس کو بند کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا ہے، تاہم انگریزی الرسالہ کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے اہل خیر حضرات کا کافی تعاون درکار ہے تاکہ خسارہ کی تلافی کر کے اس کو جاری رکھا جا سکے۔ امید ہے کہ اہل خیر حضرات اس دعوتی کام میں فیاضانہ تعاون فرمائیں گے۔

صدر اسلامی مرکز

۱۔ ایسوسی ایشن فار ہیومن ایفیرس (نئی دہلی)، تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک تنظیم ہے جس کے صدر ڈاکٹر مکند دویدی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر بھرت کمار ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے ایک مہم شروع کر رہی ہے جس کے تحت مختلف حلقوں سے ایک لاکھ ایسے لوگوں کے دستخط حاصل کیے جائیں گے جو یہ عہد کریں کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے خلاف کسی قسم کا کوئی کام نہیں کریں گے۔ اس عہدنامہ سے پہلے اس کے لیے ایک اپیل دس ہزار کی تعداد میں چھاپ کر پھیلائی جائے گی جس پر پچاس ممتاز اہلِ علم (Eminent academicians) کے نام ہوں گے۔ مذکورہ تنظیم نے اس اپیل میں صدر اسلامی مرکز کا نام شامل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، انھیں اس کی اجازت دیدی گئی۔

۲۔ ہندی زبان میں اب تک مرکز کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انسان اپنے آپ کو پہچان، اور ستیہ کی کھوج۔ اب تیسری کتاب کا ہندی ترجمہ تیار ہو چکا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد چھپ جائے گا۔ یہ وہی باب ہے جو پیغمبر انقلاب میں "مثالی کردار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ الرسالہ کا پیغام خدا کے فضل سے مختلف طریقوں سے عوام تک پہنچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر آنند (گجرات) کے کچھ لوگوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ الرسالہ کے مختصر مختصر اقتباس کو گجراتی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اور پھر ہر جمعہ کو ایک اقتباس آنند کی جامع مسجد کے بلیک بورڈ پر لکھ دیتے ہیں۔ گجراتی لوگ اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

۴۔ تذکیر القرآن کی مقبولیت خدا کے فضل سے تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ حیدرآباد کے ایک صاحب خیر نے تذکیر القرآن کے ایک سو سٹ حاصل کیے ہیں تاکہ ان کو لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ امریکہ کے کچھ لوگوں نے فرمائش کی ہے کہ پوری تذکیر القرآن ٹیپ پر منتقل کر کے انھیں فراہم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جدید طرز کا ایک خصوصی ریکارڈر اور اس کا ضروری سامان بطور عطیہ مرکز کو دیا ہے تاکہ ریکارڈنگ کا کام بآسانی

انجام دیا جاسکے ۔

۵۔ ولی محمد انصاری صاحب (دھولیہ) نے اپنے خط مورخہ ۲۳ نومبر میں اطلاع دی ہے کہ انگریزی کتاب گاڈ ارائزز کا مراٹھی ترجمہ مکمل ہو چکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ترجمہ مزید تکمیلی مراحل سے گزر کر اشاعت پذیر ہو سکے ۔

۶۔ پٹنہ میں ۱۴ سے ۲۲ نومبر ۱۹۸۸ تک کتابوں کی نمائش تھی ۔ اس موقع پر محمد صلح صاحب نے اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال لگایا ۔ کافی تعداد میں لوگوں نے آکر دیکھا اور دل چسپی کا اظہار کیا ۔ کئی لوگوں نے الرسالہ کی خریداری قبول کی ۔ کتابیں بھی بڑی تعداد میں فروخت ہوئیں ۔ ہندی کتابیں سب کی سب ختم ہو گئیں ۔ ایک صاحب نے کہا کہ "الرسالہ امریکی ڈالر کی طرح ہے ۔ اس کی ویلو ختم ہونے والی نہیں ۔ ہر جگہ اس کی قیمت ہے ۔ ہر جگہ اس کے طلب گار موجود ہیں "

۷۔ عربی پریس میں مختلف انداز سے اسلامی مرکز کا تذکرہ شائع ہوتا رہتا ہے ۔ مثال کے طور پر قاہرہ کے اخوانی ماہنامہ "المختار الاسلامی" نے اپنے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۸ (ربیع الاول ۱۴۰۹) میں پیغمبر انقلاب (انگریزی) کا تعارف شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے : محمّد نبی الثورۃ ۔ یہ تعارف ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے : صدر حدیثا للمفکر الاسلامی المعروف وحید الدین خان کتاب جدید باللغۃ الانجلیزیۃ عن المرکز الاسلامی بالهند یقدم فیہ اسهاما جدیدا فی دراسۃ شخصیۃ الرسول الکریم ۔

۸۔ مختلف مقامات سے کثرت سے رپورٹ ملی ہے کہ جو لوگ اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں پڑھاتے ہیں وہ بچوں کے خارجی مطالعہ کے لیے الرسالہ انگریزی کو پسند کر رہے ہیں ۔ کیوں کہ اس میں انھیں یہ موقع ملتا ہے کہ اچھی انگریزی زبان میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کر سکیں ۔ ہر جگہ الرسالہ کے احباب کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں تک الرسالہ انگریزی کو پہنچانے کا انتظام کریں جن کے بچے انگلش اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ الرسالہ انگریزی ایسے لوگوں کے لیے قیمتی اسلامی تحفہ ہے ۔

۹۔ خلیجی ملکوں میں الرسالہ اردو، انگریزی بڑی تعداد میں جاتے ہیں۔ نیز دوسرے مختلف طریقوں سے بھی اس کا پیغام پھیل رہا ہے۔ مثلاً شکیل احمد صاحب انجینیر ایک عرب ملک میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بارہ صفحات کا ایک کتابچہ بھیجا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ الرسالہ کے پیغام کو نئے نئے طریقہ سے پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے سائز پر یہ پمفلٹ تیار کیا ہے۔ اس میں الرسالہ کے صفحہ اول پر شائع ہونے والے چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ ہر صفحہ پر تین مضمون جلی حرفوں میں درج ہے۔ یہ پمفلٹ فوٹو کاپی کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح کے کتابچے تیار کر کے انھوں نے اپنے حلقہ میں لوگوں کے درمیان تقسیم کیے ہیں۔

۱۰۔ آزاد کتاب گھر (جمشید پور) نے اطلاع دی ہے کہ ۱۲ نومبر سے ۲۶ نومبر ۱۹۸۸ تک ٹاٹا کمپنی کے تعاون سے رابندر بھون جمشید پور میں بک فیر ہوئی جس میں ان کا واحد اردو کتابوں کا اسٹال تھا۔ اس موقع پر انھوں نے اسلامی مرکز کی اردو اور انگریزی کتابیں بک فیر میں رکھیں جن کو مسلم اور غیر مسلم دونوں نے بڑے اشتیاق اور دل چسپی سے مطالعہ کیا اور کتابیں حاصل کیں۔ لوگوں کی طرف سے کافی مانگ تھی۔

۱۱۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے اخبارات و رسائل ہیں جو برابر الرسالہ کے مضامین نقل کرتے ہیں۔ مثلاً بمبئی کا نقشِ کوکن، بنگلور کا سالار، لاہور کا وفاق، لاہور کا اشراق، بمبئی کا اردو ٹائمز، وغیرہ۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام مختلف حلقوں میں مسلسل پہنچ رہا ہے۔

۱۲۔ لیسسٹر (انگلینڈ) سے ایک سہ ماہی مجلہ شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے :

Index of Islamic literature

یہ مجلہ ورلڈ کونسل فار اسلامک ریسرچ (لکسمبرگ) کے تعاون سے شائع ہوتا ہے اور اس میں انگریزی زبان میں شائع ہونے والے لٹریچر کی فہرست دی جاتی ہے۔ اس مجلہ کی جلد ۹ نمبر ۲ (۱۹۸۹) میں صفحہ ۷ پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتاب گاڈ ارائزز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مجلہ ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ انگلینڈ میں چھاپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۹ اپریل ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

اہلِ بیت

قرآن کی سورہ الاحزاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تمہارا معاملہ عام انسانوں جیسا نہیں ہے۔ تمہارے گھر وہ ہیں جہاں اللہ کی آیتوں کی اور حکمت کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے تمہیں اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

وقرنَ فی بیوتکنّ ولا تبرّجن تبرُّج الجاهلیۃِ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ وآتین الزکوٰۃ واطعنَ اللّٰہ ورسولَہ انما یُرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (الاحزاب ۳۳)

(اے پیغمبر کی بیویو) تم اپنے گھر میں قرار سے رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح دکھلاتی نہ پھرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کردے۔

اس آیت میں اہلِ بیت سے مراد عام طور پر اہل بیت رسول لیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ غیر ضروری بحث چھیڑ دی جاتی ہے کہ اس سے مراد پیغمبر کی بیویاں ہیں یا فاطمہ کی اولاد۔ یہ بحثیں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ آیت کو صرف خاندانی معنوں میں لیا گیا ہے۔ حالاں کہ اس سے مراد محدود نسلی معنی میں صرف خاندانِ نبوّت نہیں، بلکہ وسیع تر معنی میں خاندانِ دعوت ہے۔ "پیغمبر کے گھر والے" کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، "داعیٔ حق کے گھر والے" ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کے ابتدائی اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہاں اہل بیت کا مطلب اہلِ بیتِ رسول ہی ہے۔ مگر قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہری مفہوم ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی مفہوم (لکل آیۃ منھا ظھر وبطن) اس اصول کے مطابق، مذکورہ آیت میں ظاہری طور پر اگرچہ اہلِ بیت رسول کا ذکر ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ جو شخص لوگوں کے درمیان حق کا داعی بن کر کھڑا ہو، اس کے گھر کا طرز زندگی (Life-style) دوسروں سے مختلف ہونا چاہیے۔ اگر اس کا طرز زندگی دوسروں سے ممتاز نہ ہو تو لوگ اس کے دعوتی امتیاز کو بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ وہ لوگوں کے درمیان داعی کا مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

مذہبی آزادی

ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب اشاعت اسلام (The Preaching of Islam) میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المامون (۸۱۳ - ۸۳۳) نے سنا کہ اسلام کے مخالفین یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام اپنی دلیل کی طاقت سے کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ اپنی تلوار کی طاقت سے کامیاب ہوا ہے۔ اس نے دور دور کے ملکوں میں پیغام بھیج کر ہر مذہب کے اہل علم کو بغداد میں جمع کیا اور پھر مسلم علمار کو بلا کر دونوں کو ایک عظیم الشان اجتماع میں بحث و مناظرہ کی دعوت دی۔ اس علمی مقابلہ میں علمار اسلام کامیاب ہوئے اور غیر مسلم اہل علم نے بر سر عام اسلام کی استدلالی عظمت کا اعتراف کیا (صفحہ ۸۶)

آرنلڈ نے لکھا ہے کہ خلیفہ المامون اسلام کی اشاعت کے معاملہ میں بہت زیادہ پُرجوش (Very zealous) تھا۔ اس کے باوجود اس نے کبھی اپنی سیاسی طاقت کو تبلیغِ اسلام کے لیے استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو جبراً مسلمان بنایا۔

بغداد کے مذکورہ بین مذاہب اجتماع میں دوسرے مذاہب کے جو اہل علم شریک ہوئے، ان میں ایک یزداں بخت تھا۔ وہ مانی فرقہ (Manichaean sect) سے تعلق رکھتا تھا اور ایران سے آیا تھا۔ یزداں بخت نے مسلم علمار کی باتیں سنیں تو وہ اسلام کی استدلالی طاقت سے مرعوب ہو گیا۔ اس نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی۔

اجتماع کے بعد المامون نے اس کو دربار میں بلایا اور اس سے کہا کہ اب تم کو اسلام قبول کر لینا چاہیے۔ یزداں بخت نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا : امیر المومنین، میں نے آپ کی بات سنی اور آپ کے مشورہ کو جانا۔ مگر آپ تو وہ شخص ہیں جو کسی کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتے اور جبراً کسی کو مسلمان نہیں بناتے۔ یزداں بخت کے انکار کے بعد المامون نے اپنی بات واپس لے لی۔ اور جب یزداں بخت بغداد سے اپنے وطن واپس جانے لگا تو اس نے مسلح محافظ یزداں بخت کے ساتھ کر دیا تاکہ جذبات سے بھرے ہوئے مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ (صفحہ ۵۶)

اسلام میں ہر فکر کی آزادی ہے اور اسی کے ساتھ ہر منکر والے کا احترام بھی۔

غریبی کا سبب

ٹائمس آف انڈیا نے سوسائٹی کے نام سے ایک ضمیمہ (نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۸) شائع کیا ہے۔ اس میں ٹائمس آف انڈیا (۴ دسمبر ۱۸۸۰) کی ایک خبر نقل کی گئی ہے۔ اس وقت ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ایک انگریز افسر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W. W. Hunter) نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ہندستان ایک بنیادی مسئلہ سے دوچار ہے۔ اور وہ عوام کی غربت (Poverty of the people) کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہندستان جو کسی وقت اتنا زیادہ دولت مند ملک سمجھا جاتا تھا، اب وہ اتنا غریب کیوں ہو گیا :

How comes it that India was once held to be so rich and now proves to be so poor? (p. 34).

تاریخ بتاتی ہے کہ ہندستان، مسلم حکومت کے دور میں نہایت خوش حال تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں پہلی بار وہ غریب ہوا، اور آزادی کے بعد ملکی حکومت کے زمانہ میں بھی وہ غریب ہے، بلکہ اب اس کی غربت میں ہمیشہ سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم مسلم حکمرانوں نے ملک سے جو دولت حاصل کی۔ اس کو انھوں نے ملک کے اندر ہی خرچ کیا۔ اس طرح دولت کی گردش ملک کے اندر ہوتی رہی۔ انگریزوں نے یہ کیا کہ ملک کی دولت کو یہاں سے نکال کر انگلینڈ لے گئے۔ اس طرح دولت کی گردش اندر سے باہر کی طرف ہونے لگی۔ یہی اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ہندستان مسلم عہد میں خوش حال تھا اور انگریزی عہد میں وہ بدحال ہو گیا۔

دولت کی الٹی گردش کا یہی عمل "آزاد ہندستان" میں بھی بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ ہندستان کے دیسی حکمراں اور یہاں کے بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار مختلف طریقوں سے ملک کی دولت باہر لے جا کر یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں جمع کر رہے ہیں، اسی کے ساتھ اسمگلنگ کا کاروبار جو موجودہ ہندستان کا سب سے بڑا کاروبار ہے، وہ ملک کی بے شمار دولت کو بیرونی ملکوں میں پہنچا رہا ہے۔ اس طرح جو دولت باہر جا رہی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں بھی شاید اتنی زیادہ دولت باہر نہیں بھیجی۔

ہنسنا اور رونا

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جنوری ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر ایک روتے ہوئے آدمی کی تصویر ہے۔ یہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن ہیں جو بے اختیار رو رہے ہیں اور ہاتھ میں رومال لیے ہوئے اپنے آنسوؤں کو پونچھ رہے ہیں۔ یہ ۱۸ جنوری ۱۹۸۹ کی تصویر ہے جب کہ وہ اپنے ۸ سالہ دور حکومت کو ختم کرکے واشنگٹن کے صدارتی محل (وہائٹ ہاؤس) سے واپس جا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ جنوری ۱۹۸۹) کا صفحہ اول دیکھیں تو اس میں آپ کو ایک شخص کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آئے گا۔ یہ جارج بش ہیں جو اسی دن امریکہ کے ۴۱ ویں منتخب صدر کی حیثیت سے واشنگٹن کے وہائٹ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ایک ہی عمارت ہے۔ مگر ایک آدمی اس سے روتا ہوا نکل رہا ہے اور دوسرا آدمی اس میں ہنستا ہوا داخل ہو رہا ہے۔

یہ دو آدمیوں کی شکل میں ہر آدمی کی تصویر ہے۔ لوگ دنیا کی کامیابی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ اس کو پا کر ہنستے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ "آٹھ سال" بعد یہ کامیابی ان کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ اسی طرح جو لوگ اپنی کامیابی سے محروم ہوتے ہیں، وہ روتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ آٹھ سالہ کامیابی کے آگے ان کے لیے ابدی کامیابی کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے، بشرطیکہ وہ اس ابدی کامیابی کے لیے وہی محنت کریں جو انھوں نے آٹھ سالہ کامیابی کے لیے کی تھی۔

موجودہ دنیا میں انسان کا ہنسنا اور اس کا رونا دونوں ہی بے معنی ہیں۔ کیوں کہ اس کا ہنسنا بھی غیر حقیقی چیز کے لیے ہے اور اس کا رونا بھی غیر حقیقی چیز کے لیے۔ اس دنیا کی یافت اور محرومی دونوں ہی بالکل غیر حقیقی ہیں۔ اور جب دونوں غیر حقیقی ہیں تو ان کے پانے یا ان کے کھونے پر انسان کا ردعمل بھی اس کے مطابق ہونا چاہیے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ حقیقی چیز کو اپنا مقصود بنائے، وہ آخرت کی ابدی کامیابی کے لیے عمل کرے۔ جو لوگ ایسا کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو ہنسنے والے دن ہنسیں گے۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، ان کے لیے صرف ایک انجام مقدر ہے ——— دنیا میں بھی رونا اور آخرت میں بھی رونا۔

تعدّدِ ازواج

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں جو احکام دیئے گیے ہیں، ان میں سے ایک حکم وہ ہے جو
[ازواج (چار عورتوں تک نکاح کرنے) کے بارہ میں ہے۔ اس سلسلہ میں آیت کے الفاظ یہ ہیں:

[وان] خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا [ما ط]اب لکم من النساء مثنی وثلاث و [رب]اع فان خفتم الا تعدلوا فواحدة (النساء ۳)

اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو (بیوہ) عورتوں میں جو تم کو پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔

یہ آیت غزوۂ احد (شوال ۳ ھ) کے بعد اتری۔ اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس جنگ میں ۷۰ مسلمان [شہ]ید ہو گیے تھے۔ اس کی وجہ سے مدینہ کی بستی میں اچانک ۷۰ گھر مردوں سے خالی ہو گیے۔ نتیجۃً یہ صورت حال [پید]ا ہوئی کہ وہاں بہت سے بچے یتیم اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس [مع]اشرتی مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ اس وقت قرآن میں مذکورہ آیت اتری اور کہا گیا کہ جو لوگ استطاعت [ر]کھتے ہوں وہ بیوہ عورتوں سے نکاح کر کے یتیم بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیں۔

اپنے الفاظ اور اپنے شانِ نزول کے اعتبار سے بظاہر یہ ایک وقتی حکم نظر آتا ہے۔ یعنی اس کا [تع]لق اس صورت حال سے ہے جب کہ جنگ کے نتیجہ میں آبادی کے اندر عورتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی اور [م]ردوں کی تعداد کم۔ مگر قرآن اپنے نزول کے اعتبار سے زمانی ہونے کے باوجود، اپنے اطلاق کے اعتبار سے [ا]یک ابدی کتاب ہے۔ قرآن کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زمانی زبان میں ابدی حقیقت بیان [ک]رتا ہے۔ اس کا یہ حکم بھی اس کی اسی صفتِ خاص کا مظہر ہے۔

زیادہ شادی کا معاملہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر نہیں، اس کی لازمی شرط (Inescapable condition) یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ عورتیں بھی موجود ہوں۔ اگر زمین پر ایک ہزار ملین انسان بستے ہوں، اور ان میں ۵۰۰ ملین مرد ہوں اور ۵۰۰ ملین عورتیں، تو ایسی حالت میں مردوں کے لیے ممکن ہی نہ ہوگا کہ وہ ایک سے زیادہ نکاح کریں۔ ایسی حالت میں ایک سے زیادہ نکاح صرف جبراً کیا جا سکتا ہے، اور جبری نکاح

اسلام میں جائز نہیں ۔ اسلامی شریعت میں نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ہر حال میں ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اس طرح عملی طور پر دیکھئے تو قرآن کے مذکورہ حکم کی تعمیل صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ سماج میں وہ مخصوص صورت حال پائی جائے جو احد کی جنگ کے بعد مدینہ میں پائی جارہی تھی ، یعنی مردوں اور عورتوں کی تعداد میں نابرابری ۔ اگر یہ صورتِ حال نہ پائی جارہی ہو تو قرآن کا حکم عملاً ناقابل نفاذ ہوگا ۔ مگر انسانی سماج اور انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم مدینہ کی صورت حال محض وقتی صورت حال نہ تھی ، یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جو اکثر حالات میں زمین پر موجود رہتی ہے ۔ مذکورہ ہنگامی حالت ہی ہماری دنیا کی عمومی حالت ہے ۔ یہ قرآن کے مصنف کے عالم الغیب ہونے کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ایک ایسا حکم دیا جو بظاہر ایک ہنگامی حکم تھا ، مگر وہ ہماری دنیا کے لیے ایک ابدی حکم بن گیا ۔

تعداد کی نابرابری

اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ باعتبار پیدائش عورت اور مرد کی تعداد تقریباً یکساں ہوتی ہے ۔ یعنی جتنے بچے ، تقریباً اتنی ہی بچیاں ۔ مگر شرح اموات (Mortality) کے جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے درمیان موت کی شرح زیادہ ہے ۔ یہ فرق بچپن سے لے کر آخر عمر تک جاری رہتا ہے ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مطابق ، عمومی طور پر ، موت کا خطرہ عمر کے ہر مرحلہ میں ، عورتوں کے لیے کم پایا گیا ہے اور مردوں کے لیے زیادہ :

> In general, the risk of death at any given age is less for females than for males (VII/37).

اکثر حالات میں سماج کے اندر عورتوں کی تعداد کا زیادہ ہونا اور مردوں کی تعداد کا کم ہونا مختلف اسباب سے ہوتا ہے ۔ مثلاً جب جنگ ہوتی ہے تو اس میں زیادہ تر صرف مرد مارے جاتے ہیں ۔ پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں آٹھ ملین سے زیادہ فوجی مارے گئے ۔ شہری لوگ جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں ۔ یہ زیادہ تر مرد تھے ۔ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) میں ساڑھے چھ کروڑ آدمی ہلاک ہوئے یا جسمانی طور پر ناکارہ ہوگئے ۔ یہ سارے لوگ زیادہ تر مرد تھے ۔ عراق ۔ ایران

تک (۱۹۸۸-۱۹۷۹) میں ایران کی ۸۲ ہزار عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ عراق میں ایسی عورتوں کی تعداد تقریباً
یک لاکھ ہے جن کے شوہر اس دس سالہ جنگ میں ہلاک ہوئے۔

اسی طرح مثال کے طور پر جیل اور قید کی وجہ سے بھی سماج میں مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی
تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ امریکہ کو موجودہ زمانہ میں دنیا کی مہذب ترین سوسائٹی کی حیثیت حاصل
ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں ہر روز تقریباً ۱۳ لاکھ (1,300,000) آدمی کسی نہ کسی
جرم میں پکڑے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تعداد وہ ہے جو لمبی مدت تک کے لیے جیل میں ڈال دی
جاتی ہے۔ ان سزا یافتہ قیدیوں میں دوبارہ ۹۷ فی صد مرد ہی ہوتے ہیں (EB-14/1102)

اسی طرح جدید صنعتی نظام نے حادثات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حادثاتی
موتیں روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں۔ سڑک کے حادثے، ہوائی حادثے، کارخانوں کے حادثے اور
دوسرے مشینی حادثے ہر ملک میں اور ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ جدید صنعتی دور میں یہ حادثات اتنے
زیادہ بڑھ گیے ہیں کہ اب سیفٹی انجینیرنگ (Safety engineering) کے نام سے ایک مستقل فن وجود
میں آگیا ہے۔ ۱۹۶۷ کے اعداد و شمار کے مطابق، اس ایک سال میں پچاس ملکوں کے اندر مجموعی طور پر
۱۵۰۰۰۰ حادثاتی موتیں واقع ہوئیں (EB-16/137) یہ سب زیادہ تر مرد تھے۔

صنعتی حادثات کی موتوں میں، سیفٹی انجینیرنگ کے باوجود، پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔
مثال کے طور پر، ہوائی حادثات جتنے ۱۹۸۸ میں ہوئے، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح
تمام صنعتی ملکوں میں مستقل طور پر اسلحہ سازی کے تجربات ہو رہے ہیں۔ ان میں برابر لوگ ہلاک ہوتے
رہتے ہیں۔ ان ہلاک شدگان کی تعداد کبھی نہیں بتائی جاتی، تاہم یہ یقینی ہے کہ ان میں بھی تمام تر صرف
مرد ہی ہیں جو ناگہانی موت کا شکار ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مختلف اسباب کی بنا پر عملی صورت حال اکثر یہی ہوتی ہے کہ سماج میں عورتوں
کی تعداد نسبتاً زیادہ ہو، اور مردوں کی تعداد نسبتاً کم ہو جائے۔ امریکہ کی سوسائٹی نہایت ترقی یافتہ سوسائٹی
سمجھی جاتی ہے، مگر وہاں بھی یہ فرق پوری طرح پایا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ کے اعداد و شمار کے مطابق، امریکہ کی
آبادی میں مردوں کے مقابلہ میں تقریباً ۷۸ لاکھ (7.8 million) عورتیں زیادہ تھیں۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ اگر امریکہ کا ہر مرد شادی شدہ ہو جائے تو اس کے بعد بھی امریکہ میں تقریباً ۷۸ لاکھ عورتیں ایسی

باقی رہیں گی جن کے لیے ملک میں غیر شادی شدہ مرد موجود نہ ہوں گے جن سے وہ نکاح کر سکیں۔
دنیا کی آبادی میں مرد اور عورت کی تعداد کے فرق کو بتانے کے لیے یہاں کچھ مغربی ملکوں کے اعداد و شمار دیے جا رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے لیے گیے ہیں:

COUNTRY	MALE	FEMALE
1. Austria	47.07%	52.93%
2. Burma	48.81	51.19
3. Germany	48.02	51.89
4. France	48.99	51.01
5. Italy	48.89	51.11
6. Poland	48.61	51.39
7. Spain	48.94	51.06
8. Switzerland	48.67	51.33
9. Soviet Union	46.59	53 03
10. United States	48.58	51.42

عورت کی رضامندی

ایک سے زیادہ نکاح کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آبادی کے اندر عورتیں زیادہ تعداد میں موجود ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ جس عورت سے نکاح کرنا مطلوب ہے وہ خود بھی اپنی آزادانہ مرضی سے اس قسم کے نکاح کے لیے پوری طرح راضی ہو۔ اسلام میں عورت کی رضامندی مسلمہ طور پر نکاح کے لیے شرط ہے۔ کسی عورت سے زبردستی نکاح کرنا جائز نہیں۔ اسلام کی نمائندہ تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ہے جب کہ کسی مرد کو یہ اجازت دی گئی ہو کہ وہ کسی عورت کو جبراً اپنے نکاح میں لے آئے۔

حدیث میں آیا ہے کہ کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ لے لی جائے (لا تُنکح البکر حتی تستأذن، متفق علیہ) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دیا ہے۔ آپ نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے تو نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو اس کو توڑ دے (عن ابن عباس رض، قال انّ جاریةً بکراً اتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت انّ اباها زوّجها وهی کارهةٌ فخیّرها النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رواہ ابوداؤد)

عن ابن عباسٍ، قال کان زوج بریرة عبداً اسودَ یقال لہ مغیث۔ کانی انظر الیہ یطوف خلفها فی سکك المدینة یبکی ودموعہ تسیل علیٰ لحیتہ۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم للعباس۔ یا عباسُ، الا تعجبُ من حبِّ مغیثٍ بریرةَ ومن بغض بریرة مغیثاً۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو راجعتہ۔ فقالت یا رسول اللہ اتامرنی۔ قال انّما اشفعُ۔ قالتْ لا حاجةَ لی فیہ۔
(رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ بریرہ کا شوہر ایک سیاہ فام غلام تھا۔ اس کا نام مغیث تھا۔ گویا کہ میں مغیث کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ مدینہ کے راستوں میں بریرہ کے پیچھے چل رہا ہے۔ وہ رو رہا ہے اور اس کے آنسو اس کی داڑھی تک بہہ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس سے کہا کہ اے عباس، کیا تم کو بریرہ کے ساتھ مغیث کی محبت اور مغیث کے ساتھ بریرہ کی نفرت پر تعجب نہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے کہا کہ کاش تم اس کی طرف رجوع کر لو۔ بریرہ نے کہا کہ کیا آپ مجھ کو اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے کہا، مجھے اس کی حاجت نہیں۔

تعدد ازواج کا ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں پیش آیا۔ ایک بیوہ خاتون ام ابان بن عتبہ کو چار مسلمانوں کی طرف سے نکاح کا پیغام ملا جو سب کے سب شادی شدہ تھے۔ ان چار حضرات کے نام یہ ہیں۔ عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، زبیر اور طلحہ۔ ام ابان نے طلحہ کا پیغام قبول کر لیا اور بقیہ تینوں کے لیے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ام ابان کا نکاح طلحہ سے کر دیا گیا۔

یہ واقعہ مدینہ (اسلامی دارالسلطنت) میں ہوا۔ جن لوگوں کے پیغام کو رد کیا گیا، ان میں وقت کے امیرالمومنین کا نام بھی شامل تھا۔ مگر اس پر کسی نے تعجب یا بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ اس بنا پر وہاں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام میں عورت کو اپنے بارہ میں فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ عورت کا ایک ایسا حق ہے جس کو کوئی بھی اس سے چھین نہیں سکتا، حتیٰ کہ وقت کا حکمراں بھی نہیں۔

ان احکام اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں چار کی حد تک نکاح کرنے کی

اجازت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی مرد چار عورتوں کو پکڑ کر اپنے گھر میں بند کر لے۔ یہ دوطرفہ رضامندی کا معاملہ ہے۔ وہی عورت کسی شادی شدہ مرد کے نکاح میں لائی جا سکتی ہے جو خود اس کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر بلا اکراہ راضی ہو۔ اور جب یہ معاملہ تمام تر عورت کی رضامندی سے انجام پاتا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق۔ موجودہ زمانہ میں آزادی انتخاب (Freedom of choice) کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسلامی قانون میں یہ قدر پوری طرح موجود ہے۔ البتہ "مساواتِ نسواں" کے علمبردار آزادیٔ انتخاب کو پابندیٔ انتخاب کے ہم معنی بنا دینا چاہتے ہیں۔

مسئلہ کا حل نہ کہ حکم

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت اور مرد کی تعداد میں نابرابری ہماری دنیا کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔ وہ جنگ کی حالت میں بھی پایا جاتا ہے اور جنگ نہ ہونے کی حالت میں بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب دونوں صنفوں کی تعداد میں نابرابری ہے تو اس نابرابری کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ یک زوجگی کے اصول پر عمل کرنے کے نتیجہ میں جن بیوہ یا غیر بیوہ عورتوں کو شوہر نہ ملیں، وہ اپنی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کیا کریں۔ وہ سماج میں کس طرح اپنے لیے ایک باعزت زندگی حاصل کریں۔

ایک طریقہ وہ ہے جو ہندستان کی روایات میں بتایا گیا ہے۔ یعنی ایسی (بیوہ) عورتیں اپنے آپ کو جلا کر اپنے وجود کو ختم کر لیں۔ تاکہ نہ ان کا وجود رہے اور نہ ان کے مسائل۔ یا پھر ایسی عورتیں گھر سے محروم ہو کر سڑکوں کی بے کس زندگی گزارنے پر راضی ہو جائیں۔ اس اصول پر عمل کرنے کی بنا پر ہندو سماج کا کیا حال ہوا ہے، اس کی تفصیل جاننا ہو تو انڈیا ٹوڈے (۱۵ نومبر ۱۹۸۷) کی ۸ صفحات کی باتصویر رپورٹ ملاحظہ فرمائیں جو اس بامعنی عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے کہ بیوائیں، انسانیت کا برباد شدہ ملبہ:

Widows: Wrecks of humanity

اس حل کے بارہ میں یہاں کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ مجھے یہ امید نہیں کہ موجودہ زمانہ میں کوئی باہوش آدمی اس طریقہ کی وکالت کر سکتا ہے یا کسی بھی درجہ میں وہ اس کو مذکورہ مسئلہ کا حل سمجھ سکتا ہے۔

دوسری صورت وہ ہے جو مغربی ملکوں کی "مہذب سوسائٹی" میں رائج ہے۔ یعنی کسی ایک مرد کی

دوسری منکوحہ بیوی بننے پر راضی نہ ہونا، البتہ بہت سے مردوں کی غیر منکوحہ بیوی بن جانا۔

دوسری عالمی جنگ میں یورپ کے کئی ملک لڑائی میں شریک تھے۔ مثلاً جرمنی، فرانس، انگلینڈ وغیرہ۔ ان میں مرد بڑی تعداد میں مارے گئے۔ چنانچہ جنگ کے بعد مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں جنسی بے راہ روی عام ہوگئی۔ یہاں تک کہ بہت سی بے شوہر عورتوں کے گھروں کے سامنے اس قسم کے بورڈ لکھے ہوئے نظر آنے لگے کہ رات گزارنے کے لیے ایک مہمان چاہیے :

Wanted an evening guest

یہ صورت حال مغرب میں جنگ کے بعد بھی مختلف صورتوں میں بدستور باقی ہے۔ اب اس کو باقی رکھنے کا سبب زیادہ تر صنعتی اور مشینی حادثات ہیں جس کی تفصیل اوپر درج کی گئی۔

غیر قانونی تعدد ازواج

جن قوموں میں تعدد ازواج کو ناپسند کیا جاتا ہے، ان کو اس کی یہ قیمت دینی پڑی کہ ان کے یہاں اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ایک چیز رائج ہوگئی جس کو مسٹریس (Mistress) کہا جاتا ہے۔ ان قوموں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس فطری عمل کو روک سکیں جس کے نتیجہ میں اکثر معاشرہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ اور مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ ایک طرف آبادی کے تناسب میں یہ فرق اور دوسری طرف تعدد ازواج پر پابندی، اس دوطرفہ مسئلہ نے ان کے یہاں مسٹریس کی برائی (بالفاظ دیگر غیر قانونی تعدد ازواج) کو پیدا کر دیا۔

مسٹریس (Mistress) کی تعریف ویبسٹرس ڈکشنری (Webster's Dictionary) میں یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو کسی مرد سے جنسی تعلق رکھے، اس کے بغیر کہ اس سے اس کا نکاح ہوا ہو :

> A woman who has sexual intercourse with and, often, is supported by a man for a more or less extended period of time without being married to him; paramour.

مسٹریس کا یہ طریقہ آج، بشمول ہندستان، تمام ان ملکوں میں رائج ہے جہاں تعدد ازواج پر قانونی پابندی ہے یا سماجی طور پر اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے

کہ تعدد ازدواج کو اختیار کیا جائے یا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آبادی میں عورتوں کی غیر متناسب تعداد کو کھپانے کے لیے قانونی تعدد ازدواج کا طریقہ اختیار کیا جائے یا غیر قانونی تعدد ازدواج کا۔

اسلامی طریقہ

اس کے بعد وہ طریقہ ہے جو اسلامی شریعت میں اس مسئلہ کے حل کے لیے بتایا گیا ہے۔ یعنی مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ مردوں کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت۔ تعدد ازدواج کا یہ اصول جو اسلامی شریعت میں مقرر کیا گیا ہے، وہ دراصل عورتوں کو مذکورہ بالا قسم کے بھیانک انجام سے بچانے کے لیے ہے۔ بظاہر اگرچہ یہ ایک عام حکم ہے، لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھیے کہ عملی طور پر کوئی عورت کسی مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر ہنگامی حالات ہی میں راضی ہو سکتی ہے نہ کہ معمول کے حالات میں، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ حکم دراصل ایک سماجی مسئلہ کے حل کے طور پر وضع کیا گیا ہے۔ وہ فاضل عورتوں کو جنسی آوارگی سے بچا کر معقول اور مستحکم خاندانی زندگی گزارنے کا ایک انتظام ہے۔ بالفاظ دیگر یہ یک زوجگی کے مقابلہ میں تعدد ازدواج کو اختیار کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ تعدد ازدواج اور جنسی بربادی کے درمیان انتخاب کا مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں تعدد ازدواج کو اختیار کرنا ہے۔

تعدد ازدواج کے حکم کو اگر مجرد طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک ایسا حکم معلوم ہوگا جو مردوں کی موافقت میں بنایا گیا ہو۔ لیکن اگر اس کو سماج کی عملی صورت حال کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ خود عورتوں کی موافقت میں ہے۔ وہ عورتوں کے مسئلہ کا ایک زیادہ معقول اور فطری بندوبست (Arrangement) ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک مسئلہ کو حل کرنے کی عملی تدبیر ہے۔ مردوں کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ آبادی میں مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ تعداد میں پائی جا رہی ہوں۔ اگر عورتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ نہ ہو تو اس حکم پر عمل کرنا سرے سے ممکن نہ ہوگا۔ پھر کیا اسلام مردوں کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک ایسا اصول بتا سکتا ہے جو سرے سے قابل حصول اور قابل عمل ہی نہ ہو۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تعدد ازدواج کے اصول کو اختیار

کرنے کی ایک وجہ جنسی تناسب میں عورتوں کی زیادتی (Surplus of women) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں تعدد ازدواج کی اجازت دیتی ہیں یا اس کو پسند کرتی ہیں، ان میں بھی مردوں کی بہت بڑی اکثریت فاضل عورتوں کی محدود تعداد کی وجہ سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتی ہے:

Among most peoples who permit or prefer it, the large majority of men live in monogamy because of the limited number of women (VIII/97).

اسلام میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت بطور آئیڈیل نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ایک عملی ضرورت (Practical reason) کی وجہ سے ہے، اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آبادی میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس زیادہ تعداد کے باعزت حل کے لیے تعدد ازدواج کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ایک عملی حل ہے نہ کہ نظریاتی آئیڈیل۔

خلاصۂ کلام

اوپر جو بحث کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت اگرچہ یکساں تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر بعد کو پیش آنے والے مختلف اسباب کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاشرہ میں مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور عورتوں کی تعداد زیادہ۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ جنسی نابرابری کی ناگزیر صورت حال میں دونوں جنسوں کے درمیان صحت مند تعلق کس طرح قائم کیا جائے۔

یک زوجگی (ایک مرد، ایک عورت) کے اصولِ نکاح پر عمل کرنے کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی عورتیں باقی رہتی ہیں جن کے لیے معاشرہ میں ایسے مرد موجود نہ ہوں جن سے وہ نکاح کا تعلق قائم کرکے باعزت زندگی گزار سکیں۔ یک زوجگی کا مطلق اصول کسی کو بظاہر خوشنما نظر آسکتا ہے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں وہ پوری طرح قابل عمل نہیں۔ گویا ہمارے لیے انتخاب (Choice) ایک زوجہ اور متعدد زوجہ کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ خود متعدد زوجہ کی ایک قسم اور دوسری قسم کے درمیان ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ یہ "فاضل" عورتیں جنسی آوارگی یا معاشرتی بربادی کے لیے چھوڑ دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے ایسے مردوں کے ساتھ

ازدواجی رشتہ میں وابستہ ہو جائیں جو ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ عدل کر سکتے ہوں۔

مذکورہ بالا دو ممکن صورتوں میں سے اسلام نے دوسری صورت کا انتخاب کیا ہے۔ اور غیر اسلام نے پہلی صورت کا۔ اب ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ دونوں میں سے کون سا طریقہ زیادہ باعزت اور زیادہ معقول ہے۔

ایک سفر

صنعاء (یمن) جنوبی عرب کا ایک تاریخی شہر ہے جو دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں شمار ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں، وہ اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک قابل دید شہر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کا شعر ہے کہ صنعاء ضرور جانا چاہیے، خواہ اس کے لیے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے:

لابدّ من صنعاء وان طال السفر

صنعاء میں ۲۹ اکتوبر — ۲ نومبر ۱۹۸۸ کو ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا اہتمام یمن کی وزارت اوقاف نے کیا تھا۔ کانفرنس کی دعوت پر اس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

بیرونی سفر میں سب سے پہلا مرحلہ ویزا کا ہوتا ہے۔ میرے پاسپورٹ پر یمن کا ویزا لگ کر آیا تو معلوم ہوا کہ صفحات کے اعتبار سے یہ اس کا آخری ویزا تھا۔ اب اس پاسپورٹ میں مزید اندراج کی گنجائش نہیں۔ گویا باعتبار ضخامت وہ اکتوبر ۱۹۸۸ میں ختم ہو گیا، جب کہ باعتبار مدت اس کی تاریخ فروری ۱۹۸۹ تک باقی تھی۔ اسی طرح زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے حوصلے زیادہ ہوتے ہیں، مگر وسائل اس کی نسبت سے کم ہوتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ وسائل کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے لیے زندگی کا راستہ نکالے۔ پاسپورٹ کی تاریخ زیادہ ہو تب بھی وہ اس وقت سفر کے لیے بیکار ہے جب کہ اس کے صفحات کی مقدار ختم ہو گئی ہو۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کی شام کو ۸ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد آجکل کے معاشرہ کے بارہ میں سوچتے ہوئے میری زبان سے نکلا: آہ، کوئی آدمی آدمی نہیں، ہر آدمی غیر آدمی ہے۔ ایرپورٹ پہونچ کر اندر داخل ہوا تو ایرپورٹ کے عملہ کے دو آدمی اپنے افسر کے کسی حکم کے بارہ میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "پھر کیا پرابلم ہے" دوسرا شخص بولا: "پرابلم کیا ہے، جو افسر کہے گا وہی کرنا ہوگا"

میں نے سوچا کہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ اس کو افسر کے کہے پر چلنا ہے۔ مگر انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اس کو خدا کے کہے پر چلنا ہے۔ آج کا انسان خدا کی ماتحتی قبول کرنے کے

لیے تیار نہیں۔ حتی کہ وہ لوگ بھی نہیں جو خدا کا جھنڈا اٹھانے ہی کو اپنا مشغلہ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ افسر کے معاملہ میں انسان کا حال یہ ہے کہ "پرابلم" ہو تب بھی وہ اس کی اطاعت کرتا ہے مگر خدا کے معاملہ میں صورت حال اس کے برعکس ہے ——— اگر پرابلم نہ ہو تو وہ خدا کے حکم کو مانے گا۔ اور اگر پرابلم پیش آجائے تو وہ خدا کے حکم کو ماننے سے انکار کر دے گا۔

دہلی سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کی فلائٹ ۲۷۳ کے ذریعہ ہوا۔ جہاز کے کیپٹن ضیاء الاسلام تھے۔ پی آئی اے کے جہاز کی صفائی اور اس کا انتظامی معیار انڈین ایرلائنز سے بہتر نظر آیا۔ پی آئی اے کے میگزین (ہم سفر) کے سرورق پر عالمی معیار کے مطابق (Your personal copy) لکھا ہوا تھا۔ جب کہ انڈین ایرلائنز کے میگزین نمسکار پر اس قسم کا اندراج نہیں ہوتا۔ البتہ ایک چیز دونوں میں مشترک تھی۔ نمسکار میں انگریزی کے ساتھ ہندی مضامین کا حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم سفر میں انگریزی کے ساتھ اردو کا۔ مگر دونوں میں انگریزی زبان کا حصہ زیادہ تھا اور اپنی قومی زبان کا حصہ اس کے مقابلہ میں کم۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی برتری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مگر عین اسی وقت وہ بیرونی تہذیب کی برتری کو فخر کے ساتھ قبول کیے ہوئے ہیں۔

جہاز اپنے ٹھیک وقت پر ۱۰ بج کر ۳۰ منٹ پر روانہ ہوا۔ تاہم اس کی بیشتر سیٹیں خالی تھیں۔ اس قسم کے مسافر جہازوں کو تجارتی پرواز (کمرشیل فلائٹ) کہا جاتا ہے۔ مگر دنیا بھر میں اڑنے والے جہازوں کی بہت بڑی تعداد عملاً نان کمرشیل فلائٹ ہوتی ہے۔ یہ دراصل ان پروازوں کا بالواسطہ فائدہ ہے جس کی وجہ سے انھیں جاری رکھا گیا ہے۔ اس دنیا میں اکثر کسی کام کو اس کے بالواسطہ فائدے کی خاطر کرنا پڑتا ہے، خواہ بظاہر اس سے کوئی براہ راست فائدہ حاصل نہ ہو رہا ہو۔

کراچی سے صنعار کا سفر یمن ایرلائنز کی فلائٹ ۷۵۵ کے ذریعہ ہوا۔ راستہ میں خلیج ٹائمز (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸) پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ انگریزی روزنامہ دوبئی سے نکلتا ہے۔ اس میں ایک ہندستانی مسلمان (مقیم راس الخیمہ) کا مضمون تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ قیادت کے فقدان (Lack of leadership) کا مسئلہ ہے۔

مگر میرے نزدیک یہ ادھوری بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ مخصوص اسباب کی بنا پر ہندستان کے مسلمانوں کی نفسیات کچھ اس طرح کی ہوگئی ہے کہ لفظی جوش دکھانے والے سطحی لیڈروں کی باتیں ہی ان کو اپیل کرتی ہیں جو مسلمانوں کو بربادی کے سوا کہیں اور نہ لے جا سکیں۔ اس کے مقابلہ میں جو رہنما سنجیدہ اور تعمیری بات کریں وہ مسلم عوام کے درمیان مقبولیت حاصل نہیں کرتے مسلمانوں کی یہی بے شعوری ان کا اصل مسئلہ ہے، ہندستان میں بھی اور دوسرے ملکوں میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ فقدانِ شعور ہے نہ کہ فقدانِ قیادت۔

کراچی سے یمن کے سفر میں جہاز کے اندر ایک عرب مسافر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ کویت کا عربی اخبار الانباء (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) تھا۔ اس کے آخری صفحہ پر خالد قطمہ کے قلم سے ایک دلچسپ مضمون درج تھا جس کا عنوان تھا وَلَوْ (اور اگر)۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ عرب ممالک کے ہوائی اڈوں پر "مخدرات" سے بھی زیادہ جس چیز کی جانچ ہوتی ہے اور جس کو عرب امن اور مقاصد امت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار (اخطر سلاح) سمجھا جاتا ہے وہ "کتاب" ہے۔ اگر آپ کسی ہوائی اڈہ سے گزریں تو جانچ والا آدمی آپ کے حقیبہ کو کھولے گا اور اس کو ٹٹول کر دیکھے گا۔ اگر وہ اس میں کوئی کتاب پا گیا تو وہ اس کو اس طرح لے گا جیسے کہ اس نے کوئی ٹائم بم دیکھ لیا ہو (کأنہ شاهد قنبلة موقوتة) اس کے بعد آپ نہایت بے چارگی کے ساتھ اس کے فیصلہ کا انتظار کریں گے کہ وہ آپ کی کتاب کو ممنوع الدخول قرار دیتا ہے یا آپ اور آپ کی کتاب دونوں کو۔

مضمون نگار نے اپنا بخار نظام (حکومت) پر اتارا تھا۔ مگر میرے نزدیک اس کی ساری ذمہ داری ان نام نہاد مسلم مفکرین پر ہے جنھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر کرکے اسلامی دعوت کو سیاسی انقلاب کے ہم معنی بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں کے حکمراں اب "اسلامی دعوت" کا نام لینے والوں کو سیاسی اپوزیشن کے طور پر دیکھتے ہیں اور خطرہ سمجھ کر فوراً انھیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلم مفکرین کی اس خود ساختہ تشریح نے اب مسلم ملکوں میں اسلام کا کام کرنے کو بڑی حد تک ناممکن بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اگر غیر سیاسی اسلام پیش کرتے جس کی ایک مثال تبلیغی جماعت کی صورت میں نظر آتی ہے تو مسلم داعی کو مسلم ملکوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور کام کے تمام

بہترین مواقع اسی کو حاصل رہتے۔ مگر ان کے "سیاسی اسلام" نے خود اپنی ہی دنیا کو اسلام کے لیے ایک قسم کا قید خانہ بنا دیا ہے۔

صنعار (یمن) کے ہوائی اڈہ پر اترا تو ۲۱ اکتوبر کا سورج نکل رہا تھا۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کاؤنٹر پر ضروری اندراجات کرانے کے بعد میں عام گیٹ سے باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کانفرنس کا کوئی آدمی میری رہنمائی کرنے اور ساتھ لے جانے کے لیے موجود نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں پولیس (شُرطہ) کے دفتر میں گیا۔ صنعار کے روزنامہ الشورة (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول پر مذکورہ کانفرنس کے افتتاح (۲۹ اکتوبر) کی روداد نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ یہ افتتاح یہاں کے صدر (رئیس) علی عبداللہ الصالح نے کیا تھا۔ اس اخبار کو میں نے پولیس افسر کو دکھایا اور کہا کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ مگر یہاں کوئی شخص مجھے رسیو کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک صاحب مجھے تلاش کرتے ہوئے پولیس کے دفتر میں آگیے۔

یہ عبدالرحمٰن اسماعیل الشیبی (مدیر الحج والمؤتمرات) تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم گاڑی لے کر وی آئی پی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ روانہ ہو کر مذکورہ مقام پر پہنچا۔ اور ان کے ساتھ ہوٹل تک آیا۔

اس واقعہ کے بعد دل بھر آیا۔ دنیا کے اس تجربہ سے میرا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا: کیسا عجیب ہوگا اگر آخرت میں ایسا ہو کہ میں اپنے احساسِ عجز اور احساسِ تقصیر کے تحت عام دروازہ سے گردن جھکا کر نکل رہا ہوں۔ اس وقت فرشتے میرے پاس آئیں اور کہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ——— میرے بندے کو ادھر لے آؤ اور اس کو خاص دروازہ سے نکالو، ہم نے یہاں اس کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا ہے۔

صنعار میں میرا قیام شیراٹن ہوٹل (کمرہ ۲۳۰) میں تھا۔ یہ ہوٹل پہاڑی سے متصل ہے۔ اس میں ایک نئی چیز یہ دیکھی کہ عام ہوٹلوں میں رسپشن گراؤنڈ فلور پر ہوتا ہے۔ مگر اس ہوٹل میں رسپشن چھٹی منزل پر تھا۔ اس کی نیچے کی منزلیں ایک طرف پہاڑ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ چھٹی منزل پر زمین کی سطح ملتی تھی، چنانچہ چھٹی منزل پر رسپشن اور آمد و رفت کے راستے بنائے گیے تھے۔ ہوٹل کے اس نظام کو دیکھ کر دل نے کہا: اس دنیا میں کبھی نیچے سے راستہ نکالنا ہوتا ہے اور کبھی اوپر

ہے۔ اس "فرق" کو جاننے ہی میں زندگی کی تمام بڑی بڑی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں ایک فولڈر تھا۔ اس کا عنوان تھا : ضیفنا الکریم (Dear guest) اس میں بہت سے سوالات تھے اور "مہمان" سے گذارش کی گئی تھی کہ جب وہ ہوٹل سے جانے لگے تو اس کو بھر کر استقبالیہ میں چھوڑ دے۔ ان سوالات کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ نے اپنے تجربہ میں ہمارے ہوٹل کو کیسا پایا۔ ہمارے عملہ کی کارکردگی، ہمارے کمروں کا انتظام، ہماری سروس وغیرہ کے بارہ میں جو تجربات آپ پر گزرے ہوں ان کو سوالات کے آگے تحریر کردیں۔ اسی فولڈر کا ایک حصہ موظفونا وعمالنا (Our people) عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے پوچھا گیا تھا کہ ہمارے ہوٹل کے عملہ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا :

Gave you a friendly greeting upon arrival
Were courteous and helpful at the front desk
Smiled and greeted you each time they saw you
Performed their jobs quickly and efficiently
Were enthusiastic about their jobs
Took personal responsibility to answer your questions
Helped you without being asked, anticipated your needs
Took personal responsibility to resolve your problems
Were friendly and hospitable
Showed that they wanted you to come back
Overall, how well did our people perform?

اس کو پڑھ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ میں نے سوچا کہ دنیا کے فائدے کے لیے آدمی کتنا زیادہ اہتمام کرتا ہے، مگر آخرت کے فائدے کے لیے لوگ کسی اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دکاندار اور گاہک کا جو رشتہ ہے، وہی اخروی طور پر داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر آج کوئی داعی نہیں جو اپنے مدعو کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے جو ہوٹل کا مالک اپنے گاہکوں کے ساتھ کر رہا ہے۔

دل نے کہا : لوگ اپنی دنیا کی خاطر لوگوں سے مسکرا رہے ہیں۔ مگر خدا کی خاطر لوگوں سے مسکرانے والا کوئی نہیں۔ دکاندار اپنے گاہک کا استقبال کرنے کے لیے بے قرار ہے مگر داعی کو اپنے مدعو کا استقبال کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دنیا کی اقوام سے مسلمانوں کا یہی غیر داعیانہ سلوک ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ مسلمان جب تک اس معاملہ میں اپنی اصلاح نہ کریں، وہ خدا کی رحمتوں

کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ خدا اسی شخص کا مسکرا کر استقبال کرتا ہے جس نے خدا کی خاطر اس کے بندوں کا مسکرا کر استقبال کیا ہو۔

کئی منزلہ عمارتوں میں ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں اس میں رہنے والے لوگوں کو کس طرح بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے اونچی عمارتوں میں مختلف قسم کی ضروری ہدایات جگہ جگہ درج ہوتی ہیں۔ ہوٹل میں ایک جگہ یہ ہدایت لکھی ہوئی نظر آئی:

فی حالة نشوب الحريق عليك استعمال السلم وعدم استعمال المصعد

یعنی اگر عمارت میں آگ لگ جائے تو عمارت سے نکل کر باہر جانے کے لیے لفٹ (Elevator) استعمال نہ کریں بلکہ سیڑھیوں کے ذریعہ اتریں۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے ہے کہ عمارت میں آگ لگنے کی صورت میں بجلی فیل ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں آدمی اگر لفٹ کے اندر داخل ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو آگ کے قید خانہ میں بند کرلے گا۔ اس کے بعد اس کے زندہ بچنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جائے گی۔

لفٹ عام حالت میں تیزی کے ساتھ چڑھنے اترنے کا ذریعہ ہے۔ مگر عمارت میں آگ لگنے کی صورت میں معاملہ الٹا ہو جاتا ہے۔ اب آدمی کے لیے تیز رفتار ذریعہ کے مقابلہ میں سست رفتار ذریعہ زیادہ کارآمد بن جاتا ہے ــــــ تیز سفر بظاہر بہت اچھی چیز ہے۔ مگر بعض اوقات تیز سفر موت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور سست سفر زندگی کا ذریعہ۔

یمن اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی یمن اور شمالی یمن۔ جنوبی یمن پر مارکسی ذہن رکھنے والوں کا قبضہ ہے۔ مگر شمالی یمن میں اسلامی فکر کے لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ میرا سفر شمالی یمن میں ہوا۔ ایک صاحب نے میری عربی کتابوں کی فہرست مانگی۔ فہرست بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ "ایک کتاب کا نام سقوط المارکسية ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ کے یہاں پسند کی جائے گی یا نہیں"۔ انھوں نے فوراً کہا کہ مارکسی حکومت جنوبی یمن میں ہے۔ ہمارے یہاں (شمالی یمن میں) اسلامی شورائی نظام ہے (الحكم الماركسي في جنوب اليمن اما اليمن الشمالية فالحكم فيها شوروی اسلامی) شمالی یمن میں کافی ترقیاتی کام جاری ہیں۔ یہ سب زیادہ تر سعودی عرب، کویت اور عرب امارات وغیرہ کے تعاون سے ہو رہے ہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ یمن کا وفد مدینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اَتاکُم اهلُ الیمن۔ هم اَرَقُّ افئِدۃً و اَلیَنُ قلوبًا۔ الایمان یمانٍ والفقه یمانٍ والحکمۃُ یمانیۃ (بخاری و مسلم) یعنی تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں ۔ وہ رقیق القلب ہیں اور نرم دل ہیں۔ ایمان تو یمن والوں کا ہے، سمجھ یمن والوں کی ہے، حکمت یمنی حکمت ہے۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ مطلق معنوں میں نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان اور تفقہ اور حکمت ہمیشہ کے لیے یمن والوں کی خصوصیت ہے۔ اس کا مقصد دراصل ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام قبول کرنے کے لیے آئے۔ یہ ایک وقتی کلمہ ہے نہ کہ کوئی ابدی قانون۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہ جانیں، وہ احادیث کو سمجھنے میں سخت غلطی کریں گے۔

قرآن کی سورۃ نمبر ۸۵ میں " اصحاب اخدود" کا ذکر ہے۔ یعنی قدیم زمانہ کے کچھ خدا پرست جن کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھے میں ڈال کر وحشیانہ طریقہ سے ہلاک کر دیا گیا تھا (البروج)۔

اصحاب اخدود کون لوگ تھے، ان کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی چیز ثابت نہیں۔ تاہم ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح کے پیرؤوں کے ساتھ یمن میں ہوا۔ یہ غالباً ۵۲۳ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت یمن میں ایک یہودی بادشاہ ذونواس کی حکومت تھی۔ اس نے یمن کے عیسائیوں کو یہودی بنانا چاہا۔ وہ لوگ اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ یہودی بادشاہ ان پر سخت برہم ہوا اس نے کچھ عیسائیوں کو قتل کر دیا اور کچھ کو آگ میں ڈال کر جلا دیا۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد ۲۰ ہزار بتائی جاتی ہے۔

روایات بتاتی ہیں کہ ان یمنی عیسائیوں میں سے ایک شخص (ذوثعلبان) بھاگ کر باہر چلا گیا۔ اس نے روم کے عیسائی بادشاہ قیصر اور حبش کے عیسائی حکمراں نجاشی کو اس ظالمانہ واقعہ کی اطلاع دی۔ اس کے بعد حبش کی حکومت نے اپنے فوجی سردار ارباط کی رہنمائی میں ۷۰ ہزار حبشیوں کی فوج تیار کی۔ رومی سلطنت نے بحری بیڑہ دیا جس کے ذریعہ فوج یمن کے ساحل پر اتاری گئی۔ اس نے لڑکر ذونواس کی فوج کو شکست دی اور ذونواس کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح یمن سے یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ۵۲۵ء میں پیش آیا۔ اس کے بعد یمن پر حبش کی عیسائی حکومت کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ظلم ہر شخص کے لیے ممکن ہے۔ مگر ظلم پر کھڑا ہونا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

ارياط کے بعد ابرہہ یمن کا حکمراں ہوا۔ یہی ابرہہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کچھ پہلے ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ آیا تھا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعار میں ایک بہت بڑا کلیسا (Ekklesia) بنوایا جیسا اب تک کسی عیسائی نے نہیں بنوایا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اس وقت تک رکنے والا نہیں ہوں جب تک عرب کے حج کو اس کی طرف پھیر نہ دوں (لستُ بمُنتَہٍ حتی اصرف الیہا حجّ العرب، سیرۃ ابن ہشام، اول ۴۳)

روایات کے مطابق غالباً ۵۷۱ء میں وہ ۶۰ ہزار فوج کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی فوج میں ایک درجن بڑے بڑے ہاتھی بھی شامل تھے۔ اس لیے اس کو اصحاب فیل کہا گیا ہے مگر جیسا کہ سورہ الفیل میں بتایا گیا ہے، ابرہہ اور اس کا لشکر خدائی عذاب کے تحت تباہ ہو گیا اور مکہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ابن سبا جس کے فتنوں نے اسلامی تاریخ کو شاید سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اسی صنعار کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک یہودی تھا۔ اس کا پورا نام عبداللہ بن سبا المعروف بہ ابن السوداء تھا وہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کا ہم عصر تھا۔ اس نے یہ نظریہ نکالا کہ ہر پیغمبر کا ایک وصی ہوتا ہے جو اس کے بعد اس کا خلیفہ بنتا ہے۔ محمدؐ کے وصی علی ابن ابی طالب ہیں۔ جس طرح محمد خاتم الانبیاء ہیں، اسی طرح علیؓ خاتم الاوصیار ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ محمدؐ کی وفات کے بعد لوگوں نے علیؓ کے سوا دوسروں کو خلیفہ بنا کر سخت غلطی کی ہے۔ اب سب کو چاہیے کہ موجودہ خلیفہ (عثمانؓ) کو قتل یا معزول کر دیں اور ان کی جگہ علیؓ کو خلیفہ بنائیں۔

صنعار میں اس فتنہ کو پھیلانے کے زیادہ مواقع نہیں تھے۔ چنانچہ وہ صنعار کو چھوڑ کر مدینہ آگیا۔ یہاں کے حالات بھی اس کے موافق نہ تھے۔ اس کے بعد وہ بصرہ گیا۔ پھر کوفہ اور دمشق پہونچا۔ لیکن ہر جگہ کے حالات اس کو اپنے خلاف نظر آئے۔ آخر میں وہ مصر پہنچا۔ اس وقت عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح مصر کے گورنر تھے، عبداللہ کی بعض باتوں سے یہاں کے لوگوں کو کچھ شکایات تھیں۔ انھیں شکایتوں نے ابن سبا کو مصر میں کام کرنے کا موقع دے دیا۔ اس نے لوگوں کے

جذبات کو ابھار کر مصر میں ایک عام شورش برپا کر دی جس کا آخری نتیجہ حضرت عثمانؓ کا قتل تھا۔
حکمراں کے خلاف ایجی ٹیشن کی مہم چلانا اور سیاسی شکایتوں کو بیان کر کے عوام کو بھڑکانا، یہ تمام تر ابن سبا کی سنت ہے۔ یہ سنت آج بھی مسلمانوں میں پورے زور وشور کے ساتھ جاری ہے۔ حتی کہ موجودہ زمانہ میں جن مسلم رہنماؤں نے عمومی شہرت حاصل کی، وہ تقریباً سب کے سب وہی ہیں جو ابن سبا کے اس مجرب نسخہ کو استعمال کر کے شہرت اور مقبولیت کے مقام تک پہونچے ہیں۔

یمن میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارب کے نام سے آباد ہے۔ کسی وقت یہاں عالی شان شہر قائم تھا۔ قرآن میں قوم سبا کا ذکر ہے۔ اس کا مرکز یمن کا قدیم شہر مارب تھا۔ اس کا زمانہ ۱۱۵ قبل مسیح کے بعد سے ایک ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے۔ تجارت اور زراعت میں غیر معمولی ترقی کی وجہ سے اس وقت وہ دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر آج دنیا کے اقتصادی نقشہ پر یمن کو کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔

سبا کی قوم جنوبی عرب پر حکمراں تھی۔ تاریخ میں ان کو سبائی (Sabaean) کہا جاتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہ قوم اپنے آخری عروج پر تھی۔ اس نے سدِ مارب (Marib Dam) بنا کر اپنی زراعت کو زبردست ترقی دی جس کا ذکر قرآن میں سورۂ سبا میں آیا ہے۔ (1/1044) یہ علاقہ اس وقت اتنا سرسبز اور خوش حال ہو گیا کہ مورخین اس کو دورِ قدیم کا پیرس (Paris of the ancient world) کہتے ہیں۔

سد مارب تقریباً چودہ میٹر اونچا اور ۶۰۰ میٹر لمبا تھا۔ وہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک یمن کی آبپاشی کا ذریعہ بنا رہا۔ (5/441) دورِ قدیم کے اعتبار سے وہ اتنا شاندار تھا کہ قوم سبا کے لوگ اس پر فخر کرتے تھے۔ حتی کہ اپنی ترقی اور خوش حالی کی وجہ سے ان میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اس وقت چھٹی صدی عیسوی میں بند کے اندر شگاف ظاہر ہوئے۔ یہ ابتدائی وارننگ تھی۔ مگر قوم سبا اس سے ہوش میں نہیں آئی۔ اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں سخت زلزلہ آیا اور بند سمیت پورا علاقہ ویران ہو گیا۔

صنعاء ایک تاریخی شہر ہے جو یمن کی راجدھانی ہے۔ صنعاء حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۶۳۲ میں

اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ یہ پورا شہر پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ ۱۵۱۶ء سے وہ عثمانی ترکوں کے تحت تھا۔ یہ قبضہ ۱۹۱۳ء میں ختم ہوا۔ ۱۹۶۲ میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور "امام" کی جگہ موجودہ حکومت قائم ہوئی۔ پہلے یہاں یہودی بھی آباد تھے۔ ۵۰-۱۹۴۹ میں تمام یہودی باشندے یمن کو چھوڑ کر اسرائیل چلے گیے۔ یہاں تمام ترقیاتی کام "انقلاب" کے بعد ہوئے ہیں۔ چنانچہ صنعاء یونیورسٹی ۱۹۷۰ میں قائم ہوئی۔

یمن میں ایک چیز نظر آئی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہر آدمی اپنے پیٹ پر سینگ کی مانند یا انگریزی حرف جے (J) کی شکل کی ایک چیز باندھے ہوئے تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ خنجر ہے جس کو یہاں کی زبان میں الجنبیۃ کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں ہر آدمی اپنے ساتھ ایک تلوار رکھتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں خنجر نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم وہ صرف علامت کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کو کبھی لڑائی بھڑائی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کو سخت جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں جو شخص اس کو نہ لگائے وہ کمزور شخصیت کا آدمی سمجھا جائے گا۔ بنیادی طور پر وہ بطور زینت کے استعمال ہوتا ہے (من لا یحملها یُعتبر ذُو شخصیة ضعیفة وهی تُلبسُ اساساً کالزینة)

تاہم اس رسمی خنجر کا بہت بڑا فائدہ ہے۔ یہ اگرچہ مارنے کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ مگر وہ یہاں کے بیشتر آپس کے جھگڑے ختم کر دیتا ہے۔ بہت کم جھگڑے ہیں جن کو عدالت میں لے جانے کی نوبت آتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دو آدمیوں میں آپس کا جھگڑا ہو، خواہ وہ قتل کا ہو یا ایک ملین ڈالر کا ہو۔ دونوں اپنے قبیلہ کے سردار کے پاس جائیں گے، اور اپنے اپنے "خنجر" کو نکال کر سردار کے سامنے رکھ دیں گے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہوگی کہ سردار جو بھی فیصلہ کر دے، وہ اس کو لازماً تسلیم کریں گے، خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف۔ یہاں کے ۸۰ فی صد جھگڑے اسی طرح عدالت میں جائے بغیر طے ہو جاتے ہیں۔

یہ روایات کی طاقت کا نتیجہ ہے۔ ہندستان میں آزادی کے بعد تمام روایات ٹوٹ گئیں، اور کوئی نئی روایت قائم نہیں ہوئی۔ یہی سب سے بڑی کمی ہے جو آج کے ہندستان میں پائی جاتی ہے۔

۳۱ اکتوبر کی دوپہر کو عبداللہ الصالح (رئیس جمہوریہ یمن) سے یہاں کے "قصر" میں ملاقات ہوئی۔ یہ اجتماعی ملاقات تھی۔ فرداً فرداً ملاقات کے بعد رئیس نے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس میں انھوں نے اس تصور کو پسند کیا کہ اسلام کو ایک دعوتی قوت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت بہت سی اسلامی جماعتیں اسلام کے نام پر سیاسی جھگڑوں میں مشغول ہیں۔ اس کے بجائے اگر وہ دعوتی محاذ پر کام کریں تو یہ ان کی صلاحیتوں کا زیادہ بہتر استعمال ہوگا۔

۳۱ اکتوبر کی شام کو سبا ہوٹل (Taj Sheba Hotel) میں ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں کانفرنس کے بیرونی شرکار اور یمن کے مقامی علمار جمع ہوئے۔ کارروائی کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد قاضی علی العثمان (وزیر الاوقاف) نے ابتدائی خطاب کیا۔ وہ خالص عالمانہ حلیہ میں تھے۔ اس موقع پر وزارت اوقاف کے اکثر ذمہ داران موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ وزیر، نائب وزیر اور دوسرے اکثر تعلیم یافتہ افراد میری کتابیں پڑھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں کانفرنس کے بعد مزید ٹھہروں تاکہ یہاں کی یونیورسٹی اور دوسرے اداروں میں میرے محاضرات رکھوائے جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو جب معلوم ہوگا کہ آپ یہاں آئے تو ان کو سخت شکایت ہوگی کہ آپ سے ملاقات اور محاضرہ کا پروگرام کیوں نہیں رکھوایا گیا۔ مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے عذر کر دیا۔ سبا ہوٹل کے جس ہال میں اس ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا، وہاں دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

الدعوة الى الله : رسالة الانبياء وميراث العلماء ونهج الصالحين

اس نشست میں تقریباً ۵۰ آدمی شریک ہوئے۔ مگر لوگوں کی گفت گوؤں سے ایسا معلوم ہوا کہ کسی پر پوری طرح یہ واضح نہیں ہے کہ "دعوت الی اللہ" کیا ہے۔ اکثر لوگ دعوت سے آغاز کرکے مبشرین اور مستشرقین اور صہیونیین کے پیدا کردہ مسائل پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیتے۔ حالاں کہ یہ سب دفاعی مسائل ہیں نہ کہ دعوتی مسائل۔

ایک صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر شروع کی: هل لنا ان نتسائل ما هو دور العلماء اليوم فى ايقاظ الامة ودفعها لاقامة حضارة اسلامية جديدة؟ (کیا ہم اپنے آپ سے یہ سوال کریں گے کہ امت کو بیدار کرنے میں اور اسلامی تہذیب کو قائم کرنے میں علمار کا رول کیا ہے)، مگر چند جملوں کے بعد ہی ذہن کی گاڑی "حل مشاکل" اور مقابلۂ اعداء کے

رخ پر چل پڑی۔ موجودہ زمانہ میں ہر جگہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ کام کے نام سے صرف ایک چیز کو جانتے ہیں اور وہ مقابلہ اعدا رہے۔ دعوتِ اعدا کی اہمیت نہ ان کے اصاغر کو معلوم ہے اور نہ ان کے اکابر کو۔

کانفرنس میں زیادہ تر انھیں امور پر بحث ہوئی جن کو ہندستان میں "مسائل ملت" کہا جاتا ہے۔ اس کے ایک اجلاس میں کسی موضوع پر مشاورتی بحث ہو رہی تھی۔ ہر آدمی نیا نیا نکتہ نکال کر بحث کو لمبا کر رہا تھا۔ صدر جلسہ نے اپنی طرف سے ایک آخری تجویز پیش کی اور رد عمل کا انتظار کیے بغیر فوراً کہا: اذلم یکن ھناک اعتراض فیعتبر انّ ھناک موافقۃ (اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اتفاق ہے) یہ کہہ کر کارروائی آگے بڑھادی۔

مشاورتی مجالس میں یہی طریقہ درست ہے۔ ہر شخص جس نے اس طرح کی مجالس میں شرکت کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگ اتنی زیادہ بحثیں نکالتے ہیں کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ بات کسی خاتمہ پر پہونچنے والی نہیں۔ ایسی حالت میں بات کو ختم کرنے کی صورت وہی ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔

یہاں کے اجتماع میں اور دوسری اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میں اس رائے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر "خطرات" کا ذہن سوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں "مواقع" دکھائی نہیں دیتے۔ اور بلا شبہ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بے شمار سرگرمیوں کے باوجود اب تک احیاءِ اسلام اور تعمیر ملت کا عمل ان کے درمیان شروع نہ ہو سکا۔ اس کا منزل پر پہونچنا تو درکنار۔

- امریکہ میں ایک شخص نے پیغمبر ہونے کا دعوی کیا ہے۔
- غانا میں ایک شخص نے نیا مذہب نکالا ہے جس کا مقصد تمام مذہبی کتابوں (بشمول قرآن) کو جلانا ہے۔
- انگلینڈ میں ایک شخص نے مضمون شائع کیا ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔
- فلاں مسلم حکمراں مسلمان نہیں ہے، وہ یہودی ہے، وغیرہ

مسلمان ہر جگہ بس اسی قسم کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ اب تک زندگی کے اس راز کو نہ جان سکے کہ اس قسم کے "مسائل" ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور ہر زمانہ میں لازماً باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ہمارا کام اس قسم کے "خطرات" کا انکشاف کرنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد ان مواقع کار کو تلاش کرنا ہے جو ہر حال اور ہر مقام پر موجود رہتے ہیں۔ ہمیں خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرنا چاہیے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ اسی تدبیر کے ذریعہ دور اول میں اسلام کی تاریخ بنی تھی۔ آئندہ بھی جب اسلام کی تاریخ بنے گی، اسی تدبیر کے ذریعہ بنے گی۔ اگر مسلمان خطرات کے خلاف ردعمل میں مشغول رہے تو اسلام کی جدید تاریخ بننے والی نہیں، خواہ اس قسم کے ردعمل میں ایک کرور سال کیوں نہ صرف کر دیئے جائیں۔

میں نے کہا کہ مغرب نے تسخیر کائنات کے امکان کو استعمال کرکے موجودہ غلبہ حاصل کیا ہے۔ مگر تسخیر قلوب کے امکان کو استعمال کرنے کا میدان ابھی خالی ہے۔ جو قوم اس دوسرے امکان کو استعمال کرے گی وہ مغربی تاریخ سے بھی زیادہ بڑی تاریخ بنائے گی۔ تاہم اندازہ ہوا کہ اس طرح کی بات صرف ایک تقریر سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے لیے مسلسل ذہنی خوراک پہونچانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام موثر طور پر صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ الرسالہ کا عربی اڈیشن نکلنے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ عرب حضرات بطور خود الرسالہ کا عربی اڈیشن نکالنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔

یمن قوم سبا کا وطن رہا ہے۔ سبا کا دارالسلطنت مارب تھا۔ اس کے نام پر سدّ مارب یہاں کا مشہور ترین تاریخی مقام ہے۔ ۲ نومبر ۱۹۸۸ کی صبح کو صنعاء سے مارب کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ مقام صنعاء سے تقریباً ۱۲۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شروع سے آخر تک نہایت عمدہ سڑک ہے جو کویت کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ تقریباً پورا راستہ پہاڑوں کے درمیان طے ہوا۔ ان پہاڑوں میں ہر قسم کے پتھر پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں یمن کا عقیق (قیمتی سُرخ پتھر) بہت مشہور تھا۔ ایک شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے:

اشک یخ بستہ عبرت ہیں عدن کے موتی — خون افسردۂ حسرت ہے عقیق یمنی

تین ہزار سال پہلے یمن کے لوگوں نے جو سد مارب بنایا تھا۔ وہ آج بھی انسانی ذہانت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ خود اس علاقہ میں زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ بہت بڑے علاقہ کی بارانی بارش

کو بند کے ذریعہ مارب کے مقام پر جمع کیا جاتا تھا اور اس سے سینچائی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس تدبیر نے اس خشک علاقہ کو سرسبز و شاداب بنا دیا تھا۔ قدیم سدّ مارب کے آثار اب بھی نمایاں طور پر موجود ہیں۔

قدیم بند ہی کے مقام پر اب یہاں دوبارہ جدید طرز کا ڈیم بنایا گیا ہے۔ ڈیم کے انچارج نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شیخ زائد (عرب امارات) نے یہاں کا دورہ کیا تو ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس کو دوبارہ بنایا جائے۔ سب سے پہلے انھیں نے اس تصور کا آغاز کیا (وھوالذی بدأ ھذہ الفکرۃ)

ہم لوگوں کا قافلہ تقریباً دو گھنٹہ میں سد مارب کے مقام پر پہونچا۔ تعارف کے دوران بتایا گیا کہ اس ڈیم کو دوبارہ بنانے کے دو مقصد ہیں۔ ایک مقصد اقتصادی ہے۔ یعنی اس علاقہ کی آبپاشی کے لیے پانی حاصل کرنا۔ دوسرا مقصد اسلامی ہے۔ سدّ مارب کا ذکر خود قرآن میں آیا ہے۔ یہ ڈیم اس علاقہ کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھے گا (یُحیي ذکری ھذہ المنطقۃ) یہ ڈیم گویا انسان کے لیے اس بات کا نشان ہے کہ خدا کے شکر گذار ہو تو تمہارے لیے سب کچھ ہے اور ناشکری کروگے تو اس کا نتیجہ دوبارہ وہی ہوگا جو قوم سبا کے ساتھ پیش آیا۔

موجودہ ڈیم ۷۰۰ میٹر لمبا اور ۴۰ میٹر اونچا ہے۔ قدیم سد مارب تقریباً ۱۸ میٹر اونچا تھا۔ جہاں یہ ڈیم بنایا گیا ہے اس کو عام طور پر وادی سبا کہا جاتا ہے۔ سابق سد مارب تین ہزار سال پہلے بنا تھا۔ یہ پورا کا پورا مضبوط پتھروں کا تھا۔ اس کے آثار اب بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کثیر تعداد میں کتبے موجود ہیں۔ یہ کتبے حمیری زبان میں ہیں۔ یہ پورا ڈیم شیخ زائد (عرب امارات) کے تعاون سے بن رہا ہے۔ اس کی لاگت ایک سو ملین ڈالر ہے۔ تحقیق اور ریسرچ کا سارا کام جرمن ماہرین نے کیا ہے۔ وہ پچھلے دس سال سے اس کام میں مشغول ہیں۔

سد مارب دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس کھنڈر کو دیکھنے کے لیے گیے جو معبدِ شمس (Sun temple) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ملکہ بلقیس اور اس کی قوم سبا کا عبادت خانہ تھا۔ اب بھی اس کے کھنڈر صحرا میں موجود ہیں۔ اس کے کئی ستون اب بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ایک پتھر ۵۰ ٹن کا ہے۔ یہ معبد گول انداز میں بنا ہوا تھا۔ اس کی کھدائی میں کافی کتبات اور سامان نکلے جو اب لندن کے میوزیم میں موجود

ہیں۔ یہ معبد تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے۔

ہم وہاں دوپہر کے وقت پہونچے۔ سورج پوری تابناکی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اور اس کے نیچے معبد شمس آخری حد تک کھنڈر کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اس ماحول میں ایسا معلوم ہوا جیسے سورج زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ میں تمہارا خدا نہیں۔ اگر میں خدا ہوتا ہو تو میں اپنے عبادت خانہ کو کھنڈر ہونے سے بچا لیتا۔

مزید آگے بڑھے تو وہ جگہ تھی جس کو "عرش بلقیس" کہا جاتا ہے۔ یہ ملکہ سبا (بلقیس) کا محل تھا جو معبد شمس کے قریب واقع تھا۔ اس کے پانچ بڑے بڑے ستون اب بھی سیدھے کھڑے ہوئے ہوئے ہیں۔ ہر ستون ۱۲ میٹر لمبا ہے۔ ان ستونوں کے اوپر یمنی لڑکے چڑھنے اور اترنے کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شہر کی اونچی عمارتوں میں اوپر چڑھنے کے لیے جو لفٹ لگی ہوئی ہے وہ اوٹس (OTIS) کی ہے جو ایک مغربی کمپنی ہے۔ روایتی صعود میں مسلمان خود استاد ہیں مگر مشینی صعود کے لیے انھیں مغرب کی شاگردی کرنی پڑتی ہے۔ مسلمان روایتی دور میں سب سے آگے تھے، مگر سائنسی دور میں وہ سب سے پیچھے ہو گئے۔

یہیں پر قدیم شہر مارب کے کھنڈرات ہیں جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک عمارت ہے جو "مسجد سلیمان" کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے یہاں نماز پڑھی اور پھر اسی جگہ مسجد تعمیر کی گئی۔ تاہم اس کا تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے ہال کی صورت میں ہے جو کہ تقریباً ۳۰ ستونوں پر قائم ہے۔ پورا مارب شہر ایک بلندی پر کھنڈرات کی صورت میں نظر آتا ہے اور عبرت کا عجیب نمونہ ہے۔

مارب شہر مشہور "قیرواں روڈ" پر واقع تھا۔ یہ شاہراہ بحر عرب کو بحر روم سے ملاتی تھی۔ اس پر ہزاروں کی تعداد میں اونٹوں کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ ان تاجروں سے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے اور وہ حکومت سبا کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا ——— قدیم زمانہ کی تجارتی شاہراہ اب صرف سیاحوں کی شاہراہ بن کر رہ گئی ہے۔

قدیم مارب کے پاس ہی جدید مارب آباد ہے۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے وہ بھی قدیم انداز کا بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک "ہوٹل بلقیس" ہے جو غالباً سیاحوں کی ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ گویا

صحرا کے اندر ایک تہذیبی نخلستان ہے۔ اس ہوٹل میں ظہر کی نماز پڑھی گئی اور یہیں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد صنعار کے لیے واپسی ہوئی۔

قدیم شہر مارب کے ٹوٹے ہوئے مکانات اور قدیم سد مارب، معبد شمس، عرش بلقیس وغیرہ کے کھنڈرات سب پاس پاس واقع ہیں۔ اس پورے علاقہ کو وادی سبا کہا جاتا ہے۔ جب ہم کھنڈرات کی اس خشک وادی میں پہونچے تو یہ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا اور تیز روشنی بکھیر کر دیکھنے والوں کو دور سے دکھا رہا تھا۔

یہ تاریخی منظر جب میرے سامنے آیا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ سورج نہیں ہے بلکہ خدائی ٹارچ ہے جو اندھیرے میں اس لیے جلائی گئی ہے تاکہ لوگوں کو دکھائے کہ خدا کی طاقتیں کیا ہیں اور وہ قوموں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔

یہاں ایک کتاب دیکھی۔ اس کا نام تھا ——— یمن کی از سر نو دریافت :

Yemen Rediscovered

کتاب کے مصنف مائیکل جینر (Michael Jenner) ہیں۔ وہ لندن میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور اب لندن ہی میں رہتے ہیں۔ وہ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کے مڈل ایسٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے یمن کا سفر کیا اور علم الآثار کی جدید تحقیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کتاب مرتب کی۔ اس میں یہاں کے آثار کے بہت واضح فوٹو دیے گیے ہیں اور قدیم یمن سے متعلق نہایت مفید معلومات درج ہیں۔ یہ کتاب لانگ مین کمپنی نے چھاپی ہے۔

کتاب کے سرورق پر لکھا ہوا تھا کہ یمن عرصۂ دراز تک ان ملکوں میں شامل تھا جن کے بارہ میں دنیا کو بہت کم معلومات تھیں۔ یمن نے اب اپنے دروازے بیرونی مشاہدین کے لیے کھول دیے ہیں،

For many years one of the least-known countries in the world, Yemen has recently opened its doors to foreign visitors.

آج اس طرح کی کتابیں بڑی تعداد میں مختلف ملکوں کی قدیم تاریخ کے بارہ میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ گویا، ایک اعتبار سے، قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین کی تفسیر ہے۔ قدیم زمانہ میں قوموں پر ظاہر ہونے والے فیصلے دبے ہوئے کھنڈروں کی صورت میں زمین میں

دفن تھے یا تاریخ کے پردہ میں چھپ گیے تھے۔ حتیٰ کہ اب لوگ آج کے "یمن" کو جانتے تھے، وہ قدیم "یمن" سے ناواقف ہو چکے تھے۔ علم الآثار کے ماہرین گویا موجودہ زمانہ میں خدائی کارندے بن کر ظاہر ہوئے اور بڑھتے ہوئے سیاحتی ذوق نے اس کی ضروری قیمت ادا کی۔ اس طرح ایسا ہوا کہ خدا کا فیصلہ جو تاریخ کے گرد و غبار میں چھپ گیا تھا۔ اس کو کھود کر اور تحقیق کر کے نکالا گیا اور عالمی مشاہدہ کے لیے اس کو دنیا کے سامنے رکھ دیا گیا۔ تاہم یہ پورا کام غیر مسلموں کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ اس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔

یکم نومبر کی دوپہر کو یہاں کی یونیورسٹی دکھائی گئی۔ اجتماعی طور پر تمام شرکا وہاں لے جائے گیے۔ یہ ایک مکمل یونیورسٹی ہے جہاں تمام شعبے قائم ہیں۔ ذریعہ تعلیم عربی کے ساتھ انگریزی بھی ہے۔ اس کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ایک ہال میں لے جایا گیا جہاں کلاس جاری تھی۔ استاد نے بتایا کہ یہ "ٹرانک انجینیرنگ" کی کلاس ہے۔ انھوں نے عربی میں اپنے مضمون کا تعارف شروع کیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہاں کچھ لوگ عربی نہیں جانتے اس لیے انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے۔ استاد نے اس کے فوراً بعد اپنی بات کو انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ جس روانی کے ساتھ وہ عربی میں بول رہے تھے، اسی روانی کے ساتھ انگریزی میں بولنے لگے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں جو اساتذہ ہیں وہ لائق ہیں اور اپنے مضمون پر اچھی طرح تیار ہیں۔

یمن کے وسائل زیادہ نہیں ہیں۔ ایک بڑی زیر تعمیر عمارت دکھائی گئی۔ یہ میڈیکل کالج تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ پورا کالج کویت کے تعاون کے تحت بنایا جا رہا ہے۔ یہی حال دوسرے ترقیاتی امور کا بھی ہے۔ تاہم تیل کی تلاش یہاں بڑے پیمانہ پر جاری ہے اگر تیل دریافت ہو گیا تو یمن بھی دوسرے خلیجی ممالک کی طرح خوش حال ملک بن جائے گا۔

صنعاء کے ماہنامہ الارشاد اور روزنامہ الثورہ نے انٹرویو لیا۔ الارشاد کا انٹرویو تفصیلی تھا۔ وقت کی کمی کے باعث الثورہ کو میں صرف مختصر انٹرویو دے سکا۔ ٹیلی وژن کے لوگ بھی اصرار کر رہے تھے۔ مگر وقت کی کمی کے باعث میں ٹیلی وژن کو انٹرویو نہ دے سکا۔ الارشاد کا انٹرویو اس کے رئیس تحریر د۔ عبداللہ الواسطی نے لیا۔ انھوں نے گفت گو کا آغاز اس جملہ سے کیا:

الشیخ وحیدالدین، مرحب بکم فی ھذا البلد الذی ھو بلد کل مسلم

اس کے بعد انھوں نے جو سوالات کیے ان میں سے کچھ یہ تھے :

۱- هل تتفضل باعطائنا تعريفا موجزا عن حياتك

۲- كم هي المولفات التي صدرت لكم وهل تتفضلون كتابا منها

۳- هل لكم من تعليق على الصحوة الاسلامية القائمة اليوم

۴- ماذا تتوقعون لمستقبل المسلمين في الهند

۵- بالنسبة لجارتكم الباكستان متى تتوقعون سيفوز في الانتخاب المقبلة

آخری سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میرے اندازہ کے مطابق پاکستان کے آنے والے الکشن میں بھٹو پارٹی کامیاب ہوگی اور وہی حکومت بنائے گی۔ یہ بات میں نے یکم نومبر ۱۹۸۸ کو کہی تھی، جب کہ پاکستان کا الکشن ۱۶ نومبر کو ہوا۔

یمن کی وزارت اوقاف کی طرف سے ان کی مطبوعات بطور ہدیہ دی گئیں۔ ان میں سے ایک کتاب القانون المدنی (المعاملات الشرعية) تھی جس کو علما کی ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے۔ یہ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں معاملات سے متعلق شرعی قوانین کو دفعہ وار مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں تیرہ سو سے زیادہ دفعات ہیں۔ کتاب اصولی قوانین (القواعد الاصولية) سے شروع ہوتی ہے، اور اموال اور جائداد کے غصب سے متعلق شرعی احکام پر ختم ہوتی ہے۔ مادہ ۱۲۸۶ میں کہا گیا ہے کہ شریعت کے مطابق، غصب حرام ہے اور ظلم ہے (ان الغصب حرام وظلم) اس میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ جس شخص نے ایک بالشت کے برابر (زمین) غصب کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں پہنائے گا (من غصب شبراً طوقه يوم القيامة الى سبع ارضين)

عبدالکریم بن عبداللہ العرشی (نائب رئیس الجمہوریہ) نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قانون بلاشبہ بہترین چیز ہے جو عمومی طور پر ساری انسانیت کے لیے اور خصوصی طور اسلامی امت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے (ان هذا القانون لخير عمل يقدم للبشرية عامة وللامة الاسلامية خاصة) یہ کتاب شرعی احکام کی قانونی ترتیب (تقنين احكام الشريعة الاسلامية) کی ایک کوشش ہے جس کی موجودہ زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔

یہاں ایک عربی کتاب نظر سے گزری۔ اس کا نام تھا ـــــــ قرآن کی تلاوت پر اجرت لینے پر حجت اور برہان :

اقامة الحجة والبرهان على جواز اخذ الاجرة على تلاوة القرآن

اس کتاب کے مولف یمن کے ایک عالم محمد بن اسماعیل الامیر (۱۱۸۲ - ۱۱۱۰ھ) ہیں۔ بعد کے زمانہ میں اس طرح کی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل پر حجت و برہان قائم کیا گیا۔ مگر اقوام عالم پر حجت و برہان قائم کرنے کے لیے کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی بھی تو وہ مناظرہ کے انداز میں، اور مناظرہ اقامتِ حجت نہیں۔

لندن سے آنے والے ایک صاحب نے کہا کہ یورپ میں اسلام کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ مثلاً کئی تعلیمی اداروں سے یہ رپورٹ ملی ہے کہ ایک مسلمان طالب علم نے وہاں درخواست دی۔ انٹرویو کے وقت اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تم بنیاد پرست (Fundamentalist) ہو۔ اگر اس نے کہا کہ ہاں تو اس کی درخواست رد کر دی جاتی ہے۔

میرے نزدیک یہ اغیار کا تعصب نہیں بلکہ خود اپنی حماقت کا نتیجہ ہے۔ وہ مسلم نوجوان جن کو "بنیاد پرست" کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنی یہ تصویر بنائی ہے کہ وہ جہاں موقع پاتے ہیں نظام کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تخریب کاری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ ڈسپلن کو اہمیت دیتے ہوں۔ وہ ان کے ساتھ وہی کریں گے جو یورپ کی بعض تعلیم گاہوں میں پیش آیا۔ جس شخص کے متعلق تخریب کاری کا تصور ہو، وہ خود ہمارے دینی اداروں میں قبول نہیں کیا جاتا۔ پھر ایسا آدمی یورپ کے غیر دینی اداروں میں کیوں قبول کیا جائے گا۔

عبدالمنعم الخطاب ایک مصری عالم ہیں۔ وہ تقریباً ۲۴ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ ٹولیڈو کے اسلامک سنٹر میں مدیر (ڈائرکٹر) ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ امریکہ میں اسلام کی تبلیغ کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک پہلی اہم ضرورت مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہے نہ کہ امریکیوں کو مسلمان بنانا (مهمة الاولى عندى هى اسلام المسلمين لا اسلام الامريكيين)

میں نے کہا کہ اسلام الامریکیین کے بغیر اسلام المسلمین ممکن نہیں۔ اصل یہ ہے کہ کردار محض وعظ و نصیحت سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اعلیٰ مقصد سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ مسلمان بے مقصد ہیں،

اسی لیے وہ بے کردار ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کو اخلاقی اعتبار سے اٹھانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے اندر مقصدی شعور پیدا کیا جائے۔ جب ان کے اندر مقصدی شعور آئے گا تو وہ مقصد کے لیے بھی متحرک ہوں گے اور یہی چیز ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کا سبب بھی بن جائے گی۔ اور دعوت ہی بلاشبہ سب سے بڑا اسلامی مقصد ہے۔

سفر کے دوران ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عربی یا انگریزی دونوں میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک ساتھ رہے مگر قریب ہونے کے باوجود ان سے "ربط" قائم نہ ہو سکا۔ گویا وہی کیفیت تھی کہ:

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس وقت خیال ہوا کہ نطق اور زبان خدا کی کیسی عجیب نعمتیں ہیں۔ اگر آدمی کے اندر بولنے کی صلاحیت نہ ہو، یا وہ دوسرے لوگوں کی زبان نہ جانتا ہو، تو انسانی ہجوم کے اندر بھی وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرے گا۔ انسان کی تمام سرگرمیاں اور اس کی تمام ترقیاں نہایت گہرے طور پر نطق کی صلاحیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے ربط قائم کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ مختلف لوگوں کی تحقیقات دوسروں تک پہنچتی ہیں اور انسانیت کی مجموعی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان اپنے دل کی بات سے دوسروں کو باخبر کرتا ہے۔

اس عجیب و غریب نعمت کا احساس اس وقت نہیں ہوتا جب کہ آدمی اپنے ہم زبان لوگوں کے درمیان رہ رہا ہو۔ اس نعمت کا صحیح احساس اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے درمیان پائے جہاں نہ دوسرے لوگ اس کی زبان جانیں اور نہ وہ دوسرے لوگوں کی زبان جانتا ہو۔ ایسے ماحول ہی میں صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ نطق اور زبان کیسی عجیب خدا کی نعمتیں ہیں۔

ایک صاحب اپنے ملک کے سیاسی حالات کی بنا پر اپنے وطن سے باہر یورپ کے ایک ملک میں رہتے ہیں۔ انھوں نے عالمی پناہ گزینوں کے مسئلہ پر تقریر کی اور کہا کہ ان پناہ گزینوں میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ان کے بارہ میں مسلم ملکوں کو ایک مستقل ادارہ قائم کرنا چاہیے جو ان کی مدد کر سکے۔ ان کی تقریر کی رپورٹ تیار ہو کر آئی تو عربی رپورٹ میں درج تھا: وقت

جری التاکید علی ضرورۃ الاهتمام باللاجئین اهتماماً یتکافأ مع کون ثلث المسلمین هم لاجئون فی هذا العالم۔ اسی طرح انگریزی رپورٹ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

This matter was emphasized as one third of the Muslims are refugees in this world.

اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا بھر میں جو مسلمان ہیں ان کا ایک تہائی حصہ پناہ گزین کے طور پر زندگی گزار رہا ہے ۔ یعنی دنیا کے ایک ارب مسلمانوں میں سے تقریباً ۳۳ کروڑ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے ۔ مذکورہ مقرر نے دراصل یہ کہا تھا کہ عالمی پناہ گزینوں کی جو تعداد ہے ان میں تقریباً ایک تہائی مسلمان پناہ گزین ہیں ۔ گویا کہنے والے نے پناہ گزینوں میں تہائی کی بات کہی تھی، مگر رپورٹ مرتب کرنے والوں نے اس کو مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا تہائی کر دیا ۔

یہ غلطی کی وہ قسم ہے جو موجودہ دنیا میں بہت زیادہ عام ہے ۔ اس لیے کسی کے خلاف کوئی بات علم میں آئے تو تحقیق کے بغیر ہرگز اس کو ماننا نہیں چاہیے ۔

یہاں جناب محمد شیر چودھری (پیدائش ۱۹۳۸) سے ملاقات ہوئی ۔ وہ پاکستان سے ہجرت کر کے ساؤتھ افریقہ گیے اور اب وہ وہیں رہتے ہیں ۔ انھوں نے اپنا ایک قصہ بتایا ۔ ۱۹۸۶ میں ڈربن کے اورینٹ ہال میں ان کی تقریر ہوئی ۔ تقریر کے بعد حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا : کیا آپ اس پر مطمئن ہیں کہ واقعی صدر ضیاء الحق پاکستان میں اسلام لانا چاہتے ہیں ۔ اس کے جواب میں محمد شیر چودھری نے کہا : "میں سمجھتا ہوں صدر ضیاء تو اسلام لانا چاہتے ہیں مگر علماء شاید اسلام نہیں لانا چاہتے "

میں نے کہا کہ ایک لفظی فرق کے ساتھ میں اس جواب سے متفق ہوں ۔ آپ نے کہا کہ علماء اسلام کو لانا نہیں چاہتے ، میں کہوں گا کہ علماء اسلام کو لانے نہیں دیتے ۔

کسی معاشرہ میں اسلام کو لانا ایک تدریجی عمل ہے ۔ اس کے لیے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ جو چیز آج ممکن ہے اس سے آغاز کیا جاتا ہے ، اور جو چیز آج ممکن نہیں ہے ، اس سے اعراض کرنا پڑتا ہے ۔ مگر علماء صبر اور اعراض اور تدریج کو نہیں جانتے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ فوراً اسلام کا غلبہ قائم ہو جائے ۔ علماء کی یہی تعجیل پاکستان میں اسلام کی تاخیر کا سبب بن رہی

ہے۔ پاکستان کے علماء عملی طور پر صرف اس پوزیشن میں تھے کہ وہ پاکستان کے لوگوں میں اسلامی شعور کو بیدار کریں۔ مگر پاکستان کے بنتے ہی وہ اسلامی حکومت قائم کرو کا نعرہ لے کر کھڑے ہوگئے۔ وہ ہر حکمراں کو مخالف اسلام قرار دے کر اس کو اقتدار سے ہٹانے کی مہم چلاتے رہے۔ علماء کی یہی وہ نادانی ہے جس نے ۴۰ سال بیتنے کے باوجود پاکستان میں اسلام کو آنے نہیں دیا۔

اس پر جناب محمد چودھری نے اپنا ایک اور لطیفہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک بار کسی سے کہا کہ وہ ہر شخص کا مقابلہ کر سکتے ہیں، مگر وہ مولوی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سننے والے نے پوچھا کہ کیوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی فوراً ہی چھلانگ لگا کر اپنی گاڑی پانچویں گیر میں چلا دے گا:

He must at once jump into the 5th gear.

ایک صاحب جو یورپ سے آئے تھے، مگر اصلاً وہ افغانی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت ۱۵ ملین افغانی باشندے افغانستان میں ہیں۔ ۳ ملین افغانی پاکستان میں ہیں اور ۲ ملین ایران میں۔ پاکستان کے ایک صاحب نے بتایا کہ افغانستان سے جو لوگ پاکستان گئے، ان کی بڑی تعداد اب افغانستان جانے میں دل چسپی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ انھوں نے پاکستان میں کافی تجارتیں پھیلالی ہیں جن کی امید وہ موجودہ افغانستان میں نہیں رکھتے۔ اسی طرح بہت سے افغانی نوجوانوں نے اپنے ملک سے نکل کر تعلیم حاصل کی۔ اب وہ یورپ اور امریکہ میں اچھی ملازمتوں میں ہیں، وہ بھی اس میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے کہ افغانستان واپس جائیں جو مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں برباد ہو چکا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب نے کانفرنس میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اپنے سیاسی عقیدہ کی وجہ سے اپنے مذہبی حقوق سے روکے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایرانیوں کی مثال دی کہ سعودی عرب نے ان کو حج سے روک دیا ہے۔ چنانچہ اس سال ایرانی حاجی مکہ نہ جا سکے۔ کویت کے ایک بزرگ نے فوری طور پر اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بیان واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔ سعودی حکومت نے ہرگز ایسا نہیں کیا کہ وہ ایرانیوں کو حج سے روکے۔ ان کو بدستور اجازت حاصل تھی۔ یہ خود ایرانی تھے جنھوں نے احتجاج کے نام پر اس سال حج کا سفر نہیں کیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ صحیح ہونے کے باوجود اس کی توجیہہ حد درجہ غلط ہوسکتی ہے۔ مذکورہ مثال میں ایک واقعہ جس کے ذمہ دار حقیقۃً ایرانی تھے، اس کو ایک شخص نے غلط طور پر سعودی عرب کی طرف منسوب کردیا۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے خلاف کوئی بیان دینے سے پہلے اس کے بارہ میں مکمل تحقیق کرو۔

۴ نومبر کو مجھے فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا تھا تاکہ میں وقت پر ہوائی اڈہ پہنچ کر ساڑھے پانچ بجے کے جہاز کو پکڑ سکوں۔ ہوٹل کے استقبالیہ میں شام کو میں نے لکھوا دیا کہ صبح ۳ بجے مجھے جگا دیا جائے۔ رات کو میں سو رہا تھا کہ ٹھیک وقت پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ہوٹل والوں کی طرف سے ویک اپ کال (Wake-up- call) تھی۔ گویا کہ آواز دینے والا کہہ رہا تھا کہ اٹھ جاؤ۔ اب سونے کا وقت ختم ہوگیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ صور اسرافیل بھی اسی قسم کا ایک ویک اپ کال ہوگا۔ آج تمام لوگ سو رہے ہیں۔ کسی کو آنے والے دن کا احساس نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ اسرافیل کا صور گونج اٹھے۔ کیسی عجیب ہوگی یہ خدائی پکار، اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس خدائی پکار سے غافل ہوکر بے خبر سو رہے ہیں۔

میں سفر میں ہمیشہ مختصر سامان رکھتا ہوں۔ عام طور پر صرف ایک چھوٹا ہینڈ بیگ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ صنعاء سے ۴ نومبر کی صبح کو ہوٹل سے نکلا تو ہمارے یمنی گائڈ نے پوچھا آپ کا سامان۔ میں نے اپنے ہاتھ کا بیگ دکھاتے ہوئے کہا کہ بس یہی میرا سامان ہے، اس کے سوا اور میرا کوئی لگیج نہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: افلح من خفّ متاعه (وہ شخص کامیاب رہا جس کا سامان کم ہو)

یہ گویا اسلامی تہذیب کا کلمہ تھا جو ان کی زبان سے نکلا۔ جزیرہ عرب پر اسلام کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ عربوں کی زبان اور ان کے انداز میں ابھی تک اس کے نشانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کا باہمی اختلاف اگر کسی طرح ختم ہوجائے تو اس کے بعد ان کے پاس جو کچھ بچے گا وہ وہی اسلامی تہذیب ہوگی جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر عربی کے ذریعہ انھیں ملی تھی۔

صنعاء سے کراچی کا سفر پاکستان ایرلائنز کی فلائٹ ۷۴۶ کے ذریعہ ہوا۔ راستہ میں

پاکستانی اخبارات پڑھنے کو ملے۔ روزنامہ حریت (۳ نومبر ۱۹۸۸) کی چند سرخیاں یہ تھیں :

کوئی جماعت بھی جیتے، حکومت انتخابی نتائج کو تسلیم کرے گی۔ مصطفےٰ صادق

۱۶ نومبر عوام دشمن قوتوں کی شکست کا دن ہے۔ بیگم نصرت بھٹو

پاکستانی عوام اسلام کے سوا کسی اورازم کو تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا نورانی

حکمرانوں کے لیے انتخابات کے بعد انتقال اقتدار کے سوا کوئی راہ نہیں۔ مارشل اصغر خاں

اسلامی جمہوری اتحاد برسراقتدار آکر ظالموں کے ہاتھ کاٹ دے گا۔ نواز شریف

انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز (۳ نومبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول کی ایک سرخی یہ تھی :

Islamic forces will emerge triumphant (Fazle Haq.)

روزنامہ جنگ (۳ نومبر ۱۹۸۸) بھٹو پارٹی کے تذکرے سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں یا تو بھٹو پارٹی کے لیڈروں کی تقریریں تھیں۔ یا مخالف پارٹی کی طرف سے بھٹو پارٹی کی مذمت۔ ایسا محسوس ہوا جیسے تمام دوسری جماعتوں کے اوپر بھٹو پارٹی کابوس بن کر سوار ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ اپنے کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کر رہے ہیں۔ اخبار جنگ میں جماعتِ اسلامی کے پروفیسر عبدالغفور کا ایک احتجاجی خط تھا جس میں انھوں نے اخبار جنگ سے شکایت کی تھی کہ " پاکستان کی انتخابی مہم میں جنگ کے نمائندے متعصبانہ اور جانبدارانہ انداز میں رپورٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی اتحاد کے اجتماعات گھٹا کر شائع کرتے ہیں یا بالکل شائع نہیں کرتے۔

صفدار سے کراچی تک بنگلہ دیش کے ایک صاحب کا ساتھ رہا۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں بنگلہ دیش کے کئی ہزار آدمی مختلف حیثیتوں سے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۱۹۷۱ میں پاکستان کے خلاف " آزاد بنگلہ دیش " کا جھنڈا اٹھایا تھا۔ مگر آزادی کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ بنگلہ دیش میں کام کے مواقع نہیں ہیں تو وہ پاکستان آکر یہاں کام کرنے لگے۔ اسی طرح بہت سے بنگلہ دیشی مسلمان ہیں جو یورپ اور امریکہ جاکر اپنے لیے کام تلاش کر رہے ہیں ــــــــــ " سونار بنگلہ " جب نعرہ تھا تو ہر آدمی کو سونار بنگلہ سے دل چسپی تھی۔ مگر سونار بنگلہ جب واقعہ بن گیا تو اب کسی کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۷۰ - ۱۹۷۱ میں اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کی تحریک ختم کر دو اور پاکستان کی "ماتحتی" میں رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کا کام کرو تو سارے بنگلہ دیش میں کوئی ایسے شخص کا ساتھ نہ دیتا۔ اس کے برعکس شیخ مجیب الرحمن کی آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کا ساتھ دینے کے لیے تمام بنگالی مسلمان امنڈ پڑے۔ حالاں کہ بالآخر اس کا جو انجام ہونا تھا وہ صرف یہ کہ شیخ مجیب الرحمن کو خود بنگالی مسلمان مار ڈالیں اور بنگلہ دیش دنیا کا سب سے زیادہ پست اور کمزور ملک بن کر رہ جائے۔

جذباتی رہنمائی اور حقیقت پسندانہ رہنمائی میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ مگر مسلمان ہر ملک میں، ایک یا دوسری صورت میں جذباتی رہنماؤں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ بربادی اور ہلاکت کی صورت میں بار بار اس کے نتیجہ کا سامنے آنا بھی انھیں جذباتی رہنماؤں کے پیچھے دوڑنے سے روکنے والا نہ بن سکا۔

۴ نومبر کی دوپہر کو کراچی پہونچا۔ ظہر کی نماز یہاں ایرپورٹ کی مسجد میں پڑھی۔ "ایرپورٹ" کے ساتھ "مسجد" گویا دنیا کے ساتھ دین کو جوڑنے کی کوشش ہے۔ اسلام کے مطابق دینداری یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو چھوڑ کر روحانی جزیرہ میں چلا جائے۔ صحیح دینداری یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ دیندار بنا رہے۔ اس کا جسم بظاہر دنیا میں دکھائی دے مگر اس کا دل خدا کی یاد میں مشغول ہو۔

کراچی سے دہلی کے لیے میرے علاوہ تقریباً ایک درجن مسافر اور تھے۔ ان کے عورتیں اور بچے بھی تھے۔ دہلی کے مسافروں کو انتظارگاہ کے ایک حصہ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ یہاں ان ہندستانیوں کے بچے مستقل طور پر شور و غل کرنے میں مشغول تھے اور اسی کے ساتھ ان کی مائیں بھی۔ مغربی دنیا میں ہندستانیوں کو بہت حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اور مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ ہندستانی انسان اخلاقی اعتبار سے اتنے پست ہو چکے ہیں کہ مقابلۃً اگر دیکھا جائے تو وہ مغربی انسان کے مقابلہ میں غیر انسان نظر آئیں گے۔ باہر کی دنیا میں چھوٹے چھوٹے ملک بھی ہندستان سے بہتر نظر آتے ہیں۔ ہندستان کا انسان میرے تجربہ میں، بااصول زندگی سے واقف نہیں۔ وہ صرف ایک چیز جانتا ہے، اور وہ اس کی اغراض اور خواہشیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان انسانی آبادی سے زیادہ ایک جنگل کے مشابہ ہے۔

اور جنگل میں محفوظ طور پر زندہ رہنے کی صورت صبر و اعراض کے سوا اور کچھ نہیں۔

۴ نومبر کو کراچی سے دہلی آتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے پاس کی سیٹ خالی تھی۔ دوران پرواز اچانک ایک صاحب آئے اور اس پر بیٹھ گیے۔ دیکھا تو وہ جناب فطین اشرف صدیقی (پیدائش ۱۹۶۲) تھے۔ وہ سیتامڑھی (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل مسقط (سلطنت عُمان) میں بہ سلسلۂ روزگار مقیم ہیں۔ گفتگو کے دوران پاکستان کے آئندہ ہونے والے الکشن (۱۶ نومبر ۱۹۸۸) کا ذکر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں بڑی تعداد میں پاکستان کے لوگ آباد ہیں۔ ان کا عام خیال یہ ہے کہ اس الکشن میں "اسلامی اتحاد" کے لوگ جیتیں گے اور وہی آئندہ حکومت بنائیں گے۔ خاص طور پر "اسلامی جماعت" کے لوگ تو اس طرح بات کرتے ہیں گویا پاکستان کا سیاسی مستقبل انھیں کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ اگر کھلا الکشن ہوتا ہے تو یقینی ہے کہ بے نظیر بھٹو کی پارٹی جیتے گی اور وہی حکومت بنائے گی۔ یہ بات الکشن سے دو ہفتہ پہلے ہو رہی تھی جب کہ دنیا بھر کے "اسلام پسند" پاکستان میں "اسلامی جماعت" کی کامیابی کا بالکل یقین کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ فطین اشرف صدیقی صاحب کو میرے اس بیان پر بہت تعجب ہوا۔

میں نے کہا کہ پاکستان کا یہ الکشن ایک کسوٹی ہے۔ ایک رائے پاکستان کے اور دنیا بھر کے "اسلام پسندوں" کی ہے اور ایک رائے میری ہے۔ اس معاملہ میں اگر "اسلام پسند" لوگوں کی رائے درست نکلی تو وہ لوگ بابصیرت ہیں اور میں بے بصیرت۔ اس کے برعکس اگر میری رائے درست ثابت ہو تو آپ کو ماننا ہوگا کہ میں بابصیرت ہوں اور وہ لوگ بے بصیرت۔ فطین اشرف صاحب یہ سن کر ناقابل فہم تعجب کے ساتھ خاموش ہو گیے۔

آج ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۶ نومبر کے پاکستانی الکشن میں بھٹو پارٹی نے، ووٹروں کے لیے شناختی کارڈ کی شرط جیسے بعض ناموافق حالات کے باوجود سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ یکم دسمبر ۱۹۸۸ کو بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ دوسری طرف پاکستان کی "اسلامی جماعت" کا یہ حال ہوا کہ اس کے تمام امیدوار ہار گیے۔ پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں اس کو کوئی سیٹ نہ مل سکی۔

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ وہ حقائق کے بجائے امانی میں جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاملات میں صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے ۔ پاکستان کے "اسلامی مفکرین" ۴۰ سال تک یہ کہتے رہے کہ پاکستان کے سارے مسلمان اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ صرف چند سیاسی حکمراں ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے عوام کو اگر آزادانہ اظہارِ رائے کا موقع ملے تو وہ یقینی طور پر اسلامی نظام کے حق میں رائے دیں گے ۔ مگر پہلے ہی آزادانہ انتخاب نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا۔

اسی بے بصیرتی کی بنا پر ایسا ہوا کہ پاکستان کے قیام (۱۹۴۷) کے بعد سے ۴۰ سال تک ان کی ساری کوشش حکمرانوں کو سیاسی اقتدار سے ہٹانے یا انھیں پھانسی دینے پر مرتکز رہی۔ مگر حکمرانوں کو ہٹانے کے بعد جب عوامی الکشن ہوا تو معلوم ہوا کہ اسلامی نظام کی راہ میں اصل رکاوٹ حکمران نہیں بلکہ خود پاکستانی عوام تھے ۔ اگر یہ مسلم رہنما صحیح بصیرت کے حامل ہوتے تو ۱۹۴۷ کے بعد وہ اپنی ساری کوشش عوام کا ذہن بنانے میں لگا دیتے ۔ مگر اپنی غلط تشخیص کی بنا پر انھوں نے اپنی ساری کوشش حکمراں افراد کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں لگا دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت اور طاقت کا بے شمار سرمایہ صرف کرنے کے باوجود کوئی مثبت فائدہ ان کے حصہ میں نہ آسکا۔

پاکستان ایرلائنز پر آج (۴ نومبر ۱۹۸۸) کے پاکستانی اخبارات تھے ۔ ہر ایک میں صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی : "مالدیپ پر ہندستانی فوج کا حملہ" اس کے ساتھ ہر اخبار میں، ایک یا دوسرے لفظوں میں یہ بات تھی کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور پاکستان میں اسلام کا نظام ہی نافذ ہوگا۔

میں نے سوچا کہ یہ اخبارات اگر یہ لکھتے تو زیادہ صحیح ہوتا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قومی دھوم کے لیے بنا ہے اور پاکستان میں اسلام کے نام پر قومی دھوم جاری رہے گی۔ اور اس کا ایک ثبوت مذکورہ بالا خبر ہے ۔ اگر پاکستان کے صحافیوں میں اسلام کا مزاج ہوتا تو وہ اس خبر کو اس کی صحیح شکل میں چھاپتے ۔ مگر اس کو انھوں نے اپنے مخصوص قومی سانچہ میں ڈھال کر شائع کیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک مالدیپی تاجر (عبداللہ لطفی) نے کولمبو کے پاس ایک پولٹری فارم میں اپنا مرکز بنایا۔ وہاں اس نے لنکا کے دہشت گرد نوجوانوں کو بھرتی کر کے ایک دستہ تیار کیا۔ ان کو کشتیوں کے ذریعہ اس نے مالدیپ میں اتارا اور مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کی رہائش گاہ

پر حملہ کر دیا۔ اس وقت مامون عبد القیوم نے پڑوسی ہندستان سے مدد کی درخواست کی۔ ہندستان سے بذریعہ ہوائی جہاز فوج بھیجی گئی جس نے بغاوت کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ واضح ہو کہ مالدیپ کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔

۴ نومبر کو میں پیشگی اطلاع کے بغیر دہلی پہونچا تھا۔ اس لیے یہ معلوم تھا کہ ہمارے دفتر کا کوئی آدمی ایرپورٹ پر موجود نہ ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کے ذریعہ دفتر میں اپنی آمد کی اطلاع دیدوں۔ تاکہ وہاں سے کوئی شخص آجائے۔ مگر ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد آدمی کو امیگریشن کی کھڑکی پر لائن لگانی پڑتی ہے اور یہاں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پبلک ٹیلی فون باہر کے حصہ میں تھا۔ میں نے چاہا کہ امیگریشن کی لائن میں لگنے سے پہلے میں ٹیلی فون کردوں تاکہ جب میں یہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلوں، اس وقت تک دفتر سے کوئی شخص آچکا ہو۔

اندر صرف پولس کا ٹیلی فون تھا۔ میں پولس کے دفتر میں گیا اور اپنی ضرورت بیان کی۔ پولس کا آدمی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ دفتر کا ٹیلی فون ہے۔ آپ پبلک بوتھ پر جا کر ٹیلی فون کریں۔ مگر اس نے میری ضرورت محسوس کی اور فوراً ٹیلی فون کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ کریجیے۔ پہلے زیرو گھمائیے، اس کے بعد اپنا نمبر ڈائل کیجیے، اس نے کہا۔ چنانچہ میں نے پولس کے دفتر سے ٹیلی فون کر دیا۔ جب میں اندر کی کارروائیوں سے فارغ ہو کر باہر نکلا، تو وہاں دفتر کا آدمی بھی آچکا تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اپنی ضرورت کو معقول طور پر پیش کر سکیں تو فریق ثانی خود اپنے ضمیر کے تحت اس کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے، خواہ وہ پولس کا آدمی ہو یا غیر پولس کا آدمی۔

۱۔ ڈاکٹر رالف سسن (Ralph R. Sisson) اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک (امریکہ) میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ وہ مذاہب کی عبادات ورسوم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں آئے اور اسلام کی عبادت کے موضوع پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ۲۷ جنوری کو انھوں نے دوبارہ صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور اپنے موضوع کے بارہ میں مزید گفت گو کی۔ صدر اسلامی مرکز نے خاص طور پر ان کو نماز کا فلسفہ اور اس کی حقیقت سمجھائی۔ وہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کے کہنے پر انھوں نے عملاً ایک وقت کی نماز صدر اسلامی مرکز کے ساتھ دہلی کی ایک مسجد میں پڑھی۔

۲۔ ناصر الدین شیخ صاحب نے اس سے پہلے "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ترجمہ گجراتی زبان میں کیا تھا اور اس کو بمبئی کے ایک گجراتی اخبار میں شائع کرایا تھا۔ اب انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا ہے اور اس کو پمفلٹ کی صورت میں زیادہ تعداد میں شائع کیا ہے۔ جو لوگ انسان اپنے آپ کو پہچان کا مراٹھی ترجمہ حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ ذیل کے پتہ پر دو روپیہ کا ٹکٹ بھیج کر اسے حاصل کر سکتے ہیں :

3/5, 9th Cross Lane, P. Bapurao Marg, Bombay 400004

ناصر الدین شیخ صاحب خاتون اسلام اور تعمیر ملت کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں۔

۳۔ نیویارک (امریکہ) سے مولوی ابراہیم مامون اپنے خط مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۸۹ میں لکھتے ہیں : نیویارک میں میری ملاقات پروفیسر تھامس سے ہوئی۔ وہ مجھ سے عربی سیکھتے تھے اور میں ان سے انگریزی سیکھتا تھا۔ بہت پہلے انھوں نے اسلام کی تاریخ کے بارہ میں پڑھا تھا۔ میں نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی ساری کتابیں ان کو مطالعہ کے لیے دیں۔ مطالعہ کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا اسلامی نام خالد تھا۔ افسوس کہ جلد ہی ۵۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۴۔ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ (سابق پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ اپنے خط ۲ دسمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : اس زمانہ میں جس طرح آپ اسلام کی توضیح وتشریح فرماتے

ہیں وہ اسلام کو صحیح رنگ میں پیش کرنے کا ایک جہاد ہے۔ تنگ نظر لوگوں نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے۔ کیوں کہ اس میں ان کا اپنا مفاد ہے۔ جب تک انا کو فنا نہیں کیا جائے گا اسلام کو انسان سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اسلام کے اندر تسلیم کا حکم واضح ہے اور تسلیم بھی صرف اللہ تعالیٰ کے آگے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ صحیح اسلام سے دنیا کو واقفیت بہم پہنچانے میں سرگرم ہیں (چورنگھی روڈ، کلکتہ)

۵۔ الرسالہ کے مضامین دوسرے پرچوں میں کثرت سے نقل کیے جارہے ہیں، اس طرح الرسالہ کا فکر مسلسل وسیع تر دائرہ میں پھیل رہا ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اور تاریخی جماعت جمعیۃ علماء ہند کا ہفت روزہ ترجمان الجمعیۃ کے نام سے نئی دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۳-۹ فروری ۱۹۸۹ میں الرسالہ کا ایک مضمون نمایاں طور پر مع مکمل حوالہ اس عنوان کے تحت شائع کیا ہے: تحریک بابری مسجد، کتنی ناکام کتنی کامیاب۔

۶۔ بھوپال کے ساتھی الرسالہ کا ہندی اڈیشن نکالنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ فی الحال یہ رسالہ سہ ماہی ہوگا۔ آئندہ حسب حالات اس کو ان شاء اللہ ماہانہ کیا جا سکے گا۔

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ نومبر ۱۹۸۸ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میرٹھ کا سفرنامہ کافی معلوماتی ہے اور دلسوز بھی۔ میرٹھ کے واقعات تو بہت سے اخبارات اور اکابرین ملت نے بیان کیے ہیں، لیکن ان واقعات کے اسباب تک جس گہرائی سے آپ نے نظر ڈالی ہے اس میں آپ بس یوں سمجھیے کہ بلا مقابلہ منتخب ہوئے ہیں۔ ہر واقعہ کی تفصیل اور اس کا پس منظر جس کے سبب سے وہ واقعہ نمودار ہوا، بڑے تدبر، تحقیق، تلاش اور جستجو سے جمع کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کی پیش کردہ تجاویز بہت بیش قیمت اور کارآمد ہیں۔ اگر ان پر صدق دل سے عمل کیا جائے تو کبھی فساد کی نوبت ہی نہ آئے۔ (محی الدین احمد۔ حیدرآباد)

۸۔ مسٹر ہربنس لال (نئی دہلی) لکھتے ہیں: دو سال پہلے جامع مسجد دہلی کے بک اسٹال پر الرسالہ دیکھا تھا۔ اس کو خرید کر پڑھا۔ مجھے اچھا لگا۔ اب میں دو سال سے اس کا مستقل خریدار ہوں۔ آپ کے رسالہ نے میری گھریلو زندگی میں میری بڑی مدد کی ہے۔ خداوند کریم سے

پرارتھنا ہے کہ آپ لمبی عمر تک جئیں اور زندگی میں بھرپور خوشیاں پائیں اور لوگوں کو سچا گیان، مانز زندگی عطا کرتے رہیں۔ خط کے ساتھ ایک چک (۴۸ روپیہ) کا روانہ کر رہا ہوں۔ میری خریداری جاری رکھیں۔

۹۔ سوامی سدانند (حال مقیم نیویارک) لکھتے ہیں: میں آپ کے خیالات اور تحریر سے بہت متاثر ہوں۔ آپ کے فراخدلانہ خیالات کا نہ صرف مداح ہوں بلکہ میں تو معتقد بھی ہوگیا ہوں۔ خداوند کریم آپ کو لمبی زندگی اور صحت عطا کریں تاکہ آپ دیش کی اور عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ قرآن پاک اور حدیثوں کے حوالہ جات سے انسانیت کی وسعت کی تشریح بہت بڑا کام ہے جو آپ دن رات کر رہے ہیں۔

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: گزشتہ دنوں میرا بنگلہ دیش کا سفر ہوا تھا۔ راستہ میں مطالعہ کے لیے اسلامی مرکز کی چند کتابیں اور الرسالہ کے متعدد شمارے ساتھ رکھ لیا تھا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں کے دینی مدارس کے طلبہ نے غیر معمولی دل چسپی ظاہر کی اور اب وہاں سے واپس آیا ہوں تو میرے پاس ایک بھی کتاب نہیں ہے اور نہ الرسالہ کے شمارے ہیں۔ بنگلہ دیش کے دو صاحبان کے نام گفٹ کے طور پر میری طرف سے الرسالہ جاری کر دیں۔ (محمد امین، لکھنؤ)

۱۱۔ الرسالہ اللہ کے فضل وکرم سے نہ صرف دینی، اخلاقی، تعمیری پہلو سے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو رہا ہے، بلکہ اور بھی کئی پہلوؤں سے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مسٹر کشن جیونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) اور مسٹر راج تیواری (بھوپال) نے بتایا کہ انھوں نے الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو اردو میں پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھی ہے۔ محترمہ فرزانہ (حیدرآباد) لکھتی ہیں کہ " ایک انگلش میڈیم کی طالبہ ہونے کے باوجود آج میں اردو زبان اچھی طرح لکھنے اور پڑھنے کے قابل جو ہوئی ہوں وہ آپ کی عنایت اور الرسالہ کی بدولت ہے۔ مجھے دین سے اتنی لگن اور محبت الرسالہ کے مطالعہ سے ہوئی۔ میں اب پوری طرح مسلمان ہوں۔ ہر نماز میں آپ کے لیے اور الرسالہ کے لیے دعا کرتی ہوں۔

۱۲۔ سلمان رشدی کے بارہ میں آئندہ انشاء اللہ ایک مکمل رسالہ شائع کیا جائے گا۔

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کرکے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

صفحات ۳۶۸ ہدیہ ۴۰ روپیہ

اطلاع

ماہ فروری میں انگریزی الرسالہ کے بارہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مسلسل خسارہ کی وجہ سے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب قارئین کے اصرار اور خواہش کی بنا پر فوری طور پر اس کو بند کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا ہے، تاہم انگریزی الرسالہ کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے اہلِ خیر حضرات کا کافی تعاون درکار ہے تاکہ خسارہ کی تلافی کرکے اس کو جاری رکھا جا سکے۔ امید ہے کہ اہلِ خیر حضرات اس دعوتی کام میں فیاضانہ تعاون فرمائیں گے۔

صدر اسلامی مرکز

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

شمارہ ۱۵۰ مئی ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

دو انسان

غزوۂ احد (۳ ھ) میں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگیے۔ مسلمانوں میں بہت سے لوگ زخمی یا شہید ہوگیے۔ جنگ کے خاتمہ پر مشرکین کا سردار ایک ٹیلہ پر کھڑا ہوا اور فاتحانہ جذبہ کے تحت بلند آواز سے پکار کر کہا: لنا عُزّیٰ ولا عُزّیٰ لکم (ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر مسلمانوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم (اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں)

ان دونوں فقروں کی نفسیات پر غور کیجیے۔ مشرکین کا فقرہ فخر کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کے برعکس اہلِ ایمان کا فقرہ عبدیت کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ۔ مشرک اپنے اکابر کو بُت بنا کر انھیں پوجتے ہیں۔ وہ فخر کی نفسیات میں جینے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مومن اللہ رب العالمین کو اپنا معبود بناتا ہے، وہ اس کے آگے جھک کر اس کے بڑے ہونے کا اور اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ یہ چیز مومن کو تواضع کی نفسیات میں جینے والا انسان بنا دیتی ہے۔

یہی نفسیاتی فرق وہ سب سے بڑی پہچان ہے جو اہل حق اور اہل باطل کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اہل حق عین اپنے مزاج کے تحت فخر اور ناز کے جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ انھیں تواضع میں لذت ملتی ہے۔ اپنے کو غیر نمایاں کرنا ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ ان کا بولنا آہستگی کا بولنا ہوتا ہے۔ ان کی ہر روش میں نرمی اور اعتدال کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اللہ کو سمجھتے ہیں، اور اپنے آپ کو بے کچھ کے مقام پر بٹھا کر راضی ہوجاتے ہیں۔

اہل باطل کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فخر اور گھمنڈ کے جذبات میں جیتے ہیں۔ وہ شہرت اور سرداری کے مقام پر بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو ان کا ہر بول انانیت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ چلتے ہیں تو ان کا چلنا ناز کا چلنا ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، وہ صرف اس وقت مطمئن ہوتے ہیں جب کہ اپنے آپ کو سب سے اونچی کرسی پر بٹھانے میں کامیاب ہوجائیں۔

شرک کی نفسیات سے فخر پیدا ہوتا ہے اور توحید کی نفسیات سے تواضع اور عبدیت۔

دماغی محنت

مسٹر کمال علیگ (پیدائش ۱۹۵۸) نے یکم فروری ۱۹۸۹ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بتایا۔ وہ پہلے سگریٹ پیتے تھے۔ ۱۹۸۴ سے انھوں نے مکمل طور پر سگریٹ کو چھوڑ دیا ہے۔ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۱ تک وہ تعلیم کے سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے۔ اس زمانہ میں وہ "چین اسموکر" تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ رات کو ایک بجے کا وقت ہوگیا۔ اس وقت انھیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دیکھا تو دیا سلائی ختم ہو چکی تھی۔ ہیٹر بھی بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف اندر سے سگریٹ کی سخت طلب اٹھ رہی تھی، دوسری طرف کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جس سے سگریٹ کو جلایا جاسکے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان کے دماغ پر یہ سوال چھایا رہا۔ وہ اس سوچ میں پڑے رہے کہ سگریٹ کو کس طرح جلایا جائے۔ آخر ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی۔ ان کے کمرہ میں بجلی کا سو واٹ کا بلب لٹک رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اس جلتے ہوئے بلب میں اگر کوئی ہلکی چیز لپیٹ دی جائے تو کچھ دیر کے بعد گرم ہو کر وہ جل اٹھے گی۔ انھوں نے ایک پرانا کپڑا لیا اور اس کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر جلتے ہوئے بلب کے اوپر لپیٹ دیا۔ تقریباً ۵ منٹ گزرے ہوں گے کہ کپڑا جل اٹھا۔ کمال صاحب نے فوراً اس سے اپنا سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگے۔

اسی کا نام "دماغی محنت" ہے۔ عام لوگ محنت کے نام سے صرف جسمانی محنت کو جانتے ہیں۔ مگر محنت کی زیادہ بڑی قسم وہ ہے جس کا نام دماغی محنت ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی ترقیاں وہی ہیں جو دماغی محنت کے ذریعہ حاصل کی گئی ہیں۔ جسمانی محنت پھاوڑا چلانے یا ہتھوڑا مارنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔ مگر ایک سائنٹفک فارم یا جدید طرز کا ایک کارخانہ بنانے کا کام صرف دماغی محنت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جسمانی محنت اگر آپ کو ایک روپیہ فائدہ دے سکتی ہو تو آپ دماغی محنت کے ذریعہ ایک کرور روپیہ کما سکتے ہیں۔ جسمانی محنت صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ دوڑ کر بازار جائے اور ایک دیا سلائی خرید کر لائے اور اس کے ذریعہ سے اپنی سگریٹ سلگائے۔ مگر دماغی محنت ایسی حیرت انگیز طاقت ہے جو دیا سلائی کے بغیر آپ کے سگریٹ کو سلگا دے، جو ظاہری آگ کے بغیر آپ کے گھر کو روشن کر دے۔

حمد اور تضرع

عن ابی اُمامة، قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّی لِیجعل لی بَطحاءَ مکةَ ذَھَباً، فقلتُ: لا یا ربِّ، و لکن اَشبعُ یوماً و اَجُوعُ یوماً۔ فاذا جعتُ تضرَّعتُ الیك و ذکرتك، و اذا شبعتُ حمدتُك وشکرتُك

(رواہ احمد و الترمذی)

حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے میرے سامنے یہ پیش کش کی کہ مکہ کی وادی کو تمہارے لئے سونا بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب، نہیں۔ بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب مجھے بھوک لگے تو میں تیری طرف عاجزی کروں اور تجھ کو یاد کروں۔ اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی قدرت کا اعتراف کرکے اس کے آگے اپنے عجز کا اظہار کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرکے اس پر شکر کرنے والے بن جائیں۔ یہ دونوں باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں بتائی گئی ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا عملی تجربہ وہ ہے جو بھوک اور سیری کی صورت میں انسان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جب آدمی کو بھوک لگتی ہے، جب اس کو پیاس ستاتی ہے، اس وقت اس کو آخری حد تک اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کمزور اور محتاج ہے۔ اسی طرح جب بھوک پیاس کی شدت میں مبتلا ہونے کے بعد اس کو کھانا اور پانی ملتا ہے تو اس وقت اس کو آخری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ کھانا اور پانی کتنی زیادہ قیمتی چیزیں ہیں۔

اس دنیا میں آدمی کو بھوک کا تجربہ بھی ہونا چاہئے اور سیری کا بھی۔ اس پر یہ کیفیت بھی گزرنی چاہئے کہ اس کا حلق پیاس کی وجہ سے سوکھ گیا ہو، اور اسی کے ساتھ یہ کیفیت بھی کہ اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور اس کے بعد اس کا وہ حال ہو گیا جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

ذھب الظمأ وابتلت العروق (پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ روزہ اسی قسم کے حالات پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ روزہ کے ذریعہ آدمی کو بھوک اور سیری دونوں کا تجربہ کرایا جاتا ہے، تاکہ وہ خدا کے آگے عاجزی کرنے والا بھی بنے اور اسی کے ساتھ اس کا شکر کرنے والا بھی۔

قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بنو .... رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا .... پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے .... اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی، اور تاکہ تم اس کے شکرگزار بنو (البقرہ ۸۵ - ۱۸۳)

ان آیات میں روزہ کے دو خاص فائدے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر کرنے والا بنے۔

قرآن میں جس دینی کیفیت کے لئے تقویٰ اور شکر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی کو حدیث میں تضرع اور شکر کہا گیا ہے۔ یہی دونوں کیفیتیں عبدیت کی اصل ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس آدمی کے اندر تضرع اور تقویٰ کے احساسات ابھارتا ہے۔ اور اللہ کے عطیات کا احساس اس کے اندر حمد اور شکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو تو یہ دونوں کیفیتیں ہر روز ہر تجربہ سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی رہیں گی۔ وہ ہر واقعہ سے یہ دونوں ربانی غذائیں حاصل کرتا رہے گا۔ پھر انھیں دونوں کیفیات کو مزید شدت اور عمومیت کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے رمضان کے مہینہ کا روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ رمضان کا روزہ گویا عمومی تربیت کا خصوصی کورس ہے۔

Camera convicts traffic light jumpers

Time
Lane number
film number
Date
1 second after traffic lights turns red
Site number
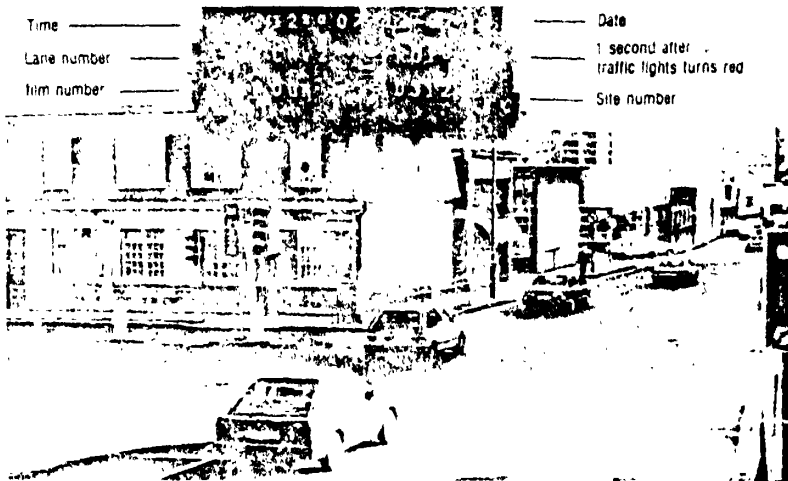
Fateful moment: One second after the lights turned red a car is filmed crossing a Nottingham junction. A second later, below, the vehicle's speed is logged.

Ten motorists yesterday became the first in Britain to be prosecuted and fined for going through red traffic lights on the evidence of remote-controlled cameras which photographed them committing the offence. They fell foul of a pioneering scheme by Nottinghamshire police in which cameras were installed at two busy junctions in Nottingham.

The computer-operated cameras are activated by vehicles passing over wires under the surface of the road. They take still photographs only when the traffic lights are at red, capturing the registration number of the offending vehicle. The scheme, which is being monitored by the Home Office, is likely to be extended to 12 other busy junctions in Nottinghamshire.

The Times (London) Thursday July 28, 1988.

خفیہ تصویر کشی

مقابل کے صفحہ پر دو تصویریں درج ہیں۔ یہ انگلینڈ کی ایک سڑک سے متعلق ہیں۔ ان کا عنوان ہے: "کیمرہ ٹریفک لائٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پکڑتا ہے۔" اوپر والی تصویر میں ایک گاڑی عین اس نازک لمحہ (Fateful moment) میں پکڑ لی گئی جب کہ وہ لال بتی والے مقام پر ٹریفک قاعدہ کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ یہ گاڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک خاص چوراہہ پر پہنچی۔ اس کے پہنچتے ہی وہاں کی لال بتی جل اٹھی۔ اب اس گاڑی کو وہاں رک جانا چاہئے تھا۔ مگر لال بتی کے باوجود وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔

ڈرائیور کو معلوم نہ تھا کہ مخفی نظام کے تحت اس کا فوٹو لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ اس نے لال بتی کو پار کیا، کیمرہ نے فوراً اس کی تصویر لے لی۔ یہ واقعہ لال بتی جلنے کے صرف ایک سکنڈ بعد پیش آیا۔

نیچے کی دوسری تصویر بھی اسی مذکورہ سڑک سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں بھی ایک گاڑی کے ڈرائیور نے یہ کیا کہ لال بتی جل جانے کے باوجود وہ رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دوبارہ کیمرہ نے فوراً اس کی تصویر لے لی۔ یہ دوسرا واقعہ لال بتی جلنے کے دو سکنڈ بعد پیش آیا۔ پہلی تصویر میں کیمرہ نے ایک سکنڈ کی خلاف ورزی کو پکڑا، اور دوسری تصویر میں دو سکنڈ کی خلاف ورزی کو۔

یہ تصویر لندن کے اخبار ٹائمس (۲۸ جولائی ۱۹۸۸) سے لی گئی ہے۔ اس اخبار میں یہ تصویر ایک خبر کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ کار چلانے والے دس اشخاص اس جرم میں پکڑے گئے اور ان پر جرمانہ کیا گیا کہ انھوں نے سڑک کی لال بتی جل جانے کے باوجود اپنی گاڑی نہیں روکی تھی۔

ان گاڑیوں کو پکڑنے کی یہ کارروائی دور سے کنٹرول کئے جانے والے کیمروں کی شہادت پر عمل میں آئی۔ مذکورہ گاڑیاں سڑک پر تیزی سے گزرتی ہوئی دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ مگر کیمرہ میں ان کی مکمل تصویر پوری طرح محفوظ تھی۔ ان تصویروں کے ذریعہ انھیں بآسانی شناخت کر لیا گیا۔ کیوں کہ ان کیمروں نے عین جرم کے موقع پر ان کی تصویریں لے لی تھیں۔

ان کاروں کے ڈرائیور ناٹنگھم شائر پولیس کی ایک خاص اسکیم کے تحت پکڑے گئے۔ اس اسکیم کے مطابق شہر کے دو معروف چوراہوں پر مخصوص کیمرے نصب کر دئے گئے تھے۔ یہ کیمرے کمپیوٹر سے جڑے ہوئے تھے اور ان کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔

اس اسکیم کے تحت مذکورہ چوراہے پر سڑک کی سطح کے نیچے خاص طرح کے حساس تار رکھ دئے گئے تھے۔ کوئی گاڑی جب اس تار کے اوپر سے گزرتی تو عین اسی وقت اس سے جڑے ہوئے کیمرے متحرک ہو جاتے۔ وہ سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں فوراً مذکورہ گاڑی کا فوٹو لے لیتے۔

سڑک کے نیچے بچھے ہوئے ان تاروں کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ مذکورہ کیمروں کو عین اس وقت متحرک کر دیتے تھے جب کہ سڑک کی بتی لال ہو گئی ہو۔ اب یہ کیمرے خود کار نظام کے تحت گزرنے والی گاڑی کا فوٹو لے لیتے۔ مزید یہ کہ وہ ایسے زاویہ سے گاڑی کا فوٹو لیتے تھے کہ اس کا رجسٹریشن نمبر بھی پوری طرح فوٹو میں آجائے۔

ان کیمروں کی شہادت اتنی قطعی اور اتنی مسلّم تھی کہ ماخوذ افراد کے لئے ان کو غلط ثابت کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ سٹی مجسٹریٹ نے انھیں کی شہادت کی بنیاد پر مس الیسن مارٹن پر ۱۰۰ پونڈ کا جرمانہ کیا۔ اس خاتون نے ایک ہی دن میں دو جگہ اپنی گاڑی لال بتی پر دوڑا دی تھی۔ اسی طرح دوسرے کئی ڈرائیوروں پر مختلف جرمانے لگائے گئے۔ یہ تمام عدالتی سزائیں انھیں کمپیوٹر کیمروں کی لی ہوئی تصویروں کی بنیاد پر دی گئیں جنھوں نے دو سکنڈ اور ایک سکنڈ تک کی خلاف ورزی کو نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ کر لیا تھا۔

اس طرح کے واقعات، قرآن کے لفظوں میں، آیات اللہ (خدا کی نشانیاں) ہیں۔ وہ "نشانی کے روپ میں حقیقت کا اظہار ہیں۔ یہ واقعات دنیوی تجربہ کے ذریعہ آخرت کے تجربہ کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ انسانی سطح پر پیش آنے والے معاملہ کی صورت میں خدائی سطح پر پیش آنے والے معاملہ کو بتا رہے ہیں۔

مذکورہ واقعہ انسان کی خفیہ ریکارڈنگ کی مثال ہے۔ یہی خفیہ ریکارڈنگ زیادہ بڑے پیمانہ پر خدا کی طرف سے ہو رہی ہے۔ انسان کی تمام گزرگاہوں پر خدا کے "تار" لگے ہیں اور اس کے ہر راستہ پر خدا کے "کیمرے" نصب ہیں۔ آدمی جیسے ہی مقررہ حد کو پار کرتا ہے، خدا کا تصویرکشی کا

نظام فوراً متحرک ہو کر اس کو محفوظ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آخرت کی عدالت میں اسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر آدمی کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ انسان کا بنایا ہوا انتظام ہے جو ایک سکنڈ کے بقدر خلاف ورزی کو بھی فوراً پکڑ لیتا ہے پھر جب انسان کے بنائے ہوئے نظام کا یہ حال ہے تو خدا کے بنائے نظام کی گرفت کتنی زیادہ ہوگی۔ انسانی نظام محدود ہے اور خدائی نظام لامحدود۔ اسی سے دونوں نظاموں کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

آدمی اگر اس سنگین حقیقت پر غور کرے تو اس کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں۔ اس کی بولتی ہوئی زبان بند ہو جائے۔ اس کا قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے۔

دنیا میں آدمی کسی سڑک پر صرف اس وقت تک اپنی گاڑی کو غلط چلاتا ہے جب تک اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس سڑک پر ٹریفک پولیس نے اس کی غلطی کو پکڑنے کا طاقت ور انتظام کر رکھا ہے۔ پولیس کے اس انتظام کا علم ہوتے ہی ہر آدمی چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنی گاڑی کو غلط دوڑانے سے رک جاتا ہے۔

اسی طرح آدمی کو اگر اس بات کا پورا یقین ہو جائے کہ اس کے چاروں طرف خدا کی "پولیس" لگی ہوئی ہے جو ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہی ہے اور اس کی ہر چھوٹی یا بڑی کارروائی کا ریکارڈ تیار کرنے میں مشغول ہے تو اس کی ساری سرکشی ختم ہو جائے۔ یہ احساس پیدا ہوتے ہی آدمی ایک محتاط انسان بن جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر لے گا۔

انسان کا بگاڑ اس کا نام ہے کہ وہ اس سنگین حقیقت سے بے خبر ہو۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی اصلاح یہ ہے کہ اس کو اس سنگین حقیقت کا زندہ احساس ہو جائے۔

ایک آیت

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ، اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (الحجرات ۹)

اس آیت میں اس جنگ کا ذکر نہیں ہے جو مسلم عوام اور مسلم حکمراں کے درمیان ہو۔ ایسی جنگ اسلام میں حرام ہے۔ ایک مسلم حکومت جب وہ قائم ہو جائے، تو اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔ خواہ مسلم حکومت میں بگاڑ آگیا ہو، اور خواہ مسلم عوام اس کے خلاف "اصلاح سیاست" کا نعرہ لے کر کیوں نہ اٹھے ہوں۔

اس آیت کا خطاب اسلامی حکومت کے ذمہ داروں سے ہے۔ اور اس میں جس باہمی جنگ (اقتتال) کا ذکر ہے، وہ عام مسلمانوں میں سے دو گروہوں کا آپس میں لڑ جانا ہے اس آیت کا مسلم حکومت اور عوام کے درمیان جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو کسی مسلم معاشرہ میں حاکمانہ اختیار رکھتے ہوں۔ ان کے ماتحت لوگوں میں سے دو فرد یا دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اس وقت حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اس باہمی ٹکراؤ کو ختم کریں۔ حکمرانوں کو چاہئے کہ دونوں فریقوں کے درمیان باہمی رضامندی سے صلح کرا دیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی فریق اپنے بھائی کے خلاف زیادتی کرے تو اس کو طاقت کے ذریعہ ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

اگر مسلم حکومت قائم ہو تو اس آیت کا خطاب مسلم حکمرانوں سے ہوگا۔ اور جہاں مسلم حکومت نہ ہو وہاں اس کے مخاطب علماء اور رہنما ہوں گے۔ اپنی استطاعت کے مطابق ان کا فرض ہوگا کہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے میں دخل دیں اور ہر ممکن دباؤ کو استعمال کر کے معاملہ کو منصفانہ انداز میں ختم کرانے کی کوشش کریں۔

دو کردار

غزوۂ بدر کے بعد مدینہ کے یہودی سردار حُیی بن اخطب اور کعب بن الاشرف مکہ گئے۔ انھوں نے مکہ کے مشرکین سے ملاقاتیں کیں اور انھیں مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسایا۔

اس سلسلہ میں جو مختلف روایتیں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل مکہ نے ان سے کہا کہ تم اہل کتاب اور صاحب علم ہو۔ تم ہمارے بارے میں اور محمد کے بارے میں اپنی رائے بتاؤ۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا ہو اور محمد کیا ہیں۔ مشرکین نے کہا کہ ہم صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ ہم اونٹ ذبح کرکے کھلاتے ہیں۔ ہم لوگوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ہم مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور محمد ایک کمزور شخص ہیں جن کا کوئی وارث نہیں۔ انھوں نے ہمارے رشتوں کو کاٹا۔ حاجیوں پر ڈاکہ ڈالنے والے بنو غفار کے لوگ ان کے ساتھی ہیں۔ پھر بتاؤ کہ ہم اچھے ہیں یا وہ۔ یہودی سرداروں نے کہا کہ تم زیادہ اچھے ہو اور تمہارا طریقہ زیادہ صحیح ہے (تفسیر ابن کثیر الجزء الاول، صفحہ ۵۱۳)

اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب سے ایک حصہ ملا تھا وہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے (النساء ۵۱ - ۵۲)

اس واقعہ میں ایک کردار مشرکین کا ہے اور دوسرا کردار یہود کا۔ مشرکین نے یہ کیا کہ اپنے معاملہ کو اچھا بنا کر دکھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو بگاڑ کر پیش کیا۔ اس کے بعد یہود کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی دشمنی میں اس بیان کو جوں کا توں مان لیا، اور اس کی روشنی میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

یہ دونوں قسم کے کردار آج بھی موجود ہیں "مشرکین" والا کردار ادا کرنے والے بھی، اور "یہود" والا کردار ادا کرنے والے بھی۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں لعنت زدہ ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو کتنا ہی زیادہ اچھا سمجھ رہے ہوں۔

فرضی کہانی

سلمان رشدی (۴۲ سال) کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) جو ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس پر نیو یارک کے ہفت روزہ ٹائم (۱۳ فروری ۱۹۸۹) میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار مسٹر پال گرے (Paul Gray) کا کہنا ہے کہ کتاب کے خلاف مسلمانوں کے عوامی احتجاجات (Public protests) غیر ضروری تھے۔ راقم الحروف خود بھی اس قسم کے احتجاج اور شور وغل کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی کتے پر نہیں بھونکتا۔ کیوں کہ ہاتھی کی عظمت بذات خود کتے کی ہر بھونک کا جواب ہے۔ اور جب چُپ کی زبان کافی ہو تو بولنے کی زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

تاہم اس سلسلہ میں تبصرہ نگار نے جو توجیہہ کی ہے، اس توجیہہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ تاریخ کی جگالی (Rumination on history) ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ اصلاً تاریخی واقعات پر مبنی ہے، اور جب ایسا ہے تو اس کے خلاف ہنگامہ اور احتجاج کیوں۔ مگر یہ مفروضہ بذات خود واقعہ کے مطابق نہیں کہ کتاب میں جو باتیں درج ہیں ان کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی افسانہ ہے اور اپنی تاریخی بنیاد کے اعتبار سے بھی افسانہ۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ کتاب میں جبریل اور محمد کے درمیان تبادلۂ کلام، بظاہر بگڑے ہوئے اور خیالی انداز میں، ایک قصہ پر مبنی ہے جو محمد کی زندگی میں پیش آیا۔ پیغمبر ابتداءً اس پر راضی ہو گئے کہ عرب کی تین دیویوں کا اعتراف قرآن میں شامل کر دیں، اور بعد کو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ آیتیں شیطان کی الہام کی ہوئی تھیں۔ اگر محمد خود یہ اقرار کرنے کے لیے تیار تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس قدیم گزرے ہوئے واقعہ کا حاشی اور افسانوی بیان آج کیوں اتنے ہنگامہ کا سبب بن جائے:

> The Gibreel-Mahound exchanges are based, in an obviously distorted and hallucinatory manner, on an episode in the life of Muhammad: the Prophet's early willingness to include in the Quran an acknowledgment of three female deities and his later repudiation of these verses as satanically inspired. If Muhammad himself was willing to admit that he had been deceived, it is difficult to see why a tangential, fictional version of this long-ago event should cause such contemporary furor (p. 42).

اس اقتباس میں جس "واقعہ" کا ذکر ہے، وہ سورہ النجم سے تعلق رکھتا ہے۔ متعلقہ آیت
حسب ذیل ہیں :

افرأیتم اللات والعزیٰ۔ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ الکم الذکر ولہ الانثیٰ۔ تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ (النجم ۱۹-۲۲)

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے اور منات کو۔ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہے

قدیم عرب میں تین بڑے بت تھے ——— لات، عزیٰ، اور منات۔ ان بتوں کو اس
میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان بتوں کی بڑائی بیان کرنے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کے کلمات
کر رکھے تھے۔ یاقوت الحموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفا
کرتے تھے : واللات والعزیٰ ومناۃِ الثالثۃِ الاخریٰ ھٰؤلاء الغرانیق العُلیٰ وإ
شفاعتھنّ لتُرتجیٰ (قسم ہے لات اور عزیٰ کی اور تیسرے منات کی۔ یہ سب بلند مرتبہ ہیں
کی سفارش ضرور متوقع ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں سورہ النجم کی مذکورہ آیتیں اتریں تو آپ نے حسب معمول
مجمع میں ان کو سنایا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کچھ مشرک لوگ بھی موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے : افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخ
تو بعض مشرکین نے اس میں اپنے الفاظ ملا دیئے۔ اپنے بتوں کے نام سن کر وہ فوراً وہ الفا
پڑے جو ان بتوں کی نسبت سے پہلے سے ان کے یہاں رائج تھے اور جن کو وہ ان بتوں کے نام کے س
جوڑ کر کہا کرتے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے : تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتھن تُرتجیٰ

ان دوسرے الفاظ کا کوئی بھی تعلق پیغمبر اسلام سے نہ تھا۔ آپ نے تو صرف اول الذکر ا
(افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ) فرمائے تھے۔ ثانی الذکر الف
(تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ) تمام تر مشرکین کے الفاظ تھے جن کو ا
نے آواز میں آواز ملا کر اپنی طرف سے کہہ دیا۔ یہی بات بعض مفسرین نے ان الفاظ میں کہی ہے

ان الشیطان اوقع فی مسامع المشرکین ذلک فتوھموا انہ صدر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شیطان نے مشرکوں کے کان میں یہ الفاظ دیئے۔ پس مشرکوں نے گمان کر لیا کہ یہ خود رسو

لیس کذلک فی نفس الامر بل انما کان من صنیع شیطان لا من رسول الرحمٰن صلی اللہ علیہ وسلم
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۰)

صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ وہ دراصل شیطان کا کلام تھا نہ کہ رسول رحمانؐ کا کلام۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی نہ کسی شکل میں ہر شخص کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً حکمراں پارٹی کا لیڈر ایک بار تقریر کر رہا تھا۔ مجمع میں اس کی پارٹی کے لوگ بھی تھے اور دوسری پارٹیوں کے لوگ بھی۔ تقریر کے دوران ایک بار لیڈر نے (بطور تنقید) مخالف پارٹی کے لیڈر کا نام لیا۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے جب اپنے لیڈر کا نام سنا تو عین اسی وقت وہ " زندہ باد، زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے مخالف پارٹی کے لیڈر کے لیے زندہ باد کہا تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے تو اس کا نام محض تنقید کے لیے لیا تھا، یہ دراصل مخالف پارٹی کے لوگ تھے جو اس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر زندہ باد کے الفاظ بولنے لگے۔

واقعہ کی سادہ شکل وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی۔ مگر اسلام کے کچھ مخالفوں نے اس واقعہ کو غلط صورت دے کر ایک خود ساختہ کہانی بنائی۔ انھوں نے مشرکین کے قول کو پیغمبر کا قول قرار دیدیا۔ اور کہا کہ پیغمبر اسلام پر سورۃ النجم اتاری جا رہی تھی جب اس کا سلسلہ مناۃ الثالثۃ الاخریٰ تک پہونچا تو اس کے بعد شیطان نے مذکورہ الفاظ آپ پر القا کر دیئے۔ آپ نے قرآن کی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر مجمع میں پڑھ دیا۔ بعد کو آپ کو غلطی کا احساس ہوا تو آپ نے اعلان کیا کہ مذکورہ کلام خدا کا کلام نہیں تھا۔ وہ شیطان کا کلام تھا۔ یہ کہہ کر اس کو قرآن سے حذف کر دیا۔

یہ ساری کہانی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بالکل لغو ہے، اور اس سے بھی زیادہ لغو بات یہ ہے کہ اس کو تاریخی حیثیت دے کر اس کی روشنی میں ایک پورا افسانہ بنایا جائے اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن کو کلام خداوندی کے بجائے، نعوذ باللہ، کلام شیطانی قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کی صداقت کا بذات خود یہ کافی ثبوت ہے کہ معاندین اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے۔ ان کے پاس اپنے معاندانہ جذبہ کی تسکین کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ بطور خود ایک جھوٹی کہانی بنائیں اور اس کو قرآن کی طرف منسوب کر کے قرآن کی سچائی کو ناکام طور پر داغدار کرنے کی کوشش کریں۔

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد نے رجب۔ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) میں اسپین کو فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ طارق جب آبنائے جبرالٹر کے ذریعہ سمندر کو پار کرکے اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی فوج کو اسپینیوں سے جنگ پر اکساتے ہوئے کہا:

این المفر۔ البحر من ورائکم والعدو امامکم۔ فلیس لکم واللہ الا الصدق والصبر	اب بھاگنے کی جگہ کہاں۔ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے۔ خدا کی قسم اب تمہارے لئے صدق اور صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

حقائق کا گہرا تجزیہ بتاتا ہے کہ کشتیوں کو جلانے کا یہ قصہ محض داستان گو قسم کے لوگوں کی ایجاد ہے، وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ ایک عرب مصنف نے لکھا ہے کہ اسپین میں ایک مثل ہے کہ میں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں (احرقتُ کل سُفُنی) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت خرچ کردی۔ یعنی جنگ کرو یا مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ (ای بذلت کل طاقتی، بمعنی قاتلوا او موتوا) ممکن ہے کہ یہی اسپینی مثل عربی میں ترجمہ ہوئی ہو، اور پھر کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنی میں لے کر بطور خود کشتیوں کو جلانے کا افسانہ گھڑ لیا ہو۔

طارق بن زیاد کا قافلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں اسپین میں داخل ہوا ہے۔ اس زمانہ کی معاصر تاریخ میں یا کسی بھی قریبی زمانہ کی تاریخی دستاویز میں کشتیوں کے جلانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ابتدائی دور کی تمام کتابیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ قصہ پہلی بار ان کتابوں میں ملتا ہے جو اصل واقعہ کے ساڑھے چار سو سال بعد چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر معاصر مورخین کو یا قریبی زمانہ کے تاریخ دانوں کو نہ ہوسکی، اس کی خبر سیکڑوں سال بعد کے مصنفین کو کیسے ہوگئی۔

طارق بن زیاد کے فتح اسپین (۹۲ھ) کے بارہ میں قدیم ترین ماخذ دو کتابوں کو مانا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں احراق سُفُن (کشتیاں جلانے) کا مطلق کوئی ذکر نہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

تاریخ افتتاح الاندلس ، ابن القوطیہ ، م ۳۶۷ھ
اخبار مجموعہ ، مصنف کا نام لا معلوم ، یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی۔
ان کے علاوہ چوتھی صدی ہجری میں کئی مشہور مسلم مورخ گزرے ہیں۔ مثلاً ابن عبد الحکم (فتوح مصر والمغرب والاندلس) عبد الملک بن حبیب (مبتدأ خلق الدنیا) ابوبکر محمد القرطبی (تاریخ افتتاح الاندلس) احمد بن محمد، ابن الفرضی (تاریخ علماء الاندلس) الخشنی (قضاۃ قرطبہ) وغیرہ۔ ان مورخین کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد اپنی کشتیوں کو آگ لگادی تھی۔ حتی کہ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون تک کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔

احراق سُفُن (کشتیوں کو جلانے) کا واقعہ پہلی بار چھٹی صدی ہجری میں بیان کیا گیا۔ ابومروان عبد الملک بن الکردبوس چھٹی صدی ہجری کا ایک مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب تاریخ الاندلس میں اس قصہ کو درج کیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ قصہ اس کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا۔ اس لئے آج ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کے ماخذ کی تحقیق کریں۔

دوسرا شخص جس نے ابتداءً اس قصہ کو بیان کیا وہ بھی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ ابوعبداللہ محمد الادریسی (م ۵۶۰ ھ) ہے۔ اس نے نزہۃ المشتاق کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں احراق سفن کا قصہ درج کیا۔ مگر اس نے بھی اس کا کوئی ذریعہ نہیں بتایا۔ انھیں دونوں کتابوں سے لے کر دوسرے لوگوں نے اس قصہ کو نقل کرنا شروع کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو واقعہ لوگوں کو ساڑھے چار سو سال تک معلوم نہ تھا، وہ ساڑھے چار سو سال بعد کس طرح لوگوں کے علم میں آگیا۔ ایسی حالت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصہ سراسر فرضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دانش مند جنرل ایسا نہیں کرسکتا۔ اسپین میں قیام کے دوران طارق کا اتصال افریقہ (مغرب) سے برابر جاری رہا۔ اگر کشتیاں جلادی جاتیں تو یہ اتصال کیوں کر ممکن ہوتا۔ طارق نے اسپین کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر (مقیم افریقہ) سے مدد طلب کی۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار مزید فوجی بطور امداد روانہ کئے۔ یہ پیغام رسانی اور سمندر میں لشکر کی منتقلی کشتیوں کے بغیر کیسے ممکن ہوئی۔

تاریخی تفصیلات

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو، ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتی وجود میں نہیں آئی تھی جس پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کرکے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴۱۵ء میں قوط (Visigoths) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ گاتھ

کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کرکے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (فیلشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (Radrick) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کر دیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کرکے مسلمانوں کے قریب کر دیا جو افریقی برّ اعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہو گیا اور جبری طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دے دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کر لے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ ھ کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا، "مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو۔"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر

پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح کی داستانوں میں اس قسم کے افسانے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی قدیم کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کرکے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایها الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم والله الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے۔ تمہارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکری چیخ اٹھے:

انا ورائك یا طارق — طارق ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمہارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر

اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلۃ الاسد (Lion's rock) تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (Pamplona) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جاسکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ ابن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو گئے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں

کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۹۰ - ۸۸ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شسرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

> "رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہو گیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ کی دعوت پر ہوا تھا نہ کہ محض اپنی تحریک پر۔ ۷۰۹ میں وٹیزا (Witiza) کی موت سے اسپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں رذریق کے مقابلہ میں وٹیزا کے خاندان نے موسیٰ بن نصیر سے مدد چاہی۔ اس کے بعد طارق ۷۱۱ میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں اترے اور رذریق کو فیصلہ کن شکست دی۔

اس کے بعد تعجب خیز طور پر اکثر اسپینیوں نے رضاکارانہ طور پر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۲۰ ہزار کی ایک فوج کے ہاتھوں اس تیز رفتار فتح کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس وقت اسپین کے لوگوں میں

اتحاد نہ تھا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں سے اسپین کے لوگوں کو بہت فائدے پہنچے۔ مثلاً نئے حکمرانوں نے ان کے اوپر سے ٹیکس کا بوجھ کم کر دیا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوگئی۔ یہود پر عیسائیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم ختم ہوگئے اور انھیں سماج کے اندر برابری کا درجہ مل گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصہ میں مسلم اسپین کے اندر ایک نیا اور بالکل مختلف سماج قائم ہوگیا (17/414)

نتیجۂ بحث

تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ حقائق حیات کا مطالعہ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ــــــ حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں طارق بن زیاد کی کامیابی ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ تھی نہ کہ محض پر جوش اقدام کا نتیجہ۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت اٹل اصولوں پر قائم ہے جن کو پوری طرح سمجھا اور جانا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی واقعہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ ان قوانین کے ساتھ مطابقت کرکے عمل کیا جائے جن پر موجودہ دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں کو جانے اور ان کے اوپر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں، خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارہ میں کتنا ہی زیادہ خوش فہم ہو اور اپنی مفروضہ کامیابی کو بتانے کے لئے اس نے کتنے ہی زیادہ شاندار الفاظ پا لئے ہوں۔

دو تصویریں

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر ہیں۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ اور پچھلے دس برس سے اس ملک میں وہ سیاست چلا رہے ہیں جس کا نام انھوں نے "اپوزیشن کی سیاست" رکھا ہے۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ نکالتے ہیں جس کا نام "مسلم ہندستان" مگر زیادہ صحیح لفظوں میں "ظالم ہندستان" ہے۔ اس پرچے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینہ مسلمانوں کے اوپر ظلم و تعصب کی داستانیں چھاپی جاتی ہیں۔ لیڈر صاحب کے ہر بیان اور ہر تقریر میں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ وہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھیں زندگی کے ہر شعبہ سے دھکے دے کر نکالا جا رہا ہے۔ ان کے ملی تشخص کو مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں میں امریکہ کے سفر پر تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو مذکورہ لیڈر کے ماہنامہ (مسلم ہندستان) کے خریدار ہیں۔ اور اس کو برابر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ " اس ماہنامہ کو میں اس لئے پڑھتا ہوں تاکہ ہندستانی مسلمانوں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اس ماہنامہ کو پڑھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں۔ وہاں محرومی اور مظلومی کے سوا ان کا کوئی اور مقدر نہیں"۔ اس ماہنامہ کا خاص طریقہ یہ ہے کہ یہاں اگر ۹۰ پلس پوائنٹ ہوں تو وہ ان کا ذکر نہیں کرے گا، اور اگر ایک مائنس پوائنٹ مل جائے تو اس کو خوب نمایاں کر کے بیان کرے گا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر کا ایک مفصل انٹرویو دہلی کے ایک اردو ہفت روزہ ۳۱ مارچ تا ۶ اپریل ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے میں اس کے اس حصہ پر پہنچا جہاں انھوں نے انٹرویور کو اپنے گھر کے اندرونی حالات بتائے ہیں۔ " اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں " ——— مسلمان لیڈر کے ان الفاظ کو پڑھ کر میں نے کچھ دیر کے لئے اخبار بند کر دیا۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچنا شروع کیا کہ لیڈر صاحب نے اس کے بعد انٹرویور سے کیا کہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے بچوں کے بارہ میں کس قسم کی خبریں بتائی ہونگی۔

لیڈر صاحب کے بیانات، ان کی تقریروں اور تحریروں میں جس "مسلم ہندستان" کی تصویر پیش جاتی ہے، اس کی روشنی میں میں نے سوچنا شروع کیا تو قیاسی طور پر جو بات میری سمجھ میں آئی وہ بڑی بھیانک تھی۔

میں نے سوچا کہ لیڈر صاحب نے غالباً یہ خبر دی ہوگی کہ میرا ایک لڑکا ہے۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں مارا مارا پھرا۔ مگر اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ اس کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ آخر مجبور ہو کر وہ رکشا چلانے لگا تاکہ کسی طرح اپنا پیٹ پال سکے۔

میرا لڑکا ماشاءاللہ پنج وقتہ نمازی ہے۔ ہمارے علاقہ میں ایک ویران مسجد تھی۔ میرے لڑکے نے محلہ والوں کی مدد سے اس کو رنگ و روغن کرایا اور اس میں باقاعدہ نماز قائم کی۔ فرقہ پرست اور ملک دشمن عناصر کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ وہ ایک روز ہجوم کرکے آئے۔ انھوں نے مسجد میں گھس کر میرے لڑکے کو بری طرح مار اپیٹا۔ اس کی داڑھی نوچی جس کو وہ اپنے مذہبی تشخص کے نشان کے طور پر نہایت عزیز رکھتا ہے۔ لڑکے کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں وہ بہت دنوں تک زیر علاج رہا۔

میری ایک لڑکی کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ کوشش کے باوجود اس کو اچھے انگریزی اسکول میں داخلہ نہیں ملا۔ مجبوراً اس کو ایک معمولی قسم کے اردو میڈیم اسکول میں داخل کرنا پڑا۔ لڑکی نے پاس کورس سے بی اے کیا۔ اس کے بعد وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایم اے نہ کر سکی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کو کوئی اچھی سروس نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ اب وہ گھروں پر جا جا کر اردو اور قرآن کا ٹیوشن کرتی ہے۔ اور اس طرح زندگی کے دن گزار رہی ہے۔

یہی میرے سب بچوں کا حال ہوا۔ ملک میں اندھے تعصب کی وجہ سے کسی کی بھی اچھی تعلیم نہ ہو سکی۔ میری تمام لڑکیاں ماشاءاللہ مذہبی ہیں۔ سب کی سب خدا کے فضل سے شرعی برقعہ پہنتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتی ہیں، ان کے برقعہ کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی تشخص پر حملے کئے جاتے ہیں۔ کسی بھی اسکول یا کالج میں ان کو نہ داخلہ ملتا ہے اور نہ ملازمت۔

آخر کار میں نے اعلیٰ تعلیم سے مایوس ہو کر یہ طے کیا کہ لڑکیوں کی شادی کر دوں۔ مگر جب

میں اپنی لڑکیوں کے لئے مسلمان شوہر کی تلاش میں نکلا تو معلوم ہوا کہ یہاں تعلیم سے بھی زیادہ بڑی مشکلات حائل ہیں۔

ہندستان کی ظالم پولیس نے مسلم نوجوانوں کو صحیح سالم حالت میں باقی نہیں رکھا تھا۔ میں نے پایا کہ کسی مسلم نوجوان کا حال یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں پولیس کی گولی لگی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا، جہاں ڈاکٹر نے اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس تھانہ میں لے گئی اور اس کے ساتھ اتنی زیادہ مارپیٹ کی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہو گیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس نے رائفل کے کندوں سے مار مار کر اس کا ہاتھ توڑ ڈالا۔ میری تلاش نے مجھے بتایا کہ قوم کے نوجوانوں کو پولیس نے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اور جو زندہ بچے ہیں وہ بھی اس حال میں ہیں کہ ان کا جسم اور ان کے اعضاء صحیح سالم نہیں۔

مجھ کو بہرحال اپنی لڑکیوں کی شادی کرنی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر انھیں مظلوم اور معذور نوجوانوں میں سے کچھ نوجوانوں کو منتخب کیا اور ان کا نکاح اپنی لڑکیوں کے ساتھ کر دیا۔ اب میرے گھر کا حال یہ ہے کہ وہ بیک وقت معذور خانہ بھی بنا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ غریب خانہ بھی۔ میرا گھر اس "مسلم ہندستان" کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس کا زیادہ بڑا نقشہ میں ہر مہینہ اپنے پرچہ میں دکھاتا ہوں۔

میری لڑکیاں اپنے لنگڑے لولے شوہروں کے ساتھ اس طرح رہ رہی ہیں کہ ان کی زندگیاں خوشیوں سے خالی ہو چکی ہیں۔ آسمان نے کبھی ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں اپنے بچوں اور اپنے دامادوں سے کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں، جو دنیا میں کھوئے وہ آخرت میں پاتا ہے۔ جو انسانوں کی طرف سے محروم کیا جائے اس کو خدا کی طرف سے سرفرازی عطا کی جاتی ہے۔

لیڈر صاحب کے اپنے بیانات کی روشنی میں میں نے ان کے گھر کی یہ قیاسی تصویر بنائی اور اس کے بعد دوبارہ اخبار کھولا اور لیڈر صاحب کے انٹرویو کا بقیہ حصہ پڑھنا شروع کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لیڈر صاحب کے گھر کا نقشہ اس نقشہ سے سراسر مختلف ہے جو میں نے قیاسی طور پر سمجھا تھا۔ ناقابل فہم حیرانی کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا

وہ اس "مسلم ہندستان" میں نہیں ہیں جس کی خبر وہ صبح و شام اپنے ہم قوموں کو دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک اور ملک میں ہیں جو ان کے بیانات والے ملک سے یکسر مختلف ہے۔ انٹرویو کے مطابق لیڈر صاحب کے الفاظ یہ تھے :

"اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ اور ہمارے سماج میں جس کی اتنی لڑکیاں ہوں، اس کے لئے کتنی پریشانیاں ہوتی ہیں، اس کا احساس آپ کو بھی ہوگا۔ میں نے ایک ہی بات کا وعدہ اپنی اہلیہ سے کیا کہ کچھ ہو جائے، ہم بھوکے مریں، مگر بچوں کی تعلیم پر اثر نہیں ہونے دیں گے۔ آج دس برس بعد اللہ کے فضل سے میری بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر آئی اے ایس آفیسر ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی ہوگئی اور اس کا شوہر ایم ڈی ہے۔ میرا لڑکا امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی سب سے مایۂ ناز ڈگری آپریشن ریسرچ میں پی ایچ ڈی ہے۔ اس کے بعد کی میری لڑکی اللہ کے فضل سے ڈاکٹر ہو چکی ہے، اور آج وہ دہلی میں ہاؤس سرجن ہے۔ اس کے بعد کی لڑکی آئی آئی ٹی سے دو مہینوں میں انجنیئرنگ کا کورس مکمل کرلے گی۔ وہ وہاں کی ٹاپر ہے۔ آج اس کے سامنے دسیوں ملازمتوں کے آفر ہیں۔ اور میری آخری اولاد دہلی یونیورسٹی میں بی ایس سی آنرز کے دوسرے سال میں ہے۔"

یہ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ لیڈر صاحب اگرچہ اسی ملک میں رہتے ہیں، مگر ان کے گھر کا حال اس مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) سے سراسر مختلف ہے جس کی خبر وہ دنیا کو اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ پچھلے دس سال سے دے رہے ہیں۔ ان کے بیانات کے مطابق، "مسلم ہندستان" میں مسلمان صرف ایک برباد شدہ قوم بنا دئے گئے ہیں۔ مگر اسی "مسلم ہندستان" میں ان کا اپنا گھر ترقی اور خوش حالی کی اعلیٰ شاہراہ پر گامزن ہے۔

۱۹۸۹ میں مذکورہ مسلمان لیڈر کے سیاسی کیریر کے دس سال پورے ہو گئے۔ اس دس سال میں، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق، ان کے "۶ بچوں" کا مستقبل اتنا شاندار ہو چکا ہے کہ وہ خود اس پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اسی دس سال میں ملت کے بچوں کا حال یہ ہے کہ دوبارہ، خود

ان کے اپنے بیان کے مطابق ، وہ بدستور ظالمانہ تعصب کا شکار ہیں۔ ان کے سینے اب بھی پولیس کی گولیوں سے چھلنی کئے جا رہے ہیں۔ گویا شاعر کے الفاظ میں :

دو پھول ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے   نوشہ نے ایک پہنا اک قبر پر چڑھا ہے

اس فرق کا راز کیا ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آیا جو نومبر ۱۹۸۷ میں میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں ہندستان کے ایک شہر میں چند روز کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہاں میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر مجھ سے ملنے کے لئے میرے کمرے میں آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر آپ مسلمانوں کو جو سبق پڑھا رہے ہیں ، وہ بزدلی کا سبق ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہزیمت ، شکست، احساس محرومی اور رپا یوسی کی طرف لے جا رہا ہے۔ مجھے آپ کے اس نظریہ سے سخت اختلاف ہے۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ چلئے ، آپ کو شہر کی سیر کرا دیں۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنی نئی ماروتی کار پر بیٹھا کر شہر کے مختلف حصوں کو دکھاتے رہے۔ راستہ میں انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کی میونسپل کمیٹی میں نائب چیرمین ہوں۔ میں نے کہا کہ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد بمشکل ۵ فی صد ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ میونسپل انتخابات میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا : اپنے ذاتی معاملہ میں میری پالیسی وہی ہے جو الرسالہ کی پالیسی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کے ہندوؤں سے ہمیشہ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ ان کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مقامی پولیس اور انتظامی افسران سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ برادرانِ وطن کو مختلف مواقع پر تحفے تحائف بھی دیتا رہتا ہوں۔ اس لئے یہاں کے سب لوگ مجھ سے خوش ہیں۔ مجھ کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بھی کافی ووٹ ملتے ہیں۔ کوئی بات ناخوشگواری کی ہو تو میں اس کی پروا نہیں کرتا۔

اب مذکورہ مسلمان لیڈر کی کامیابی کا راز میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے جان لیا کہ انٹرویو دینے والے لیڈر صاحب کا معاملہ بھی یقیناً یہی ہے۔ لیڈری کے اسٹیج پر تو وہ اپنی وہ پالیسی چلاتے ہیں جس کو وہ "اپوزیشن کی سیاست" یا احتجاجی سیاست کہتے ہیں۔ مگر اپنے گھر اور اپنے بچوں کے

معاملہ میں وہ عین اسی طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس کی نشان دہی الرسالہ میں تقریباً پندرہ سال سے کی جارہی ہے۔ یعنی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا اور حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے معاملات کو درست کرنا۔ باہر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں اور اندر وہ اس کو اپنا پیرومرشد بنائے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحب نے اپنے انٹرویو میں اس بات کی تردید کی ہے کہ اس وقت ہندستان میں جو حالات ہیں، اس کے باقی رہتے ہوئے بھی مسلمان ترقی کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں، ان کی موجودگی میں بھی مسلمان اپنے لئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں: مسلمان ایجی ٹیشن کی سیاست چھوڑ کر اگر صرف تجارت کریں تو یہاں کوئی انھیں تجارت کرنے نہیں دے گا۔ مسلمان اگر صرف تعلیمی جد وجہد میں مصروف ہونا چاہیں، تو انھیں تعلیمی جدوجہد کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس ملک میں جو یلغار ہے، وہ ہمارے پورے وجود پر ہے۔ اس میں اقتصادی، سماجی، سیاسی سارے حقوق اور اختیارات شامل ہیں۔ سیاسی تبدیلی لائے بغیر اور حقوق کی مانگ کئے بغیر مسلمانوں کو اس ملک میں کچھ نہیں ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہی "مسلم ہندستان" جس میں عام مسلمانوں کے لئے، لیڈر صاحب کے بیان کے مطابق، ترقی کے مواقع بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ یہاں موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ مگر اسی مسلم ہندستان میں خود ان کا اپنا خاندان جو بچوں اور ان کے متعلقین کو ملا کر ایک درجن سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے، وہ کیسے کامیاب ہو گیا۔ کس طرح اس نے اسی ظالم ہندستان میں اپنے لئے قابل رشک حد تک ایک شاندار مستقبل تعمیر کر لیا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ انھوں نے طے کیا کہ "ہم بھوکے رہیں گے مگر ہم اپنے بچوں کو پڑھائیں گے"۔ لیڈر صاحب نے اس پر باقاعدہ عمل کیا۔ ان کا کامیاب تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ "مسلم ہندستان" کا ایک باشندہ "بھوکا" رہ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکے۔ حتی کہ صرف دس برس میں ان کا شاندار مستقبل بن کر کھڑا ہو جائے۔ دس سالہ محنت کے بعد اس کا اپنا پیٹ بھی بھر جائے اور اس کے تمام بچوں کا بھی۔

لیڈر صاحب کے مذکورہ جملہ (ہم بھوکے رہیں گے مگر اپنے بچوں کو پڑھائیں گے) پر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس ایک جملے کے اندر معانی کا پورا خزانہ ہے۔ اس کے اندر زندگی کی تعمیر کا

زبردست راز چھپا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو الرسالہ کے ذریعہ مسلسل طور پر مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ زندگی کی تعمیر کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو راقم الحروف نے اپنے آرٹیکل مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا (۵ استمبر ۱۹۸۷) میں ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ :

Starve the problems, feed the opportunities.

لیڈر صاحب نے، الرسالہ کے اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے، اپنے بچوں کو سکھایا کہ مسائل کو بھلاؤ اور مواقع کو استعمال کرو۔ حقوق طلبی کا جھنڈا مت اٹھاؤ بلکہ محنت کے ذریعہ اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرو۔ شکایت اور احتجاج کو چھوڑ دو اور مثبت ذہن کے تحت کام کرو۔ حالات سے لڑنے کی حماقت نہ کرو بلکہ حالات سے مطابقت کرکے اپنے مستقبل کی تعمیر کرو۔ ملک کے اندر غیر موافق پہلو بھی ہیں اور موافق پہلو بھی۔ تم لوگ غیر موافق پہلو کو نظر انداز کرو اور جو موافق پہلو ہیں ان پر اپنی ساری توجہ لگا دو۔ تم ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرو۔

ایک لفظ میں یہ کہ میں گھر کے باہر لیڈری کے اسٹیج پر الرسالہ کے اصول کی مخالفت کروں گا، اور تم لوگ گھر کے اندر الرسالہ کے اصول کو دانتوں سے پکڑ لو۔ کیوں کہ یہاں کے حالات میں لیڈرانہ مقام الرسالہ والے طریقہ کی مخالفت کرنے میں ملے گا، اور حقیقی کامیابی اس کے طریقہ کو اختیار کرنے میں۔ یہی دوطرفہ تکنیک ہے جس نے بیک وقت دونوں کو کامیاب و بامراد کر دیا ہے، لیڈر کو بھی اور لیڈر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی۔

مسلمان لیڈر نے غالباً اسی مصلحت کی خاطر مزید اہتمام یہ کیا کہ اپنے تمام بچوں کو انگلش اسکولوں میں داخل کرکے پڑھایا۔ انھوں نے اپنے کسی بچہ کو اردو میڈیم اسکول میں تعلیم نہیں دلائی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے مفروضہ مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) کو جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ مسلمانوں کے وہ "زرد اخبارات" ہیں جو اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ بچوں نے اگر اردو جان لی تو وہ اردو کے زرد اخبارات پڑھیں گے، اور پھر ان کا ذہن غیر ضروری طور پر شکایت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ دوسرے مسلمان بچوں کی طرح سڑکوں پر مظاہرے کریں گے اور خواہ مخواہ پولیس کی گولیاں کھائیں گے۔ اس لئے عقل مندی یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اردو زبان سے

ناواقف رکھا جائے تاکہ وہ نہ اردو زبان کے زرد اخبارات پڑھیں اور نہ اس مفروضہ ہندستان کو جان سکیں جہاں مسلمانوں کے لئے احتجاج اور ایجی ٹیشن کے سوا کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں۔ جب بانس ہی نہ ہوگا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔

یہاں میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہ صرف ایک مسلم لیڈر کی بات نہیں، یہی تقریباً تمام مسلم لیڈروں اور رہنماؤں کی بات ہے، خواہ وہ بے ریش رہنما ہوں یا باریش رہنما۔ ان میں سے ہر ایک کا معاملہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں مذکورہ لیڈر کا نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے سامنے الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں، مگر خود وہ دل وجان سے الرسالہ کو اپنا پیرومرشد بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ظاہری طور پر الرسالہ کے طریقہ کو غلط بتاتے ہیں۔ مگر اندرونی طور پر وہ اپنے بچوں کو اور اپنی زندگی کے تمام ذاتی معاملات کو الرسالہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلا رہے ہیں۔

یہی وہ دوطرفہ کردار ہے جس کو فارسی شاعر نے تمثیلی طور پر ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ وہ بظاہر مے کا انکار کرتے ہیں، مگر عملاً وہ خود بھی مے پرستوں ہی کے رنگ میں جیتے ہیں:

منکرِ مے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

یہ تقسیم کیسی المناک ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں نے اپنے لئے زندگی کا انتخاب کیا ہے، اور عوام کے لئے موت کا۔ ایک لفظ میں یہ کہ ــــــ جنھیں مرنا نہیں وہ للکارتے ہیں، اور جو للکارتے نہیں وہ مارے جاتے ہیں۔

کتنے ہوشیار ہیں مسلمانوں کے لیڈر، اور کتنے نادان ہیں ان کے مسلمان پیرو جو کھلے ہوئے استحصال کو دیکھتے ہیں، پھر بھی پوری وفاداری کے ساتھ ان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ اتنا عجیب منظر شاید اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

ایک سفر

ایک تعلیمی سیمنار کی دعوت پر بھوپال کا سفر ہوا۔ ۷ نومبر کو انڈین ایر لائنز کا ٹکٹ منگایا گیا جس کا نمبر 0582-3899903 تھا۔ اس ٹکٹ کے ساتھ ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ اس پر پوری ادا شدہ قیمت (۱۲۰۰ روپیہ) لکھی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس پر دہلی۔ بھوپال۔ دہلی درج تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھوپال کا ریٹرن ٹکٹ ہے۔ مگر کھول کر دیکھا تو اس میں قاعدہ کے مطابق دو سلپ موجود نہ تھی۔ اس میں صرف ایک سلپ تھی اور اس سلپ پر فلائٹ کوپن نمبر ۲ (Flight coupon no. 2) لکھا ہوا تھا۔ کلرک نے فلائٹ کوپن نمبر ا کو پھاڑ کر نکال لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ٹکٹ بھوپال سے دہلی کی واپسی میں کار آمد ہے، مگر دہلی سے بھوپال جانے کے لئے کار آمد نہیں۔

سرکاری دفتروں میں عام طور پر کارکردگی کا یہی حال ہے۔ ہندستان کے کسی سرکاری دفتر میں جب بھی کوئی کام کرایا جائے تو اس کو اسی وقت پوری طرح چیک کر لینا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ کچھ معلوم نہیں کہ انھوں نے آپ کے کام میں کون سی قابل قیاس یا ناقابل قیاس غلطی کر دی ہو۔

میرا واپسی کا رزرویشن کنفرم نہ تھا۔ ایر پورٹ پہنچ کر میں نے سوچا کہ یہاں اس کو کنفرم کرالوں۔ متعلقہ کھڑکی (Endorsement & Reservation) پر پہنچا تو وہاں لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ بعد کو آرہے ہیں وہ پیچھے کھڑے ہونے کے بجائے کھڑکی میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں، ویسے ہی جیسے بسوں اور ریلوں کا ٹکٹ لینے میں عام طور پر ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے لوگ عام طور پر پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کیوں جاہلوں کا سا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں تعلیم کی شرح بمشکل ۲۰ فی صد ہے۔ اور جس سماج کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہو، وہاں کی تعلیم یافتہ اقلیت بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے جو سماج کی عام حالت ہو۔ کسی سماج کی شعوری اور تہذیبی حالت کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام افراد کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ جز کی ذہنی حالت کو بلند کرنے کے لئے کل کی ذہنی حالت کو بلند کرنا پڑے گا۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۸ کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۳۳ کے ذریعہ بھوپال کے لئے روانگی ہوئی۔ دہلی سے جہاز ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا۔ زمین پر دیر تک کھڑا رہنے کے بعد جب جہاز رن وے پر دوڑا اور پھر "ٹیک آف" کرکے فضا میں اڑنے لگا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے میری زندگی کا "جہاز" اب تک زمین پر لینڈ کئے ہوئے تھا اور اب وہ زمین سے اوپر اٹھ کر آخرت کی طرف جا رہا ہے تاکہ خدا کے میدان عدالت میں اتر جائے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب انسان "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہنچے گا۔ بیشتر لوگوں پر یہ لمحہ آچکا، بقیہ لوگوں پر یہ لمحہ بہت جلد آنے والا ہے۔

ہماری پہلی منزل گوالیار تھی۔ گوالیار مدھیہ پردیش کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں کی صنعتیں ہیں جس نے اس شہر کو خوشحال شہر بنا دیا ہے۔ یہاں بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں۔ یہاں کے مشہور قدیم قلعہ میں چھ مندروں کے ساتھ ایک مسجد بھی موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دور میں ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کس قدر اتحاد اور رواداری موجود تھی۔ غیر منقسم ہندستان میں ۶۰۱ ریاستیں تھیں۔ ان میں پندرہ ریاستیں بڑی ریاستیں تھیں۔ ان بڑی ریاستوں میں سے ایک گوالیار بھی تھی۔

آزادی کے بعد جو کانسٹی ٹیوشن (دستور) بنا، اس میں ہندستانی ریاستوں کی دو تقسیم کی گئی تھی۔ ایک وہ جو ۱۹۴۷ سے پہلے براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت تھیں۔ دوسری وہ جہاں راجہ یا نواب حکومت کر رہے تھے۔ ابتدائی دستور (۱۹۵۰) میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اول الذکر ریاستوں میں انتظامی سربراہ (Executive head) کی حیثیت سے گورنر مقرر کئے جائیں گے، اور ثانی الذکر ریاستوں میں سابق راجہ یا نواب ہی کو انتظامی سربراہ کی حیثیت حاصل رہے گی جن کو راج پرمکھ کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان سابق راجاؤں کے لئے اور بھی کئی امتیازی حق تسلیم کیے گیے تھے۔ مثلاً صرف خاص (Privy perses) وغیرہ۔

مگر اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن کی ۲۶ ویں ترمیم (۱۹۷۱) مرکزی اسمبلی نے منظور کی جس کے مطابق سابق راجاؤں اور نوابوں کو دی ہوئی تمام رعایتیں یک لخت ختم کر دی گئیں۔ یہ ایک نہایت عبرتناک مثال ہے۔ ہندستان کے تمام مسلم لیڈر پچھلی نصف صدی سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قانونی تحفظات حاصل کریں۔ انھوں نے اس واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا کہ جب خود دستور میں دیے

ہوئے کاغذی حقوق تنکے کی مانند ہوا میں اڑ گئے تو دوسرے کاغذی حقوق کی کیا حیثیت۔ ایسے کاغذ
تحفظات کا ملنا بھی اتنا ہی بے قیمت ہے جتنا ان کا نہ ملنا۔ اس دنیا میں قومیں اپنے ذاتی استحقاق کے بل
جیتی ہیں نہ کہ قانونی تحفظات کے بل پر۔

جہاز کے اندر انڈین ایرلائنز کا ماہنامہ سواگت (نومبر ۱۹۸۸) پڑھنے کے لیے موجود تھا۔ اس کے ایک
مضمون میں بتایا گیا تھا کہ ہوائی جہاز (ایربس) زمین کی سطح سے ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا
ایک منٹ میں ۱۰ میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ ایک عام ایربس میں ۲۷۳ مسافروں کے لئے
ہوتی ہے۔ جہاز میں اگرچہ کچھ لوگ سگرٹ پیتے ہیں۔ مگر اس کے اندر کی ہوا خراب نہیں ہوتی۔ اس کی و
یہ ہے کہ مخصوص انجینیرنگ کے ذریعہ کیبن کی ہوا ہر ۹۰ سکنڈ میں مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔

ہوائی جہاز کے سفر کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۲۷ میں ہوا۔ سب سے پہلے امریکہ کے فورڈ اور بوئنگ
نے تجارتی سطح پر جہاز بنایا۔ ابتدائی جہازوں میں انفصال (Insulation) کا انتظام نہ ہونے کی
کیبن کے اندر بہت زیادہ شور رہتا تھا۔ مسافر وقتی طور پر بہرے ہوجاتے تھے۔ تمام گفتگو اشار
زبان (Sign language) کے ذریعہ ہوتی تھی۔ ابتدائی جہاز ایک گھنٹہ میں صرف ۱۱۵ میل کا فاصلہ
طے کرتے تھے۔ خبر ہے کہ جاپان اپنے یہاں ہوائی جہاز کی صنعت شروع کر رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو عجب
نہیں کہ آئندہ ہوائی جہاز کی صنعت ایک نئے ترقی یافتہ مرحلہ میں داخل ہوجائے۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۸ کی دوپہر کو میں بھوپال پہنچا تو بھوپال مجھے ایک جانا پہچانا شہر نظر آیا۔ بار
کے سفر کے بعد اب بھوپال میرے لئے کوئی اجنبی جگہ نہیں رہی۔ مجھے تقریباً ۲۵ سال پہلے کی بار
یاد آئی۔ میں ایک سفر پر تھا۔ رات کے وقت ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ باہر دیکھا تو بورڈ
"بھوپال" لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تک میں نے بھوپال کو نہیں دیکھا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ بھوپال ک
ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین آگے بڑھ گئی اور اسٹیشن نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

پڑھ کر یا سن کر میں نے "بھوپال" کا لفظ جان لیا تھا، مگر ابھی میں نے بھوپال کے شہر کو ا
آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اُس وقت میں بھوپال کی کوئی تصویر اپنے ذہن میں نہ بنا سکا
واقعہ انسانی علم کی نوعیت کو بتاتا ہے۔ آدمی کے پاس اگر "لفظ" ہو مگر اس کے پاس "معلومات"
سرمایہ نہ ہو تو وہ کبھی حقیقت کو جاننے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

بھوپال میں میرا قیام جناب ذاکر صاحب کی رہائش گاہ پر تھا جو ایک مقامی تاجر ہیں۔ وہ خاموشی کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اصول دو لفظ میں یہ ہے ——— کم بولنا زیادہ کرنا۔

موجودہ زمانہ میں کھلے چڑیا گھر بنائے جاتے ہیں جن کو اوپن زو (Open zoo) کہا جاتا ہے۔ بھوپال میں اسی قسم کا ایک اوپن زو ہے اور اس کا سرکاری نام ون وہار ہے۔ آجکل ون وہار کے ڈائرکٹر سید مسعود الحسن صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ ون وہار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ ون وہار گیارہ سو ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ اس میں سفید شیر اور دوسرے قسم کے شیر ہیں اور بہت سے دوسرے جانور ہیں جو قدرتی ماحول میں رہتے ہیں۔ کئی شیر اور دوسرے جانور دیکھے۔ اسی دوران ہمارے ایک ساتھی نے سید مسعود الحسن صاحب سے کہا کہ اس کھلے چڑیا گھر کے مینجمنٹ میں آپ لوگوں کو کسی قسم کی زحمت تو پیش نہیں آتی۔ انھوں نے کہا کہ جانوروں کو مینج کرنا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں، البتہ انسانوں کو مینج کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس زو کو دیکھنے کے لئے سالانہ تقریباً چار لاکھ آدمی آتے ہیں۔ ان انسانوں کا حال یہ ہے کہ جانور چپ چاپ بیٹھا ہو تب بھی وہ اس کو پتھر مارتے ہیں۔ جانور کی زندگی کے لئے انسان (Wild life) کا لفظ بولتا ہے، لیکن اگر ان جانوروں سے پوچھئے، تو وہ کہیں گے کہ جو نام تم ہم کو دے رہے ہو، وہ تمہیں خود اپنے آپ کو دینا چاہئے۔

مدھیہ پردیش کے موجودہ چیف منسٹر ارجن سنگھ بھی ایک جلسہ میں موجود تھے۔ یہاں کے مسلمانوں نے عام طور پر ان کی تعریف کی۔ ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بھوپال یونیورسٹی کا نام بدل کر برکت اللہ یونیورسٹی کر دیا ہے۔

مولانا برکت اللہ ولد شجاعت اللہ صاحب، جولائی ۱۸۵۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ کو سان فرانسسکو میں انتقال کیا۔ یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو کابل میں جلاوطن حکومت بنائی گئی۔ راجہ مہندر پرتاپ اس کے صدر تھے اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کو اس کا وزیراعظم مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا برکت اللہ صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا تھا جس کا نام اسلامک فریٹرنٹی تھا۔ وہ بھوپال کے ممتاز "فریڈم فائٹر" تھے۔

یہاں کے ہندی روزنامہ افکار (۳ ستمبر ۱۹۸۸) نے برکت اللہ بھوپالی کے سلسلہ میں راجہ مہندر
پرتاپ کا ایک خط ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۸ شائع کیا ہے۔ اس میں راجہ مہندر پرتاپ لکھتے ہیں: مولانا برکت اللہ
نے نہایت محبت وصداقت سے اپنے فرائض ادا کئے۔ چونکہ وہ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور حضرت
عالی سردار نصر اللہ خاں صاحب صدر اعظم افغانستان کو پہلے انگلینڈ میں مل چکے تھے، ہم کو افغان
حکومت سے رفاقت پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ بعد کو مولانا صاحب لال روس کے بھی
دوست بنے اور ہندستان کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکے۔

"افکار" صحافت کی دنیا میں ایک نیا تجربہ ہے۔ یہ ایک ایسا اخبار ہے جس کی زبان اردو ہوتی
ہے۔ مگر اس کا رسم الخط دیوناگری ہوتا ہے۔ مثلاً افکار (۱۲ نومبر) نے میرا انٹرویو چھاپا۔ اس کی
سرخی کے الفاظ حسب ذیل تھے جو ہندی رسم الخط میں لکھے ہوئے تھے:

مکمل اعراض ہی تمام مسائل کا حل

اس کے قارئین میں تقریباً ۳۰ فی صد ہندو ہیں۔ میں نے افکار کے اڈیٹر صاحب سے اس
کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے ایسے ہندو ہیں جو اردو زبان کو پسند کرتے ہیں مگر فارسی
رسم خط نہ جاننے کی وجہ سے اردو کو پڑھ نہیں سکتے۔ افکار ان کی اس مشکل کو حل کر دیتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا
کہ افکار میں ہندو کو دوسرا نقطۂ نظر بھی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اس طرح اس کا شک دور ہو جاتا ہے۔
انھوں نے کہا کہ دوسری ریاستوں میں بھی اس قسم کے اخبار جاری کرنا چاہئے۔ اس سے قومی ہم آہنگی
پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

۱۱ نومبر کی شام کو روزنامہ افکار (ہندی) نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا جواب دیتے
ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کے بارہ میں میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کچھ لوگوں کو اس لئے مشکل پیش آتی ہے
کہ دوسرے لوگ مسلم اور غیر مسلم کے تعلق کو حریف اور رقیب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس میں
یہ کہتا ہوں کہ دونوں کے درمیان جو تعلق ہے، وہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ اگر آپ حریفانہ نفسیات
سے اٹھ کر داعیانہ نفسیات کے ساتھ دیکھ سکیں تو آپ ہمارے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنے پر مجبور
ہوں گے۔

۱۱ نومبر کی شام کو سیرت کے جلسہ میں خطاب تھا۔ اس کو جناب خلیل اللہ خاں ایڈوکیٹ اور ان

کے ساتھیوں نے منظم کیا تھا۔ اس میں میں نے ایک حدیث کی تشریح کی جس کے الفاظ یہ ہیں: انّ الفتنة نائمة لعن الله من ایقظها (فتنہ سویا ہوا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے) اس کا مطلب یہ ہے کہ "فتنہ" خود نظام تخلیق کے تحت اس دنیا میں موجود ہے، اور وہ لازماً موجود رہے گا۔ ہمارے کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ فتنہ کی موجودگی پر شور وغوغا کریں، بلکہ اصل کام یہ ہے کہ سوئے ہوئے فتنہ کو سویا ہوا رہنے دیں، ایسا نہ کریں کہ اپنی نادانی کے ذریعہ اس کو جگا دیں۔

۱۲ نومبر کی دوپہر کو تعلیمی سمینار میں شرکت کی۔ اس سمینار کے مہمان خصوصی جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ سید حامد صاحب نے اپنے علم اور تجربہ کی روشنی میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو خود اپنی محنت سے تعلیم میں آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر وہ دوسروں کی طرف دیکھتے رہے تو ان کی تعلیمی پسماندگی میں مزید اضافہ کے سوا کچھ اور ہونے والا نہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تعلیم بذات خود مطلوب ہے۔ حتیٰ اگر "مسلم اسکول" موجود نہ ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ "غیر مسلم اسکول" میں داخلہ لیں۔ قوم کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو، اور یہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کا اصل مسئلہ اغیار کی مفروضہ سازش نہیں ہے۔ بلکہ سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کا تعلیمی پچھڑا پن ہے۔ اس کی وجہ سے مسلم رہنماؤں اور مسلم عوام کے درمیان ایک ذہنی بعد (Intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی کے ا[illegible] وائس چانسلر کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو امتیازی لیاقت کے راستہ پر آگے بڑھائے۔ مگر مسلم طلبہ یہ [illegible] ہیں کہ انھیں رعایتی داخلے اور رعایتی سروسیں دی جائیں۔ اس بنا پر دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ او[illegible] حقیقی تعمیری کام انجام نہیں پاتا۔ جناب سلیم شمسی صاحب اس سمینار کے داعی تھے۔

۱۳ نومبر کو منشی حسین خاں ٹکنیکل اسکول کے جلسہ میں شرکت کی۔ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر م[illegible] ارجن سنگھ اس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر میری ایک تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے کہا کہ مسلمان [illegible] زمانہ میں ٹکنالوجی میں پیچھے ہو گئے۔ حالانکہ یہ عین اسلام کا تقاضا تھا کہ وہ اس میدان میں آگے رہ[illegible] میں نے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ بقدر استطاعت طاقت فراہم کرو (واعدوا لہ[illegible]

ستطعتم من قوة) قدیم ذہن کے تحت مسلمان یہ سمجھتے رہے کہ اس کا مطلب فوج اور تلوار کی طاقت جمع
نا ہے۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے وہ ہتھیاروں کے ذہن سے سوچتے رہے۔ مگر ساری دنیا
، انھیں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی اصل طاقت علم ہے، اور علم میں بھی سائنس اور ٹکنالوجی خصوصی
ر پر طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا گیا۔

۱۳ نومبر کی دوپہر کو قدسیہ مسجد میں قارئین الرسالہ کا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے دعوت کی
یت پر زور دیا۔ اس اجتماع میں کچھ ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ وہ الرسالہ ہر ماہ پڑھتے ہیں۔ ان میں
ے ایک بھائی مسٹر راج تیواری نے تقریر کے بعد اپنا تاثر بتلاتے ہوئے کہا: دعوت کے بنا اسلام
ے فیوز بلب کی طرح ہے۔ بلب کا فیوز اڑ جائے تو ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام
ں دعوت نہ رہے تو گویا کچھ بھی نہ رہا۔ مسٹر پی این گپتا ایڈوکیٹ نے بھی اسی قسم کی بات کہی۔

۱۳ نومبر کو جناب محمد خان صاحب (سابق ڈسٹرکٹ جج) کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس
ں بھوپال کے وکلاء اور جج صاحبان شریک تھے۔ اس موقع پر میں نے اسلامی عبادت کی حقیقت
یان کی۔ اس سلسلہ میں نماز کے تین اعمال ــــــــ اللہ اکبر، الحمد للہ اور السلام علیکم
رحمۃ اللہ کی وضاحت کی گئی۔ بھوپال میں جتنے خطابات ہوئے، ان کا ٹیپ مقامی لوگوں کے پاس موجود ہے۔

بھوپال میں پروگرام

نومبر ۱۹۸۸	انٹرویو روزنامہ افکار (ہندی)	مسلمانوں کے موجودہ مسائل
	کارکنان الرسالہ سے ملاقاتیں	
۱ نومبر ۱۹۸۸	سیمینار بمقام ٹیگور ہال میں تقریر	ملت اسلامیہ کے تعلیمی مسائل
	جلسہ سیرت مقام برکت اللہ میدان میں خطاب	سیرت محمدی کا پیغام امن
۱۱ نومبر ۱۹۸۸	محمد خاں صاحب سابق ڈسٹرکٹ جج کی رہائش گاہ پر وکلاء اور جج صاحبان سے گفتگو	
	منشی حسین خاں ٹکنیکل اسکول کے اجلاس میں شرکت	سائنسی تعلیم کی اہمیت
	قدسیہ مسجد میں قارئین الرسالہ کا اجتماع	دعوت کی اہمیت

اس سفر میں ایک نئی بات یہ سامنے آئی کہ پچھلے ایک سال کے عرصہ میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی اور ان کے ساتھیوں نے ہندو مسلم تعلقات کو خوش گوار بنانے کا کام وسیع پیمانہ پر کیا ہے۔ اس کے بعد دونوں فرقے ایک دوسرے سے قریب آئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف روک قائم ہوا ہے بلکہ دعوت کے کام کے لئے بھی نئے امکانات کھلے ہیں۔ اس انداز کی کوششیں ملک کے ہر شہر اور ہر علاقہ میں کی جانی چاہئیں۔ مسٹر پریم نرائن گپتا ایڈوکیٹ بھوپال کی انسانی برادری کے صدر ہیں۔

ایک مشترک نشست میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارا ملک دو مرحلوں سے گزر چکا ہے اور اب اسے تیسرے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔

پہلا مرحلہ ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے۔ اس وقت ہندستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے لیڈروں نے کہا کہ ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ بدیشی حکومت ہے۔ اگر بدیشی راج ختم ہو جائے اور ملک والوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی، ہر آنکھ کے آنسو پچھ جائیں گے۔ ۱۹۴۷ میں یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ مگر آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارا کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے جو آزادی کے بعد شروع ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں، قانون کے ذریعہ اصلاح، کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک بے شمار قانون ہر چیز کے بارہ میں بنائے گئے۔ مگر قانون کی بھرمار کے باوجود ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہ ہوا۔ بلکہ "غلام ہندستان" میں جتنے مسئلے تھے، اب "آزاد ہندستان" میں اس سے زیادہ مسئلے پائے جاتے ہیں۔

اب آخری بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم مذہب کا تجربہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب ہی واحد چیز ہے جو زندگی کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ مذہب کا مطلب لاؤڈ اسپیکروں کا شور اور جلوسوں کے مظاہرے نہیں ہیں۔ مذہب کی اصل حقیقت جوابدہی (Accountability) ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو اپنے تمام کاموں کا خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ لوگوں میں اس احساس کو جگایا جائے۔

ایک نشست ہوئی جس میں کچھ مسلمان تھے اور زیادہ تر ہندو بھائی شریک تھے۔ میں نے کہا کہ برصغیر (ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش) کا اگر آپ سفر کریں تو آپ پائیں گے کہ ہر آدمی بس ایک ہی سوچ میں گرفتار ہے، اور وہ ہندو مسلم سوچ ہے۔ اس علاقہ میں تقریباً ۱۰۰۰ ملین انسان آباد ہیں

مگر ہر ایک بس ایک ہی اصطلاح میں سوچنا جانتا ہے۔ اور وہ ہندو مسلم کی اصطلاح ہے۔

میں نے کہا کہ یہ جھوٹی سوچ ہے۔ اصل سوچ یہ ہے خدا اور انسان کے اعتبار سے سوچا جائے۔ زندگی اور موت، دنیا اور آخرت کی اصطلاحوں میں معاملہ کو سمجھا جائے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں قومی جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب کے سب مصنوعی جھگڑے ہیں۔ اصل چیز جو سامنے آنے والی ہے وہ یہ کہ انسان کو مرنا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنے رب کے سامنے حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

میں نے کہا کہ اگر ایک بلڈنگ میں آگ لگ جائے تو ہر طرف شعلے بھڑکنے لگیں گے، اس وقت کوئی شخص ہندو مسلم اصطلاحوں میں نہیں سوچے گا۔ اس وقت ہر آدمی زندگی اور موت کے ذہن سے سوچے گا۔ ضرورت ہے کہ آگ لگنے سے پہلے یہی سوچ پیدا ہو جائے۔

حضرت پیر سعید میاں صاحب مجددی بھوپال کے مشہور بزرگ ہیں۔ ان کی ہر بات نصیحت اور وعظ سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران کامیاب زندگی کا گُر دو لفظوں میں اس طرح بیان فرمایا ——— ذوق کی بلندی، زندگی کی سادگی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے لکھا ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں میں کوئی صحیح رہنما پیدا نہیں ہوا۔ اس درمیان میں جو لوگ اٹھے وہ حالات کے ردعمل کی پیداوار تھے نہ کہ مثبت فکر کی پیداوار۔ میں نے کہا کہ میں نے تو صرف ڈیڑھ سو سال کی بات کہی ہے مگر آپ کے محبوب شاعر اقبال تو اس مدت کو اس سے بھی زیادہ وسیع کر رہے ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند۔

میں نے کہا کہ اگر آپ میری بات پر تنقید کرتے ہیں تو اقبال کی بات پر دگنی طاقت کے ساتھ تنقید کیجیے۔ اس کو سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

شری برج کشور ساتھی ایڈوکیٹ سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی ہیں۔ وہ اگرچہ ہندو مذہب میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر اتنی ہی قوت کے ساتھ وہ مذہبی رواداری کے بھی حامی ہیں اور ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلم لیڈر وزیروں اور حکمرانوں کی طرف دوڑتے ہیں، انھیں اس قسم کے سنجیدہ ہندوؤں سے ربط بڑھانا چاہئے۔ یہ

شعبہ کی حالات کو درست کرنے کے لئے اول الذکر دوڑ دھوپ سے زیادہ کارآمد ہے۔

قاضی وجدی الحسینی صاحب نے بتایا کہ ایک بار ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی ہے۔ یہ ملاقات لاہور میں موصوف کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے ہوئی۔ اس وقت علامہ اقبال مرض الموت میں مبتلا تھے۔ میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ علامہ اقبال کی کوئی ایسی بات بتلائیے جو آپ نے خود براہ راست سنی ہو۔

قاضی صاحب نے کہا کہ مذکورہ ملاقات میں موت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک لطیفہ بتایا تھا جو اب تک مجھے یاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ سعدی نے ایک کہانی لکھی ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں ایک پہلوان رہتا تھا۔ پہلوان کی عمر زیادہ ہونے لگی تو بادشاہ نے اس سے کہا کہ کسی جوان آدمی کو اپنے کرتب سکھا کر پہلوان بنا دو تاکہ تمہارے بعد دربار کی یہ جگہ خالی نہ رہے۔ پہلوان نے ایک نوجوان کو منتخب کرکے اس کو سکھانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ ایک تربیت یافتہ پہلوان بن گیا۔

اس کے بعد وہ شخص اپنے استاد سے باغی ہوگیا۔ وہ شہر میں لوگوں کے درمیان اس طرح کی باتیں کرنے لگا گویا کہ وہ اپنے استاد سے زیادہ بڑا پہلوان ہے۔ یہ بات بادشاہ کو اچھی نہیں لگی۔ درباریوں سے گفتگو کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ استاد اور شاگرد دونوں کا مقابلہ کرایا جائے۔

دونوں اکھاڑے کے اندر جمع ہوئے۔ شاگرد نے کچھ دیر تک زور آزمائی کی اس کے بعد اچانک استاد نے اس کو زمین پر پٹک دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے استاد سے پوچھا کہ تم تو اپنا سارا کرتب اپنے شاگرد کو سکھا چکے تھے۔ پھر تم کس طرح اس کو ہرانے میں کامیاب ہوئے۔ استاد نے جواب دیا: پہلوان ہمیشہ ایک داؤ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس کہانی کو بیان کرنے کے بعد کہا ——— اسی طرح پہلوانِ فطرت نے ایک داؤ اپنے پاس محفوظ رکھا ہے، اس کا نام موت ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب (عمر ۸۴ سال) بھوپال زو کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ برسوں تک جنگلوں میں رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جنگل میں کئی بار ایسا ہوا کہ چلتے ہوئے شیر سامنے آگیا۔ مگر شیر دفاع کے سوا، کبھی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ چنانچہ مجھ کو دیکھتے ہی شیر اپنے آپ راستہ بدل کر دوسری طرف چلا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ شیر جب آدمی کو دیکھتا ہے تو فوراً واپس ہو کر تیزی سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کی

تجربہ ہے کہ شیر انسان سے ڈرتا ہے۔ وہ "چوپایہ" پر حملہ کرتا ہے۔ مگر "دوپایہ" سے خود ڈرتا ہے۔ شیر انسان خور صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ انسان خود کوئی حماقت کرکے شیر کو یہ حقیقت بتادے کہ وہ شیر سے کمزور ہے۔

یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی طاقت کا ضرورت سے زیادہ اندازہ کرلیتا ہے۔ اس لئے ایک شخص دوسرے شخص سے خائف رہتا ہے۔ خوف کی یہ نفسیات جارحیت کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ مگر جب کوئی آدمی غلط اور ادھورا اقدام کرکے اپنی کمزوری سے فریق ثانی کو باخبر کردے۔ تو ایسے آدمی کا حال اپنے سماج میں وہی ہو جاتا ہے جو مردم خور شیر کے پڑوس میں انسان کا۔

سید مسعود الحسن صاحب جو وائلڈ لائف کے عالم ہیں، انھوں نے بتایا کہ شیر، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح ایک علاقہ پسند (Territorial) جانور ہے۔ شیر ہمیشہ ایک علاقہ کو اپنا علاقہ بنالیتا ہے۔ اس کے نشان کے طور پر وہ ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنے علاقہ کی "سرحدوں" پر گھوم کر پیشاب کے راستہ سے ایک خاص طرح کا کیمیکل چھڑک دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے جس کو دوسرے شیر پہچان لیتے ہیں۔ چنانچہ دوسرا کوئی شیر جب وہاں آتا ہے تو وہ اس بو کو سونگھ کر جان لیتا ہے کہ یہ ایک اور شیر کا علاقہ ہے، وہ فوراً وہاں سے واپس چلا جاتا ہے۔

شیر علاقائی تقسیم کے ذریعہ اس سے بچتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ انسان کے لئے قدرت کا بتایا ہوا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنی حد پر رہے۔ نہ ایک شخص اپنی حد سے باہر نکلے اور نہ دوسرا شخص اس کی حد کے اندر داخل ہو۔

سید مسعود الحسن صاحب نے بتایا کہ اس سے پہلے وہ شہڈول نیشنل پارک میں تھے۔ وہاں ایک جاپانی فوٹو گرافر آیا اور ایک ہوٹل میں دو مہینے تک ٹھہرا رہا۔ اس کا روزانہ کا خرچ تقریباً ۵۰۰ روپیہ تھا۔ وہ ہاتھی پر چڑھ کر پارک میں گھومتا تھا اور شیروں کے فوٹو لیتا تھا۔ اس طرح اس نے تقریباً دس ہزار فوٹو حاصل کئے اور پھر واپس چلا گیا۔

فوٹو گرافر سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک ماہانہ میگزین نکلتا ہے۔ یہ ہر مہینہ کسی خاص جانور کے فوٹو شائع کرتا ہے۔ آئندہ ہمارا میگزین شیر کے فوٹو شائع کرنے والا ہے۔

میں نے جو فوٹو لیے ہیں، ان میں سے ایک سو فوٹو چنے جائیں گے اور ان کو میگزین میں شائع کیا جائے گا۔ اس میگزین کی اشاعت ایک لاکھ ہے، اور ہر ایک شمارہ کی قیمت ڈیڑھ سو روپیہ ہوتی ہے۔

فوٹو گرافر نے واپسی کے بعد اپنے میگزین کا وہ شمارہ سید مسعود الحسن صاحب کے پاس بھیجا جس میں اس کے فوٹو شائع کئے گئے تھے۔ اس کو میں نے دیکھا۔ آرٹ پیپر پر شیروں کی نہایت عمدہ تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں شیر کی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ میگزین گویا شیر کی بابت ایک فلم ہے ـــــــ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کی صحافت کا معیار کتنا بلند ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب سے میں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر سالم علی کی سوانح حیات پڑھی ہے جس کا نام ہے:

The Fall of Sparrow

اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چڑیوں سے کتنی زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ ایک بار ڈاکٹر سالم علی ہمارے یہاں آئے۔ ہم ان کو جنگل میں لے گئے۔ وہ دوربین لگائے ہوئے چڑیوں کو دیکھا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک چڑیا کو دیکھنا شروع کیا جس کو بش چاٹ (Bush chat) کہا جاتا ہے۔ اسی وقت جھاڑی میں ایک شیر دکھائی پڑا۔ میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے وہ شیر ہے۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور برابر چڑیا کو دیکھتے رہے۔ جب میں نے کئی بار کہا تو وہ بولے ـــــ اس بش چاٹ کو تو دیکھو:

Look at this bush chat

اسی کا نام ذہنی ارتکاز ہے، اور اسی ذہنی ارتکاز میں تمام بڑی بڑی ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

بہت سے ہندو بھائی رہائش گاہ پر اور اجتماعات میں آئے۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یا تو الرسالہ (انگریزی) پڑھتے ہیں یا اردو الرسالہ کسی سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ انھوں نے عام طور پر یہ بات کہی کہ الرسالہ کو ہندی زبان میں نکالا جانا چاہئے۔ ایک ہندو نوجوان نے کہا، میرے جیسے کتنے لوگ ہیں جو ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ ان کو ہندی الرسالہ سے روشنی ملے گی۔ مسٹر راج تیواری کو الرسالہ سے اتنی دلچسپی ہے کہ اس کو براہ راست پڑھنے کے لئے انھوں نے اردو سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ انگریزی الرسالہ پڑھ رہے تھے۔

ایک نوجوان نے "آٹوگراف" کے لئے کہا۔ میں نے اپنے دستخط کے ساتھ ان کو یہ جملہ لکھ کر دے دیا:
زندگی آسانیوں کا چمنستان نہیں، زندگی مشکلوں کا خارزار ہے۔

بھوپال سے دہلی کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۳۴ سے واپسی ہوئی۔ ایرپورٹ پر کئی لوگ آ گئے تھے۔ یہاں ایک چھوٹا سا اجتماع ہو گیا۔ جس میں اسلامی دعوت سے متعلق کچھ باتیں عرض کی گئیں۔

ہوائی جہاز کی طرف بڑھا تو گیٹ پر ایک واقعہ پیش آیا۔ انڈین ایرلائنز کے عملہ کی ایک خاتون گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا: مولوی صاحب، میری بچی کے لئے دعا کیجئے، وہ بہت بیمار ہے۔ یہ لفظ وہ بار بار دہراتی رہی۔ اس نے اپنا نام روزی بتایا۔ میرا مولویانہ حلیہ دیکھ کر اس نے سمجھا کہ یہ کوئی مذہبی آدمی ہے۔ اس بنا پر اس نے دعا کے لیے کہا۔

جدید انسان یہ کہتا ہے کہ مولوی آدمی سیاست نہیں جانتا۔ مگر عین اسی وقت اس کا یقین ہے کہ "مولوی آدمی" روحانیت جانتا ہے۔ ایسی حالت میں داعی کو اس دروازے سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے کھلا ہوا ہے، نہ کہ وہ اس دروازہ سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے جو اس کے لئے بند ہے۔

الرسالہ کیسٹ

۱ الرسالہ کا ایک نمبر زیر تیاری ہے جس کا نام "اسلام دور جدید کا خالق" ہوگا۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے بتایا جائے گا کہ موجودہ زمانہ کی تمام علمی اور تمدنی ترقیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلامی انقلاب کا نتیجہ ہیں۔ یہ نمبر تقریباً ۱۰۰ اصفحات پر مشتمل ہوگا اور اسی نسبت سے اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ آئندہ اس سلسلہ میں متعین اعلان کیا جائے گا۔

۲ محمد شفیع صاحب رانوی (کراچی) نے اطلاع دی ہے کہ "پاکستان کے چار صوبائی دارالحکومتوں سے شائع ہونے والے ایک سرکاری روزنامہ مشرق (جو کہ کمپیوٹر ٹرمینل پر کتابت ہوتا ہے) نے گزشتہ کچھ عرصہ سے محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب کے مضامین و مقالات کو نمایاں طور پر اور بڑے اہتمام سے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے"۔

۳ نرنکاری مشن ایک بڑا مشن ہے جس سے لاکھوں لوگ وابستہ ہیں۔ اس کا ماہانہ پرچہ دہلی سے "سنت نرنکاری" کے نام سے کئی زبانوں میں نکلتا ہے۔ اس پرچہ میں اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک نئے اور وسیع حلقہ میں الرسالہ کا پیغام پہنچ رہا ہے۔

۴ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمز (نئی دہلی) کے نمائندہ نے ۳ مارچ ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر سلمان رشدی کے بارہ میں تھے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے قانون اور اس کے عدالتی نظام کی وضاحت کی گئی۔

۵ الرسالہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ہر شمارہ کو کئی کئی لوگ پڑھتے ہیں۔ مثلاً محمد اشرف شاہین صاحب (پیدائش ۱۹۵۷) کشمیر یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہر ماہ ایک الرسالہ خریدتے ہیں اور خود پڑھنے کے بعد دوسرے طلبہ کی مجلسوں میں اس کو سناتے ہیں۔ اس طرح ایک الرسالہ سے ہر ماہ کم از کم پندرہ افراد تک اس کا پیغام پہنچ رہا ہے۔ یہی الرسالہ کے بیشتر خریداروں اور قارئین کا حال ہے۔

۶ بھارت وکاس پریشد کی طرف سے ۱۱ - ۱۲ فروری ۱۹۸۹ کو ایک آل انڈیا سیمینار ہوا۔ اس کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ہوئیں۔ اس سیمینار کا موضوع یہ تھا:

National unity and religious minorities

۱۲ فروری کو "کلوزنگ سشن" میں صدر اسلامی مرکز کا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت صدر اسلامی مرکز نے سیمنار میں شرکت کی۔ اس کی مختصر روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۷ دفتر میں اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جو یہ کہہ کر کتابیں لے جاتے ہیں کہ " ملک یا ملک کے باہر کے کچھ غیر مسلم تعلیم یافتہ افراد ہمارے ربط میں آئے ہیں۔ ان کو ہم آپ کی انگریزی مطبوعات بطور تحفہ دینا چاہتے ہیں" اس طرح لوگ کثرت سے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کے لئے اسلامی مرکز کی مطبوعات سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

۸ دو امریکی پروفیسر، ڈاکٹر پیگی اسٹارکی اور ڈاکٹر آر کی نیشنز ۲۵ فروری ۱۹۸۹ء کو اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے اسلام کے مختلف موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی۔ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اپنے ساتھ لے گئے۔

۹ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ۲۸ فروری ۱۹۸۹ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا " رشدی ۔ خمینی اشو"۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی روشنی میں اظہار خیال کیا۔ یہ تقریر انڈین اکسپرس (یکم مارچ) اور جن ستا (یکم مارچ) اور دہلی کے دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ بعد کو دوسرے انگریزی پرچوں نے بھی اس کو نقل کیا۔ مثلاً سنڈے (۱۲-۱۸ مارچ ۱۹۸۹) وغیرہ۔

۱۰ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا مطالعہ ۱۹۷۶ سے پابندی کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ اسلامی مرکز کی دوسری کتابیں بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ شکر ہے کہ ان کتابوں کی بدولت مجھے ایمانی زندگی نصیب ہو رہی ہے۔ اس مطالعہ کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں ـــــ کھل گئے دل کے دریچے آپ کی تحریر سے (احسن غنی، سرینگر، کشمیر)

۱۱ جناب عبد الرحمٰن کوندو صاحب سرینگر سے لکھتے ہیں، مولانا مسعودی صاحب برابر الرسالہ کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ بعض پرچوں میں آپ کے خلاف بے بنیاد تنقید دیکھ کر مولانا مسعودی صاحب نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا وحید الدین صاحب کی تحریرات کے توڑ کے لئے ان کے مخالفین کے پاس کوئی ٹھوس اور معقول دلیل نہیں ہے،

اس لئے ان کے مخالفین بے سر و پا اور دور از کار تاویلات سے کام لے رہے ہیں۔

۱۲ ایک صاحب لکھتے ہیں : چند ماہ سے الرسالہ کا پابندی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ الرسالہ کے مطالعہ سے پہلے میں ایک جوشیلا نوجوان تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میری زندگی کا مطلب کیا ہے۔ اور مجھے کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اب الحمدللہ میں ایک ہوش مند مسلمان ہوں اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ الرسالہ کے دعوتی مشن کو اپنے طور پر جاری رکھوں (فیروز خاں اورنگ آباد)

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں : اس رقعہ کے ہمراہ ۱۹۲۰ روپیوں کا ڈرانٹ حاضر خدمت ہے۔ ماہنامہ میں آجکل جو مضامین آرہے ہیں وہ لائق صد تحسین و آفریں ہیں جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں ایک جولانی فراوانی اور کیفیت وجدانی پیدا ہوجاتی ہے۔ جو ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہی صفحہ کاغذ پر رقم ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ پر اور خصوصاً فساد کے موضوع پر آپ کے نظریہ کو ملحوظ رکھا جائے تو ہندو اور مسلمان کے درمیان کھڑی ہوئی خودساختہ دیوار منہدم ہو کر نفرت، حسد اور بیگانگی کا قلع قمع ہوجائے (محمد یوسف صدیقی، پونہ)

۱۴ ایک صاحب لکھتے ہیں : میری عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ ۱۹۲۰ سے میری بدنصیب آنکھیں مسلم لیڈرشپ اور مسلمانوں کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو بحیثیت تماشائی دیکھتی رہی ہیں۔ کس طرح ان کے مہرے پٹتے اور مات کھاتے رہے۔ کیونکہ مقصد اور حصول مقصد کے ذرائع غلط۔ اسی لئے ناکامی و نامرادی اس کے قدرتی ثمرات ہیں۔ آپ نے موجودہ غلط روی کو روکا ہی نہیں بلکہ الرسالہ کے ذریعہ صغیر و کبیر کے دل و دماغ کو روشنی بخشی ، حتی کہ اردو اخباروں کا رنگ تحریر اور طریقے بدل گئے (فاروق احمد خاں، علی گڑھ)

۱۵ ملک کی لائبریریوں میں کثرت سے الرسالہ (اردو یا انگریزی) اور اسلامی مرکز کی مطبوعات منگوائی جارہی ہیں۔ اس طرح زیادہ وسیع حلقہ میں اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام پہنچانا ممکن ہوسکے گا۔

۱۶ "دین کامل" کے نام سے ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے جو ۳۶۸ پر مشتمل ہے اور چھپ کر آگئی ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کا ایک جامع مطالعہ شامل ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۱ جون ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

قابلِ غور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بگاڑنے اور آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش آپ کے ہم عصر یہودیوں نے شروع کی جو اس وقت عرب میں آباد تھے۔ پھر صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے صدیوں تک اسے پوری قوت کے ساتھ جاری رکھا۔ موجودہ زمانہ میں ہندستان کے سلمان رشدی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ یہی نازیبا کام جدید ترین ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے انجام دے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کریں۔ وہ ایسی کتابوں کے خلاف ایجی ٹیشن اور ہنگامہ شروع کردیں۔ اب تک مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے عملاً بس اسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور بدقسمتی سے مسلمان اپنے منفی جوش کی وجہ سے اب تک اس دوسرے پہلو سے آگاہ نہ ہو سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے کعب بن اشرف سے لے کر بیسویں صدی کے سلمان رشدی تک بے شمار لوگ مسلسل اس معاندانہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ وہ آپ کی تصویر کو داغدار کریں۔ اس مخالفانہ عمل پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ مگر ان دشمنانِ رسولؐ کو اپنے مقصد میں ایک فی صد کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ساری کوششیں عملاً کامل طور پر بے نتیجہ رہیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کی نازیبا کوششیں پچھلے پیغمبروں کے خلاف بھی کی گئیں مگر یہاں نتیجہ بالکل مختلف رہا۔ یہاں ان کے دشمنوں کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ سابق پیغمبروں کے دشمنوں نے ان کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنا یا معدوم کردینا چاہا اور عملاً بگاڑ دیا یا معدوم کرڈالا۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر پیغمبر کے خلاف انھوں نے اپنی تحریفی کوشش کی اور ہر بار وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

انسانی تاریخ کا جو مدوّن ریکارڈ ہے، اس میں پچھلے تمام پیغمبروں کو حذف کردیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مصر کی قدیم تاریخ میں فرعون کا ذکر ہے مگر موسیٰؑ کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ فلسطین کی تاریخ سے مسیحؑ کا ذکر حذف ہے، جب کہ آپ کے ہم عصر رومی حکمرانوں کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن کے علاوہ، پچھلے پیغمبروں کی بابت جاننے کا واحد ذریعہ بائبل ہے اور بائبل کا یہ حال ہے کہ اس میں تمام پیغمبروں کو مسخ شدہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں بائبل کا بیان ہے کہ نوح کاشتکاری کرنے لگا۔ اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہو گیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا۔ (پیدائش، باب ۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ بائبل میں ملتا ہے۔ مگر اس میں آپ کی غیر متعلق خاندانی باتوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، مگر آپ کی دعوتِ توحید کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ (پیدائش، باب ۱۵)

حضرت لوط علیہ السلام ایک سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل میں ان کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو مے پلایا اور رات کے وقت ان کے ساتھ ہم آغوش ہوئیں۔ اور پھر لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ (پیدائش، باب ۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چمک قرآن کے مطابق ایک خدائی نشانی تھی۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔ (خروج، باب ۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل ان کی بابت کہتی ہے کہ سلیمان بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے کہا تھا کہ ان کے بیچ نہ جانا، کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گی۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا۔ اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا۔ کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی۔ (۱۔ سلاطین، باب ۱۱)

یہ صرف چند حوالے ہیں جو بطور مثال یہاں درج کیے گئے ہیں نہ کہ بطور احاطہ۔ تفصیل کے طالب

بائبل کا مطالعہ کرکے اسے جان سکتے ہیں۔

پیغمبروں کی طویل فہرست میں اس اعتبار سے صرف ایک استثنار ہے، اور وہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تمام معلوم پیغمبروں میں آپ اکیلے پیغمبر ہیں جن کی تصویر بگاڑنے کی ہر کوشش مسلسل ناکام ہوتی چلی جارہی ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ اپنی کامل ترین ابتدائی شکل میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے اور کسی بھی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کرکے اس کو بخوبی طور پر جان سکے۔

یہ محض ایک اتفاق کی بات نہیں اور نہ یہ مسلمانوں کی کوششوں کی بنا پر ہے۔ یہ براہ راست خدا کی مداخلت کے تحت ہے۔ یہ خود خدا ہے جس نے آپ کے معاندین کی معاندانہ کوششوں کو مکمل طور پر ناکام بنا رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جن شیطانی کتابوں (Satanic books) پر انسانی حکومتوں سے پابندی لگانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ پابندی، پیغمبر اسلام کے معاملہ میں، خود مالک کائنات کی طرف سے زیادہ بڑے پیمانے پر پہلے ہی سے لگی ہوئی ہے۔ امتحانی آزادی کی بنا پر خدا نے کسی دشمن حق کے زبان وقلم کو تو نہیں پکڑا۔ مگر اس کی زبان وقلم کی کاوشوں کے نتیجہ کو یقیناً پکڑ رکھا ہے۔ اس نے انہیں عملی طور پر موثر بننے سے روک دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاندین اپنی ساری کوششوں کے باوجود، باعتبار نتیجہ، پیغمبر آخر الزماں کی تصویر کو بگاڑنے کے معاملہ میں وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جو پچھلے پیغمبروں کے معاملہ میں بلا استثنار انھوں نے حاصل کرلی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبر اسلام کے دین کی اشاعت کے لیے تو کچھ نہیں کرتے، البتہ اگر کوئی معاند ایک لغو بیان دے یا ایک مخالفانہ تحریر چھاپے تو اس کے خلاف شور وغل کرنے میں وہ نہایت تیزی دکھاتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ مسلمان وہ کام کرنے کے لیے تو بہت بے قرار ہیں جس کا اہتمام خدا نے خود اپنی طرف سے کر رکھا ہے۔ مگر اس کام کو کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ موجود نہیں جو شریعت کے مطابق انہیں خود اپنی کوششوں کے ذریعہ انجام دینا ہے۔

قرآن کے مطابق مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی نصرت کریں۔ مگر نصرت سے مراد دعوت ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف شور وغل۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ پیغمبر آخر الزماں

پر طعن کرنے والوں کے خلاف شور و غل کر کے انھیں پیغمبر آخر الزماں کی نصرت کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ یہ کریڈٹ انھیں صرف اس وقت ملے گا جب کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کے پیغام کی اشاعت کے لیے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب و شرائط کے ساتھ ساری قوموں کے سامنے انجام دیں۔

مسلمانوں کی موجودہ روش کیوں ہے، اس کا نہایت گہرا نفسیاتی سبب ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان، مختلف اسباب سے، دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ ان کے بارہ میں وہ محبت اور خیر خواہی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف بھڑکنے کا موقع ہو تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری قوموں کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی کی بات ہو تو اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔

" رسولؐ کی شان میں گستاخی " کے مسئلہ پر اٹھنے کے لیے صرف نفرت کا جذبہ کافی ہے، جو مسلمانوں کے اندر کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے برعکس " رسولؐ کے پیغام کی اشاعت " کے لیے محبت کا جذبہ درکار ہے جو آج کے مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سوال پر تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور دوسرے سوال پر وہ حرکت میں نہیں آتے، خواہ اس کے لیے انھیں کتنا ہی زیادہ پکارا جائے۔ یہ صورت حال حد درجہ تشویشناک ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں، یہ روش یقینی طور پر خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

سوچنے کی بات

قرآن خدا کی کتاب ہے جو کائناتی حقیقتوں کو بیان کرتی ہے۔ قرآن میں جن حقیقتوں کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں سے ایک عالمگیر حقیقت وہ ہے جو ان لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے۔ فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا (پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کیساتھ آسانی ہے)

موجودہ دنیا میں جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح یہاں دشواری کے ساتھ آسانی کا پہلو بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ کبھی خوش گوار امکانات کو ختم نہ کر سکے۔ ہر ناپسندیدہ صورت حال میں دوبارہ ایک پسندیدہ موقع آدمی کے لیے باقی رہے۔ امکانات کی یہ فہرست اتنی لمبی ہے کہ اس کا سلسلہ سلمان رشدی جیسے نازیبا واقعات تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم مدینہ میں سلمان رشدی جیسا ایک برا کردار موجود تھا۔ یہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس ظالم نے ایک بار ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام لگایا۔ یہ جھوٹی کہانی اس طرح پھیلی کہ پورے مدینہ میں ایک مہینہ تک ہنگامی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد قرآن میں اس کی تردید اتاری گئی جو سورۃ النور (رکوع ۲) میں موجود ہے۔

ان تردیدی آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ: لا تحسبوہ شرا لکم بل ھو خیر لکم (النور ۱۱) یعنی اے مسلمانو، یہ طوفان جو تمہارے خلاف برپا کیا گیا ہے، اس کو تم اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں اچھا ہے۔ بہتان تراشی کا واقعہ بظاہر "عسر" کا ایک واقعہ تھا۔ مگر قرآن نے بتایا کہ اس میں بھی تمہارے لیے "یسر" کا یقینی پہلو چھپا ہوا ہے۔

اس یسر (موافق پہلو) کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جب داعی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تو اس کی ذات اور اس کی دعوت لوگوں کے درمیان گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس

طرح داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان جھوٹے پروپیگنڈوں کی تردید کرکے اصل حقیقت کو واضح کرے۔ وہ اپنی بات کو از سر نو مزید وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرسکے۔

اس طرح ایک طرف مخالفین کا برسر باطل ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف داعی کا برسر حق ہونا اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ وہ اور زیادہ ثابت شدہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ دعوتِ حق سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ابھی تک شبہات کا شکار تھے، وہ اس کے بعد یقین کے درجہ تک پہنچ کر داعی کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھ لیتے ہیں کہ حق کا داعی ٹھوس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مخالفین کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس جھوٹے الزام اور بے بنیاد اتہام کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصل مسئلہ

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ میں قابلِ غور مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں رشدی جیسے لوگ ہیں جو اسلام کے خلاف لکھتے اور بولتے ہیں۔ بلکہ اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جس نے انہیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھیں اور بولیں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ برطانیہ میں ۱۷ویں صدی سے ایک قانون موجود ہے جو مسیحیت (اینگلیکن چرچ) کے خلاف کفریہ کلمات (Blasphemy) کو قابلِ سزا جرم قرار دیتا ہے۔ مگر اس تعزیری قانون کے ہوتے ہوئے برطانیہ میں ایک فلم بنائی گئی ہے جو سراسر اس کی منشا کے خلاف ہے۔ اس فلم کا نام ہے:

The Last Temptation of Christ

اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جنسی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ان کو اور ان کی والدۂ محترمہ (حضرت مریم) کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ یہ فلم برطانیہ میں کھلے طور پر دکھائی جارہی ہے مگر مذکورہ قانون کے باوجود اس فلم پر آج تک پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ اس کے بنانے والوں کو کوئی سزا دی گئی۔

اب اسی ملک کی ایک برعکس مثال لیجئے۔ پیٹر رائٹ (Peter Wright) ایک انگریز ہے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ وہ برطانیہ کے محکمہ انٹلجنس میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام اسپائی کیچر (Spy Catcher) ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کے بہت سے راز بتائے گئے ہیں۔

پیٹر رائٹ نے اپنی یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کی مگر اس کی اشاعت سے پہلے حکومتِ برطانیہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوراً یہ کہہ کر اس پر پابندی لگا دی کہ یہ کتاب سرکاری رازوں کی پردہ داری کے خلاف ہے۔ مصنف اور پبلشر کی تمام کوششوں کے باوجود یہ کتاب لندن سے چھپ نہ سکی۔ ۱۹۸۸ میں وہ ایک بیرونی ملک میں چھاپی گئی ہے۔ تاہم برطانی حدود میں اس کا داخلہ مکمل طور پر ممنوع ہے۔

اس تقابلی مثال پر غور کیجئے۔ ایک ہی ملک ہے۔ وہاں "توہین پیغمبر" کا واقعہ ہوتا ہے مگر باقاعدہ قانون کے ہوتے ہوئے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ دوسری طرف اسی ملک میں "توہینِ ریاست" کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت اس کے خلاف فوراً سرگرم ہو جاتی ہے اور پورا ملک اس کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ برطانیہ توہینِ ریاست کی اہمیت سے واقف ہے۔ مگر توہین نبوت کی اہمیت کا اسے احساس نہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ان کے یہاں دونوں مثالوں میں وہ فرق پیدا کر دیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ آج اسلام کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کی عظمت و اہمیت جدید لوگوں کے ذہن سے نکل گئی ہے۔ وہ اسلام کو ایک بے قیمت اور آج کے لحاظ سے بے ضرورت چیز سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جس نے لوگوں کو اسلام کے خلاف بولنے کے لیے جری کر دیا ہے۔ نہ صرف غیر مسلموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو مذکورہ قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ وہ اسلام کے خلاف نہایت سطحی انداز میں لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔

اس وقت جرأت کا کام یہ ہے کہ اسلام کے بارہ میں جدید انسان کی غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اسلام کی اہمیت کو آج کے انسان کے لیے دوبارہ ایک ثابت شدہ حقیقت بنایا جائے۔ اسلام کی تصویر کو لوگوں کی نظر میں اتنا باعظمت بنا دیا جائے کہ کوئی آدمی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہ

کر سکے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص اس قسم کی نازیبا حرکت کرے تو اس کی بات ماحول کے اندر اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آج کوئی شخص جمہوریت (ڈیموکریسی) کے خلاف بولے تو اس کی بات موجودہ ماحول میں اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

جدید اسلامی لٹریچر

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلمان رشدی جیسے لوگ جب کوئی شر پھیلاتے ہیں تو وہ ہمارے لیے صرف شر بن کر رہ جاتا ہے، وہ ہمارے لیے خیر کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے امام اور مفکر ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کا جو تعارف پیش کر رہے ہیں، وہ صرف شور وغل ہے، اور شور وغل آج کے انسان کو صرف متنفر کر سکتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں اس کو متاثر کرنے والا نہیں۔

ایسے مواقع پر فطری طور پر اسلام کے مطالعہ کی فضا بنتی ہے۔ لوگوں کے اندر اسلام کے بارہ میں تجسس پیدا ہوتا ہے، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اسلام کو جاننے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ پاتے ہیں کہ موجودہ کتب خانوں میں ایسا لٹریچر موجود نہیں جو ان کی قابل فہم زبان میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو پیش کر رہا ہو۔ جس کے اندر اتنی جاذبیت ہو کہ وہ اس کو دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھ سکیں۔ آج کے انسان کے ارد گرد مخالف اسلام لٹریچر کا انبار موجود ہے، مگر موثر اسلوب میں تیار کیا ہوا موافق اسلام لٹریچر کہیں وجود نہیں۔
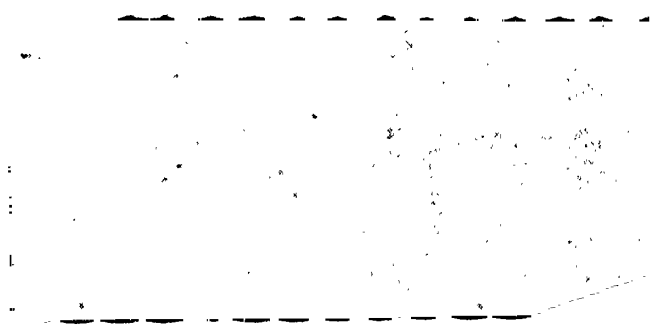
راقم الحروف نے چالیس سال پہلے عصر حاضر کی اس ضرورت کا احساس کیا تھا۔ اس کے مطابق میں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا، اور اسی کے ساتھ جدید علوم کو اس کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں نے عصری تقاضوں کے تحت ایسا اسلامی لٹریچر تیار کرنا شروع کیا جو آج کے انسان کے ذہن پر اسلام کی عظمت قائم کر سکے۔ میری تمام کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے اسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کام میں اگرچہ مجھے ملت کا مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اپنی حد تک میں نے اپنی پوری طاقت اسی ایک کام میں لگا رکھی ہے۔

اسی خاص ضرورت کے تحت حال میں، میں نے ایک نئی کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے۔ "اسلام دورِ جدید کا خالق" یہ کتاب ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اور عنقریب انشاء اللہ

اسلامی مرکز کے تحت چھپ کر شائع ہو جائے گی۔

اس تازہ کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ جدید سائنس اور موجودہ ترقی یافتہ دور جس پر آج کا انسان فخر کرتا ہے، وہ تمام تر اسلام کا عطیہ ہے یہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے ذریعہ لایا جانے والا اسلامی انقلاب ہے جس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار وہ عمل جاری کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر دور جدید کی تمام ترقیاں ظہور میں آئیں۔ یہ کتاب اوّلاً انشاء اللہ اردو زبان میں شائع کی جائے گی، اور اس کے بعد انگریزی اور دوسری زبانوں میں۔ وبیداللہ التوفیق۔

مصلحت دعوت

عبداللہ بن ابی مدینہ کا ایک منافق مسلمان تھا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت عناد تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت بے ہودہ قسم کی گستاخیاں کیں۔ آپ کی ازواجِ مطہرات کے خلاف گھناؤنے الزامات لگائے۔ حتیٰ کہ اس کا مجرم اکبر ہونا خود قرآن (النور ۱۱) میں ثبت کر دیا گیا۔

عبداللہ بن ابی کے اس مجرمانہ فعل کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اگر میں ایسا کروں تو لوگ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور آپ کی ازواج مطہرات کی کردار کشی نہایت سنگین بات ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنت بتاتی ہے کہ ایک اور بات ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہے ——— لوگوں کو اسلام کی تصویر بگاڑنے کا موقع دینا۔

ایک گستاخ رسول کو سزا دینے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بہانہ بنا کر اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے، تو ایسی حالت میں اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت کو ترجیح دی جائے گی اور گستاخ رسول کی سزا کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوت اور دعوت کا مفاد ہے۔ بقیہ چیزوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

اسلام کے اس تقاضے کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کے اس شدید ردِّ عمل پر غور کیجئے جو انھوں نے سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ساری دنیا میں ظاہر کیا ہے۔ اس معاملہ میں یہ یقینی تھا اور ہے کہ سلمان رشدی کو اگر قتل کر دیا جائے، یا اس کے خلاف قتل کا "فتویٰ" جاری کیا جائے تو عالمی پریس اور غیر مسلم صحافت اس کو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لیے استعمال کرے گا۔

عبد اللہ بن ابی کے قتل پر قدیم زمانہ میں اسلام کو بدنام کرنے کا جو عمل کیا جاتا اس کا اثر مدینہ یا زیادہ سے زیادہ عرب تک محدود رہتا، مگر سلمان رشدی کے معاملہ میں اس کا زبردست اندیشہ تھا کہ اس کے خلاف قتل کے فتویٰ کو لے کر سارے کرۂ ارض پر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم جاری کر دی جائے گی، جیسا کہ فی الواقع ہوئی۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں غور کرنے کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ پہلو یہی ہے مگر یہی وہ پہلو ہے جس کو موجودہ مسلم رہنماؤں نے اور ان کی پیروی میں عام مسلمانوں نے سب سے زیادہ نظر انداز کیا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں نے بلاشبہ اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی۔ رسول کے نام پر رسول کے طریقہ کی خلاف ورزی کی اس سے زیادہ سنگین مثال شاید پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

نیو یارک کے ٹائم میگزین (۲۰ مارچ ۱۹۸۹ء) میں اٹاوہ کے عبد الحسین ماجد کفائی کا خط چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب کو قابلِ مذمت کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ زیادہ بہتر تھا کہ رشدی کو زندہ رہنے دیا جائے اور تمام لوگ اس پر لعنت کریں، بمقابلہ اس کے کہ رشدی کو قتل کر دیا جائے اور پھر تمام لوگ مسلمانوں پر لعنت کریں:

It is better to let Rushdie live and be cursed by fanatical Muslims than have him killed and the Muslim world cursed by all.

راقم الحروف عبد الحسین ماجد کفائی کے اس تبصرہ سے متفق ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت میں مقامِ محمود پر فائز کیے جا چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کسی "رشدی" کی تحریریں اس کو ادنیٰ درجہ میں بھی داغدار کر سکیں۔

مگر رشدی کے خلاف مسلمانوں نے قتل کا فتویٰ دے کر جو ہنگامہ برپا کیا، اس نے اسلام کے معاندین کو اس بات کا سنہری موقع دے دیا کہ وہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں۔ وہ تمام دنیا کو یہ تاثر دیں کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے، وہ قتل و خون کا دین ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کر کے مسلمانوں نے پایا کچھ نہیں، البتہ انھوں نے ایک بہت بڑی چیز کھو دی اور جو چیز انھوں نے کھوئی وہ وہی چیز ہے جو اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے دعوتِ اسلامی کے مواقع۔

قدیم عرب میں جو "میڈیا" اہلِ کفر کے پاس تھا، وہی میڈیا اہلِ اسلام کے پاس بھی تھا۔ اس معاملہ میں دونوں برابر تھے۔ موجودہ زمانہ میں صورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ آج عالمی صحافت کا زمانہ ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک بھی ایسا اخبار یا ایسا میگزین نہیں جو عالمی سطح پر پھیلے اور تمام قوموں کے درمیان پڑھا جائے۔ دوسری طرف غیر مسلم اقوام کا حال یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر عالمی صحافت پر قابض ہیں۔ ان کے پاس ایسے اخبارات و رسائل ہیں جو کروروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

اس فرق نے بے حد نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی بات صرف ان کے اپنے مقامی یا گروہی پرچوں میں چھپتی ہے، وہ اس کو خود ہی چھاپتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ جبکہ فریقِ ثانی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باتوں کو اپنے عالمی پرچوں میں چھاپتا ہے اور رات دن کے اندر ان کو ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں کو نازک معاملات میں ہنگامہ آرائی کرنے سے انتہائی حد تک پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ان کی ہنگامہ آرائی کا کوئی مثبت فائدہ تو ان کو نہیں پہنچے گا، البتہ یہ منفی نقصان ہوگا کہ غیر مسلم عالمی صحافت اس کو شوشہ بنا کر ساری دنیا میں انہیں بدنام کرے گی۔ وہ بے بسی کے ساتھ اپنی اور اسلام کی بدنامی کو دیکھیں گے اور اس کے دفعیہ کے لیے کچھ نہ کرسکیں گے۔

دورِ اوّل کی مثال

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہوگیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی یا اس کا استہزار ایک ایسا جرم ہے جو علی الاطلاق طور پر مجرم کو واجب القتل بنا دیتا ہے یعنی جیسے ہی کوئی شخص ایسے الفاظ بولے جو مسلمانوں کو رسول اللہ کی شان میں گستاخی نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا مطلق نظریہ شرعی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اسلام میں اس کے لیے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ استہزار کا معاملہ کوئی اتفاقی نہیں۔ یہ مجرمانہ فعل بلا استثناء خدا کے تمام پیغمبروں کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا ہے (الحجر ۱۱، الزخرف ۷) قرآن میں تقریباً ۵۰ مقامات پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کے معاصرین نے پیغمبروں کا استہزار اور تمسخر کیا۔ انھوں نے ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔ مگر ایک جگہ بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جہاں بھی کوئی شخص پیغمبر کا مذاق اڑائے، فوراً اس کو قتل کر دو۔ ایسے کسی شخص کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو۔

قرآن میں استہزار کے جرم کا ذکر تو بار بار آیا ہے مگر اس کے مجرم کے لیے سزائے قتل کا اعلان سارے قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔ قرآن میں مستہزئین رسالت کے سلسلہ میں صرف دو قسم کے ردِ عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یا تو دلائل کے ساتھ ان کی کہی ہوئی بات کو رد کیا گیا ہے، یا انہیں خدا کی پکڑ سے اور اس کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

یہ استہزار کرنے والے غیر مسلمین بھی ہوتے تھے (یٰس ۳۰) اور منافق قسم کے مسلمان بھی (البقرہ ۱۴، التوبہ ۶۵) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ معاملہ اپنی بدترین صورت میں پیش آیا۔ مگر مجرد استہزار کی بنا پر قرآن میں نہ غیر مسلموں کے لیے قتل کی قانونی سزا کا حکم دیا گیا اور نہ منافق مسلمانوں کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر رسول کی اہانت اور آپ کے ساتھ گستاخی کو اس طرح مطلق انداز میں واجب القتل جرم قرار دے دیا جاتا تو یہ مجرم سے زیادہ خود اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان

کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ اسلام کے وہ مقدس سپاہی جن کو صحابۂ کرام کہا جاتا ہے، ان کی بیشتر تعداد ابتداءً عین اسی جرم میں مبتلا تھی جس کو "رسول کی شان میں گستاخی" کہا جاتا ہے۔

اگر اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی فوراً انہیں قتل کر دیا جاتا تو یہ سادہ معنوں میں صرف مجرم کا قتل نہ ہوتا بلکہ تاریخ ساز انسانوں کا قتل ہوتا۔ اس کے بعد اسلام کی وہ تاریخ ہی نہ بنتی جو بعد کو بنی، اور جو موجودہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ پُرفخر سرمایہ ہے۔ تمام قیمتی زندگیاں اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں کہ وہ اسلام قبول کریں اور دنیا کی تاریخ میں وہ عظیم الشان کردار ادا کریں جو منصوبۂ الٰہی کے تحت ان کے لیے عالمی سطح پر مقدر کیا گیا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ واقعات بطور حصر نہیں ہیں، بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ پہلے کچھ غیر مسلموں کے واقعات درج کیے جائیں گے، اور اس کے بعد کچھ مسلمانوں کے واقعات۔

مستقبل پر نظر

قدیم مکہ میں جو ممتاز افراد تھے، ان میں سے ایک شخص کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ آج سہیل بن عمرو کا شمار صحابہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ وہ بدر کی لڑائی میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں رسول اللہ ؐ کے مقابلہ میں مشرکین کو شکست ہوئی۔ ان کے ۷۰ آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک سہیل بن عمرو بھی تھے۔

سہیل بن عمرو کے اندر زبان آوری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ خطیبِ قریش کہے جاتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بھرپور طور پر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ وہ شعر اور خطابت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے رہتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے اور ان کے اوپر مسلمانوں کو پوری طرح قابو حاصل ہو گیا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دانت توڑ دوں۔ اس طرح اس کی زبان باہر نکل پڑے گی اور اس کی آواز خراب ہو جائے گی۔

اس کے بعد وہ اس قابل نہ رہے گا کہ آپ کے خلاف خطیب بن کر کھڑا ہو سکے۔

بظاہر یہ ایک جائز بات تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا مُثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں اس کا مُثلہ کروں تو اللہ میرا مُثلہ کرے گا، اگرچہ میں ایک رسول ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے مزید ایک بات فرمائی۔ یہ بات بظاہر شخصی ہے مگر وہ ایک عالمی انسانی حقیقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سہیل بن عمرو ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں تم ان کی مذمت نہ کر سکو۔ (انہ عسیٰ ان یقوم مقاماً لا تذمہ، سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۹۳) چنانچہ مُثلہ یا قتل کے بغیر سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غیر معمولی سلوک کیا کہ غزوۂ بدر (۲ھ) کے بعد ان پر قابو پانے کے باوجود انہیں رہا کر دیا۔ مگر اب بھی وہ اپنی اسلام دشمنی سے باز نہ آئے۔ انھوں نے مکہ کے لوگوں کو دوبارہ اکسایا اور تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اندوہناک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ احد (۳ھ) کہا جاتا ہے۔

یہی سہیل بن عمرو تھے جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر لفظ رسولؐ کو کاغذ سے محو کرایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی یک طرفہ شرائط پر راضی ہونے کے لیے مجبور کیا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس وقت تک سہیل بن عمرو کفر کی حالت میں تھے۔ مگر اب بھی، ثابت شدہ جرائم کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے برعکس آپ نے اپنے اصحاب کو ان کے ساتھ حسن اخلاق کی ہدایت فرمائی۔ آپ نے کہا:

من لقی سہیل بن عمرو فلا یحد الیہ النظر۔ فلعمری ان سہیلاً لہ عقل وشرف وما مثل سہیل یجہل الاسلام	جو شخص سہیل بن عمرو سے ملے، وہ اس کی طرف تیز نگاہوں سے نہ دیکھے۔ میری جان کی قسم، بلاشبہ سہیل عقل اور شرف والا آدمی ہے۔

(سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۲۲۶) اور سہیل جیسا آدمی اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایتیں جاری رہیں۔ غزوۂ ہوازن کے بعد آپ نے ان کو ایک سو اونٹ تالیف قلب کے طور پر دیے۔ اس عطیہ کے بعد وہ بالکل ڈھ پڑے اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں یہ تاثر پھیل گیا کہ وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے اسلام کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ چنانچہ عرب قبائل کی اکثریت ارتداد کی طرف مائل ہو گئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مکہ کے بیشتر لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ انھوں نے اس کا پورا ارادہ کر لیا۔ مکہ کی فضا اتنی خراب ہوئی کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل عتاب بن اُسید روپوش ہو گئے۔

مذکورہ سہیل بن عمرو اس وقت تک اسلامی جماعت کے ایک فرد بن چکے تھے۔ وہ شاندار خطیب ہونے کے ساتھ ایک بارعب شخصیت والے آدمی تھے۔ جب انھوں نے مکہ کا یہ حال دیکھا تو وہ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان ایک پُرزور تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس نے اسلام کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ جو شخص ہمارے خلاف کچھ کرے گا، ہم تلوار سے اس کی گردن ماردیں گے۔

سہیل بن عمرو کی گرج دار تقریر کو سن کر لوگوں نے رجوع کر لیا۔ انہوں نے اسلام سے پھرنے کا جو ارادہ کیا تھا، اس سے باز آ گئے۔ اس کے بعد عتاب بن اسید بھی روپوشی سے نکل آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہی مطلب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں وہ تمہارے نزدیک قابلِ مذمت نہ ہوں بلکہ قابلِ تعریف ہوں۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت بتاتی ہے کہ آپ کی نظر حال پر نہیں رکتی تھی۔

آپ آدمی کے حال سے گذر کر اس کے مستقبل کے امکانات کو دیکھتے تھے۔ ایک انسان کا آج اگر باغیانہ ہے تو اس کو نظر انداز کرکے آپ یہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ ہمارا وفادار ہو جائے۔ اور پھر اس کی وہ خداداد صلاحیتیں جو اس وقت اسلام کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں، وہ اسلام کی تائید میں استعمال ہونے لگیں ــــــ تاریخ بتاتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔

اگلی نسلوں تک انتظار

اسلامی تاریخ میں ۱۰ نبوی کو عام الحزن کہا جاتا ہے، کیونکہ اسی سال اوّلاً ابوطالب اور اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ کے حالات انتہائی حد تک غیر موافق ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اسی سال مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ یہ سفر اس امید میں تھا کہ شاید طائف میں آپ کے لیے کام کے موافق حالات مل سکیں۔

مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ طائف کے سرداروں (عبدیالیل، مسعود، حبیب) نے آپ کے ساتھ بے حد گستاخی اور اہانت کا سلوک کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جو آپ کی ہنسی اڑائیں اور آپ پر پتھر برسائیں۔ آپ اس حال میں طائف سے واپس ہوئے کہ پتھروں کی مار سے آپ کا جسم خوں آلود ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن وہ ہے جو طائف کے سفر کے موقع پر گزرا۔

صحیح بخاری (باب ذکر الملائکۃ) میں ہے کہ جب آپ طائف سے زخم خوردہ اور غمگین حالت میں واپس لوٹ رہے تھے تو قرن ثعالب کے مقام پر حضرت جبریلؑ آپ کے پاس آئے انھوں نے آپ کو آواز دے کر کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کے سلوک کو دیکھا۔ اب اللہ نے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتہ) کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اہل طائف کے بارہ میں جو کچھ چاہتے ہیں، اس کا انہیں حکم دیں۔

اس کے بعد ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) سامنے آیا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اللہ نے آپ کے خلاف آپ کی قوم کی بات سنی

میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو باہم ملا کر اس کے درمیان طائف کی بستی کو پیس ڈالوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے وہ انسان پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے۔ (ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ لا یشرك بہ شیئا)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر موجودہ نسل نہ مان رہی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اگلی نسلوں تک انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔ موجودہ لوگوں کی طرف سے توہین اور سرکشی کا تجربہ ہونے کے باوجود آپ اس امید میں انھیں ہلاک کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ شاید ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد میں وہ انسان پیدا ہو جو خدا کی خدائی کا اعتراف کرے اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد کے دور میں طائف کے تمام باشندے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مثلاً ابو عبید مسعود ثقفی انہیں اہل طائف کی اولاد تھے۔ وہ اس مسلم فوج کے قائد تھے جس نے حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایران میں جہاد کیا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی فوج کے مقابلہ میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر ایرانی فوجوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ انہوں نے جنگ کا حوصلہ کھو دیا۔

محمد بن القاسم ثقفی ۷۱۱ء (۹۵ھ) میں سندھ کے راستہ سے ہندستان میں داخل ہوا وہ ایک انتہائی عادل اور باصلاحیت سردار تھا۔ اس نے صرف دو سال کے عرصہ میں سندھ اور پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی کہ ایک پورا علاقہ اللہ کے دین کے سایہ میں آگیا۔ موجودہ پاکستان محمد علی جناح کی دین نہیں بلکہ حقیقتاً وہ محمد بن القاسم ثقفی کی دین ہے۔

محمد بن القاسم اتنا لائق اور شریف سردار تھا کہ جب وہ ہندوستان سے واپس ہو کر دمشق گیا تو، فتوح البلدان کے بیان کے مطابق، اہل ہند اس کے لیے روئے اور اس کا مجسمہ

نا کر اس کی تعظیم و تقدیس کی (فبکیٰ اھل الھند و صوروہ) اسلام کا یہ قیمتی مجاہد اسی
یلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا جس کی بدترین گستاخی اور ایذارسانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
لم نے یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسل میں ایسے لوگ پیدا
ں گے جو اللہ کے عبادت گذار بنیں گے۔

قبیلۂ ثقیف (اہل طائف) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی اور
یذارسانی کا بدترین فعل کیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کو سزا دینے کا معاملہ پوری طرح آپ کے قابو
یں تھا، کیونکہ پہاڑوں کا فرشتہ (ملک الجبال) آپ کے حکم کے نفاذ کے لیے آچکا تھا۔
مگر آپ نے انہیں سزا دینے کے بجائے اس کو پسند کیا کہ ان کی نسلوں سے ایسے افراد نکلیں
جو اسلام کے سپاہی بن کر اسلام کی تاریخ بنائیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔ اگر آپ طائف والوں کی گستاخی
کی سزا دینے کے لیے ملک الجبال کو استعمال کرتے تو طائف آج صرف کھنڈروں کی داستان ہوتا،
نہ کہ اسلام کے قلعہ کی تعمیر کی شاندار تاریخ۔

آج کا دشمن کل کا دوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخالفین میں سب سے بڑا کردار جس شخص نے
ادا کیا، وہ مکہ کا عمرو بن ہشام ہے جو تاریخ میں ابوجہل کے نام سے مشہور ہے۔ ابوجہل کے
لڑکے کا نام عکرمہ تھا۔ عکرمہ آج اصحاب رسول کی معزز فہرست میں شامل ہیں، مگر فتح مکہ سے
پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف تھے اور اس معاملہ میں پوری طرح اپنے
باپ کے ساتھ تھے۔ گستاخی اور جارحیت کی کوئی قسم نہ تھی جو انھوں نے آپ کے خلاف
اختیار نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے باپ کی موت کے بعد بھی وہ بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے خلاف سرگرم رہے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مشرک فوج کے میمنہ کے سردار خالد بن ولید
تھے، اور میسرہ کے سردار عکرمہ بن ابی جہل۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عکرمہ کا جرم اتنا واضح تھا کہ فتح مکہ کے بعد وہ
مکہ کو چھوڑ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔

ان کی بیوی جو مسلمان ہوگئی تھیں، وہ یمن جاکر باصرار انہیں واپس لے آئیں۔ وہ انتہائی شرمساری کے ساتھ اپنا سر جھکائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا مجھے امان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، تم کو امان ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرکار انھوں نے کلمہ شہادت ادا کرکے اسلام قبول کرلیا۔

عکرمہ جب یمن سے واپس ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عکرمہ تمہارے پاس آرہے ہیں۔ تم ان کے باپ (ابوجہل) کو برا نہ کہنا۔ کیونکہ مردہ کو برا کہنا مردہ تک تو نہیں پہنچتا، البتہ وہ زندہ کو تکلیف دیتا ہے۔ عکرمہ جب آپ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوش ہوکر ان کی طرف تیزی سے بڑھے، حتی کہ آپ کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد عکرمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں آپ سے یک چیز طلب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم طلب کرو میں تمہیں ضرور وہ چیز دوں گا۔ لرمہ نے کہا کہ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ہر دشمنی جو میں نے آپ کے ساتھ کی ہے، یا ہر رکاوٹ جو میں نے آپ کے راستہ میں ڈالی ہے، ہر وہ لڑائی جو میں نے آپ کے خلاف ڑی ہے، ہر وہ بدکلامی جو میں نے آپ کے منہ پر کی ہے یا آپ کے پس پشت کی ہے، ان سب کو آپ معاف کردیں اور ان کے بارے میں اللہ سے میرے لیے استغفار فرمائیں۔ ہول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی ان کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ ہر وہ عداوت و عکرمہ نے میرے ساتھ کی، ہر وہ سرگرمی جو انھوں نے اس ارادہ سے کی کہ تیرے نور کو بجھادیں، ن سب کو تو ان کے لیے معاف کردے اور وہ سب کچھ جو انھوں نے میری بے آبروئی کے لیے یا، خواہ میرے سامنے کیا ہو، یا میرے پس پشت، ان سب کو تو ان سے معاف کردے۔

اس کے بعد عکرمہ نے کہا کہ اے رسول اللہ، خدا کی قسم، ہر وہ خرچ جو میں اللہ کی راہ ں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کرتا تھا، اب میں اس کا دگنا اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور لہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو جنگیں میں نے کیں، اب اللہ کے راستہ میں اس سے

ؤگنا جنگ کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد عکرمہ اپنی جان اور اپنے مال کیساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں لگ گئے۔ وہ برابر اسی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ یرموک کے معرکہ میں زبردست جانبازی دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (حیاۃ الصحابہ طبع دمشق، الجزء الاول، صفحہ ۷۷-۱۷۶)

عکرمہ نے گستاخی سے لے کر جارحیت تک ہر جرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا تھا۔ بظاہر وہ صرف اس قابل تھے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل نہیں تھے، داعی تھے۔ آپ نے عکرمہ کے "آج" میں ایک چھپا ہوا "کل" دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ داعیانہ نگاہ تھی جس کی بنا پر آپ نے انہیں یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ بعد کے واقعات نے بتایا کہ آپ کا اندازہ نہایت درست تھا۔ چنانچہ دشمن عکرمہ کے اندر سے ایک دوست عکرمہ برآمد ہوا۔ جو شخص اپنی ابتدائی زندگی میں کفر کا کھمبا بنا ہوا تھا، وہ اپنی بعد کی زندگی میں اسلام کا ستون بن گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد

اوپر ان لوگوں کی مثال نقل کی گئی ہے جو قبولِ اسلام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہوئے مگر انہیں سزا دینے کی بجائے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اب کچھ ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جب کہ آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ اس کے باوجود اس مسلمان کو قتل کی سزا نہیں دی گئی۔

۱۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ، مجھ سے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر نے مقسم بن ابوالقاسم مولیٰ عبد اللہ بن الحرث بن نوفل کی روایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اور تلید بن کلاب اللیثی دونوں نکلے، یہاں تک کہ ہم عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا۔ کیا آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے جب حنین کے دن تمیمی نے آپ سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بنو تمیم کا ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو مالِ غنیمت دے رہے تھے۔ (وہ دیکھتا رہا) یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے محمدؐ، میں نے اس کو دیکھ لیا جو آپ نے آج کیا ہے۔ رسول اللہ

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ
نے عدل کیا ہو (لم أرك عدلت)

عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے بیان کیا کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب
ہو گئے۔ آپ نے کہا کہ تیرا برا ہو، اگر میرے پاس عدل نہیں ہو گا تو پھر کس کے پاس
دل ہو گا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا میں اسے قتل نہ کر دوں۔
نے کہا کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہو گی جو دین میں تعمق کرے گی،
تک کہ وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کہ تیر شکار سے۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۴۴)

مذکورہ مسلمان (ذو الخویصرہ) کے معاملہ پر غور کیجیے۔ اس نے خدا کے رسولؐ کی شان
جو گستاخی کی وہ سادہ معنوں میں صرف ایک لفظی گستاخی نہ تھی، وہ خود آپ کی حیثیت
ت پر ضرب لگانے کے ہم معنی تھی۔ اس شخص نے آپ کی عدالت پر شبہ کیا تھا اور آپ کو
خیال کے مطابق غیر عادل بتایا تھا۔ یہ بات انتہائی حد تک سنگین ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ
اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قرآن کے راوی کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بواسطہ جبریلؑ
کا کلام پایا ہے۔ اور اس کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی اسی روایت پر
کر کے ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ کسی روایت کو قبول کرنے کے لیے راوی کا عادل ہونا شرط لازم ہے۔
راوی کی عدالت مشتبہ ہو، اس کی روایت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسی حالت میں
ہ تمیمی مسلمان کا آپ کو غیر عادل بتانا گویا آپ کے راوی قرآن ہونے کی حیثیت کو
قرار دینا ہے۔ یہ بلا شبہہ سب سے زیادہ سخت بات ہے جو آپ کے خلاف کہی جا سکتی
۔ مذکورہ شخص نے اتنی سنگین بات کہی، اس کے باوجود اس کو نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ
و قتل کیا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ رسول اللہؐ کی شان

میں گستاخی بجائے خود مستوجب قتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے واجب القتل ہونے کے لیے اسی کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاست اسلامی سے بغاوت۔ چند افراد جو دور اول میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انہیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا نہ کہ مجرد گستاخی رسول کے جرم میں۔

۲ شعبان ۶ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ بنی المصطلق کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ کے لیے جو لشکر روانہ ہوا، اس میں عبد اللہ بن ابی اور دوسرے بہت سے منافق قسم کے مسلمان بھی شریک تھے۔ یہ لوگ اپنی بے حسی اور بے خوفی کی بنا پر معمولی باتوں کو شوشہ بنا لیتے اور رسول اللہؐ اور مخلص مسلمانوں کے خلاف فتنے برپا کرتے رہتے۔

اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ واپسی میں فوج نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہؓ حسب معمول رات کے آخری حصہ میں رفع حاجت کے لیے دور چلی گئیں۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک معمولی قسم کا ہار تھا، وہ اتفاق سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ حضرت عائشہ اس کو تلاش کرنے لگیں۔ اندھیرے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ دیر لگ گئی۔

حضرت عائشہؓ ابھی لوٹی نہیں تھیں کہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت حضرت عائشہ اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھیں جو چاروں طرف کپڑے سے ڈھکا ہوتا تھا، اور چار آدمی اس کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک چھوٹی اور دُبلی خاتون تھیں۔ چنانچہ ہودج اٹھانے والوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی سواری نہیں ہے۔ انھوں نے خالی ہودج کو اونٹ پر رکھ دیا اور اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کوئی اور صورت نہ پا کر وہ وہیں چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ صبح کے وقت صفوان بن معطل سُلمی وہاں آئے جو قافلہ کے پیچھے چلنے پر مامور تھے۔ میدان میں ایک خاتون کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ (عائشہ) ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس کے سوا انھوں نے کوئی اور کلام نہ کیا۔ صرف اپنا اونٹ لا کر حضرت عائشہ کے پاس

بٹھادیا۔ حضرت عائشہ اشارہ کو سمجھ کر اونٹ پر سوار ہوگئیں۔ اس کے بعد وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوپہر کے قریب یہ اونٹ مسلمانوں کے قافلہ سے جا ملا جبکہ وہ اگلے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ابن ابی مُلیکہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ جب اس طرح قافلہ میں پہنچیں تو منافقین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا جو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سردار عبد اللہ بن ابی نے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ عائشہ ہیں۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، نہ یہ اس سے بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ تمہارے پیغمبر کی بیوی نے ایک غیر شخص کے ساتھ رات گزاری، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اب وہ ان کو لے کر آرہا ہے۔ (قال عبد اللہ بن ابی رئیسهم من هٰذه ـ قالوا عائشة ـ قال : واللّٰہ ما نجت منه وما نجا منها ـ وقال : امرأة نبيكم باتت مع رجل حتى اصبحت ثم جاء يقود بها ' (التفسیر المظہری، المجلد السادس، صفحہ ۴۷۴)

اس کے بعد جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے اس معاملہ کو پروپیگنڈہ کا اشو بنایا اور اس کو بھرپور طور پر آپ کے خلاف استعمال کیا۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں ہنگامی حالت پیدا ہوگئی۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا۔ ہر زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے۔ حضرت عائشہ کا یہ حال تھا کہ وہ رات دن روتی رہتی تھیں۔ اس قصہ کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ ہنگامی صورتِ حال ایک مہینہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ سورہ النور کی آیتیں ۱۱-۲۱ اُتریں۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ عائشہ مکمل طور پر معصوم اور بے قصور ہیں۔ اس معاملہ میں سارا جرم یک طرفہ طور پر عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ اس طرح یہ سنگین معاملہ براہِ راست خدائی مداخلت کے ذریعہ ختم ہوا۔

عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ

مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت کے ساتھ اتنا بڑا اتہام تراشا۔ خود قرآن کی گواہی (النور، ۱۱) کے مطابق، اس معاملہ میں عبد اللہ بن ابی سب سے بڑا مجرم تھا۔ قرآن میں اس کے ابلیسی جرم کا اعلان کیا گیا، مگر اس کے لیے کوئی قانونی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ اس کی سزا کے معاملہ کو تمام تر آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ کے بعد زندہ رہا، یہاں تک کہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مر کر وہ اپنا حساب دینے کے لیے خدا کے یہاں چلا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی کی بابت کہا کہ اے خدا کے رسول ﷺ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (صفحہ ۷۰) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے مزید یہ فرمایا کہ ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور بہتر سلوک کریں گے، جب تک وہ ہمارے درمیان رہے (بل نترفق به ونحسن صحبته ما بقی معنا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۷۲)

عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کچھ کیا، وہ آپ کی اور آپ کے اہلِ بیت کی کردارکشی کی بدترین صورت تھی۔ یہ پیغمبر کے خلاف اتنی بڑی مجرمانہ حرکت تھی کہ اس سے بڑی کسی مجرمانہ حرکت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مدینہ کے حاکم تھے۔ اس اعتبار سے آپ کو عبد اللہ بن ابی کے اوپر کامل قانونی اختیار حاصل تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ صرف اس کے جرم کا اعلان کر کے اس کو آزاد چھوڑ دیا۔

ایسی حالت میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجب قتل جرم ہے، وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن وسنت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

ایک سفر

اگست ۱۹۸۸ کی ۲۷ تاریخ تھی۔ اور دن کے ڈیڑھ بجے کا وقت۔ میں اپنے دفتر میں
مشغول تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کیلی فورنیا (امریکہ) سے
حسین صدیقی بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو وہ لوگ
ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اس میں
روں۔ انھوں نے کہا کہ آپ اتنا وقت نکال کر آئیں کہ کانفرنس میں شرکت کے بعد
دوسرے مقامات پر بھی آپ کے خطابات کا پروگرام رکھا جا سکے۔

اس گفتگو کے موقع پر میں دہلی میں تھا اور ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک
)) کیلی فورنیا میں۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان ۱۴ ہزار میل سے بھی زیادہ
تھا۔ مگر ٹیلی فون پر دونوں کو ایک دوسرے کی آواز اس طرح صاف سنائی دے رہی تھی
لوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوں۔ ٹیلی فونی ربط کا یہ
ید اس لیے بنایا گیا ہے کہ انسان اُس دوسرے عظیم تر ربط کے بارے میں سوچ سکے
ے اور خدا کے درمیان اعلیٰ ربانی سطح پر قائم ہوتا ہے۔

۱۲ ستمبر کو ان کا باضابطہ دعوت نامہ (۵ ستمبر ۱۹۸۸) بذریعہ ڈاک مل گیا۔ اس میں
دعوت نامہ کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کا
ضوع حسب ذیل ہوگا:

The Sirah of Prophet Mohammed and its Message
for Contemporary Men and Women.

میرے پاسپورٹ کے صفحات ختم ہو گئے تھے، مگر اس کی قانونی مدت ابھی باقی تھی۔
ے اضافہ کی درخواست دی گئی۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی کارروائی تھی۔ مگر تقریباً
ینہ کی دفتری دوڑ دھوپ کے بعد ۱۰ صفحہ کا اضافہ ہو کر پاسپورٹ دوبارہ مل سکا۔
یہ ہندستانی دفتر کا حال تھا۔ دوسری طرف امریکی سفارت خانہ میں ویزا کی درخواست

دی گئی تو انھوں نے درخواست کے اگلے ہی دن ایک سال (۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹) کا ملٹیل ویزا دے دیا۔ یعنی اس ویزا پر میں ایک سال تک امریکہ میں قیام کرسکتا تھا۔ یا ایک سال کے دوران جتنی بار چاہے وہاں جا سکتا تھا۔ جب کہ ہماری درخواست میں صرف دو ہفتہ کا ویزا مانگا گیا تھا ——— یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ ہندستان اور امریکہ کے نظام میں وہ کیا فرق ہے جس نے ایک کو پیچھے اور دوسرے کو آگے کر دیا ہے۔

اس فیاضانہ سلوک کا سبب غالباً یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ریکارڈ کے مطابق پایا کہ اس سے پہلے نومبر ۱۹۸۵ میں میں امریکہ گیا تو میں کانفرنس میں شرکت کے بعد فوراً واپس آگیا۔ وہاں میں نے نہ ان کی انتظامیہ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کیا اور نہ ناجائز طور پر زیادہ ٹھہرنے کی کوشش کی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں صرف وہ شخص مشکلات سے دوچار ہوتا ہے جو وہاں کے نظام سے انحراف کرے۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں ہر حال میں آدمی کو دفتری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خواہ اس نے مقررہ نظام سے ادنیٰ انحراف بھی نہ کیا ہو۔

آخری دنوں میں ایک مسئلہ پیش آیا۔ میرے رفیقِ سفر کو نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنے کے لیے ایک تحریر درکار تھی جس میں بتایا گیا ہو کہ امریکہ کے متعلقہ اسلامی ادارہ نے ان کو بھی میرے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا ہے۔ مگر وقت اتنا کم تھا کہ ڈاک کے ذریعہ سے امریکہ کا خط ہندستان نہیں پہونچ سکتا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے امکانات کو استعمال کرکے جدید انسان نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے دفتر کو بذریعہ ٹیلی فون ضرورت بتائی گئی اور ایک گھنٹہ کے اندر ان کا دستخط شدہ خط دہلی میں موجود تھا۔

یہ تیز رفتار ترسیل اس آلہ کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تصویری مشین (Facsimile machine) کہا جاتا ہے اور جس کا مختصر نام فیکس (Fax) ہے۔ آپ ایک تحریر یا ایک خط تیار کرکے مشین میں ڈالیں، اور ایک سکنڈ کے اندر وہ مطلوبہ مقام پر پہونچ کر ویسا ہی چھپا ہوا نکل آئے گا۔

ابتدائی انسانی دور میں صرف پیدل پیغام رسانی کا طریقہ رائج تھا۔ پھر گھوڑوں کا

ستعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹیلی گرام، ٹیلی فون اور ٹیلکس کے طریقے دریافت ہوئے۔
ب فیکس کے طریقہ نے سب پر برتری حاصل کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی زیادہ نعمتیں
سان کو دے رکھی ہیں، مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس کا واقعی شکر ادا کرتے ہوں۔

دہلی کا انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے۔ انتظارگاہ میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی مسافر دروازہ
ھلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ ہندستانیوں نے ہندستانی ہوائی اڈوں پر تبصرہ شروع
یا۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے فلاں فلاں ملکوں کے ہوائی اڈے دیکھے ہیں، ان کے مقابلہ
ں ہندستانی ہوائی اڈے بالکل پسماندہ نظر آتے ہیں۔ قریب کی کرسی پر ایک جاپانی مسافر بیٹھا
ا ان کی پرجوش باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں وہ نہایت آہستگی کے ساتھ بولا: دوستو، کسی
ے کا ہوائی اڈہ ویسا ہی ہوتا ہے جس کا وہ تحمل کرسکتا ہو اور جس کا وہ مستحق ہو، نہ اس سے
یادہ اور نہ اس سے کم:

Friends, a country gets the airports it can afford — and deserves. No more, no less.

جاپانی کا یہ تبصرہ سن کر اکثر لوگ چپ ہوگیے۔ تاہم ایک شخص بولا: جناب عالی،
صل بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی داداؤں (Political dadas) کی حکومت
ہے۔ اور جب تک یہ صورت حال قائم ہے، ہمارے ملک میں کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔

دہلی سے پین ایم (Pan Am) کی فلائٹ نمبر ۶۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸
صبح چار بجے کا وقت تھا کہ جہاز اپنا پر پھیلائے ہوئے رن وے پر دوڑا۔ اور پھر اوپر اٹھ کر پرواز
کرنے لگا۔ یہ عین وہی انداز تھا جو کسی بڑی چڑیا کا انداز پرواز کے وقت ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز
بھی عین اسی اصول کے تحت اڑتا ہے جس طرح کوئی چڑیا اڑتی ہے۔

ہوائی جہاز کیا ہے۔ ہوائی جہاز دراصل چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ اس کا مطلب یہ
ہے کہ ہوائی جہاز کا پہلا کامیاب ماڈل وہ ہے جو نیچر (قدرت) نے تیار کیا۔ اب اگر ہوائی
جہاز کی نقل تیار کرنے کے لیے ذہانت درکار ہے تو ہوائی جہاز کی اصل بنانے کا کام
ذہانت کے بغیر انجام پاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز، دوسری بے شمار

چیزوں کی طرح ، اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ یہاں ایک زندہ ذہانت موجود ہے۔ کائنات کے پیچھے زندہ ذہانت کا اقرار کیے بغیر کائنات کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی ۔

ہوائی جہازوں میں سگرٹ پینے کی اجازت ہوتی ہے ۔ مگر ٹوائیلٹ (غسل خانہ) میں سگرٹ پینا سخت منع ہے۔ حسب معمول ٹوائیلٹ کے باہر لکھا ہوا تھا کہ اس کے اندر اسموکنگ نہ کریں۔ اس ممانعت کے نیچے یہ سطر درج تھی :

This lavatory is equipped with a smoke detector

میں نے اس فقرہ کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہا تو اس کا عمدہ لفظی ترجمہ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لمحہ کے لیے خیال ہوا کہ اردو زبان جدید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے۔ مگر یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ انگریزی زبان کا ارتقا جن حالات میں ہوا ، اس کی وجہ سے اس کے اندر مشینی خیالات کو ادا کرنے کی زیادہ بہتر صلاحیت پیدا ہوگئی۔ مگر ایک اور میدان ایسا ہے جہاں اردو (اور عربی) کو مغربی زبانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ ہے روحانی تجربات یا معرفت ربانی والے خیالات کو ادا کرنا۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسٹر راجیو گاندھی جہاز چلا رہے تھے۔ اتفاق سے خوشونت سنگھ بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ راجیو گاندھی نے خوشونت سنگھ کو پیش کش کی کہ وہ پائلٹ کے کیبن (Cookpit) میں آئیں اور دیکھیں کہ ہوائی جہاز کس طرح چلایا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا ایک عام مسافر صرف ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ اس کا مشاہدہ نہیں کرتا کہ ہوائی جہاز کس طرح اڑایا جاتا ہے ۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ میں چاہتا ہوں کہ کائناتی جہاز کے "انجن" کو دیکھوں۔ میں اس عالم غیب کو دیکھوں جس کے تحت یہ عالم شہود چلایا جا رہا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اس کو دیکھے گا۔ مگر اس لذت دیدار کی سعادت انھیں لوگوں کو ملے گی جنھوں نے دنیا میں اپنی "بینائی" کی حفاظت کی ہو۔ جو لوگ دنیا میں اپنی "بینائی" کو کھو دیں انھوں نے گویا اپنے آپ کو اس ربانی مشاہدہ کے لیے نااہل بنا لیا۔ وہ دنیا میں خدا کی بات کو دیکھنے سے محروم تھے ، آخرت میں وہ خدا کی ذات کو دیکھنے سے محروم رہیں گے ۔

دہلی اور فرینکفرٹ کے درمیان سفر کرتے ہوئے جہاز ہلنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک شدید جھٹکے لگتے رہے۔ خالص فنی اعتبار سے اس قسم کے جھٹکے خطرناک نہیں ہوتے۔ مگر ایک عام مسافر جو ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہو اور اس کی سواری ہچکولے کھانے لگے تو اس کا غیر متاثر رہنا سخت مشکل ہے۔ بے اختیار میری زبان سے کلمہ کے الفاظ نکلنے لگے۔

اس وقت خیال آیا کہ آخر وقت میں کلمہ پڑھنے کی اہمیت کیوں ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ مومن پر آخری وقت آئے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ اپنے اعمال نامہ میں کوئی آخری نیکی ریکارڈ کرا سکے۔ اس وقت اس کو سب سے بہتر چیز صرف کلمہ نظر آتا ہے۔ کیوں کہ کلمہ دو سب سے بڑی حقیقت کا اعلان ہے۔ ایک یہ کہ اس دنیا کا معبود صرف ایک اللہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہاں کامل صداقت صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں پر ظاہر کی گئی۔ آخر وقت میں کلمہ پڑھ کر بندہ گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں کوئی عمل نہ کر سکا، اب میں اعتراف کو تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میرے پاس اقرارِ عملی کا سرمایہ نہیں۔ تو اقرار لسانی کو میری طرف سے قبول کر لے۔

ساڑھے آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز فرینکفرٹ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ فرینکفرٹ کو مغربی جرمنی کا تجارتی مرکز (Business capital) کہا جاتا ہے۔ گویا مغربی جرمنی میں اس کی حیثیت وہی ہے جو ہندستان میں بمبئی کی اور امریکہ میں نیویارک کی۔ ۱۹۴۴ کے ہوائی حملہ میں فرینکفرٹ تباہ ہو گیا تھا۔ تاہم اب چند تاریخی عمارتوں کے سوا کہیں اور اس کا نشان موجود نہیں ——— اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تخریب کے بعد نئی تعمیر کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

فرینکفرٹ میں ایک دکان ہے جو ۳۲۵ سال سے مسلسل جاری ہے اس کا نام میسن (Meissen) ہے۔ یہ کٹلری کی دکان ہے۔ یہاں سے آپ ۷۰ قسم کی قینچیاں اور ایک سو قسم کی چھریاں خرید سکتے ہیں ——— تجارت کی کامیابی سب سے زیادہ استقلال پر منحصر ہے۔ مگر یہی صفت موجودہ مسلمانوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

فرینکفرٹ سے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۷۰ کے ذریعہ سفر ہوا۔ ساڑھے نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز نیویارک پہونچا۔ نیویارک میں باہر کا موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ تاہم ایرپورٹ کے اندر

آدمی اپنے آپ کو ایک جزیرہ میں محسوس کر رہا تھا۔ نیویارک کو عالمی اقتصادی مرکز (World Financial Centre) کہا جاتا ہے۔ یہ جدید مواصلاتی ذرائع کا کرشمہ ہے، اس کے بغیر سی شہر کو عالمی اقتصادی مرکز کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد تقریباً ۴ سال تک امریکہ کو یہ حیثیت حاصل رہی۔ مگر اب امریکہ پر زوال کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا عتراف حال میں خود رونالڈ ریگن نے کیا۔

بین ایم کی میگزین (دسمبر ۱۹۸۸) میں ایک مضمون سفر کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سفر میں اگرچہ بہت سے فائدے ہیں، لیکن سفر ایک تھکا دینے والا عمل (Tiring task) ہے۔ کم از کم یہ بات میرے لیے صد فی صد سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ اس سفر کے لیے جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میری زبان سے نکلا: مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مذبح کی طرف جا رہا ہوں۔ سفر میں خواہ بظاہر کتنی ہی چمک دمک ہو، مگر میرے لیے وہ ہلاکت خیز حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہر بار یہ سوچتا ہوں کہ اب کبھی کسی سفر میں نہ جاؤں گا۔ مگر مشن کا تقاضا مجبور کرتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔

انسان کا ذہن قدرت کا ایک خاموش کارخانہ ہے۔ وہ ہر آن اپنی "پیداوار" دیتا رہتا ہے۔ البتہ عام کارخانوں کی طرح، ذہن کا معاملہ بھی یہ ہے کہ جیسا "خام مال" اس کے اندر ڈالا جائے اسی کے مطابق وہ اپنی پیداوار دے گا۔ مثلاً ایک شخص حسد، بغض، گھمنڈ اور ناجائز نفع اندوزی جیسی چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے تو اس کے ذہن سے جو چیزیں بن کر نکلیں گی، وہ انھیں برائیوں کا مرکب ہوں گی۔ اس کے برعکس جو شخص صالح چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے اس کا ذہن صالح پیداوار کا کارخانہ بن جائے گا۔

میرے اندر خدا کے فضل سے توحید، آخرت اور تعمیر پسندی کا مزاج ہے۔ اس لیے میرے ذہن سے جو فکری پیداوار برآمد ہوتی ہے وہ ہمیشہ انھیں چیزوں کا مرکب ہوتی ہے۔ نیویارک سے لاس اینجلس جاتے ہوئے راستہ میں بن جانسن کا واقعہ ذہن میں آیا، اس نے کہا تھا کہ لوگوں نے مجھ سے میرا میڈل چھینا ہے نہ کہ میری رفتار (الرسالہ فروری ۱۹۸۹، صفحہ ۵)

میرے ذہن میں آیا کہ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگا کہ: لوگوں نے مجھ

سے اپنی دی ہوئی چیز چھینی ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی چیز۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہمیشہ کم ہوتی ہے اور خدا کی دی ہوئی چیز ہمیشہ زیادہ۔ ہر آدمی جب بھی کوئی چیز کھوتا ہے تو وہ "کم" کو کھوتا ہے "زیادہ" پھر بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ کم کو بھول کر زیادہ پر اپنی ساری توجہ لگا دے۔

ایک اور موقع پر ایک تجربہ گذرا۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آگیے: آج کا انسان تمنا کے درجہ میں بھی جنت کا طالب نہیں، عمل کے درجہ میں اس کا طالب ہونا تو درکنار۔ ایسی حالت میں لوگوں پر جنت کے دروازے کھلیں تو کیسے کھلیں۔

ہندستان سے امریکہ جانے کے لیے پان امریکن کی دو روٹ ہیں۔ ایک لندن کے راستہ سے۔ دوسرا، فرینکفرٹ کے راستہ سے۔ پچھلی بار نومبر ۱۹۸۵ میں جب میں امریکہ گیا تھا تو لندن کے راستہ سے گیا تھا۔ امریکہ کے لیے میرا موجودہ سفر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہوا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس بار جو ٹکٹ بھیجا وہ فرینکفرٹ کے راستہ سے تھا۔ جس دن میں نے فرینکفرٹ سے نیویارک کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۷۰ سے سفر کیا۔ عین اسی دن پین ایم کا دوسرا جہاز فلائٹ نمبر ۱۰۳ لندن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اگر میری روٹ لندن

کے راستہ سے ہوتی تو میں عین اسی جہاز میں ہوتا۔

لندن سے نیویارک جانے والے اس جہاز (فلائٹ ۱۰۳) کے ساتھ عجیب حادثہ پیش آیا۔ لندن سے روانہ ہو کر وہ فضا میں بلند ہوا اور ۳۱ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہونچ کر ۸۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگا۔ جب وہ اسکاٹ لینڈ میں داخل ہوا تو اچانک اس میں دھماکہ ہوا۔ وہ وہاں کے ایک گاؤں لاکربی (Lockerbie) کے اوپر گر پڑا۔ جہاز مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اس کے اوپر اس وقت ۲۵۸ مسافر تھے جو سب کے سب فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔

امریکہ کی سرزمین پر اترنے کے بعد مجھے جو پہلی خبر ملی وہ یہی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری روٹ کو بدل دیا۔ اگر میرا سفر لندن کے راستہ سے ہوتا تو الرسالہ کے قارئین کو "سفرنامہ" کے بجائے شاید میری موت کی خبر پڑھنے کو ملتی۔

امریکہ کی سرزمین پر پہلی بار میں اپریل ۱۹۸۳ میں آیا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں چھپ چکی ہے۔ اس وقت میں ٹرانزٹ پیسنجر کے طور پر نیویارک ایرپورٹ پر اترا تھا۔ اس موقع پر ایک عجیب ناقابل فہم واقعہ پیش آیا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ میری باری آئی تو کلرک نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگانے کے بجائے اس کو اپنے پاس رکھ کر مجھے ایک طرف کھڑا کر دیا۔

میں انتظار میں کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ تمام مسافر ایک کے بعد ایک چلے گئے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام سپاہی آیا۔ کلرک نے فوراً میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا جیسے کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ اب میں اس سپاہی کی تحویل میں تھا، اور میرا پاسپورٹ اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ مجھ کو لے کر لاؤنج میں کھڑا ہو گیا۔ اب دوبارہ ایک اور شخص کے انتظار کا مرحلہ شروع ہوا۔ کافی دیر کے بعد ایک سفید فام پولیس افسر آیا۔ سیاہ فام سپاہی نے اب میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

سفید فام پولس افسر نے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلا۔ یہاں تک کہ ہم لوگ ایرپورٹ کے باہر پہونچ گئے۔ یہاں پولس کی ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کار پر بیٹھ گئے۔ کار روانہ ہوئی اور مختلف سڑکوں سے ہوتی بالآخر ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے

رکی۔ پولس افسر مجھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ یہ اس کا دفتر تھا۔ یہاں اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔ اور مشین پر میرے پاسپورٹ کے ہر صفحہ کا فوٹو لینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے پولس افسر سے کہا :

Am I under arrest?

اس نے مسکرا کر کہا کہ نہیں۔ اب تک ہم دونوں خاموش تھے۔ اب باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔ اس نے اپنا نام مسٹر لوئی (My Louis) بتایا۔ اس پولس افسر کی کار پر بیٹھے بیٹھے میں نے پہلی بار نیویارک شہر کی ایک جھلک دیکھی۔ تاہم کسی نامعلوم ہدایت کی بنا پر اس نے میرا پاسپورٹ مجھے نہیں دیا۔ وہ مجھ کو لے کر دوبارہ ایرپورٹ آیا اور خود ہی ایر انڈیا کی پہلی فلائٹ سے میری سیٹ کنفرم کرائی اور مجھ کو ہوائی جہاز کے اندر داخل کر کے بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات آپ کو پائلٹ کے ذریعہ مل جائیں گے۔ چنانچہ دوران پرواز مجھے ایک لفافہ دیا گیا جس میں پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔

امریکہ کے لیے میرا دوسرا سفر نومبر ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی مفصل روداد الرسالہ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۶ میں شائع ہو چکی ہے۔ امریکہ کا تیسرا سفر موجودہ سفر تھا جو دسمبر ۱۹۸۸ میں ہوا۔

ہوائی سفر کے اعتبار سے ہماری آخری منزل لاس اینجلیز تھی۔ نیویارک سے لاس اینجلیز تک کا فاصلہ ساڑھے پانچ گھنٹہ میں طے ہوا۔ ایرپورٹ سے جائے قیام (انا ہائم) تک ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کا ساتھ رہا۔ راستہ کی گفتگو میں انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بالکل صحیح طور پر معلوم نہیں۔ عام اندازہ کے مطابق ۸ ملین سے ۱۰ ملین تک مسلمان امریکہ میں آباد ہیں۔ ان مسلمانوں میں عام طور پر دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ایسے ملکوں سے آئے ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ دوسرے، وہ لوگ جو ایسے ملکوں میں تھے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور اب وہ وہاں سے آکر امریکہ میں آباد ہوئے ہیں۔

اکثریتی ملکوں کے مسلمانوں میں دینداری نسبتاً بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے ملکوں میں دینی کام (مثلاً مسجد، مدرسہ وغیرہ) سب حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نفسیاتی

طور پر یہ سمجھنے لگے کہ یہ سب حکومت کے کرنے کے کام ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں انھوں نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اقلیتی ملکوں کے لوگ اپنے ملک میں خود ہی یہ سب کام کر رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ امریکہ (یا دوسرے مغربی ملکوں) میں آئے تو اپنی سابقہ نفسیات کے تحت انھوں نے اس کو خود اپنی ذمہ داری سمجھا کہ وہ اپنے دین کا تحفظ کریں اور مسجد اور مدرسے اور دینی ادارے قائم کریں۔ اس وقت امریکہ میں کثرت سے مدرسے اور اسلامی مراکز قائم ہیں۔ اور یہ زیادہ تر اقلیتی ملکوں کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صدیقی نے بتایا کہ تاہم یہاں کا تہذیبی دباؤ بہت سخت ہے۔ بمشکل دس فی صد مسلمان ایسے ہوں گے جو اپنے دین کے لیے واقعۃً فکرمند ہوں۔ ڈاکٹر صدیقی کی گفتگو ایک یہودی سے ہوئی۔ انھوں نے دوران گفتگو کہا کہ مغربی ملکوں میں بھی ہم اسلامی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں (we can survive) یہودی نے ان کی بات کو سنا اور پھر بولا کہ تیسری نسل کے بعد آکر مجھے بتانا :

Come and tell me after third generation

جس ادارہ کی دعوت پر میرا یہ سفر ہوا، اس کے دفاتر گارڈن گروو (Garden Grove) میں واقع ہیں۔ تاہم سیرت کانفرنس کا اہتمام قریب کے شہر اناہائم (Anaheim) میں کیا گیا تھا۔ یہ امریکہ کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں میرا قیام ہلٹن ہوٹل (Hilton and Towers) کے کمرہ نمبر ۱۴۸-۵ میں تھا۔ مذکورہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کی کارروائیاں اسی ہوٹل کے ایک بڑے ہال میں انجام پائیں۔

اناہائم، کیلی فورنیا میں واقع ہے۔ کیلی فورنیا کے بعض حصے نہایت گرم ہیں۔ مشہور وادی موت (Death Valley) کا تعلق اسی علاقہ سے ہے جو تقریباً ۲۲۵ کیلومیٹر لمبی ہے۔ پروفیسر ارونگ (T.V. Irving) کی تحقیق ہے کہ کیلی فورنیا کا لفظ اسپین سے آیا ہے۔ عرب جب اسپین آئے تو وہاں کے کسی گرم مقام کو انھوں نے قلعۃ الفُرن (تنور کا قلعہ) کہا۔ یہ لفظ اسپینی لہجہ میں بگڑ کر کیلی فورنیا ہو گیا۔ اس کے بعد جب اسپین کے لوگ امریکہ آئے اور چلتے ہوئے اس مقام پر پہونچے تو یہ مقام انھیں بہت گرم محسوس ہوا۔ چنانچہ اس کا نام

انھوں نے کیلی فورنیا رکھ دیا۔ گویا کیلی فورنیا ایک عربی لفظ قلعۃ الفرن کی اسپینی صورت ہے۔

ہندستان ایک زیر ترقی ملک ہے۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں ہر چیز کا معیار ہندستان سے ممتاز طور پر مختلف ہے۔ مثلاً ہندستان کا ایک آدمی اپنے ٹی وی سٹ کو چلانے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور اس کا بٹن دبا کر اس کو آن کرتا ہے۔ مگر یہاں آپ کو ٹی وی سیٹ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ فاصلہ پر لیٹے یا بیٹھے ہوئے دیاسلائی کے برابر ایک آلہ کا بٹن دبائیں گے اور آپ کا ٹی وی فوراً چلنے لگے گا۔ ریموٹ کنٹرول کا یہ طریقہ اب امریکہ میں بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔

ہوٹل کے کمرہ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہمیں چابی استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے پاس تاش کے پتہ کی مانند ایک چھوٹا سا سوراخ دار کارڈ تھا۔ اس کو ایک خانہ میں ڈالا جاتا تو وہاں ہری بتی جل جاتی۔ اس کے بعد ایک ہینڈل دبانے سے دروازہ اپنے آپ کھل جاتا تھا۔ یہ کمپوٹر کا کرشمہ تھا۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ہوٹل کے کمرہ کی پشت پر دیواری شیشہ کے باہر میں نے دیکھا تو کمرہ سے ملا ہوا وسیع پارک نظر آرہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ میں تو ہوٹل کی پانچویں منزل پر ہوں، پھر یہاں پارک کیسا۔ مگر یہ چھت کا پارک تھا۔ ہوٹل کے درمیان میں وسیع چھت پر درخت اور پھول اگا کر یہ پارک قائم کیا گیا تھا۔ تاہم اس کی زمین مصنوعی تھی۔ بظاہر زمین پر گھاس کا ہرا لان دکھائی دیتا تھا۔ مگر وہ درحقیقت کیمیائی قالین تھا جو کٹی ہوئی گھاس کی مانند بنا کر زمین پر بچھا دیا گیا تھا۔

ہلٹن ہوٹل کے جس وسیع ہال میں سیرت کانفرنس ہو رہی تھی، ایک بار مجھے اس کے ٹوائیلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے اندر میں نے دیکھا کہ ایک ٹونٹی دار لوٹا (Watering can) رکھا ہوا ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا یہ امریکی لوٹا اس ہندستانی لوٹے سے بالکل مختلف تھا جس کے متعلق یہ استہزائی فقرہ مشہور ہے: "کیا آپ کے شامل بندھنا بھی ہے"۔ یہ اتنا خوبصورت اور اتنا موزوں بنا ہوا تھا کہ وہ آرٹ کا ایک نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اگر اتنا خوبصورت لوٹا بنایا ہوتا تو ناممکن تھا کہ کسی جواہر لال نہرو

کو یہ جرأت ہو کہ وہ ٹونٹی دار لوٹے کو مسلم تہذیب کا نشان بتا کر اس کا مذاق اڑا لے۔ اس کے بعد لوٹے کا مذاق اڑانا خود اپنی بد ذوقی کا اشتہار دینے کے ہم معنی بن جاتا ، اور کون ہے جو اپنی بد ذوقی کا اشتہار دینا پسند کرے ۔

کانفرنس کے دوران عربوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملا ۔ ۲۴ دسمبر کو فجر کی نماز کے لیے مقررہ ہال میں پہونچا تو وہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر جمال بدوی موجود تھے۔ وہ مصری ہیں اور آج کل کناڈا میں رہتے ہیں ۔ انھوں نے مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے اصرار کیا۔ میں نے یہ کہہ کر ان کو آگے بڑھا دیا : الائمة من العرب ، وانا احبّ ان اسمع قرأة العرب ۔

فنی قاریوں کی قرأت مجھے پسند نہیں ۔ مگر عربوں کی سادہ قرأت مجھے بے حد پسند ہے ۔ ایک عرب عالم جب قرآن کی قرأت کرتا ہے تو اس کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ صوتی لہروں پر میرا رشتہ ماضی سے قائم ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر ایک ارتعاش (Thrill) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام بھی اسی طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے ۔

یہ اسلام کی ایک نادر خصوصیت ہے جو آج کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں ۔ دوسرے مذاہب کی کتابیں جن زبانوں میں تھیں وہ آج مردہ زبانیں بن چکی ہیں ۔ یہ زبانیں جس لہجہ میں اپنے ابتدائی زمانے میں بولی جاتی تھیں ، ان کا تسلسل بعد کی تاریخ میں قائم نہ رہ سکا ۔ اس لیے آج یہ جاننا ناممکن ہے کہ قدیم مذاہب کی مقدس کتابوں کو ان کے ابتدائی حاملین کس طرح پڑھتے تھے ۔ مگر قرآن کی زبان پوری طرح ایک زندہ زبان ہے ۔ اس کا لہجہ تواتر کے ساتھ تاریخ میں سفر کرتا ہوا ہم تک پہونچ رہا ہے ۔ آج کا ایک فصیح عرب عالم جب قرآن کو پڑھتا ہے تو وہ عین وہی لہجہ ہوتا ہے جس میں اصحاب رسول قرآن کو پڑھتے تھے ۔ اس طرح ہر فصیح عرب عالم گویا صحابہ کرام کی قرأتِ قرآن کا زندہ ٹیپ ہے ــــــ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے جو " قرآنِ محفوظ " کی صورت میں انسانیت کے حصہ میں آیا ہے ۔

قومی آواز (۱۳ جنوری ۱۹۸۹) میں ایک عالم کی تقریر نقل ہوئی ہے ۔ موصوف نے ایک عربی مدرسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا : اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کی زبان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس کی وجہ سے ڈیڑھ ہزار سال سے یہ کلام اور زبان آج تک ایک حرف کی تبدیلی کے

بغیر محفوظ ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں تغیرات رونما ہوئے اور ان کی اصلی حالت زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ۔ لیکن عربی زبان انقلاباتِ زمانہ کے باوجود اپنی اصل حالت پر برقرار ہے ۔ کیوں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے اور اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے ۔ مسلمان بجا طور پر اس پر فخر کر سکتے ہیں (صفحہ ۶)

قرآن کا اور عربی زبان کا محفوظ ہونا اہل اسلام کے لیے فخر کی بات نہیں بلکہ شکر کی بات ہے ۔ کوئی شخص کہے کہ سورج کروروں سال سے برابر روشن ہے اور اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے تو یہ ایک لغو بات ہوگی ۔ کیوں کہ سورج کو دیکھ کر ہمارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فخر کا جذبہ ۔ اسی طرح قرآن اور عربی کا محفوظ ہونا بھی شکر کا موضوع ہے نہ کہ فخر کا موضوع ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل غلطی یہی ہے کہ انھوں نے قرآن اور اسلام کو اپنا قومی فخر بنالیا ہے ۔ یہی وہ برائی ہے جس میں اس سے پہلے یہود مبتلا ہوئے ، اور اب مسلمان بہت بڑے پیمانہ پر اس میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔

کانفرنس کے پروگرام میں شیخ جاد الحق (شیخ الازہر ، قاہرہ) ، ڈاکٹر عبد المحسن الترکی (ریاض) اور ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف (مکہ) کا نام بھی تھا ۔ وہ لوگ اس کے اجلاس کو خطاب کرنے والے تھے مگر آخر وقت میں کچھ اسباب پیش آنے کی وجہ سے وہ شرکت نہ کر سکے ۔ ان لوگوں کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے ۔

کانفرنس میں ایک عرب شیخ نے بہت دلچسپ تقریر کی ۔ انھوں نے عربی میں خطاب کرتے ہوئے کہا : هل قرأتم في القرآن : ادع الى سبيل ربك بالسيف او بالارهاب (کیا آپ نے قرآن میں پڑھا ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف تلوار اور دہشت گردی کے ذریعہ بلاؤ) اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ (النحل ۱۲۵) اس کے بعد انھوں نے بہت اچھے انداز میں اس کی تفصیل کی کہ دعوت دل کو جیتنے کا نام ہے نہ کہ جسم کو قتل کرنے کا ۔

میں نے کہا کہ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ دوسرے لوگ اگر "سیف" کو استعمال کریں تب بھی ہمیں حکمت اور موعظت حسنہ ہی کے طریقہ پر قائم رہنا ہوگا ۔ اس کے

بغیر حکیمانہ دعوت کا عمل جاری رہنا ممکن نہیں ۔

ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی (ملک عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ) نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی منفی تصویر (Negative image) بن گئی ہے ۔ اس صورت حال کو بدلنا اور لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی مثبت تصویر (Positive image) بنانا وقت کا سب سے بڑا کام ہے ۔ یہ عین وہی بات ہے جس کی الرسالہ مشن کے ذریعہ کوشش کی جارہی ہے ۔ ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی ہمارے اس مشن سے پوری طرح واقف ہیں ۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے ، مگر وہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں یہ دوسری بات شامل نہ کی جائے کہ تصویر کو بدلنے کا یہ کام خود مسلمانوں کو کرنا ہوگا ۔ اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ مسلمان دوسروں کی ایذا رسانی پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کریں ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ کو شام کے اجلاس میں میں نے اپنا مقالہ (انگریزی) پڑھ کر سنایا ۔ سننے کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کی کاپی حاصل کرنا چاہا ۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے بتایا گیا کہ یہ مقالہ (دوسرے مقالوں کے ساتھ) کتابی مجموعہ میں شائع کیا جائے گا ۔ نیز اس کا مکمل ویڈیو ٹیپ بھی کانفرنس کے منتظمین کے پاس موجود ہے ۔ مقالہ کا عنوان یہ تھا :

Dawah Activism: The Prophetic Method

۲۴ دسمبر کی شام کو " ورک شاپ " تھی ۔ اس میں کافی لوگ شریک ہوئے ۔ اس نشست کے ماڈریٹر ڈاکٹر عبدالرحیم الطالب (سوڈانی) تھے ۔ ایک اعتبار سے یہ " سوال و جواب " کی مجلس تھی ۔ سب کے سب پڑھے لکھے لوگ تھے ۔ پوری گفتگو نہایت سنجیدہ علمی انداز میں ہوئی ۔

ابتداءً میں نے دعوت کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی کچھ مزید وضاحت کی ۔ اس کے بعد تحریری انداز میں سوالات آنا شروع ہوئے ۔ تقریباً دو درجن سوال آئے ۔ میں نے مختصر اور مثبت انداز میں سوالات کا جواب دیا ۔ یہ سوالات کس قسم کے تھے ، اس کا اندازہ کرنے کے لیے تین سوالات یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

1. Please tell us which are the books in English that can enlighten the non-Muslims who are interested in accepting Islam.

2. We are having difficulty in doing Dawah work because of bad and wrong practices of Muslims. The religion of Islam teaches one thing and the Muslims do just against it. What is your answer to this problem.

3. Could you explain how does one manage to awaken his or her spiritual consciousness.

۲۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس ہال میں ایک اثر انگیز واقعہ پیش آیا۔ اسی روز میں نے اپنا ۴۵ منٹ کا مقالہ پڑھا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنا مقالہ ختم کیا ، سامنے کی نشستوں پر ایک امریکی نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس نوجوان کو اسٹیج پر لایا گیا اور مائک کے پاس کھڑا کر کے اس سے کلمہ پڑھایا گیا۔ اس کے بعد انگریزی میں کلمۂ شہادت کی تشریح بتائی گئی۔

بعد کو اس نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنا نام میریو سرانو (Mario Serrano) بتایا۔ اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس نے بطور خود کچھ اسلام کا مطالعہ کیا تھا، مگر اسلام قبول کرنے کی بابت آخری فیصلہ اس نے کانفرنس میں میرا مقالہ سننے کے بعد کیا۔ اسی طرح امریکہ میں اور پوری دنیا میں ہر روز کچھ نہ کچھ افراد اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اسلام کی اپنی طاقت کے ذریعہ ہو رہا ہے ، مسلمانوں کے کسی باقاعدہ تبلیغی عمل کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

۲۴ دسمبر کی شام کو آخری پروگرام تھا۔ اس موقع پر امریکن مسلم کمیونٹی کے قائد امام دبلیس (وارث) محمد نے خطاب کیا۔ وہ باقاعدہ باڈی گارڈ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ وہ شکاگو سے خاص اسی شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا مقصد مکمل لبریشن ہے۔ یعنی انسان کو ہر عملی یا فکری بندھن سے آزاد کر کے ایک خدا کا عابد بنانا۔

آخری تقریر سعودی عرب کے پرنس محمد الفیصل کی تھی۔ وہ سعودی ایمبیسی (واشنگٹن) میں اسلامک افیرس شعبہ کے چیرمین ہیں۔ مسلم ملکوں میں غالباً سعودی سفارت خانہ پہلا سفارت خانہ ہے جس نے اس قسم کا اسلامی شعبہ بڑے پیمانہ پر قائم کیا ہے۔ پرنس محمد الفیصل نے نہایت

سادہ اور سنجیدہ انداز میں انگریزی میں تقریر کی جس میں لقد جاءکم رسول من انفسکم (التوبہ ۱۲۸) کی تشریح بیان کی ۔ انھوں نے اپنی تقریر اس جملہ پر ختم کی کہ یہاں آنے سے میرا مقصد آپ کے ساتھ شریک ہونا تھا نہ کہ آپ سے کچھ کہنا :

I came here to share something with you, rather than to say something to you.

کانفرنس ۲۲ ۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو تھی ۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ یہاں مزید قیام کیا جائے اور مختلف مقامات (نیو یارک ، شکاگو ، سان فرانسسکو وغیرہ) میں پروگرام رکھا جائے اور وہاں خطابات کیے جائیں ۔ اگر میں ان لوگوں کی تجویز مان لیتا تو مجھے کئی مہینے تک یہاں ٹھہرنا پڑتا ۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہ تھا ، اس لیے کانفرنس کے بعد میں صرف چند دن ٹھہر سکا اور بعض اجتماعات کو خطاب کیا ۔

۲۳ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا ۔ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی ۔ یہ مسجد پہلے چرچ تھی ۔ مسیحی حضرات نے اس کو فروخت کر دیا ۔ چرچ کی یہ عمارت اب مسجد کے طور پر استعمال ہوتی ہے ۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد میں قرآن کا مختصر درس دیا ۔ ۲۵ دسمبر کو نماز ظہر کے بعد دوبارہ اس مسجد میں درس حدیث کا پروگرام تھا ۔

جمعہ کے دن جب میں مسجد میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نمازی لوگ اس کے اندر متفرق طور پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ مگر جب پہلی اذان ہوئی تو اس کے فوراً بعد تمام لوگ مل مل کر صف کی صورت میں کھڑے ہو گئے ۔ جماعت سے پہلے کی سنتیں انھوں نے صف بندی کر کے پڑھیں ۔ سنتوں سے فارغ ہو کر وہ صف بہ صف بیٹھ گئے ۔ خطبہ کے بعد جب جماعت کی نماز شروع ہوئی تو ان کے اٹھتے ہی صفیں قائم ہو گئیں ، " آگے آجائیے ، آگے آجائیے " کی پکار بلند کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ۔ یہی طریقہ ہندستانی مسجدوں میں بھی رائج ہو جائے تو کتنا اچھا ہو ۔

پروفیسر ایوانے یازبیک حداد کے حوالہ سے معارف (جنوری ۱۹۸۹) میں ایک رپورٹ (امریکہ میں مسلمان) شائع ہوئی ہے ۔ اس میں درج ہے کہ :

" امریکہ میں مسلمان عورتیں جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرتی ہیں ۔ مگر مرد اپنی ملازمت اور کاروباری مشغولیتوں کی وجہ سے جمعہ کی نماز کے لیے

ن میں نہیں جاسکتے۔ چنانچہ وہ اتوار کو اجتماعی طور پر ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں " صفحہ ۶۰
امریکہ کے مسلمان مردوں کے بارہ میں اس رپورٹ میں جنرلائزیشن سے کام لیا گیا ہے۔ امریکہ
مسلمان مرد تین قسموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا۔
گروہ اتوار کے دن ظہر کی با جماعت نماز کو جمعہ کے بدل کے طور پر ادا کرتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ
ہ حسب قاعدہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے۔ ۲۳ دسمبر کو میں خود جمعہ کی ایک
ت میں شریک ہوا۔
جناب صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ۲۵ دسمبر کو عورتوں اور مردوں کی ایک تعداد جمع ہوئی۔
زہ تر تاجر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اس موقع پر آیات اور احادیث کی روشنی میں
ں خطاب ہوا۔ ۲۷ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں تیسرا خطاب ہوا۔
ا موضوع حقیقتِ دین تھا۔ پھر ۲۸ دسمبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر
ہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے اسلام میں آخرت کا تصور اور اس کی اہمیت پر ایک
ی۔ ان سب تقریروں کا ٹیپ وہاں کے لوگوں کے پاس موجود ہے۔
۲۹ دسمبر کے اجتماع میں ایک انجینیر، صفی الرحمٰن قریشی (پیدائش ۱۹۵۱) بھی موجود تھے۔
نے دیکھا پورے مجمع میں وہ سب سے کم بولنے والے ہیں۔ اجتماع کے دوران وہ مکمل طور پر
ش رہے۔ بعد کو ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے
حدیث سنائی جس میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص چپ رہا، اس نے نجات پائی (من سکت
ا) میں نے کہا کہ آپ اس حدیث کی تشریح کن الفاظ میں کریں گے۔ انھوں نے کہا: " جب
ل رہا ہوں تو میں سیکھ نہیں رہا ہوں " ان کی یہ مختصر تشریح مجھے بہت پسند آئی۔
ایک مجلس میں دعوتی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہفت روزہ
ۃ (ریاض) کے شمارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا
ہم مغرب کی مسلم نسلوں کو ضائع ہونے کے لیے چھوڑ دیں :
اجیالنا المسلمۃ فی الغرب ھل نترکھا نھباً للضیاع
ن میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت مغربی دنیا میں جو مسلمان آباد ہیں، ان کی تعداد دس ملین

سے زیادہ ہے ۔ یہ لوگ گویا مغرب میں ہمارے سفیر ہیں (هم سفراءنا في المغرب)

یہ بلاشبہ صحیح ترین لقب ہے جو مغرب میں مقیم مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے ۔ خاص طور پر امریکہ میں جو مسلمان آباد ہیں، انھیں اگر اپنی اس حیثیت کا شعور ہو جائے تو وہ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں ۔

میں نے انھیں ایک حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی ۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، مگر وہ مدینہ ہے (أُمِرتُ بقرية تأكل القرى يقولون يثرب وهي المدينة) اس حدیث سے اسلام کا طریق کار معلوم ہوتا ہے ۔ وہ یہ کہ "مکہ" میں اگر اسلامی دعوت کے لیے حالات نامساعد ہوں تو "مدینہ" کو دعوتی مرکز بنا کر دوسرے علاقوں کو مسخر کرو ۔ یہ طریق کار دور اول میں نہایت کامیابی کے ساتھ زیر عمل لایا جا چکا ہے، اور موجودہ زمانہ میں بھی اس کے مواقع پوری طرح موجود ہیں ۔

میں نے کہا کہ امریکہ کو آج اسی قسم کے ایک "قریہ" کا مقام حاصل ہے ۔ امریکہ میں وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو قدیم زمانہ میں "یثرب" میں پیدا ہوئے تھے ۔ یہاں کے لوگوں میں مختلف اسباب سے دین حق کی پیاس پیدا ہو چکی ہے ۔ یہاں دعوت و تبلیغ کے آزادانہ مواقع پوری طرح موجود ہیں ۔ یہاں وہ تمام جدید ترین اسباب و وسائل مہیا ہیں جو اشاعت فکر کے کام کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے درکار ہیں ۔

• مزید یہ کہ امریکہ کو، ایک اعتبار سے، عالمی قیادت کا مقام حاصل ہے ۔ اگر امریکہ میں موثر انداز میں دعوتی کام کر کے یہاں کی اکثریت کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے تو وہ دوسری قوموں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا ۔ حدیث کے الفاظ میں، امریکہ کا "قریہ" دوسرے تمام قریوں کو نگل جائے گا ۔

مک کلوسکی (Pete McCloskey) امریکہ کے ایک سیاسی لیڈر ہیں ۔ وہ پندرہ سال تک کانگرس (پارلیمنٹ) کے ممبر رہے ہیں ۔ وہ مسلم نواز مشہور ہیں، خاص طور پر فلسطین کے معاملہ میں وہ کھلے طور پر اسرائیل کے مخالف اور عربوں کے حامی ہیں ۔ چنانچہ یہاں کے یہودی ان کے سخت مخالف ہیں ۔ پچھلے الکشن (کیلی فورنیا) میں یہودیوں نے ان کے خلاف متحدہ ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا ۔

اس حلقہ انتخاب میں یہودی ووٹروں کی تعداد ۸۰۰ ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں نیویارک میں پانچواں "مسلم ورلڈ ڈے" منایا گیا۔ اس موقع پر روز ویلٹ ہوٹل کے ہال (Grand Ballroom) میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر مک کلوسکی نے کہا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہودی یہاں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کا یہاں کی پالیسیوں پر کوئی اثر نہیں۔ اس کی وجہ خود مسلمان ہیں نہ کہ امریکی نظام۔ امریکی مسلمان اگر اپنے ووٹوں کا بھرپور استعمال کریں تو وہ یہاں کے نظام کو بدل سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہود نوازی امریکہ کی روایتی پالیسی نہیں۔ موجودہ یہود نواز پالیسی کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کا یہودی گروپ نہایت گہرے طور پر یہاں کے سیاسی عمل میں شریک ہے اور ہر سطح پر اس میں حصہ لیتا ہے۔ امریکہ میں ایک اور طاقتور گروپ ہے جو تعداد میں زیادہ بڑا ہے۔ یہ عرب ہمدردوں (مسلمانوں) کا گروپ ہے۔ مگر وہ ہمارے سیاسی عمل میں شرکت نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کی پامالی کے بارہ میں آپ کے احساسات امریکی نظام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک آپ اس مقصد کے لیے منظم نہ ہو جائیں:

> The reason for the pro-Israeli policy of the United States is because one group of people in this country is deeply involved in political process and participates in it at all levels. The United States has another strong group which is greater in size and that group is Arab sympathisers, (yourselves), which has not participated in our political process. Your feelings about human rights violations will not be translated into American system unless you are not organized.
>
> (*The Minaret*, New York, December 16, 1988)

آپ کو امریکہ میں اور امریکہ کے باہر بے شمار مسلمان ملیں گے جو امریکہ کی مسلم دشمنی پر الفاظ کا دریا بہائیں گے۔ مگر ایسا مسلمان شاید ایک بھی نہ ملے جو سنجیدہ طور پر یہ رائے رکھتا ہو کہ یہ خود اپنی عمل کوتاہی کا مسئلہ ہے نہ کہ امریکہ کی اسلام دشمنی کا۔ امریکہ کو "مسلم دشمنی" کے مقام سے ہٹا کر مسلم نوازی اور اسلام دوستی کے مقام پر لانے کے دو یقینی راستے ہیں۔ ایک دعوتی عمل کا راستہ، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ دوسرا سیاسی عمل کا راستہ، جس کی نشاندہی مسٹر مک کلوسکی نے کی۔

مگر مسلمانوں کے اندر نہ پہلے عمل کے لیے کوئی حقیقی جذبہ ہے اور نہ دوسرے عمل کے لیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خود تو اپنی ساری طاقت اپنا ذاتی مستقبل بنانے میں لگائے رہیں، اور دوسرے لوگ آکر ان کا ملی مستقبل بنا دیں، مگر اس دنیا میں ایسا واقعہ کبھی ظاہر ہونے والا نہیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں امریکہ میں رہنے والے ہندوؤں کا ذکر آیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ وہ لوگ تو رات دن بس ڈالر کمانے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بھی تو یہاں یہی کر رہے ہیں۔ دونوں میں صرف نام کا فرق ہے۔ ہندو کے نزدیک "ڈالر" اگر مذہبی دیوتا ہے تو آپ کے یہاں ڈالر زندگی کا مقصد۔

ڈاکٹر رالف سسن (Dr Ralph R. Sisson) اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں کمیونیکیشن کے پروفیسر ہیں۔ پیدائشی طور پر وہ عیسائی ہیں اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے میں نے ایک ملاقات میں پوچھا کہ امریکہ میں یہودی صرف ۳ فی صد ہیں، اس کے باوجود وہ یہاں چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ہارڈ ورک (سخت محنت) اس کے برعکس یہی سوال کسی مسلمان سے کیجئے تو بلا تامل اس کا جواب ہوگا کانسپریسی (سازش)

موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس نے محبت اور نفرت سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والوں نے امریکی یہودیوں کے بارہ میں بے شمار کتابیں اور مضامین شائع کیے ہیں جن میں جوش و خروش کے ساتھ یہودی سازشوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام تحریریں بالکل سطحی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو اصل حقیقت سے باخبر نہیں کرتیں۔

امریکہ کے موجودہ سفر میں میں نے جو نئی باتیں دریافت کیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کی طاقت کا اصل راز ان کی تنظیم ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے امریکہ میں یہودیوں کی تعداد ۵۸ لاکھ بتائی ہے۔ اس قلت تعداد کے باوجود، انھوں نے اپنے تمام

قابل ووٹ افراد کو ووٹر لسٹ میں درج کرا رکھا ہے۔ ہر الکشن میں ان کے بیشتر افراد ووٹ دیتے ہیں اور ہمیشہ متحدہ طور پر اپنے ووٹوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے تمام ادارے شیرازہ کی طرح باہم مربوط ہیں۔ اپنے قومی مقاصد کے لیے وہ بے دریغ دولت خرچ کرتے ہیں۔ ان میں انفرادی سطح پر اختلافات ہیں، مگر قومی نوعیت کے معاملہ میں وہ ہمیشہ متحد رہتے ہیں۔ وہ ارباب کار سے مسلسل ربط رکھتے ہیں اور ان کی رائے کو اپنے حق میں متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر کام منظم انداز میں کرتے ہیں نہ کہ اس طرح منفرد انداز میں جس کا ہمارے یہاں عام رواج ہے۔

امریکی مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۸ سے ۱۰ ملین تک ہے۔ جب کہ یہودیوں کی موجودہ تعداد زیادہ سے زیادہ ۶ ملین قرار دی جا سکتی ہے۔ مگر مسلمان ہر معاملہ میں یہودیوں کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ملک گیر تنظیم نہیں۔ ان کے بے شمار ادارے ہیں، مگر سب کے سب آزاد ادارہ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کے ووٹ یہودیوں سے زیادہ ہیں مگر سیاسی بے شعوری کی بنا پر اب تک وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو استعمال نہ کر سکے۔ امریکی مسلمانوں کا نقطۂ نظر ایک لفظ میں یہ ہے کہ —— زیادہ سے زیادہ ڈالر کماؤ، اور بقیہ ہر چیز سے غیر متعلق رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کا متحد اور منظم ہونا ان کی اصل طاقت ہے، اور امریکی مسلمانوں کا غیر متحد اور غیر منظم ہونا ان کی اصل کمزوری۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ امریکی زندگی کی الف ب بھی نہیں جانتے۔

آخری اجتماع (۲۴ دسمبر) میں اسلامک سوسائٹی (گارڈن گروو) کے لیے تعاون کی اپیل کی گئی۔ لوگوں نے ڈالر کی صورت میں اپنے عطیات دینے شروع کیے۔ اسٹیج کے پاس ایک بلیک بورڈ رکھا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں مسلسل رقم کی مقدار لکھی جا رہی تھی —— ایک ہزار ڈالر، ۲۰ ہزار ڈالر، ۳۵ ہزار ڈالر، اس طرح گنتی بڑھتے بڑھتے تقریباً ۹۰ ہزار ڈالر تک پہونچ گئی۔ پورا مجمع بیک وقت بلیک بورڈ پر عطیات کی مقدار دیکھ رہا تھا۔ یہ گویا چندہ کے قدیم طریقہ کو ماڈرنائز کرنا ہے۔ مجھے یہ طریقہ پسند آیا۔

گارڈن گروو (Garden Grove) امریکہ کا ایک شہر ہے جو لاس انجلیز کے قریب

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۲ جولائی ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

کرنے کا کام

ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے آغاز میں مفصل مقدمہ لکھا تھا جس میں اس نے فلسفہ تاریخ سے بحث کی تھی۔ یہ حصہ "مقدمہ ابن خلدون" کے نام سے الگ سے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اس مقدمہ کا ایک باب اس نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے کہ ۲۳ ویں فصل اس بارہ میں کہ مغلوب ہمیشہ اس بات کا شیدائی ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعار، اپنے لباس، اپنے مذہب، اپنے تمام حالات اور اپنی تمام عادات میں غالب کی پیروی کرے:

الفصل الثالث والعشرون فی ان المغلوب مولع ابداً بالاقتداء بالغالب فی شعارہ وزیّہ ونحلتہ وسائر احوالہ وعوائدہ

جب ایک قوم غالب اور دوسری قوم مغلوب ہو جائے تو مغلوب قوم کے افراد میں تاثر پذیری کا عمل اپنے آپ شروع ہو جائے گا، بغیر اس کے کہ غالب قوم نے اس کے لیے کوئی براہ راست کوشش کی ہو۔

ایسی حالت میں مغلوب قوم کے رہنما اگر اپنے افراد میں تاثر پذیری کا عمل دیکھیں اور غالب قوم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف چیخ پکار شروع کر دیں تو یہ ایک بے معنی بات ہوگی۔ کیونکہ ابن خلدون کے مطابق، یہ عمل خود تاریخی قانون کے تحت ہو رہا ہے نہ کہ حقیقۃً غالب قوم کی سازش اور جارحیت کے تحت۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقع پر کرنے کا اصل کام غالب قوم کے خلاف احتجاج کرنا نہیں ہے بلکہ خود مغلوب قوم کو دوبارہ اوپر اٹھانا ہے۔ غالب قوم کا اپنی برتری کے ساتھ زندہ رہنا ہی مغلوب قوم کا موت سے دوچار ہونا ہے۔ ایک کے ابھرنے ہی کا نام دوسرے کا مٹنا ہے۔ اس لیے ایسے موقع پر غیر قوم کے خطرہ اور سازش کا انکشاف کرنا صرف اپنی بے خبری کا انکشاف کرنا ہے۔ خبردار رہنما وہ ہے جو ہر چیز کو بھلا کر مغلوب قوم کی داخلی تعمیر میں لگ جائے، جو خود اپنی قوم کو دوبارہ اٹھانے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دے۔

مغلوب اپنی اصلاح سے دوبارہ اوپر اٹھ سکتا ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف فریاد اور مطالبہ سے۔

مٹھاس کا اضافہ

ٹائمس آف انڈیا کے ضمیمہ (The Neighbourhood Star) بابت ۱۸ - ۲۴ مارچ ۱۹۸۹ (صفحہ ۶) پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ ایران کے پارسی جب پہلی بار ہندستان میں آئے تو وہ ہندستان کے مغربی ساحل پر اترے۔ اس وقت یادو رانا گجرات کا راجہ تھا۔ پارسی جماعت کا پیشوا راجہ سے ملا۔ اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی ریاست میں ٹھہرنے کی اجازت دے۔ راجہ نے اس کے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس پارسی پیشوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری ریاست پہلے ہی سے آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں مزید لوگوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں۔

پارسی پیشوا نے لفظوں میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ ایک چمچہ شکر لے کر دودھ میں ملایا اور گلاس کو راجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اشاراتی زبان میں اس بات کا اظہار تھا کہ ہم لوگ آپ کے دودھ پر قبضہ کرنے کے بجائے اس کو میٹھا بنائیں گے، ہم آپ کی ریاست کی زندگی میں شیرینی کا اضافہ کریں گے۔ اس کے بعد راجہ نے انھیں گجرات میں قیام کی اجازت دیدی۔

اس واقعہ پر اب ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پارسیوں کے رہنما نے جو بات کہی تھی اس کو پارسی قوم نے پورا کر دکھایا۔ پارسی اس ملک میں مطالبہ اور احتجاج اور ایجی ٹیشن کا جھنڈا لے کر کھڑے نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی خاموش محنت سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ کیا۔ پارسیوں نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ وہ تعلیم اور تجارت اور صنعت میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ملک کی دولت اور ملک کی ترقی کو بڑھایا۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ لینے والے گروہ (Taker group) کی حیثیت رکھتے ہیں، پارسیوں نے عمل کے ذریعہ اپنے لیے دینے والے گروہ (Giver group) کا درجہ حاصل کیا ہے ——— یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اس آدمی کو باعزت جگہ ملتی ہے جو لوگوں کے "دودھ" میں اپنی طرف سے "مٹھاس" کا اضافہ کرے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف کڑواپن ہو، انھیں بھی اس دنیا میں وہی چیز ملتی ہے جو انھوں نے دوسروں کو دی ہے۔

ہزار میل کا سفر

چینی زبان میں ایک مثل ہے کہ "ہزار میل کا سفر ایک قدم سے شروع ہوتا ہے"۔ یعنی کسی شخص کو ہزار میل دور جانا ہو تب بھی پہلے قدم ہی سے اس کے سفر کا آغاز ہوگا۔ ایک ایک قدم چل کر ہی وہ اپنی منزل پر پہونچے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پاؤں اٹھاتے ہی وہ پہلا قدم اپنی آخری منزل پر رکھ دے۔

یہ زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔ ایک فرد کا سفر بھی اسی اصول پر عمل کر کے کامیاب ہوتا ہے اور ایک قوم کا سفر بھی۔

اگر آپ ایک لاکھ روپیہ کمانا چاہتے ہیں تب بھی ابتداءً آپ کو ایک ایک روپیہ کی کمائی پر قناعت کرتے ہوئے ایک لاکھ کی کمائی تک پہونچنا ہوگا۔ اگر آپ ماسٹر ڈگری لینا چاہتے ہیں تو ابتدائی درجات میں محنت کر کے ماسٹر ڈگری کے قابل بننا ہوگا۔ اگر آپ مصنف بننا چاہتے ہیں تو مطالعہ اور تحقیق کے لمبے مرحلہ سے گزرنے کے بعد مصنف کے مقام کو پانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان دیکھنا چاہتے ہیں تو بنیاد اور دیوار کی تعمیر کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان کھڑا کر سکیں۔

ٹھیک یہی معاملہ قومی تعمیر کا بھی ہے۔ قومی تعمیر "تاریخ ساز" تقریروں سے نہیں ہوتی، بلکہ تاریخ ساز عمل سے ہوتی ہے۔ ملت کا مستحکم قلعہ مستحکم پتھروں سے بنتا ہے نہ کہ لفظی خطابت اور شاعرانہ خیال آرائی کا کمال دکھانے سے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ہر ایک نے کسی نہ کسی "مجاہدانہ اقدام" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ شعور کی اصلاح اور ذہن کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پُرشور ہنگاموں کے باوجود اب تک کوئی نتیجہ خیز کام نہ ہو سکا۔ تعمیر ملت کا کام فکری تعمیر اور ذہنی اصلاح سے شروع ہوتا ہے، اس کو عملی اقدام (بالفاظ دیگر چھلانگ) سے شروع نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ان کے رہنماؤں کی یہی مجرمانہ غفلت ہے۔

فطری ڈھال

۱۹۷۲ میں ہندستان کے جنگلوں میں تقریباً ۱۸۰۰ شیر تھے۔ اس کے بعد شیر کی نسل بڑھانے کے لیے شیر منصوبہ (Project Tiger) شروع کیا گیا۔ یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ چنانچہ اب شیروں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ تاہم شیر کی تعداد بڑھنے سے خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ یوپی کی ترائی میں دُدھوا نیشنل پارک ہے۔ اسی طرح ہندستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سندر بن ہے۔ یہاں شیر اکثر باہر آکر گاؤں والوں کے مویشی مار ڈالتے ہیں۔

تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شیر انسان کے اوپر حملہ کرے۔ شیر اگر انسان کے اوپر حملہ بھی کرتا ہے تو پیچھے کی طرف سے کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیر انسان کے چہرے سے ڈرتا ہے۔ ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، ۱۱ دسمبر ۱۹۸۸) میں بتایا گیا ہے کہ سندر بن کے جنگل میں جو لوگ ضرورت کے تحت شیر کے مخصوص علاقہ میں داخل ہوتے ہیں، وہ اپنے سر کے پیچھے کی طرف مکھوٹا ڈال لیتے ہیں۔ تاکہ سامنے کی طرح ان کے پیچھے بھی انسانی چہرہ دکھائی دے۔ اس تدبیر کی وجہ یہ ہے کہ شیر بہت کم ایسا کرتا ہے کہ وہ سامنے سے انسان کے اوپر حملہ کرے:

Those that do enter the buffer zone of the Sundarbans wear masks on the back of their heads because a tiger seldom attacks a man from the front.

انسان کے چہرے میں فطری طور پر رعب کی صفت ہے۔ یہ رعب جس طرح جانوروں کے مقابلہ میں ایک روک ہے، اسی طرح وہ انسانوں کے مقابلہ کے لیے بھی روک ہے۔ شیر انسانی چہرہ سے مرعوب ہو کر اس پر حملہ کی جرأت نہیں کرتا۔ شیر انسان کے اوپر صرف اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ انسان نے اپنی ناکافی کارروائی سے شیر پر یہ ظاہر کر دیا ہو کہ وہ اس کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ یہی معاملہ انسان کے مقابلہ میں انسان کا بھی ہے۔ فطری حالت میں ایک انسان دوسرے انسان کے چہرے سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔ یہ ہیبت صرف اس وقت ختم ہوتی ہے جب کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جو فطری حالت کو توڑنے کا سبب بن جائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا (خلق اللہ آدم علی صورتہ)

یہ روایت اگرچہ باعتبار سند کمزور ہے، مگر باعتبار معنی وہ درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا چہرہ ساری معلوم کائنات میں سب سے زیادہ پر شوکت چیز ہے۔ وہ اپنے اندر ایک برتر عظمت لیے ہوئے ہے۔

خدا نے آپ کے چہرہ اور آپ کی شخصیت کو آپ کے لیے ایک غیر مفتوح ڈھال بنایا ہے۔ آپ ہر ضرورت کے موقع پر اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے دوسروں کی نظر میں اپنی کیا تصویر بنائی ہے۔

اگر آپ نے اپنے ماحول میں اپنی یہ تصویر بنائی ہو کہ آپ ایک سطحی اور بے قیمت انسان ہیں، آپ صرف جھوٹی لڑائی لڑنا جانتے ہیں۔ آپ اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں اور دھمکی سن کر اقدام ملتوی کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب آپ دوسروں کے سامنے آئیں گے تو آپ کا آنا ایک بے وزن انسان کا آنا ہوگا۔ اس وقت آپ گویا ایک ٹوٹی ہوئی ڈھال ہوں گے جس کے اندر لوگوں کے لیے کوئی زور نہیں۔

اس کے برعکس اگر آپ نے اپنے آس پاس اپنی یہ تصویر بنائی ہے کہ آپ ایک بھاری بھرکم انسان ہیں۔ آپ کے اعلیٰ اخلاق نے لوگوں کو آپ کا معترف بنا رکھا ہو۔ ایسی حالت میں آپ کے سامنے آتے ہی لوگوں کی نظریں آپ کے لیے جھک جائیں گی۔ آپ کا آنا " وہ آیا، اس نے دیکھا، اس نے فتح کر لیا " کا ہم معنی بن جائے گا:

He came, he saw, he conquered.

آپ کا انسانی چہرہ آپ کے حق میں ایک مرعوب کن ڈھال ہے۔ کوئی انسان آپ کے اوپر صرف اس وقت وار کرنے کی ہمت کرتا ہے جب کہ آپ اپنی کسی نادانی سے اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ آپ اس سے کمزور ہیں۔ دانش مندی کے ذریعہ اپنے رعبِ انسانی کو قائم رکھیے، اور پھر کوئی شخص آپ کے اوپر وار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

قضا و قدر

مارک ٹوین (Mark Twain) ایک انگریزی ادیب اور ناول نگار تھا۔ وہ ۱۸۳۵ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں ۱۹۱۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ اب میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اور اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں کے لیے فکرمند ہوا ہوں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کبھی وقوع میں نہیں آئیں :

I am an old man and have known a great many troubles, but most of them never happened.

راقم الحروف کا تجربہ بھی یہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں بہت سے ایسے مواقع دیکھے ہیں جب کہ ایک آدمی کسی صورت حال کے پیش آنے کی وجہ سے سخت پریشان ہو گیا۔ حتیٰ کہ مستقبل کے اندیشہ کی بنا پر اس نے اپنے حال کو برباد کر لیا۔ غم سے نڈھال ہو کر اپنی صحت تباہ کر لی۔ مگر وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اندیشہ بجائے خود صحیح نہ تھا جس کی وجہ سے آدمی نے اپنے آپ کو اتنا زیادہ پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔

اسلام میں اس کا بہترین حل قضا و قدر کا عقیدہ ہے۔ مفصل کلمہ میں یہ بات بطور ایمان شامل کی گئی ہے کہ خیر اور شر دونوں اللہ کی طرف سے آتے ہیں (وبالقدر خیرہ وشرہ)

"کوشش کرنا بندہ کا کام ہے، اور تکمیل تک پہنچانا اللہ کا کام" اور یہ کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہوتا ہے" یہ عقیدہ انسان کے لیے موجودہ دنیا میں ایک بے حد عظیم تحفہ ہے۔ وہ انسان کے اندر یہ طاقت پیدا کرتا ہے کہ وہ نقصان کو سہے اور حادثات کو برداشت کر سکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنی ہے۔ اس لیے یہاں عین اس کے تخلیقی نقشہ کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی زندگی میں ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ اس کو نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ عقیدہ آدمی کے اندر بیٹھ جائے کہ جو ہوا وہی ہونے والا تھا، اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہ تھا تو آدمی کی زندگی نہایت سکون کی زندگی بن جائے، وہ راضی برضا ہو کر ہر حال میں پوری طرح مطمئن رہے۔

۴۹ سال بعد

۲ اپریل ۱۹۸۹ کو دہلی یونیورسٹی میں کانوکیشن کی ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ اس موقع پر مسٹر ایم فاروقی کو ایم اے (تاریخ) کی، اور مسٹر ڈی سانگھی کو بی اے کی ڈگری دی گئی۔ ان دونوں نے ۴۹ سال پہلے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے اور بی اے کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا تھا۔ مگر اس وقت کی انگریز حکومت نے ان کی ڈگریاں ضبط کر لیں۔ اب نئی حکومت نے ضبطی کے حکم کو منسوخ کرتے ہوئے دونوں کو ان کی ڈگریاں دیدی ہیں جن کے وہ جائز طور پر مستحق تھے۔

یہ ۱۹۴۰ کا واقعہ ہے۔ اس وقت دہلی پراونشیل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں مسٹر فاروقی صدر اور مسٹر سانگھی سکریٹری تھے۔ مدراس اور یوپی کی حکومت کی طرف سے یہ سرکلر جاری کیا گیا کہ طلبہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں، ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ مسٹر فاروقی اور مسٹر سانگھی نے اس سرکاری حکم کے خلاف تقریریں کیں۔ اور ۱۶ نومبر ۱۹۴۰ کو دہلی کے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹرائک کرائی۔ اس جرم کے نتیجہ میں دونوں صاحبان دہلی یونیورسٹی سے ایک سال کے لیے خارج کر دیے گیے۔ اسی سال (نومبر ۱۹۴۰) میں دونوں کی ڈگریاں ضبط کر لی گئیں۔ ضبطی کا حکم اس وقت دہلی یونیورسٹی کے انگریز وائس چانسلر سر مارس گوائر (Sir Maurice Gwyer) نے جاری کیا تھا۔ اب ۴۹ سال بعد دونوں کو ان کی ڈگریاں اعزاز و اکرام کے ساتھ دیدی گئی ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۳ اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۵)

دنیا کا یہ واقعہ آخرت میں پیش آنے والے واقعہ کی ایک تصویر ہے۔ آج کی دنیا میں متکبر اور خود پسند لوگوں کا غلبہ ہے۔ وہ خدا کے سچے بندوں سے ان کی "ڈگریاں" چھینے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے برسرِ حق ہونے کا اعتراف نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعلیٰ خدمات کو بے وزن بتاتے ہیں۔ وہ ان کو بالقصد عزت کے مقامات سے دور رکھتے ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی اور انسانی اقتدار کی جگہ خدائی اقتدار قائم ہوگا تو ساری صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ اس وقت ان محروموں کو مزید اضافہ کے ساتھ ان کی "ڈگریاں" انھیں عطا کی جائیں گی۔ آج کے دن اور آنے والے دن کے درمیان "۴۹ سال" سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔

اعترافِ حقیقت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام امیہ ابن ابی الصلت تھا۔ وہ طائف کے قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نہایت ہوشیار اور صاحب شخصیت آدمی تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عالم بھی تھا۔ اس کو یہود کی کتابوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ عرب میں خدا کا آخری پیغمبر آنے والا ہے۔ اس کو اپنی بڑائی کا اتنا زیادہ احساس تھا کہ اس نے بطور خود یہ سمجھ لیا کہ خدا اس کو اپنا پیغمبر مقرر کرے گا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ مقام محمد بن عبداللہ کو دیدیا گیا ہے تو اس پر سخت ردعمل ہوا۔ وہ آپ کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔

اس عرب کردار کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے ـــــ اور لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ اس سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے، مگر وہ زمین کا ہو رہا اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا (الاعراف ۷۶-۱۷۵)

امیہ ابن ابی الصلت کے لیے اللہ نے یہ مقدر کیا تھا کہ وہ وقت کے پیغمبر کا پیرو بن کر رفعت حاصل کرے۔ مگر اس نے خود پیغمبر بننا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پست اور ذلیل ہو کر رہ گیا۔ اس کے برعکس مثال مکہ کے عمر بن الخطاب کی ہے۔ ان کو بھی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتیں ملی تھیں۔ مگر انھوں نے اس خبط کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دی کہ وہ خود پیغمبر بنیں۔ اس کے بجائے وہ پیغمبر کے پیرو بننے پر راضی ہو گیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ میں، پیغمبر اور ابو بکر صدیق کے بعد تیسری سب سے بڑی شخصیت قرار پائے۔ اس کے علاوہ عالمی تاریخ میں ان کو اتنا ممتاز مقام ملا کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب (The 100) میں دنیا کے بڑوں کی فہرست میں ان کو نمبر ۵۱ پر جگہ دی ہے۔ جب کہ امیہ بن ابی الصلت کو کہیں کوئی جگہ نہ مل سکی۔

انسان اکثر حالات میں اپنا مبالغہ آمیز اندازہ کرتا ہے۔ وہ پیرو کا کردار ادا کرنے کے بجائے قائد کا کردار ادا کرنے کا خواہش مند بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ خدا کے منصوبہ کے خلاف ہے، اور خدا کے منصوبہ کے خلاف چلنا کسی آدمی کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

اسوۂ نبوت

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک انتہائی لغو کتاب ہے۔ اس کتاب کی لغویت کے بارہ میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے۔ مگر اس کتاب کے بارہ میں مسلمانوں کا ردّ عمل کیا ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رائے ان لوگوں سے مختلف ہے جو یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ رشدی کو قتل کر کے اسے جہنم رسید کرو۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ کہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تمام باتیں نہ صرف پچھلے ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں کہی جاتی رہی ہیں، بلکہ یہ خود اس زمانہ میں بھی کہی گئی تھیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔ اس وقت آپ نے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس کو معلوم کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسی قسم کے موجودہ واقعہ میں ہم کیا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اس معاملہ میں کسی اجتہاد یا قیاس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبرِ اسلام کا اسوہ (نمونہ) واضح طور پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

چند مثالیں

۱۔ سلمان رشدی کی کتاب میں ایک بات نعوذ باللہ یہ کہی گئی ہے کہ قرآن میں جبریلؑ کی لائی ہوئی آیتوں کے ساتھ شیطان کی القار کی ہوئی آیتیں بھی شامل تھیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب کا نام "شیطانی آیات" رکھا ہے۔ یہ نام زیادہ صحیح طور پر خود رشدی کی کتاب پر صادق آتا ہے۔ تاہم اس نے اپنے خیال کے مطابق، یہ نام قرآن کو دینا چاہا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنا یہ نظریہ اس قصہ کی بنیاد پر گھڑا کیا ہے جس کو غرانیق کا قصہ کہا جاتا ہے۔ یہ قصہ، جس کی تفصیل دوسرے مضمون میں بتائی گئی ہے، اس وقت گھڑا گیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ اس لغو قصہ کے ابتدائی مصنف مکہ کے مشرکین تھے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ان مشرکوں کے اوپر آپ کو مکمل قابو حاصل ہو گیا۔ مگر آپ نے یہ

اعلان نہیں فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غرانیق کا جھوٹا قصہ گھڑا تھا، انہیں قتل کر کے ان سب کو جہنم رسید کر دو۔ اس کے برعکس آپ نے ان سے فرمایا کہ اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کیا، نہ کہ اسلام کی شمشیری طاقت پر۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اگرچہ آپ نے ان پر تلوار استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام کی نظریاتی طاقت نے ان کو مسخر کر لیا۔ ان کو آزادی دینے کے جلد ہی بعد وہ اسلام کے عقیدہ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق سے اتنا متاثر ہوئے کہ کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خدا کی غلامی میں دے دیا۔

۲۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مہاونڈ (Mahound) لکھا ہے۔ یہ ایک استہزائی نام ہے۔ جس طرح بعض لوگ وہابی کو وہابڑا اور دیوبندی کو دیو کے بندے وغیرہ کہتے ہیں، اس طرح سلمان رشدی نے آپ کے لیے اس بگڑے ہوئے نام کو استعمال کیا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے عیسائیوں نے آپ کے لیے گھڑا تھا۔

اس مجرمانہ حرکت کی مثال بھی زمانۂ نبوت میں موجود ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اگرچہ آپ کے دادا عبد المطلب نے محمد رکھا تھا، مگر مکہ کے قریش نے استہزائی طور پر آپ کا نام مذمّم رکھ دیا۔ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا ہوا جبکہ مذمّم کے معنی ہیں مذمّت کیا ہوا۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے مذمّم کے لفظ کو لے کر شعر کہا تھا اور اس کو اس طرح پڑھا کرتی تھی :

مذمما عصينا، وامره ابينا، ودينه قلينا

ہم نے ایک قابلِ مذمّت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

اس معاملہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یہ فرمایا ہو کہ دیکھو فلاں لوگ میرا نام بگاڑ کر مجھ کو مذمّم کہتے ہیں، ان سب کو قتل کر دو۔ اس کے

برعکس جو ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کا نام مذمّم رکھتے تھے۔ اور پھر اسی نام سے آپ کو گالی دیتے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ کیا تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی ایذا رسانی کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو گالی دیتے ہیں اور مذمّم کہہ کر میری ہجو کرتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قال ابن اسحاق۔ وكانت قريش انما تسمى رسول الله صلے الله عليه وسلم مذمماثم يسبونه۔ فكان رسول الله صلے الله عليه وسلم يقول: الا تعجبون لما صرف الله عنى من اذى قريش يسبون ويهجون مذمما وانا محمد

(سيرة ابن هشام، الجزء الاول، صفحه ۳۷۹)

یہاں دوبارہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کو اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ مگر آپ اپنے اصحاب سے یہ نہیں کہتے کہ یہ لوگ ناقابلِ معافی جرم کے مجرم ہیں، ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ اس کے برعکس آپ اپنے اصحاب کی توجہ قولِ انسانی سے ہٹا کر قولِ خداوندی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ انسان اگر میری مذمّت کرتے ہیں اور میرا سب وشتم کر رہے ہیں تو اس سے کیا ہوا۔ تمام انسانوں کے رب اور ساری کائنات کے مالک نے ابدی طور پر مجھے محمد کے مقامِ اعلیٰ پر فائز کر دیا ہے۔ پھر ان کی بے ہودہ گوئی کی پروا کرنے کی مجھے کیا ضرورت۔

۳۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں ایک اور نہایت بے ہودہ حرکت یہ کی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ کو نعوذ باللہ ایک بدکردار خاتون کے روپ میں دکھایا ہے۔ یہ بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک ایک بے ہودہ بات ہے۔ کوئی مسلمان کتاب کے اس حصہ کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔

مگر یہاں بھی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ امہات المومنین کی کردار کشی کا یہ جرم پہلی بار رشدی کی کتاب میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ شنیع جرم اس سے پہلے خود زمانۂ رسالت میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح صفوان بن معطل کے ایک واقعہ کو

شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ منافقین نے یہ جھوٹا افسانہ گھڑا۔ اور اس کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کی۔

یہ افسانہ اس وقت اتنا زیادہ پھیلا یا گیا کہ کئی مخلص مسلمان تک اس سے متاثر ہو گئے۔ ایک مہینہ تک مدینہ کی پوری فضا شرمناک افواہوں سے بھری رہی۔ یہ تکلیف دہ صورتِ حال صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اللہ تعالےٰ نے مداخلت فرمائی۔ اور قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ محض جھوٹا پروپگنڈہ ہے نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

مگر اس وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دے دیں جو کردارکشی کی اس جھوٹی مہم میں ملوث تھے۔ کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ امہات المومنین کی کردارکشی کے ان مجرمین کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مرے۔ اور اللہ تعالےٰ کے یہاں اپنے آخری حساب کے لیے پہنچا دیے گئے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ الزام کی طاقتور تردید کر کے مجرمین کو چھوڑ دیا جائے تاکہ لوگ ساری عمر ان کی لعنت کریں، اور پھر مر کر وہ اللہ کی عدالت میں پہنچا دیے جائیں تاکہ وہ اپنے خلاف ابدی لعنت کا فیصلہ سنیں اور ہمیشہ کے لیے رسوائی کے گڑھے میں پڑے رہیں۔

یہ ہے اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔ اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں، اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے، تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانونِ جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے نام پر انہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انہیں ڈرنا چاہیے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں وہ خود اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بڑا مجرم نہ بنالیں۔

پہلا کام

سلمان رشدی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ــــــ آدھی رات کے بچے (Midnight's Children) اس کتاب میں سلمان رشدی نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں عقیدہ اور بے عقیدگی کے درمیان جھول رہا ہوں

I am hanging between belief and disbelief

رشدی کا یہ کہنا کہ میں مذہب کے معاملہ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں، یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کا معاملہ ہے ۔ سلمان رشدی نے جو بات اپنے بارے میں کہی ہے یہی کروروں مسلمانوں کی بات ہے ۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس کی تعلیم جدید ماحول میں ہوئی ہے اس کا کم از کم ۵۰ فیصد حصہ اسی قسم کی بے یقینی میں مبتلا ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی شخص نے رشدی والا قلمی پیشہ اختیار کیا اور وقتی فائدے کی خاطر اپنے دل کی گندگی کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگا ۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ کسی اور میدان میں کھانے کمانے میں مشغول ہیں ۔ چنانچہ انہیں رشدی جیسی گندی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں ۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں جب کہ میں امریکہ میں تھا، مجھے وہاں کے ایک اسلامی مرکز میں لے جایا گیا ۔ یہ مرکز جس خطہ میں واقع ہے وہاں تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں ۔ میں نے منتظمین سے پوچھا کہ اس علاقہ کے ایک لاکھ مسلمانوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس اسلامی مرکز سے جڑے ہوئے ہوں ۔ ایک ذمہ دار نے جواب دیا کہ دس فیصد مسلمان ہیں ۔ حاضرین میں سے دوسرا شخص بولا کہ آپ مبالغہ کر رہے ہیں، بمشکل ۵ فیصد تعداد ہوگی جو اس مرکز سے جڑی ہوئی ہو ۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں ان کی نئی نسلوں کی بیشتر تعداد اسلام سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے ۔ ان کو نماز، روزے سے کوئی مطلب نہیں، جنس اور شراب اور غذا کے معاملہ میں ان کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے آزاد خیال امریکیوں کے ہیں ۔ وہ بس برائے نام مسلمان ہیں ۔

یہ کوئی انکشاف کی بات نہیں۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "رشدی" ہمارے درمیان ایک نہیں، بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی "رشدیت" ظاہر ہو چکی ہے اور کسی کی اب تک چھپی ہوئی ہے۔

مسلم نسل کی یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کی ترقی یافتہ زبانوں میں اعلیٰ معیار کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ "ارتداد ذہنی" میں مبتلا ہونے والے ان بے شمار مسلمانوں کی بے یقینی کو دوبارہ یقین میں تبدیل کیا جا سکے۔ ان کو بے عقیدگی کے دلدل سے نکال کر دوبارہ عقیدہ کی صالح زمین پر کھڑا کیا جائے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو اس کام کو موثر اسلوب اور مطلوبہ معیار پر انجام دے رہا ہو۔ اپنے دعویٰ کے مطابق بہت سے لوگوں نے عصری کتابیں چھاپ رکھی ہیں مگر یہ نام نہاد عصری کتابیں عصری کوڑا خانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "دورِ جدید کی تحریکیں"۔ اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دورِ جدید میں اسلام کے احیار کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مگر کتابوں کے اَن گنت انبار کے باوجود، یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابلِ ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس مضمون کی اشاعت پر اب دو سال کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ مگر آج تک کسی مسلم ذمہ دار کی طرف سے ایسی کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی گئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اوّلین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں۔ وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے طریقِ استدلال اور اسلوبِ تحریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور اس کے بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔ مگر جدید اسلوب میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار، موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کر کے شائع نہ کر سکے۔

ایسی حالت میں مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقۃً خود اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اس کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ہے جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ بن کیے پر کریڈٹ لینا چاہیں ان کے لیے خدا کے یہاں عذاب ہے نہ کہ انعام۔

پیغمبر کا طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کا استقبال ان کی قوموں نے بہت بُرے انداز سے کیا۔ انھوں نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کی۔ ان کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے، وغیرہ۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا کہ اس قسم کے مجرمین کو گردن زدنی قرار دے کر فوراً انہیں قتل کر دیا جائے۔ بلکہ دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی کاٹ کی گئی۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے۔

ویقولون انہ لمجنون ۔ وما هو الا ذکر للعالمین (القلم ۵۱ — ۵۲) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور دیوانہ ہے۔ حالانکہ وہ صرف نصیحت ہے سارے عالم والوں کے لیے۔

ان آیات پر غور کیجیے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ لوگ خدا کے پیغمبر کو مجنون کہتے ہیں، اس لیے انہیں فوراً قتل کر دو۔ بلکہ دلیل کی زبان میں ان کی بات کو رد کیا گیا۔ اس آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ اے پیغمبر کو مجنون کہنے والو، پیغمبر کے کلام کو دیکھو۔ کیا مجنون کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس قرآن کو وہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے، وہ سراپا نصیحت ہے۔ اس میں ساری انسانیت کے لیے بہترین پیغام ہے۔

کیا کوئی جنون والا آدمی ایسی کتاب لا سکتا ہے جس میں اتنی اعلیٰ تعلیمات درج ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ نے ہجو اور استہزار کے مواقع پر یا تو صبر کیا، یا دلیل کی زبان میں ان کا رد کیا۔

آپ قاتلِ عالم نہیں تھے بلکہ رحمتِ عالم تھے۔ اور رحمتِ عالم وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوگوں کی ایذا رسانی کے باوجود انہیں معاف کرے، جو لوگوں کی طرف سے اشتعال انگیز سلوک کے باوجود ان کے لیے رحمت کا پیکر بنا رہے۔ آپ کی یہی بلند کرداری ہے جس کی شہادت قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی ہے: انک لعلیٰ خلقٍ عظیم (بے شک تم بلند اخلاق پر ہو)

دعوتی تصویر

اسلام ایک دعوت ہے نہ کہ محض ایک تعزیری قانون۔ اسلام کی اوّلین دلچسپی خدا کے بندوں

کو خدا کا پرستار بنانا ہے نہ کہ انہیں مجرم قرار دے کر انہیں کوڑا مارنا اور گولی اور پھانسی کا نشانہ بنانا۔
تعزیری قانون کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مگر دعوت کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے۔ داعی لوگوں کو ختم کرنے کے بجائے لوگوں کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے داعی ایسا نہیں کرتا کہ لوگوں کے خلاف اندھا دھند سزائیں جاری کرنا شروع کر دے۔ وہ یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کے "حال" سے زیادہ انسان کے "مستقبل" پر نظر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر اس کے بارہ میں نرم گوشہ پیدا ہو، وہ لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے تاکہ جو لوگ آج اس کے ہجو گو ہیں، کل وہ اس کے مدح خواں بن جائیں۔ جو لوگ ابھی اس کے ساتھی نہیں بنے، آئندہ وہ اس کے شریک اور ساتھی بن جائیں۔ داعی کا کام غیر کو اپنا بنانا ہے، نہ کہ جو غیر دکھائی دے اس کا دشمن بن کر صرف اس کی ہلاکت کے درپے ہو جانا۔

بدنامی سے بچت

کسی کارخانہ کی خوش نامی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کی اشاعت کے لیے اس کی دعوتی تصویر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ بات آخری حد تک مطلوب ہے کہ اسلام کی دعوتی تصویر کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہے، حتیٰ کہ توہینِ رسول اور اہانت اسلام جیسے جذباتی مواقع پر بھی۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں عبد اللہ بن ابی بن سلول کی مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ شخص مدینہ کے قبیلۂ خزرج کا سردار تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر مدینہ کے لوگوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا۔ اس کے لیے ایک تاج کی تیاری بھی شروع ہو گئی ـــــ عین اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے۔ یہاں آتے ہی لوگوں نے آپ کو اپنا بڑا بنا لیا۔ عبد اللہ بن ابی کو اس سے بہت تکلیف پہنچی۔ حالات کے دباؤ کے تحت اس نے رسول اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ تاہم اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے ساری عمر آپ کی توہین و تحقیر کرتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لیے نکلے۔ آپ

ایک گدھے پر سوار تھے۔ راستہ میں عبد اللہ بن ابی کا قلعہ نما مکان آیا جس کا نام مزاحم تھا۔ اس وقت عبد اللہ بن ابی کے گرد اس کے قبیلہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ وہاں سواری سے اتر پڑے اور عبد اللہ بن ابی کے پاس پہنچ کر اس کو سلام کیا۔ آپ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔

راوی (اسامہ بن زید بن حارثہ) کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی بے پروائی کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب آپ فارغ ہو چکے تو عبد اللہ بن ابی نے کہا: اے شخص، آپ کی یہ بات تو اچھی ہے، لیکن اگر وہ حق ہے تو آپ اپنے گھر میں بیٹھیں اور جو شخص اس کو سننے کے لیے آپ کے پاس آئے اس کو سنائیں، اور جو شخص آپ کے پاس نہ آئے تو اس کو آپ اس کی تکلیف نہ دیں۔ اور ایسے شخص کی مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں جو اس کو ناپسند کرتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد اللہ بن ابی کا یہ قول سخت ناگوار ہوا مگر آپ خاموشی سے آگے بڑھ گئے (سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۱۹)

غزوۂ احد (شوال ۳ھ) میں قریش کا لشکر مکہ سے چل کر مدینہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ فرمایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ شہر کے اندر ٹھہر کر مقابلہ کیا جائے۔ عبد اللہ بن ابی نے یہی دوسری رائے پیش کی۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے گروہ کی رائے کا لحاظ فرمایا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

جب آپ مدینہ اور احد کے درمیان پہنچے تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر اسلامی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس طرح اس نے بے حد نازک موقع پر سخت بے وفائی کا ثبوت دیا۔ مزید یہ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی بھی کی۔ اس نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا کہ اس شخص نے دوسروں کی بات مانی اور میری بات نہیں مانی۔ لوگو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم یہاں کس لیے اپنے آپ کو ہلاک کریں (اطاعهم وعصانی، ما ندري علام نقتل انفسنا ههنا ايها الناس) (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۸)

غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۶ھ میں ہوا۔ اس مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبد اللہ بن ابی بھی تھا۔ سفر سے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قافلہ نے ایک

مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ صبح کو اندھیرے میں روانگی ہوئی۔ اس وقت ایک اتفاقی غلطی سے حضرت عائشہ، جو آپ کے ساتھ شریک سفر تھیں، قافلہ سے پیچھے رہ گئیں۔ سورج نکلنے کے بعد ایک صحابی صفوان بن معطل سُلمی اس جگہ سے گزرے۔ انہوں نے حضرت عائشہ کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود اس کی نکیل پکڑ کر آگے چلتے ہوئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ اس واقعہ کو عبداللہ بن ابی نے خوب استعمال کیا۔ حضرت عائشہ کا اس طرح تنہا ایک نوجوان کے ساتھ آنا ایک ہنگامی سبب سے تھا۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اس کو برے معنی پہنا کر خوب تقریریں کیں۔ اس نے اس واقعہ کو پیغمبر کی کردارکشی کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ پورے مدینہ میں آپ کے خلاف شک وشبہ کی فضا پیدا ہوگئی۔

اس واقعہ کی تفصیلات سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص نے اس بہتان تراشی میں سب سے بڑا حصہ ادا کیا اس کے لیے عذابِ عظیم ہے (النور ۱۱) اس آیت میں جس شخص کے لیے سب سے بڑے عذاب کا ذکر ہے، اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے۔ مگر اس کو دنیا میں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس کے معاملہ کو تمامتر آخرت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

غزوۂ بنی المصطلق (۵ ھ) سے واپسی میں ایسا ہوا کہ پانی کے ایک چشمہ پر پانی لینے کے لیے مسلمانوں کا ہجوم ہوگیا۔ اس وقت ایک مہاجر اور ایک انصاری آپس میں لڑ گئے۔ مہاجر نے کہا: یاللمہاجرین، انصاری نے کہا: یاللانصار۔ یہاں تک کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداخلت فرماکر اس کو ختم کیا۔

عبداللہ بن ابی پہلے سے اس بات پر خوش نہ تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ بلا کر انہیں یہاں پناہ دی جائے۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس میں اس نے کہا کہ اپنے کتے کو پال کر موٹا کرو کہ وہ تمہیں کو کاٹ کھائے۔ خدا کی قسم، اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔

عبداللہ بن ابی کی یہ باتیں سن کر صحابہ کو غصہ آگیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ،

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (دعه لایتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه) تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۳۷۰)

مزید مثالیں

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لیث بن سعد نے یحییٰ بن سعید سے، انھوں نے ابو الزبیر سے روایت کی ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا کہ جعرانہ میں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔ آدمی نے دیکھ کر کہا کہ اے محمد، انصاف کیجئے (یا محمد اعدل) آپ نے فرمایا، تمہارا برا ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ گفتگو سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں، آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ (معاذ اللہ ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۶۸۰

غزوۂ تبوک کی واپسی میں کچھ منافق قسم کے مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ مخلص مسلمانوں سے الگ ہو کر بیٹھتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے ہودہ باتیں کیا کرتے۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم انھیں قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (اکره ان یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الرابع، صفحہ ۳۵۔

زیادہ قابلِ لحاظ

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور آپ کے خلاف سب وشتم والے افعال

۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام کو وہ قابلِ قتل نظر آنے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر
زت دیں تو وہ انہیں قتل کر دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل کی اجازت نہ دی۔
اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر میں ان کو قتل کر دوں تو لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو
تل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو "قتل شاتم" سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اور وہ اسلام کی
ار رحمت کی تصویر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں دعوتی تصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دعوتی
ویر بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک شخص کے کھلے ہوئے سب و شتم اور اس کی شدید ایذا رسانی کے باوجود
کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم
ثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ وہ بجائے
و کتنی ہی زیادہ سنگین نظر آتی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں کا مجروح ہونا خدا و رسول کی نظر میں اتنا اہم
ہیں ہے جتنا کہ دعوتی مصلحت کا مجروح ہونا۔ اگر کسی معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں
انہیں اپنے جذبات کو دبانا چاہیے، نہ کہ وہ جذبات کا بے جا اظہار کریں اور دعوت کے قیمتی مصالح کو
باد کر کے رکھ دیں۔

اغیار کو موقع نہ دینا

مذکورہ واقعات میں جن افراد کا ذکر ہے، ان کی توہین رسول اور اسلام دشمنی بالکل واضح
تھی۔ اپنے کردار کے اعتبار سے بلاشبہ وہ لوگ اس کے مستحق بن چکے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اسی
نا پر صحابہ کرام نے ان کو اعداء اللہ قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اجازت دیجیے
ہم خدا و رسول کے ان دشمنوں کو قتل کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان اشخاص کو قتل کرتے تو اس کی وجہ یقیناً ان کی اسلام دشمنی
ہوتی۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں جہاں ہر ایک کو آزادی ہے، آپ کسی کو اس پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ
وہی الفاظ بولے جو آپ چاہتے ہیں کہ بولا جائے۔ چنانچہ یہ یقینی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر
صرف ان کے شتم کو دیکھا اور شتم کی سزا کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کو نہیں دیکھا اور ان

افراد کو قتل کرایا تو اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ اصل واقعہ کے مطابق صرف یہ کہیں کہ "محمد نے اسلام دشمنوں کو قتل کیا ہے"۔ اس کے برعکس یقینی تھا کہ وہ یہ کہیں گے کہ "محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں" ان برے لوگوں کا قتل بجائے خود ایک صحیح فعل تھا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یقینی تھا کہ صحیح ہونے کے باوجود وہ عوام کے درمیان اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ نہ تھا کہ پہلے قتل کر دیں۔ اور پھر جب لوگ بدنام کریں تو اس کے بعد یہ شکایت کریں کہ لوگ ہم کو غلط طور پر بدنام کرتے ہیں۔ اس کے بجائے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ایسا فعل ہی نہ کیا جائے جس کی وجہ سے لوگوں کو غلط طور پر بدنام کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملہ میں یہی حکمتِ نبوی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال آج ہمارے سامنے ہے۔ سلمان رشدی نے بلاشبہ توہینِ رسول اور اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا۔ بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادیٔ فکر کے قاتل ہیں۔ اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔

ہمیں اس حقیقت کو جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادیٔ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادی خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادیٔ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں، باعتبار نتیجہ، سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادیٔ فکر کا قاتل ہے، اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنّتِ رسول کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو اس "بدنامی" سے بچایا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی ہو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی چیز کو برداشت کرنا پڑے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام دشمنوں کو قتل نہیں کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ کھلے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے سرگرم ہیں تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ بند ہو جائے، اس قسم کی سرگرمی بلاشبہ سرکشی ہے، اس کا

خداو رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں ۔

دو اقتباس

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے مجنونانہ ایجی ٹیشن کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوا ۔ البتہ اس کا یہ زبردست نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو کر رہ گیا ۔ اس کی بے شمار مثالیں ۱۹۸۹ کے نصف اوّل میں سامنے آئی ہیں ۔ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان میں سے دو مثال نقل کی جاتی ہے ۔

۱۔ لندن کے مضافات میں مقیم ایک برطانوی نژاد نومسلم انگریز نے ، جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے ، لکھنؤ میں مقیم اپنے ایک دوست کو لکھا ہے کہ مجھے اپنے خاندان ، رشتہ داروں ، اپنے دوستوں اور اپنی پوری قوم کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آرہا ہے ۔ چاروں طرف سے لوگ حملے کر رہے ہیں ۔ جملے کس رہے ہیں ، اور خمینی کا نام لے کر چڑھا رہے ہیں ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انگریز قوم کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سے اتنی سخت نفرت پیدا ہو جائے گی ۔ اس واقعہ سے پہلے جو چند ماہ میں نے اسلام لانے کے بعد یہاں گزارے تھے ، ان کے دوران مجھے ایسی تلخی کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا ۔"

ماخوذ از : ماہنامہ الفرقان ، لکھنؤ ، اپریل ۱۹۸۹ ، صفحہ ۴ ـ ۵

۲۔ ٹائم میگزین (۱۷ اپریل ۱۹۸۹) کے دو صفحہ پر یورپ میں اسلام کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے ۔ اس رپورٹ کا ایک پیراگراف یہ ہے :

The incendiary furor over Salman Rushdie and his novel *The Satanic Verses* seemed to confirm the long-standing Western stereotype of Islam as a religion of intolerance and violence. The clash in Europe was especially acute. Almost overnight, efforts to erase old perceptions were "demolished," says French historian Bruno Etienne, a scholar of Islam. "I would have preferred that instead of the screaming thousands brought to us by TV, we could have seen the hundreds of thousands o. Muslims who reflect and who pray in private for an integrated Islam."

سلمان رشدی اور اس کے ناول "شیطانی آیات" پر مسلمانوں کا اشتعال انگیز

شور وغل مغرب کے اس قدیم نظریہ کی تصدیق کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام غیر رواداری اور تشدد پسندی کا مذہب ہے ۔ یورپ میں ٹکراؤ خاص طور پر بہت سخت تھا۔ تقریباً راتوں رات ایسا ہوا کہ قدیم تصورات کو مٹانے کی کوششیں ملیامیٹ ہو کر رہ گئیں۔ ایک فرانسیسی مورخ برونوایٹنی جو اسلام کا عالم ہے، اس نے کہا کہ ہزاروں لوگ جو ہم کو ٹی وی کے اوپر چیختے چلاتے ہوئے دکھائے گئے، اس کے مقابلہ میں مجھ کو یہ زیادہ پسند تھا کہ ہم ایسے ہزاروں مسلمان دیکھتے جو اپنی تنہائیوں میں اسلام کے استحکام کے لیے دعائیں کر رہے ہوتے۔ (صفحہ ۴۰)

ان دو حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے رشدی کے خلاف جو بے معنی شور وغل کیا، وہ کس طرح کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہونچا، البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب ضرور بن گیا۔

الرسالہ (مجلد)

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک، ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔ ہدیہ فی جلد ۶۰ روپیہ

گارڈن گروو (Garden Grove) امریکہ کا ایک شہر ہے جو لاس انجلیز کے قریب پیسفک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اسلامک سوسائٹی یہیں پر ۱۹۶۲ میں قائم ہوئی۔ اپنے دستور کے مطابق یہ ایک غیر سیاسی (Non-political) ادارہ ہے۔ اس میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ اب وہ پانچ ایکڑ سے زیادہ بڑے رقبہ میں قائم ہے۔ اس کے اندر مسجد، کانفرنس روم، لائبریری، اسکول، وغیرہ واقع ہیں۔ اس سوسائٹی کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ہیں۔ سوسائٹی کی ہر چیز امریکی معیار کے مطابق ہے۔ اس کے اسکول کو دیکھتے ہوئے ہم ایک بند دروازہ پر پہونچے۔ معلوم ہوا کہ اس کے اندر لفٹ لگی ہوئی ہے۔ اس لفٹ پر سوسائٹی کو ۴۵ ہزار ڈالر خرچ کرنا پڑا۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ ہر اسکول جو گراؤنڈ سے اوپر ہو، خواہ وہ صرف ایک منزل ہو، اس میں لفٹ (Elevator) لگانا ضروری ہے، تاکہ معذور طالب علموں کو اوپر چڑھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

امریکہ میں معذوروں (Handicapped) کا ہر سطح پر بے حد خیال کیا جاتا ہے۔ ہر جگہ انھیں خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ یہ صرف لفظی قانون نہیں ہے، بلکہ اس پر باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا اسکول اس وقت تک منظور نہیں کیا گیا جب تک اس نے لفٹ نہ لگالی۔ اب بھی اس کا جدید ترین طرز کا "کچن" غیر منظور شدہ ہے، کیوں کہ اس کے طعام خانہ کے دروازہ پر چوکھٹ لگی ہوئی ہے جو معذوروں کی پہیہ دار گاڑی کے بآسانی گزرنے میں رکاوٹ ہے۔ واضح ہو کہ فی الحال سوسائٹی کے اسکول میں کوئی معذور طالب علم موجود نہیں۔

اسلامک سوسائٹی میں مسلم بچوں کے لیے ایک اسکول قائم ہے۔ یہ اسکول بھی جدید معیار کے مطابق ہے۔ ایک اجلاس میں بچوں نے عربی اور انگریزی میں تقریریں کیں۔ اس طرح کے پروگرام ہندستان میں بھی مکاتب و مدارس میں کیے جاتے ہیں۔ مگر یہاں بچوں نے جس طرح تقریریں کیں، ان کا معیار ہندستانی طلبہ سے بہتر نظر آیا۔ حسان صدیقی (۱۱ سال) نے عربی میں تقریر کی۔ یہ تقریر بالکل عرب لہجہ میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عرب بچہ بول رہا ہے۔ اسلامک سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ میگزین بھی نکلتا ہے جس کا نام آرنج کریسنٹ (The Orange Crescent) ہے۔

امریکہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر چیز کا ایک اسٹینڈرڈ قائم ہو گیا ہے۔ ملک کے ایک

مہ میں چیزوں کا جو معیار ہے، وہی آپ کو پورے ملک میں نظر آئے گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ
نے امریکہ کے ایک شہر کو دیکھا ہو تو آپ نے تمام شہروں کو دیکھ لیا:

If you have seen one city, you have seen them all.

اس ماحول کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں جو اسلامی کام ہو رہے ہیں، وہ بھی، کم از کم ظاہر کے اعتبار
ے، جدید معیار کے مطابق ہیں۔ ہندستان میں ہمارے بزرگوں نے دعوت کا کام زیادہ تر پست
بقات میں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اسلام کا معیار بھی پست ہو گیا۔ امریکہ میں عمومی طور پر پست و
ند کا یہ فرق نہیں ہے، اس لیے یہاں اسلام کا کام کرنے والوں کو بھی اپنا معیار بلند رکھنا پڑتا ہے،
رنہ یہاں کے ماحول میں وہ بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

امریکہ میں بڑی تعداد میں ایسے مراکز قائم ہیں جن کو یہاں کی اصطلاح میں "اسلامک سنٹر" کہا
اتا ہے۔ ہندستانی اصطلاح میں ان کو وسیع تر مسجد کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں مرکزی طور پر ایک مسجد
وتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے تعلیمی اور ثقافتی شعبے بھی۔ یہ مراکز یہاں کے مسلمانوں کے لیے
نقطۂ اتحاد یا اجتماعی شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس قسم کے ایک مرکز کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں کے وابستہ مسلمانوں میں کافی اختلاف پایا
اتا ہے۔ وہاں میں نے لوگوں کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ اتحاد کی واحد
بت اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔
ں سلسلہ میں صحابہ کرام کی بہت سی مثالیں دیں (اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے)

تقریر کے بعد بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ "اختلاف کے باوجود
تحاد" کا یہ نظریہ ابھی تک ہم کو بتایا ہی نہیں گیا۔ حالاں کہ اس معاملہ میں اہم ترین بات یہی ہے۔
قیقت یہ ہے کہ خواہ مشرق کے مسلمان ہوں یا مغرب کے مسلمان، سب کی واحد کمی یہ ہے کہ ان میں
قیقی شعور موجود نہیں۔ ہمارے علما اور قائدین خود ہی بے شعوری کا شکار ہیں، پھر وہ دوسروں کو
س طرح شعور دے سکتے ہیں۔

اسلامک سوسائٹی (آرنج کاونٹی) کے علاقہ میں تقریباً ۴۰ ہزار مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم
ن میں بمشکل دس فیصد ایسے مسلمان ہوں گے جو اسلامک سوسائٹی سے وابستہ ہوں۔ میں نے سوسائٹی

کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کے پاس ایک بار کسی دور کے شہر سے ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ اقبال نے معذرت کرتے ہوئے لکھا ——— اقبال خانہ نشین ہے۔ اور موجودہ طوفان کے زمانہ میں اپنے گھر کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے۔

میں نے کہا کہ امریکہ (اور دوسرے مغربی ملکوں) میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اور ان کی نسلیں ایک کلچرل طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے طوفانی سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں "اسلامک سوسائٹی" جیسا مرکز ان کے لیے کشتیٔ نوح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر جگہ ایسے اسلامی مراکز قائم کریں، اور جہاں وہ قائم ہیں وہاں انھیں مضبوط کریں اور ان سے وابستہ رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ جو لوگ ان مرکزوں سے علٰحدہ رہیں گے ان کے لیے اندیشہ ہے کہ وہ فکان من المغرقین (ہود ۴۳) کا مصداق ثابت ہوں۔

امریکی براعظم کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کو ساؤتھ امریکہ اور دوسرے کو نارتھ امریکہ کہا جاتا ہے۔ نارتھ امریکہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اگر صرف لفظ "امریکہ" بولا جائے تو اس سے یہی نارتھ امریکہ مراد لیا جاتا ہے۔ میرا موجودہ سفر نارتھ امریکہ میں ہوا جس کو زیادہ صحیح طور پر یو ایس یا یو ایس اے کہا جاتا ہے۔ امریکہ (یونائیٹڈ اسٹیٹس) کا رقبہ ۹۳۶۳۴۰۵ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ رقبہ انڈیا کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہے۔

"امریکہ ایک خوش قسمت ملک ہے" ایک صاحب نے کہا "امریکہ میں ہر قسم کے قدرتی ذرائع وافر مقدار میں موجود ہیں، اور یہی اس کی غیر معمولی ترقی کا راز ہے۔" میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ امریکہ نے اگر ذرائع کی فراوانی کے بل پر ترقی کی ہے تو جاپان کی ترقی کے بارہ میں آپ کیا کہیں گے جہاں قدرتی ذرائع نایابی کی حد تک کم ہیں۔ سیاسی حالات کا غیر موافق ہونا اس پر مزید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جاپان کا ظاہرہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی محنت اور دانش مندی ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ وہ ہر دوسری چیز پر بالا ثابت ہوتی ہے۔

اینڈریو کلگور (Andrew Killgore) یہاں کی ایک مشہور شخصیت ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی مہاجر کمیونٹی کے ایک اجتماع میں تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ کسی بھی سماج میں سب سے زیادہ محنت سے کام کرنے والے لوگ مہاجر ہیں:

The hardest working people in
any society are the immigrants.

ریکہ جیسے ملک میں جو حیثیت مہاجر کی ہے، وہی ہندستان جیسے ملک میں اقلیتی فرقہ کی ہے۔ ایک
نبار سے، دونوں ہی اقلیت کا کیس ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی "اقلیت" زیادہ محنت کے
ریعہ اپنے کامیاب مستقبل کی تعمیر کر رہی ہے، اور ہندستان کی اقلیت" محنت کے راستہ کو
ہوڑ کر احتجاج اور مطالبہ کا ناکام راستہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ امریکہ جیسے ملکوں کی "اقلیتیں" اپنی
طرت پر ہیں۔ یہ فطرت کا سکھایا ہوا سبق ہے کہ جہاں کم مواقع ہوں، وہاں زیادہ محنت کرو۔
ںانچہ یہ لوگ فطرت کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں کہ محنت کی زیادتی سے مواقع کی کمی کی تلافی کرنے میں
ف جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان جیسے ملکوں میں فطرت اور انسان کے درمیان ایک
صنوعی پردہ حائل ہو گیا ہے۔ یہ نام نہاد لیڈروں کا پردہ ہے۔ لیڈروں نے مسلسل جھوٹا سبق
پڑھا کر یہاں کے انسان کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ ہندستان کی اقلیت کو اگر اس کے
اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو وہ بھی اپنی فطرت کے زور پر وہی طریقہ اختیار کر لیتی جو امریکہ کی اقلیت
نے اختیار کیا۔

امریکی اقلیت کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی رہنما خدائی فطرت ہے، ہندستانی اقلیت
کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے رہنما جھوٹے انسانی لیڈر ہیں۔ انھیں دو لفظوں میں دونوں ملکوں کی
اقلیتوں کے فرق کا راز چھپا ہوا ہے۔

امریکہ کی آبادی ڈھائی سو ملین (۲۵ کرور) ہے۔ اس میں چھ ملین یہودی ہیں۔ کل آبادی کا
تین فی صد۔ اس اعتبار سے وہ یہاں کی ایک بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ مگر امریکی یہودی اپنے کو اقلیت
نہیں سمجھتے۔ امریکی نظریہ کے مطابق، وہ مختلف مگر برابر (Different but equal) کے اصول
کو مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقلیت محض کوئی عددی معاملہ نہیں۔ وہ دراصل ایک ذہنی
حالت کا نام ہے:

Minority is a state of mind.

ہندستان میں بھی آپ کو ایسے مسلمان ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ ہم اس ملک میں اقلیت نہیں ہیں، ہم یہاں کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمان کی یہ بات محض ایک لفظی فخر ہے۔ جب کہ امریکی یہودی کی مذکورہ بات مواقع کار کو بتانے کے لیے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی مسلمان ہندستان میں اقلیت والے حقوق بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس امریکی یہودی امریکہ کے ان مناصب پر قبضہ کیے ہوئے ہیں جو عام حالات میں صرف اکثریت کا حصہ ہوتے ہیں۔

۹

لی آیاکوکا (Lee Iacoca) امریکہ کی تجارتی دنیا میں افسانوی شخصیت (Legend) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ کو امریکہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تجارت کے میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور نیویارک سے چھپی ہے۔ یہاں میں نے یہ آپ بیتی دیکھی۔ اس کا نام ہے :

IACOCA: An Autobiography, 1984

انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ آدمی چلتا رہے حتی کہ برے وقتوں میں بھی۔ آدمی مایوس نہ ہو، حتی کہ اس وقت بھی جب کی اس کی دنیا منہدم ہو رہی ہو۔ میں نے سخت محنت کی اہمیت کو جانا۔ آخر کار آپ کو مفید بننا چاہیے :

I learned to keep going, even in bad times. I learned not to despair, even when my world was falling apart. And I learned about the value of hard work. In the end, you've got to be productive.

اپنی زندگی کی کہانی بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ کیسے یہاں تک پہونچے۔ میں وہی جواب دیتا ہوں جو میرے والدین نے مجھے بتایا تھا ——— اپنے آپ کو استعمال کرو :

People say to me: "You're a roaring success. How did you do it?" I go back to what my parents taught me. Apply yourself (p. 340).

امریکہ کے معمار اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا راز یہ بتاتے ہیں کہ اپنے آپ کو استعمال کرو

اس کے برعکس ہندستان کے مسلم لیڈر اپنے ہم قوم لوگوں کو یہ جھوٹا سبق سکھا رہے ہیں کہ دوسرے کے خلاف حقوق طلبی کی مہم چلاؤ۔

ہندستان میں تجارت کا مطلب لوٹ ہوتا ہے۔ یہاں میں کسی کے پاس ملکی صنعت کی بنی ہوئی کوئی چیز دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو: ایک مرتبہ تو میں پھنس گیا، مگر دوبارہ میں پھنسنے والا نہیں۔ ہندستان میں آدمی قیمت دے کر بھی اپنی مطلوب چیز کو نہیں پاتا۔

امریکہ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آئی۔ یہاں ہر چیز سائنس کے جدید معیار پر بنائی جاتی ہے۔ ہینڈ بیگ سے لیکر کار تک، اور ٹیلی فون سے لیکر دستی گاڑی تک ہر چیز عین وہی ہے جیسا کہ معیار کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔ یہاں کا گاہک ضروری قیمت دینے کے بعد ہمیشہ اپنی مطلوب چیز کو پالیتا ہے۔

یہ فرق دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان میں بھری ہوئی سیٹوں کے درمیان ایک عظیم الشان سیٹ ابھی خالی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کوئی آکر وہاں بیٹھے۔ یہاں تجارتی لوٹ کی جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر تجارتی تبادلہ کی جگہ ابھی تک خالی ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائیں اور مشترکہ سرمایہ کے ذریعہ مختلف صنعتیں کھولیں جہاں سستے سامان بنانے کے بجائے حقیقی مطلوبہ معیار کے مطابق چیزیں بنائی جائیں تو وہ زبردست کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندستان کے وسیع جغرافیہ میں وہ اپنا ایک "امریکہ" بنا سکتے ہیں۔

امریکی ایک بہت خرچ کرنے والی قوم ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت جاپانی اپنی آمدنی کا ۱۸ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ جب کہ امریکی اپنی آمدنی کا صرف ۳ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ بچت (Individual savings) کے اعتبار سے اس وقت جاپانی سب سے زیادہ بچانے والی قوم ہیں۔ ۱۹۸۸ میں جاپانیوں کے سیونگ اکاونٹ میں مجموعی طور پر جو رقم تھی۔ اس کی مقدار ۵۰۰۰ بلین ڈالر ہے۔

امریکیوں کی اسی خصوصیت کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں ہر قسم کی سرگرمیاں شباب پر نظر آتی ہیں۔ کوئی بھی غلط یا صحیح کام کیجیے، وہاں آپ کو مالی تعاون کرنے والے مل جائیں گے۔ خیراتی کاموں

میں رقم دینے والے امریکہ میں سب سے زیادہ ہیں۔ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو سب سے زیادہ امداد امریکہ سے ملتی ہے۔ ہندو گروؤں کو سب سے زیادہ تعاون امریکہ سے ملا ہے۔ انگریزی اسلامی لٹریچر کا سب سے بڑا مارکیٹ امریکہ ہے، وغیرہ۔ بعض لوگ اس کی شکایت کرتے والے ملے کہ امریکہ کے لوگ بے فائدہ کاموں میں بہت زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ امریکہ میں فائدہ والے کاموں کے لیے بھی بہت زیادہ تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔

مغربی دنیا میں امریکی لوگ سب سے زیادہ مذہبی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً فرانس میں صرف ۵ فی صد لوگ چرچ جاتے ہیں۔ انگلینڈ میں ۱۰ فی صد۔ مگر امریکہ میں چرچ جانے والوں کی تعداد ۵۰ فی صد ہے۔ امریکہ غالباً واحد ملک ہے جس کی کرنسی (ڈالر) پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہوتا ہے:

In God we trust

ایک طرف امریکہ میں اگر جنسی آزادی اور اس قسم کی دوسری برائیاں عروج پر ہیں تو دوسری طرف ان کے یہاں مذہبی مزاج بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ اگر امریکی سماج کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو یہاں اسلامی دعوت کے مواقع نہایت روشن نظر آئیں گے۔

یہاں اگر آپ صبح کے وقت کسی سڑک پر نکلیں تو ہر گھر کے سامنے آپ کو پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلے رکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان تھیلوں کے اندر گھر کا کوڑا بھرا ہوتا ہے۔ سرکاری گاڑیاں ان کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پھر خاص قسم کی مشینوں میں رکھ کر انھیں دبایا جاتا ہے تو ان کا حجم بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کو ٹھکانے لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں یہ کام ایک مستقل فن بن چکا ہے جس کو گاربالوجی (Garbology) یا ویسٹ مینجمنٹ (Waste management) کہا جاتا ہے۔

اس فن میں تازہ ریسرچ اس بات پر ہو رہی ہے کہ کوڑے کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لیے کیا کیا جائے۔ یہ ریسرچ اب کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ آئندہ یہ ممکن ہو سکے گا کہ سیور گیس (Sever gas) سے ڈائمنڈ بنایا جا سکے۔ امریکی بحریہ کے سائنس والوں نے حال میں اس کا دعویٰ کیا ہے۔ ایک شخص نے اس کو بتاتے ہوئے کہا:

That's the most recent claim of US naval scientists.

امریکہ کے حالیہ الکشن (۱۹۸۸) میں جو لوگ صدارت کے امیدوار تھے، ان میں مسٹر گیری ہارٹ (Gary Hart) کا نام ابتداءً سر فہرست تھا۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی بنا پر پیشین گوئی کی جارہی تھی کہ اگلی میعاد کے لیے وہی صدر منتخب ہوں گے۔ مگر الکشن سے پہلے یہاں کے بعض اخباروں نے مسٹر ہارٹ کی ایک تصویر چھاپ دی جس میں وہ امریکہ کی ایک فلم ایکٹرس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ اخباروں نے انکشاف کیا کہ مسٹر ہارٹ نے ڈونا رائس کے مکان میں رات گزاری ہے۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ کی مقبولیت اچانک ختم ہوگئی۔ حتی کہ انھیں صدارت کی امیدواری سے اپنا نام واپس لینا پڑا۔

اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ نومبر ۱۹۸۸ کے الکشن کے موقع پر بھٹو پارٹی کے اسلامی مخالفین نے ایک تصویر چھاپی جس میں مسز نصرت بھٹو کو امریکہ کے سابق صدر مسٹر فورڈ کے ساتھ ناچتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پاکستان بھر میں پھیلا دیا گیا۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پاکستانی عوام نے بھٹو پارٹی کے حق میں ووٹ دے کر بے نظیر بھٹو کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا ———— اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک کا یہ فرق بھی کیسا عجیب ہے۔

ایک خبر پڑھی۔ اس میں بیل گاڑی کے بارہ میں ایک "نئی دریافت" کا ذکر تھا۔ ترقی پذیر ملکوں میں جانوروں کے ذریعہ کھینچی جانے والی گاڑیوں میں ٹائر لگانے سے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ یہ گاڑیاں تیز چلتی ہیں اور ان میں زیادہ سامان ڈھویا جاسکتا ہے۔ مگر دیہاتی علاقوں میں کچی سڑکوں کی وجہ سے ان کے ٹائر اکثر اوقات پنکچر ہوجاتے ہیں اور پھر ان میں دوبارہ ہوا بھرنا اور قابل استعمال بنانا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ان ٹائروں میں ہوا کی جگہ لکڑی کا بھوسہ بھرنے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان ٹائروں کے پنکچر ہونے کا خطرہ ختم ہوجاتا ہے۔ یہ گاڑیاں تقریباً دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتی ہیں اور ان میں ۵۰۰ کلو گرام سامان لادا جاسکتا ہے۔ یہ "دریافت"

اقوام متحدہ کے ادارۂ زراعت کے تحت کی گئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں کار اور ہوائی جہاز سے لیکر جدید قسم کی بیل گاڑی تک اکثر چیزیں وہ ہیں جو امریکہ سے دنیا کو ملی ہیں۔ امریکہ کا یہی تخلیقی عمل ہے جس نے اسے جدید دنیا میں برتر مقام دیدیا۔ اس کا سبب وہ " سازشیں " نہیں ہیں جو ہم نے اس لیے دریافت کر رکھی ہیں تاکہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی پسماندگی کو خود اپنی نااہلی کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے دوسروں کی نالائقی کے خانہ میں ڈال سکیں۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے جولائی ۱۹۶۵ کا ایک تجربہ ان الفاظ میں لکھا تھا " ایک دن دوپہر کی گاڑی سے کلیفورنیا یونی ورسٹی کے ایک استاد بے شان وگمان دریا باد پہنچے۔ اور دو ڈھائی گھنٹے کے سوال وجواب کے بعد واپسی کی ٹرین سے واپس ہو گئے امریکہ کے صاف وشفاف بلوری سڑکوں کا عادی ہمارے قصبات کی ادھ پکی ادھ کچی کھانچوں اور گڑھوں سے بھری ہوئی سڑکوں کا تصور بھی نہ کر سکتا ہوگا۔ اور پھر موٹر نشیں امریکی کے ذہن میں کھڑکھڑے چرخ چوں ایکوں کی تصویریں بھی کیوں آنے لگیں تھیں۔ اور یہ تجربہ بالکل انوکھا نہیں۔ ایک اور امریکی پروفیسر خاک پھانکنے آج سے چند سال قبل بھی آچکے تھے۔ ایسے اعجوبہ سفر سے بڑھ کر اعجوبہ سفر بھی غرض وغایت نکلا۔ موضوع مطالعہ وتحقیق ہندستان میں تحریک خلافت کی تاریخ (تقریباً ۱۹۱۹ - ۱۹۲۹) اسی ایک کام کے لئے امریکہ سے ہندستان، پاکستان کا سفر۔ اور مدراس، بنگلور، دہلی، حیدرآباد، کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، کراچی وغیرہ کے علاوہ دریاباد تک کی پرمشقت مسافت۔ اور عین اسی زمانہ میں ایک دوسرے امریکی ریسرچ اسکالر اپنا موضوع لئے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکات (۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۲۰ تک) ہندستان کی خاک چھان رہے ہیں۔ اور دریاباد آنے پر ہروقت آمادہ۔ لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ حقیر ذخیرۂ معلومات (کامریڈ وغیرہ کی جلدوں) سے کام لے رہے ہیں (صدق جدید ۱۲ اگست ۱۹۶۵)

یہ اس قسم کی بے شمار مثالوں میں سے ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی قومیں کس طرح ہر قسم کے احوال سے اپنے کو باخبر رکھتی ہیں تاکہ ان کی پلاننگ صحیح ہو۔ قدیم زمانہ میں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سارے یوروپ میں نئے قسم کے اہل علم جاگ اٹھے جن کو مستشرق کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مشرقی اقوام (بشمول مسلمان) کی اتنی کامل تحقیق کی کہ ان کے بارے میں خود مشرقی اقوام سے زیادہ واقف اور باخبر ہوگئے۔ اس واقفیت سے انھوں نے زبردست فائدہ اٹھایا جس

کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

صلیبی جنگوں جیسا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ برعکس صورت میں پیش آیا۔ مگر موجودہ پورے دور میں مسلمانوں میں کوئی بھی مثال نہیں ملتی جب کہ مسلم اہل علم نے مغربی اقوام کی برتری کا راز سمجھنے کے لیے حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ کوشش کی ہو۔

سیٹیل (Seattle) میں امریکہ کی مشہور جہاز ساز کمپنی بوئنگ (Boeing) کا پلانٹ ہے جس کی ورک فورس (Workforce) ۹۶ ہزار ہے۔ یہ اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جو امریکی معیار کے ۷۵ فوٹ بال فیلڈ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر آپ وہاں جائیں تو وہاں ایک شاندار بورڈ پر آپ کو یہ الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے کہ جس طرح ہیرا تراشنے والا ہیرے کو تراشتا ہے، اسی طرح ہمارے ماہر کاریگر ہر جہاز کو درست کرتے ہیں اور صد درجہ صحت اور تفصیل کے ساتھ اس کو تیار کرتے ہیں:

Just as the diamond cutter strikes the stone, so our skilled workers assemble and carefully inspect each airplane with precision and detail.

ابتداءً بوئنگ کمپنی میں کام کا معیار ایسا ہی تھا۔ مگر اب اس کا سابقہ معیار باقی نہیں رہا ہے۔ ۱۹۸۸ میں بوئنگ کے ایک درجن سے زیادہ جہازوں کے ساتھ چھوٹے یا بڑے حادثات پیش آئے۔ چنانچہ اب بوئنگ کمپنی کی ساکھ (Reputation) بہت گر گئی ہے۔ آبزرور (The Observer) کی ایک تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان ہوائی حادثات کا سبب زیادہ تر بناوٹ کی خامیاں (Manufacturing errors) تھیں ـــــــ الفاظ میں اعلیٰ معیار مقرر کرنا بے حد آسان ہے، مگر عمل میں اس کو مسلسل طور پر برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔

امریکہ نے ایک شٹل خلا میں بھیجی جس کا نام چیلنجر (Challenger) تھا۔ یہ شٹل دو ملین میل کا سفر طے کر کے ۹ اپریل ۱۹۸۳ کو زمین پر واپس آگیا۔ اس میں دو خلائی کاریگر (Orbital repairman) اوپر بھیجے گئے تھے۔ ان دونوں کے جسم پر ۲۵۰ پونڈ وزن کا خلائی سوٹ تھا۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت دو ملین ڈالر سے زیادہ تھی۔ وہ زمین سے ۱۷۶ میل کی دوری پر اپنے جہاز سے باہر نکلے اور چار گھنٹہ تک خلا میں رہے اور ایک مواصلاتی سٹلائٹ کی مرمت کا کام کر کے دوبارہ اپنے کیبن میں

واپس آگیے۔

امریکی خلاباز جس وقت زمین سے پونے دوسو میل کی بلندی پر "تاریخ کا پہلا خلائی کارنامہ" انجام دے رہے تھے، اس وقت سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن نے اپنے زمینی دفتر میں بیٹھے ہوئے ان سے بات کی۔ صدر نے ان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ یہ خلائی شٹل ہمارے اس عہد کی ایک علامت ہے کہ ہم خلا میں امریکی بالاتری کو باقی رکھیں گے:

The space shuttle is a symbol of our commitment to maintain America's leadership in space. *Herald Tribune*, London, April 10, 1983.

اب پانچ سال بعد امریکہ کی خلائی بالاتری کا افسانہ ختم ہو رہا ہے۔ خلائی بالاتری کا منصوبہ امریکہ کے لیے اتنا مہنگا پڑا کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ انسان اپنی محدودیت کو نہیں جانتا۔ اگر وہ اپنی محدودیت کو جانتے تو ہرگز وہ بڑی بڑی باتیں نہ کرے۔

ایک خبر اخبار میں نظر سے گذری ——— امریکہ اور فلپائن کی حکومت کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے جس کے تحت واشنگٹن نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ فلپائن میں اپنے چھ فوجی اڈوں (Military bases) کے استعمال کے لیے پانچ کروڑ ڈالر سالانہ معاوضہ ادا کرے گا۔ یہ معاہدہ ۱۹۹۱ تک نافذ رہے گا۔ ان میں ایک فضائی اڈہ، ایک بحری اڈہ، اور چار نسبتاً چھوٹی تنصیبات شامل ہیں۔ امریکہ یہ سالانہ معاوضہ معاشی امداد، فوجی تعاون اور اشیار کی فراہمی کی صورت میں ادا کرے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ وہ عالمی قیادت حاصل کرے۔ وہ اس کی بے حد مہنگی قیمت مسلسل دیتا رہا ہے۔ مذکورہ خبر اس کی محض ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مگر امریکہ کے مدبرین اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ پالیسی قابل عمل نہیں۔ ایک امریکی لیڈر نے کہا کہ ایک خاندان کی طرح ایک سماج بھی اپنے ذرائع سے باہر جاکر غیر محدود طور پر زندہ نہیں رہ سکتا:

A society, like an individual family, cannot live beyond its means indefinitely.

اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ غیر اسلام احساس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور اسلام احساس خداوندی کی زمین پر۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس آج دونوں میں سے کوئی زمین موجود نہیں۔ اور بلاشبہ یہی ان کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

نومبر ۱۹۸۸ میں امریکہ میں جو صدارتی الکشن ہوا ہے، اس میں جارج بش (George Bush) کو امریکہ کے صدر کی حیثیت سے چنا گیا ہے۔ ایک خبر پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ مسٹر جارج بش کا ایڈمنسٹریشن امریکہ کی اقتصادی پالیسی میں اہم تبدیلیاں لا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ اب تک یورپ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا رہا ہے۔ مگر نئے فیصلہ کے تحت ایشیا کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اس کا سبب ایشیا سے ہمدردی نہیں، بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔

نئے ایڈمنسٹریشن کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۷ میں امریکہ کی تجارت یورپ سے تقریباً ۱۷۰ بلین ڈالر کے بقدر تھی جب کہ اسی مدت میں ایشیا سے امریکہ کی تجارت ۲۴۱ بلین ڈالر رہی۔ ۱۹۸۸ میں بھی یہی تناسب مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔

باشعور لوگ ہمیشہ اپنے عمل کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے اپنے عمل کا رخ بدل لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ بے شعور ہوں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار وہ جس ڈگر پر چل پڑیں، بس اسی ڈگر پر وہ بے سوچے سمجھے چلتے رہتے ہیں، ان کی آنکھ صرف اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ بربادی کے گڑھے میں گر کر اصلاح حال کا آخری موقع کھو چکے ہوں۔

امریکہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بے قید آزادی ہے۔ اس بے قید آزادی کا سب سے زیادہ اظہار جنسی معاملات میں ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی کم سن لڑکیوں میں، دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں، اسقاط کی شرح سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یورپی قوموں کے مقابلہ میں تقریباً دگنا زیادہ۔ ۱۵ سے ۱۹ سال کی عمر کی امریکی عورتیں تقریباً دس فی صد کی تعداد میں ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں:

American teenage girls have the highest rate of abortion in the developed world, more than double that of most European nations. About 9.8 per cent of American women aged 15 to 19 become pregnant annually, the highest rate among the nations studied.

بیسویں صدی میں ایک طرف امریکہ میں آزاد زندگی کا تجربہ کیا گیا، اور دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کا۔ امریکہ میں آزاد نظام کے تجربہ نے اس کو برباد کن اباحیت تک پہونچا دیا۔ یہاں تک کہ خود امریکہ میں بی ایف اسکنر (B.F. Skinner) جیسے لوگ پیدا ہوئے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے :

We can't afford freedom

دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کو قائم کرنے کی کوشش کا یہ بھیانک انجام ہوا کہ سابق روسی وزیر اعظم جوزف اسٹالن نے ۱۲ ملین آدمیوں کو مار ڈالا۔ مجموعی طور پر ۳۸ ملین آدمی اس کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ یہ اعداد و شمار خود روسی مورخ میڈویڈیو (Roy Medvedev) نے "ماسکو نیوز" میں شائع کیے ہیں (کلیرٹی ۴ دسمبر ۱۹۸۸) چنانچہ موجودہ روسی وزیر اعظم میخائیل گورباچوف کو اعلان کرنا پڑا کہ "ہم پابند زندگی کا تحمل نہیں کر سکتے"۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہنمائی کے بغیر جب بھی انسانی زندگی کا نقشہ بنایا جائے گا، وہ یا تو ایک انتہا کی طرف جائے گا یا دوسری انتہا کی طرف۔ وہ کبھی معتدل اور متوازن نقشہ نہیں ہو سکتا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رونالڈ ریگن نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت میں امریکہ کو کوئی ترقی نہیں دی، البتہ اس کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ ریگن نے، بظاہر اپنی ذاتی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے ستارہ کی جنگ (Star wars) کا نعرہ لگایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی جنگی ٹکنالوجی تیار کی جائے کہ دشمن کے حملہ کا مقابلہ زمین سے اوپر ہو سکے اور اس کو خلا کے اندر ہی برباد کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ریسرچ اور تجربات کا خرچ اتنا بڑھ گیا کہ امریکہ جو دنیا کو قرض دیتا تھا، وہ خود سب سے بڑا مقروض ملک بن گیا۔ اس وقت (۱۹۸۸ کے آخر تک) امریکی قرضہ دو کھرب ساٹھ ارب ڈالر تک پہونچ چکا ہے۔ صرف جاپان کا قرضہ اس کے اوپر ۱۵ ارب بیس کرور ڈالر ہے۔ اس وقت امریکی انتظامیہ کے اخراجات اس کی آمدنی سے بہت زیادہ ہیں۔ مختلف ملکوں کا سرمایہ جو اس وقت امریکہ کے بینکوں میں ہے، اگر وہ اس کو نکال لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہو جائے گا۔ دنیا کے دس بڑے بینکوں میں صرف ایک امریکی بینک ہے، باقی سب جاپانی بینک ہیں۔ پہلے یہ حال تھا کہ دنیا بھر میں جتنی کاریں تیار ہوتی تھیں، ان کا ۷۵ فیصد امریکہ تیار کرتا تھا۔ اب صرف ۲۵ فی صد کاریں یہاں

تیار ہو رہی ہیں۔ ۱۹۷۲ میں دنیا کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کا ۷۰ فی صد امریکہ میں تیار ہوتا تھا۔ اب اس کی مقدار صرف ۳۰ فی صد رہ گئی ہے۔

کوئی شخص یا قوم خواہ وہ کتنا ہی زیادہ طاقتور ہو، اس کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ طاقت کے اندر اقدام کرنا کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور طاقت کے باہر اقدام کرنا بربادی کی طرف۔

ایک لطیفہ پڑھنے کو ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت کیوں کم ہو گئی ہے۔ اگر سب نہیں تو کم از کم ایک وجہ یقیناً یہی ہے جو اس لطیفہ میں بتائی گئی ہے۔

۸۶ سال کی ایک بوڑھی عورت پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اس نے دوران پرواز جہاز کے عملہ کی طرف سے ایک اعلان سنا: آپ کا کیپٹن آپ سے ہم کلام ہے۔ بعض مشینی خرابی کی وجہ سے ہمارے چوتھے انجن نے کام چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تین انجن کے ذریعہ اپنی پرواز جاری رکھیں گے اور وقت پر اپنی منزل پر اتر جائیں گے۔ مزید میرے پاس آپ کے لیے کچھ قابل اطمینان خبر بھی ہے۔ ہم اپنے ساتھ جہاز میں چار پادری رکھتے ہیں۔ بوڑھی خاتون جو اعلان کو بغور سن رہی تھی، اس نے جہاز کے عملہ کے ایک شخص کو بلا کر کہا: براہ کرم کیپٹن سے یہ کہہ دیں کہ میں اس کو زیادہ پسند کروں گی کہ ہمارے پاس چار انجن ہوں اور تین پادری:

An 86-year-old woman who was flying for the first time heard the following announcement come over the plane's intercommunication system. "This is your captain speaking. Our number four engine has just been shut off because of mechanical trouble. However, there is nothing to worry about. We will continue our flight with three engines and will land on schedule. Also, I have some really reassuring news for you. We have four priests on board."
The elderly passenger, who had been listening apprehensively, called the flight attendant. "Would you please tell the captain," she said, "that I would rather have four engines and three priests."

یہ لطیفہ دور جدید کے ایک اہم پہلو کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ مشینی زمانہ ہے۔ آج ہر چیز کا تعلق مشین سے ہو گیا ہے، خواہ سفر کرنا ہو یا گھر کے اندر کھانا پکانا یا اشیاء صرف کو تیار کرنا ہو۔ قدیم روایتی دور میں ان چیزوں کے لیے مشینی ماہرین کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آج ہر چیز کا تعلق مشینی ماہرین سے ہو گیا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت گھٹا دی

اور مشینی طبقہ کی اہمیت کو لوگوں کی نظر میں بڑھا دیا۔ کیوں کہ دورِ جدید کی مشینیں مشینی ماہرین سنبھالتے ہیں نہ کہ مذہبی ماہرین۔

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام، امریکہ میں مغلوب ہو گیا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو مسلمان امریکہ آئے، وہ ابتداءً اپنے ساتھ اسلامی تہذیب لے کر آئے تھے۔ اس طرح یہاں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلہ میں مغربی تہذیب برتر ثابت ہوئی۔ کیوں کہ ان مسلمانوں کی اکثریت نے اب اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اختیار کر لیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کو بتانے کے لیے زیادہ صحیح لفظ یہ ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ یہاں جو مقابلہ پیش آیا وہ اصول پسندی اور خواہش پرستی کے درمیان تھا۔ اسلام اصول پسند زندگی کا نمائندہ تھا، اور مغربی تہذیب خواہش پرست زندگی کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اور ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ انسان اس معاملہ میں ہمیشہ کمزور واقع ہوا ہے، وہ اصول پسندی کو چھوڑ کر خواہش پرستی کی طرف جھک جاتا ہے۔

یہ تصادم امریکہ میں نہیں بلکہ ہر جگہ جاری ہے۔ جہاں بھی آدمی کو موقع مل رہا ہے۔ وہ اصول کو چھوڑ کر خواہش کو اختیار کر لیتا ہے۔ امریکہ میں یہ واقعہ تہذیب کے انداز میں ہو رہا ہے اور دوسرے مقامات پر عمومی انداز میں۔

ایک صاحب نے اپنی گفتگو میں مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی مسلمان دنیا میں غالب اور فاتح حیثیت رکھتے تھے۔ آج مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے، مگر آج ہمارا حال یہ ہے کہ دنیا پر اثر انداز ہونا تو درکنار دوسرے لوگ ہمارے قومی فیصلے کرتے ہیں، آج ہم اپنی قسمت کے مالک نہیں :

We are not the master of our destiny

موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر جگہ مسلمان اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ حالت کا تقابل ماضی کی فاتحانہ حیثیت سے کرتے ہیں، وہ اپنا تقابل داعیانہ حیثیت سے نہیں کرتے۔ مسلمان اگر اپنی موجودہ حیثیت کا تقابل ماضی کی داعیانہ تاریخ سے کریں تو ان کے اندر دعوتی عمل کا جذبہ بیدار ہوگا۔ مگر ماضی کی فاتحانہ تاریخ سے تقابل ان میں کسی صحت مند جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

۲۷ دسمبر کو صبح ساڑھے دس بجے کا وقت ہے۔ صاف آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ موسم نہایت خوش گوار ہے۔ میں کوسٹا میسا (Costa Mesa) کے پارک (Wakeham Park) میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوں۔ پارک کے اندر کے مناظر، باہر کا ماحول اور اطراف کی سڑکیں اور مکانات، ہر چیز اتنی باقاعدہ اور اتنی منظم دکھائی دیتی ہے کہ دیر تک سوچنے کے باوجود مجھے وہ الفاظ نہیں ملے جن سے میں اس کی تصویر کشی کرسکوں۔

مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا۔ انھوں نے ایک بے نمازی نوجوان کو دیکھ کر کہا تھا کہ میرے بیٹے نماز پڑھا کرو تاکہ آخرت میں تمہارا خوبصورت چہرہ آگ میں نہ جلایا جائے۔ امریکہ کی خوبصورت زندگی اور یہاں کے بارونق تمدن کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے سوچا کہ کاش اللہ کے کچھ بندے اٹھیں اور یہاں کے انسانوں کو اللہ کے دین پر لانے کی کوشش کریں تاکہ ان کی نسلیں اگلی دنیا میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں۔ اس دعا کے سوا مجھے کوئی اور لفظ نہیں ملا جس کو میں یہاں درج کروں۔

امریکہ میں بہت سے "قابل دید" مقامات ہیں۔ لوگوں نے کئی جگہوں پر لے جانے کی پیش کش کی مگر میں کہیں نہ جاسکا۔ البتہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۸ کو یہاں کا مشہور ڈزنی لینڈ (Disnyland) دیکھا۔ یہ ایک تفریح گاہ یا تماشائی پارک (Amusement park) ہے۔ اس کو ابتداءً والٹ ڈزنی نے بنایا تھا اور ۱۹۵۵ میں اس کا افتتاح ہوا۔ بہت بڑے رقبہ میں طرح طرح کی عجیب چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر لوگ حیرت اور مسرت میں پڑجاتے ہیں۔ اس کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش کن مقام (Happiest place on earth) کہا جاتا ہے۔ اس کا ٹکٹ فی کس ۲۵ ڈالر ہے۔ دنیا بھر کے بے شمار لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں ہر روز میلے جیسی بھیڑ ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس قسم کے دو پارک بنائے گیے ہیں۔

ڈزنی لینڈ میں ایک طرف حال اور مستقبل کی دنیا کے پُرعجوبہ مناظر ہیں۔ دوسری طرف اس میں سفر کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی ایک ٹرین بنائی گئی ہے جو پانی اور کوئلے سے چلتی ہے، اور سیٹی کے بجائے اس میں قدیم طرز کا گھنٹہ ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ تاہم مجھے ڈزنی لینڈ سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوسکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈزنی لینڈ کی واقعی اہمیت اس سے بہت کم ہے جتنی اس کی

پلسٹی کی گئی ہے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی اہمیت کی چیز کو شہرت نہیں ملتی۔ البتہ غیر حقیقی اہمیت والی چیزیں بہت زیادہ شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔

ایک صاحب نے پُرفخر طور پر کہا کہ امریکہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے فلک بوس عمارتیں (Skyscrapers) میں شہرت حاصل کی، میجر ولیم لی بیرن جینی نے ۱۸۸۵ میں پہلی دس منزلہ بلڈنگ شکاگو میں بنائی۔ اس کے بعد یہ ذوق بڑھتا رہا۔ نیویارک میں ۱۹۳۰ میں کرسلر بلڈنگ بنائی گئی جس کی ۷۷ منزلیں تھیں۔ ۱۹۳۱ میں نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بنی جس میں ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ ۱۹۷۳ میں شکاگو میں سیرس ٹاور بنایا گیا جس کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ موجودہ سیرس (Sears) میں ۱۳ ہزار کارکن کام کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان ریٹیل شاپ ہے، چنانچہ اس کو ہر چیز کی دکان (Everything stores) کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ انسانی کارنامہ سے زیادہ خدائی کارنامہ کو یاد دلاتا ہے۔ یہ غیر معمولی اونچی عمارتیں تمام تر لوہا (اسٹیل) کا کرشمہ ہیں۔ قرآن میں ہے کہ لوہے کے اندر خدا نے بأس شدید (الحدید ۲۵) پیدا کیا ہے۔ لوہے کی اسی قدرتی صفت نے اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ زمین کے اوپر اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کی جاسکیں۔

"اسکائی اسکریپر" کو دیکھ کر آپ کے اوپر استعجاب کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ مگر یہ استعجاب حقیقۃً انسانی انجینئرنگ پر نہیں بلکہ خدائی تخلیق پر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ انجینئرنگ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی تخلیق کا انسانی استعمال ہے۔ "لوہا" تخلیق ہے اور اسکائی اسکریپر صرف اس کا ایک استعمال۔

ایک امریکی سے ملاقات ہوئی جو واشنگٹن کا رہنے والا تھا۔ واشنگٹن امریکہ کی راجدھانی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ واشنگٹن کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ اس نے مسکرا کر کہا:

People only leave Washington by way of the box — ballot or coffin.

یعنی لوگ واشنگٹن کو صرف بکس کی راہ سے چھوڑتے ہیں۔ ووٹ کا بکس یا تابوت کا بکس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجدھانی ہونے کی وجہ سے واشنگٹن میں ہر قسم کی اعلیٰ ترین سہولتیں مہیا ہیں۔

اس کے علاوہ تمام اہم ترین سیاسی فیصلے یہیں ہوتے ہیں۔ جس شخص کو واشنگٹن میں کوئی جگہ مل جائے، وہ اس کو آخری سمجھ کر اسی سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جس "واشنگٹن" کا حال یہ ہو کہ ایک "بکس" آدمی کو اس سے جدا کر دے، اس واشنگٹن کی کیا حقیقت۔ "واشنگٹن" تو وہ ہے جس میں ہمیشگی کی صفت پائی جائے۔ اور ایسا واشنگٹن آدمی کو جنت کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے گھر پر تھا۔ صبح فجر کے وقت اچانک خطرہ کا الارم بجنے لگا۔ چند سکنڈ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ صغیر احمد صاحب نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے فوراً آواز آئی کیا آپ ٹھیک ہیں (Are you O.K., Sir?)۔

یہاں پر گھروں میں ایک سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے جس کو سیکورٹی الارم سسٹم کہتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی شخص دروازہ کھول کر باہر نکلے یا اندر داخل ہو تو الارم فوراً بجنے لگتا ہے۔ اور عین اسی وقت پولس کے کنٹرول روم میں لال بتی جل جاتی ہے۔ پولس ایک منٹ کے اندر صاحب مکان کو ٹیلی فون کر کے خیریت معلوم کرتی ہے۔ یہ ٹیلی فون اسی کے مطابق، پولس کے دفتر سے آیا تھا۔ مذکورہ الارم کا قصہ اس لیے پیش آیا کہ ہمارے ایک ساتھی نے فجر کے وقت باہر جانے کے لیے گھر کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اتنے زبردست انتظام کے باوجود امریکہ میں مسلسل قتل اور ڈاکہ کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پرامن سماج کے قیام کے لیے مشینی انتظام کے سوا بھی ایک چیز درکار ہے۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔ صرف مشینی انتظام کبھی پُرامن سماج کے قیام کی ضمانت نہیں بن سکتا۔

صغیر احمد اسلم (پیدائش ۱۹۳۶) کمالیہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اب وہ امریکی شہری ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا ۱۹۵۱ کا ایک واقعہ بتایا۔ رمضان کا زمانہ تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر وہ بائیسکل کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے بازار سے آلو بخارا اور مالٹا خریدا۔ اس کو بائیسکل کے پیچھے رکھ کر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک شخص ملا۔ اس نے ان کو روکا اور کچھ آلو بخارا زبردستی نکال کر لے لیا۔ صغیر احمد اسلم صاحب نہ غصہ ہوئے اور نہ اس سے دوبارہ اپنا آلو بخارا چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے انھوں نے کہا: دیکھو، یہ مالٹا ہے، اس میں سے بھی لے لو۔

آدمی نے مزید کوئی چیز نہ لی، وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

مذکورہ واقعہ میں ایک صورت یہ تھی کہ صغیر اسلم صاحب یہ سوچتے کہ ابھی تو اس نے صرف آلو بخارا لیا ہے، اگر میں کمزوری دکھاؤں تو وہ مالٹا بھی لے لے گا۔ اور اگر میں نے مزید کمزوری دکھائی تو وہ میری بائیسکل بھی چھیننے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس قسم کے خیالات صرف شیطانی وسوسہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر خود عمل نہ کرنا فطرتِ خداوندی کو عمل کرنے کا موقع دینا ہے۔ چنانچہ صغیر اسلم صاحب نے جب کوئی مخالفانہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تو مذکورہ آدمی کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فطرتِ خداوندی نے وہ کام زیادہ بہتر طور پر کر دیا جس کو انسان صرف ناقص طور پر انجام دیتا۔

جناب صغیر اسلم صاحب یہاں کپڑے وغیرہ کی تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۵ میں ایک بار ایک اخبار میں اشتہار نکلا کہ فلاں ہوٹل میں ہمارا لکچر ہوگا جس میں بتایا جائے گا کہ آپ مفید طور پر کوئی جائداد (Real estate) کس طرح حاصل کریں۔ اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ اس کی کوئی فیس نہیں ہے۔ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ہال بالکل بھرا ہوا تھا۔ بلکہ سیٹ پر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی سامعین میں موجود تھے۔

اس اجتماع میں انھوں نے محض اپنا تعارف کرایا اور کچھ ابتدائی باتیں بتا کر کہا کہ کل ہمارا آٹھ گھنٹہ کا کورس ہوگا، اس میں تمام تفصیل بتائی جائے گی اور اس کی فیس ۵۰۰ ڈالر ہوگی۔ صغیر اسلم صاحب نے ۵۰۰ ڈالر دے کر ٹکٹ خرید لیا۔ اگلے دن وہ ہال میں پہونچے تو وہاں بمشکل ایک درجن آدمی موجود تھے۔ انھوں نے آٹھ گھنٹہ کے کورس میں شرکت کی۔ اس میں انھیں جائداد کی خریداری کے بارہ میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے اگلے چند مہینوں میں ۱۰ مکانات کی خریداری مکمل کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کام میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ صرف تین سال میں ان مکانات کی قیمت دگنا ہو گئی۔ انھوں نے پانچ سو ڈالر خرچ کر کے پانچ لاکھ ڈالر کمائے۔

اس دنیا میں کامیابی کے لیے حوصلہ درکار ہے۔ جو شخص حوصلہ مند نہ ہو، وہ اس دنیا میں کبھی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

۱۔ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کی طرف سے پیارے لال بھون میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں سلمان رشدی کی کتاب (سیٹنک ورسز) پر تقریریں ہوئیں۔ اور اس کے جواب میں ڈاکٹر ماجد علی خاں کی لکھی ہوئی کتاب (The Holy Verses) کا اجرا عمل میں آیا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

۲۔ آریہ سماج (جنگ پوری ، نئی دہلی) کی طرف سے اپریل ۱۹۸۹ میں ایک ہفتہ منایا گیا۔ اس میں مختلف مذاہب کے ذمہ دار افراد کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی ۔ ۱۵ اپریل ۱۹۸۹ کو اس میں صدر اسلامی مرکز کی تقریر رکھی گئی تھی اور پروگرام میں ان کا نام بھی چھاپ دیا گیا تھا۔ مگر رمضان کی وجہ سے اس میں شرکت نہ ہوسکی ۔ البتہ اس کے منتظمین کو مرکز کی کچھ مطبوعات بطور تعارف بھیج دی گئی ہیں ۔

۳۔ نئی دہلی (کانسٹی ٹیوشن کلب) میں ۱-۲ اپریل ۱۹۸۹ کو صوفیا کے سماجی رول پر ایک سمینار ہوا۔ اس کا اہتمام عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی اور اردو اکادمی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۲ اپریل کے اجلاس میں مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی ۔

۴۔ الرسالہ کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں کثرت سے نقل کیے جارہے ہیں۔ کچھ حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور کچھ حوالے کے بغیر ۔ اس سلسلہ میں اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ جو لوگ الرسالہ کے مضامین الرسالہ کے حوالے کے بغیر نقل کر رہے ہیں ، ان کے قارئین ان کو پڑھتے ہی فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ الرسالہ کا مضمون ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ الرسالہ کے پیغام کے ساتھ الرسالہ کا اسلوب بھی آج ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکا ہے ۔ نام نہ لیا جائے تب بھی لوگ کہہ پڑتے ہیں کہ یہ تو الرسالہ کی بات ہے ، یہ تو الرسالہ کا اسلوب ہے ۔

۵۔ عبدالکریم نبی بخش صاحب (۶۷ سال) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں ۔ انھوں نے

یکم اپریل ۱۹۸۹ کی ملاقات میں بتایا کہ ان لوگوں نے ایک مسلمان پائلٹ آفیسر کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرایا تھا۔ ڈیڑھ سال کے مطالعہ کے بعد ان کی ملاقات مذکورہ پائلٹ آفیسر سے ہوئی۔ انھوں نے تاثر پوچھا۔ پائلٹ آفیسر نے کہا کہ میرے تاثر کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ الرسالہ کے مطالعہ ہی کی وجہ سے ایسا ہوا کہ میں ہوائی جہاز کی سروس میں ہوتے ہوئے شراب کے استعمال سے بچ گیا، ورنہ وہاں تو شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے۔

۶۔ الرسالہ (اردو، انگلش) دوسری خدمات کے علاوہ ایک خدمت یہ انجام دے رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف الزامات کا علمی سطح پر مدلل جواب دیتا ہے۔ یہ جوابات نہ صرف یہ کہ لوگ خود پڑھتے ہیں بلکہ وہ اس کو دوسرے اخبارات ورسائل میں چھپوا کر اس کو مزید وسیع تر دائرہ میں پہنچاتے ہیں۔ الرسالہ انگلش میں مسٹر ارون شوری کے بعض سنگین الزامات کا مدلل اور سائنٹفک جواب دیا گیا تھا۔ اس کو محمد رفیع عمر صاحب نے بمبئی کے ایک اخبار The Afternoon Despatch & Courier میں پہنچایا۔ اس اخبار نے اپنے شمارہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۹ میں صفحہ ۱۱ پر اس کو مکمل طور پر شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے Distorting the Facts۔

۷۔ محمد سکندر عالم (عالم بک اسٹور، جھومپورا، اڑیسہ) لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ۳-۴ مارچ ۱۹۸۹ کو ایک بہت بڑا دینی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے جلسہ گاہ میں اسلامی مرکز کی مطبوعات اور الرسالہ کا اسٹال لگایا۔ کافی لوگ اسلامی مرکز سے متعارف ہوئے اور اچھا تاثر لیا۔ الرسالہ اور کتابیں جو اسٹال پر موجود تھیں، سب کی سب پہلے ہی روز فروخت ہو گئیں۔ اس کے بعد ہمارا اسٹال صرف نمائشی اور تعارفی مرکز بن کر رہ گیا۔ پرچہ اور کتابوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ لوگوں کا بیان تھا کہ الرسالہ اور اسلامی مرکز وقت کے اہم تقاضے کے عین مطابق ہیں۔

۸۔ شجاعت اللہ خاں صاحب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ (نئی دہلی) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ اپنے خط یکم اپریل ۱۹۸۹ میں لکھتے ہیں: آپ کے مضامین بہت معیاری ہوتے ہیں اور مسائل پر بحث مکمل اور آسان طریقہ سے کی جاتی ہے۔ آپ کا طریقہ قانونِ خداوندی

کو سمجھانے کا جدید اور سائنس پر مبنی ہوتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ سارے علما ر صاحبان کو آپ کا طریقہ تحریر ہی اپنانا چاہیے ۔

۹۔ ایک خاتون لکھتی ہیں کہ میں اپنے بچوں سے ملنے کے لیے ہندستان سے عُمان آئی ہوں۔ یہاں ہمارے پڑوس میں بہت سے غیر مسلم رہتے ہیں ۔ ان کو میں نے انگریزی رسالہ دیا ۔ اسی طرح سفر کے دوران جہاز میں ایر ہوسٹس وغیرہ کو بھی انگریزی رسالے دیے ۔ یہاں عمان۔ برطانیہ ایگزبیشن لگی ہوئی تھی ، ۲۰ فروری سے ۲۶ فروری ۱۹۸۹ تک ۔ وہاں بھی بہت سی انگریز عورتوں کو میں نے انگریزی الرسالہ کے پرانے شمارے دیے ۔ اسی طرح سنگاپور میں نومسلموں کی تنظیم ہے ، ان کو بھی ہم نے الرسالہ انگریزی کے شمارے بھجوائے ہیں ۔
(والدہ نکہت ضیاء)

۱۰۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی ۔ اس کا عنوان تھا : تیوہار اور قومی یک جہتی ۔ اس تقریر میں قومی تیوہاروں کی سماجی حیثیت اور ان کے انسانی پہلو کو بیان کیا گیا ۔

۱۱۔ بنگلور کے ارشاد احمد خاں (پیدائش ۱۹۶۴) سینٹ جوزف کے طالب علم ہیں ۔ وہ الرسالہ انگریزی پڑھتے ہیں ۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے :

I subscribe many Islamic papers. *Al-Risala* (English) is the only paper that inspires me and gives me the right direction.

۱۲۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : "خاتونِ اسلام" کی وی پی وصول کی ۔ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد بس چھوڑنے کو جی نہیں چاہا اور جب تک کتاب ختم نہیں ہوئی ، دل میں بس آگے ہی آگے پڑھنے کی تڑپ رہی ۔ واقعی کتاب اپنے موضوع پر لاثانی ہے ۔ اللہ مولانا کے قلم میں اور زور بخشے ۔ لکھنے کا انداز بھی انوکھا ہے ۔ دل میں اثر کر کے ہی دم لیتا ہے
(محمد رحمت اللہ ، سیتامڑھی)

۱۳۔ "اسلام دور جدید کا خالق" نامی کتاب جلد ہی پریس سے چھپ کر آنے والی ہے ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

زرِ تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۳ — اگست ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳۰۰۱۱ ، فون: 697333, 611128

مشرک کا حکم

قرآن میں ہے کہ خنزیر کا گوشت ناپاک ہے (او لحم خنزیر فانه رجس) اسی طرح قرآن میں ہے کہ مشرک ناپاک ہیں (انما المشرکون نجس) اس لفظی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ جس طرح خنزیر باعتبار جسم ناپاک ہے، اسی طرح مشرک بھی باعتبار جسم ناپاک ہے۔ چنانچہ مشرک کا برتن، کھانا، کپڑا اور اس کی تمام چھوئی ہوئی چیزوں کو ناپاک سمجھ لیا گیا۔ حتی کہ کہا گیا کہ کوئی مسلمان اگر مشرک سے مصافحہ کر لے تو اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ کو دھوئے اور وضو کر کے اپنے کو پاک کرے (قال اشعث عن الحسن من صافحهم فليتوضأ، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۴۶)

یہ صحیح نہیں۔ اگر چہ مذکورہ دونوں آیتوں میں بظاہر یکساں لفظ ہے، مگر دونوں کا مطلب یکساں نہیں۔ "خنزیر نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خنزیر کا جسم نجس ہے۔ اس کے برعکس "مشرک نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مشرک کا عقیدہ نجس ہے۔ جہاں تک مشرک کے بدن کی نجاست کا تعلق ہے، جمہور کی رائے یہ ہے کہ مشرک کا بدن اور اس کا وجود نجس نہیں۔ اسی بنا پر اہل کتاب کے کھانے کو جائز ٹھہرایا گیا ہے (واما نجاسة بدنه فالجمهور على انه ليس بنجس البدن والذات لان الله تعالى احل طعام اهل الكتاب، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۴۶) عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں:

اما قوله تعالى (انما المشركون نجس) فالمراد به النجاسة المعنوية التى حكم بها الشارع وليس المراد ان ذات المشرك نجسة كنجاسة الخنزير (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، الجزء الاول، صفحہ ۶)	اللہ تعالیٰ کا قول کہ مشرکین نجس ہیں، اس سے مراد معنوی نجاست ہے جس کا حکم شارع نے بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرک کا وجود ناپاک ہے جس طرح خنزیر کا وجود ناپاک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مسائل مسلمانوں میں دعوتی ذہن ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسری قوموں کو مدعو سمجھنا انھیں قابل التفات بناتا ہے۔ مگر جب دوسری قومیں مدعو نہ سمجھی جائیں تو وہ قابل اجتناب بن کر رہ جائیں گی۔

شاہ کلید

مانٹگومری واٹ (W. Montgomery Watt) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: اسلام کی عظمتِ رفتہ (The Majesty that was Islam) یہ کتاب اگرچہ اسلام کی تعریف پر ہے۔ مگر اس کا نام بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ کتاب کے اس نام کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی ساری عظمتوں کے باوجود ماضی کی چیز تھا، وہ مستقبل کی چیز نہیں۔ کتاب کا یہ نام ماضی کے بارہ میں فخر اور مستقبل کے بارہ میں مایوسی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

مصنف نے کتاب کے پانچویں باب میں فلکیات کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ فلکیات کا فن عربوں کے لیے ایک عملی سائنس تھی۔ کیوں کہ ان کے لیے اپنے مذہب کی رو سے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر اسلامی شہر سے مکہ کے رخ کو جانیں۔ تاکہ نمازوں کے وقت اپنے چہرہ کا رخ اس کی طرف کر سکیں:

> Astronomy was a practical science for the Arabs... because they had to know the direction of Mecca from every Islamic city, in order to face in this direction in their prayers (p. 228).

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے عبادتی اعمال غیر متعلق رسوم نہیں ہیں، بلکہ ان کا رشتہ دوسرے انسانی علوم سے براہ راست طور پر جڑا ہوا ہے ـــــ نماز کا تعلق سمتوں کے علم سے ہے۔ اسی طرح روزہ کا تعلق کیلنڈر سے۔ زکوٰۃ کا تعلق علم الحساب سے۔ حج کا تعلق علم جغرافیہ سے، وغیرہ۔

مسلمانوں کے درمیان اسلام اگر حقیقی شکل میں زندہ ہو تو اسی کے ساتھ دوسری تمام چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ ہو جائیں گی۔ اسلام کا قیام اپنے آپ دوسری چیزوں کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسلامی تاریخ کے دور اول میں ایسا ہی پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام اپنی حقیقی صورت میں زندہ نہیں۔ اس لیے دوسری چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ نظر نہیں آتیں ـــــ اسلام شاہ کلید (Master key) ہے، دینی امور کے لیے بھی، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے دنیوی امور کے لیے بھی۔

نازک مسئلہ

خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان پر کچھ شورش پسند مسلمانوں نے قاتلانہ حملہ کیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو انھیں شہید کر ڈالا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ آپ کی مدت خلافت ۱۲ سال ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ اس وقت حج کی ادائگی کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جارہی تھیں۔ وہ مقام سرف تک پہونچی تھیں کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ راستہ ہی سے مکہ کی طرف واپس روانہ ہوگئیں۔ مکہ پہونچیں تو ان کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپ کی سواری کے گرد جمع ہوگئے۔ حضرت عائشہ نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ خدا کی قسم، عثمان مظلوم مارے گئے۔ خدا کی قسم، میں ان کے خون کا بدلہ لوں گی (قُتل واللہ عثمان مظلوماً واللہ لأطلبن بدمہ، العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۷۲۱)

حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو کر مکہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ مکہ اور اطراف مکہ میں منادی کر دی گئی کہ ام المومنین عائشہ بصرہ جارہی ہیں۔ جو شخص اسلام کا حامی ہو اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہے، وہ قافلہ میں شریک ہو جائے۔

مکہ سے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا لشکر روانہ ہوا۔ باہر نکلے تو اطراف وجوانب سے لوگ جوق در جوق آکر قافلہ میں شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی اس لشکر کی تعداد تین ہزار ہوگئی۔

یہ لوگ چلتے ہوئے ایک مقام پر پہونچے جہاں ایک چشمہ تھا۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کو دیکھ کر وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہ نے یہ منظر دیکھ کر چشمہ کا نام پوچھا۔ بتایا گیا کہ یہ موأب کا چشمہ ہے۔ یہ نام سنتے ہی حضرت عائشہ نے کہا کہ مجھ کو لوٹاؤ۔

لوگوں نے سبب دریافت کیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی بیویاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ آپ نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم میں سے کس کو دیکھ کر موأب کے کتے بھونکیں گے یہ کہہ کر حضرت عائشہ نے اونٹ کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اونٹ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ ایک دن اور ایک رات وہیں مقیم رہیں۔ تمام لشکر بھی آپ کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہا۔

اس کے بعد کچھ لوگوں نے منصوبہ بنا کر اچانک شور کر دیا کہ جلدی کرو، جلدی کرو۔ علی تم تک پہنچ گئے ۔ یہ سن کر تمام لشکر نہایت عجلت کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ کے اونٹ کو بھی تیزی سے اٹھا کر بھیڑ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت عائشہ کے سوال پر انھیں بتایا گیا کہ کسی نے غلطی سے آپ کو اس چشمہ کا نام مواُب بتا دیا تھا۔ درحقیقت یہ چشمہ وہ چشمہ نہیں ہے۔ اور نہ مواُب کا چشمہ اس راستہ میں آتا ہے۔

یہ لوگ چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ بصرہ کے قریب پہونچ گئے جہاں خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب مقیم تھے۔ یہیں وہ جنگ پیش آئی جو اسلامی تاریخ میں جنگ جمل (۳۶ ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں خود مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ ایک گروہ کے قائد حضرت علی تھے جن کے ہاتھ پر حضرت عثمان کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی تھی۔ دوسری طرف حضرت عائشہ تھیں جو خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر وہاں پہنچی تھیں، کیوں کہ انھیں یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ حضرت علی خونِ عثمان کے معاملہ کو دبا رہے ہیں اور قاتلینِ عثمان سے انتقام لینے پر تیار نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑ گیا۔

جنگ جمل کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ بوقت مقابلہ حضرت عائشہ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تقریباً ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف حضرت علی کی فوج کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت عائشہ کے لشکر میں سے ۹ ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے۔ اور حضرت علی کی فوج میں سے ایک ہزار ستر آدمی کام آئے۔ گویا مجموعی طور پر تقریباً دس ہزار مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ عوامی تحریک اٹھانا جتنا آسان ہے، اس کو کنٹرول کرنا اتنا آسان نہیں۔ خواہ اس کی قیادت ام المومنین جیسی مقدس ہستی کیوں نہ کر رہی ہو۔ جو لوگ جذباتی اشو پر پرجوش تقریریں کر کے بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے ہیں اور عوام کی بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ آغاز سے زیادہ انجام پر غور کریں۔

اس قسم کی عوامی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں لیڈر نمبر ا پر ہوتا ہے

اور عوام نمبر ۲ پر۔ مگر جب جوش و جذبہ میں بھرے ہوئے عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو چلی ہو تو اس کے بعد صورت حال یکسر بدل جاتی ہے۔ اب عوام کو نمبر ا کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور لیڈر نمبر ۲ کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اب تحریک کی رہنمائی کے لیے عملی طور پر صرف عوام کا جوش رہ جاتا ہے نہ کہ رہنماؤں کا ہوش۔

ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے عوامی کام کو بہت زیادہ سوچ سمجھ کر شروع کیا جائے۔ کیوں کہ اس قسم کے کام کو شروع کرنا ہمیشہ انتہائی آسان ہوتا ہے، مگر اس کو نیک انجام تک پہونچانا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ حضرت عائشہ اگر حج کے بعد گھر (مدینہ) واپس جانے کا فیصلہ کرتیں تو یہ ان کے لیے بالکل سادہ اور آسان سی بات ہوتی۔ مگر حواب کے چشمہ پر جب کہ وہ بھیڑ کے درمیان تھیں تو یہی سادہ سی بات ان کے لیے ناممکن کے درجہ میں مشکل ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہنگامی مواقع پر بیچ سے رائے بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں میں بیچ سے رائے بدلنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دریا کو چھلانگ کے ذریعہ پار کرنا چاہے اور جب وہ اس کے درمیان میں پہونچے تو یہ فیصلہ کرے کہ مزید تیاری کے لیے اس کو پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔

قیامت میں ادائگی

عن ابی هریرة ، ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : اتدرون ما المفلس ؟ قالوا المفلس فینا من لا درهم له ولا متاع ۔ فقال : ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیامة بصلاة وصیام وزکاة ویاتی قد شتم هذا ، وقذف هذا ، واکل مال هذا ، وسفك دم هذا ، وضرب هذا ، فیعطی هذا من حسناته ، وهذا من حسناته ، فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاهم فطرحت علیه ، ثم طرح فی النار (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے ۔ لوگوں نے کہا کہ ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان ۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز اور روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے ۔ اس کے ساتھ وہ اس حال میں آئے کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی کو الزام لگایا ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو۔ کسی کو مارا ہو۔ پس اس کی نیکیاں اس کو اور اس کو دے دی جائیں ۔ پھر اگر حساب برابر ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو لوگوں کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے ۔ اور پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے ۔

یہ حدیث پڑھ کر ان لوگوں کے اوپر کپکپی طاری ہونی چاہیے جو دوسروں کا حق مارتے ہیں. کیوں کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دوسروں کے مال پر مال دار بننے والے قیامت میں بالکل مفلس ہو جائیں گے۔ جو لوگ دوسروں کے گھر پر قبضہ کرکے گھر والے بنے ہوئے ہوں، وہ آخرت میں اس طرح بے گھر ہو جائیں گے کہ درخت کے پتوں کا سایہ بھی نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے سکیں ۔

دوسری طرف اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے جن کا حق مارا گیا ہے ۔ اس دنیا میں جو چیز انھیں گالی، الزام تراشی، غصب، تشدد اور جارحیت کے روپ میں مل رہی ہے ۔ قیامت کے دن اس کی ادائگی ایسے قیمتی سکوں کی صورت میں ہوگی جس سے آخرت کی دنیا کی ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے ۔ دنیا کے مفلس ، اس دن آخرت کے دولت مند کی صورت میں ظاہر ہوں گے ۔

اجنبی دین

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ دوبارہ وہ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ تھا۔ تو مبارک ہو اجنبیوں کے لیے (بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء، رواہ مسلم) ابتدائی زمانہ میں اسلام کس طرح اجنبی تھا۔ اس کی مثالیں قرآن و حدیث سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کے مشرکین کے سامنے یہ دعوت پیش کی کہ ایک اللہ کو اپنا الٰہ بناؤ اور دوسرے الٰہوں کو چھوڑ دو تو انھوں نے کہا کہ کیا اس پیغمبر نے کئی الٰہ کی جگہ ایک الٰہ کر دیا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے (ص ۵) مکہ کے مشرکین اللہ کو مانتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے بزرگوں کو بھی اونچا درجہ دے رکھا تھا۔ ان کے بت بنا کر وہ ان کو پوجتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے جب ایک اللہ کے سوا ہر ایک کی بڑائی کا انکار کیا تو یہ بات انھیں اجنبی اور نامانوس معلوم ہونے لگی۔

اسی طرح ایک مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں عرب کے لوگ میراث میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب قرآن میں یہ حکم آیا کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے (للذکر مثل حظ الانثیین) تو انھیں اپنے ذہن کے اعتبار سے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا عورت اپنے باپ کے ترکہ میں آدھی کی حقدار ہے، حالاں کہ وہ نہ گھوڑے کی سواری کرتی ہے اور نہ دشمن سے لڑسکتی ہے (یارسول اللہ نعطی الجاریۃ نصف ماترك ابوا ولیست ترکب الفرس ولا تقاتل القوم، تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۵۸)

حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، دین آج دوبارہ اسی اجنبی حالت کو پہنچ چکا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا موجودہ مسلمانوں میں آج خالص توحید اجنبی چیز بن چکی ہے۔ وہ صرف اس توحید کو جانتے ہیں جس میں اللہ کی عظمت کے ساتھ ان کے اپنے بڑوں کو بھی شریک عظمت کیا گیا ہو۔ وہ صرف اس دین سے مانوس ہیں جس میں ان کے بزرگوں کو بھی اسی طرح تنقید سے بالاتر رکھا گیا ہو جس طرح پیغمبر خدا تنقید سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح شریعت کے نام سے وہ صرف اپنی خواہشوں کی شریعت کو جانتے ہیں۔ وہ شریعت جو ان کی خواہشوں پر روک لگائے۔ مثلاً سنت کے طریقہ پر طلاق دینا، عورتوں کو پورا حصہ ادا کرنا، تو ایسی شریعت ان کی نظر میں بالکل اجنبی ہے۔

بے فائدہ معرکہ آرائی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم آغازِ نبوت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ وہاں مقدس کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ روزانہ عبادت کے لیے کعبہ میں جاتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ تنہا یا اپنے ساتھیوں کو لے کر بتوں کو نکالیں اور ان کو توڑ کر پھینک دیں۔ آپ وقتی طور پر ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن اگر آپ ایسا کرتے تو یقینی تھا کہ مکہ کے مشرکوں سے بے نتیجہ ٹکراؤ ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ لوگ اگلے ہی دن دوسرے بتوں کو لاکر وہاں رکھ دیتے اور مسلمان انھیں روک نہ پاتے۔ مگر ہجرت کے بعد جب مکہ فتح ہو گیا اور مکہ میں آپ کا اقتدار قائم ہو گیا تو آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام بتوں کو وہاں سے نکال کر پھینک دیا اور کعبہ کو مقدس عبادت گاہ کی حیثیت سے دوبارہ قائم کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام کا طریقہ نتیجہ رخی (Result-oriented) طریقہ ہے۔ آپ کا طریقہ یہ ہے کہ صرف اس وقت اقدام کیا جائے جب کہ اقدام کو نتیجہ خیز بنانے کا امکان پیدا ہو چکا ہو۔ ایسا اقدام ہرگز نہ کیا جائے جو صرف بے فائدہ ہنگامہ آرائی کر کے ختم ہو جانے والا ہو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سیرتِ رسول کے اس پہلو سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام کارروائیاں اس طریقِ رسول کے سراسر خلاف ہیں۔ ۱۸۳۱ میں پنجاب کے رنجیت سنگھ کے خلاف اٹھنے والے شہیدوں سے لے کر ۱۹۸۸ میں اجودھیا کی بابری مسجد کے لیے دھوم مچانے والے غازیوں تک سب جو کچھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کو ایک لفظ میں، بے فائدہ معرکہ آرائی کہا جا سکتا ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں کے تمام اقدامات یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی بربادی پر ختم ہوئے۔ وہ ان کو کوئی مثبت فائدہ نہ دے سکے۔

اس قسم کے ہنگامے یقینی طور پر پیغمبر کی سنت کے مطابق نہیں۔ وہ جھوٹی ہنگامہ بازی اور بے معنی معرکہ آرائی کے خانہ میں جانے والی کارروائیاں ہیں نہ کہ سنتِ رسول کی سچی پیروی کے خانہ میں لکھا جانے والا عمل۔

ابوطالب

مکہ میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان کیا تو مردوں میں سب سے پہلے جو شخص ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابی طالب تھے۔ جن کی عمر اس وقت تقریباً ۱۰ سال تھی۔ اس وقت مکہ کے حالات اتنے سخت تھے کہ نماز بھی آپ کو چھپ کر پڑھنی پڑتی تھی۔ چنانچہ آپ حضرت علی کے ساتھ مکہ کے باہر پہاڑوں کی طرف چلے جاتے اور وہاں لوگوں کی نظروں سے دور ہو کر نماز ادا کرتے۔ ایک روز مکہ کی گھاٹی میں آپ حضرت علی کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے کہ اتفاقاً ابوطالب وہاں آگیے۔ نماز کا طریقہ انھیں بالکل اجنبی معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، یہ کون سا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کو بتایا کہ اللہ نے مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے اور ۔۔ عبادت کا وہ طریقہ بتایا ہے جو اس کو پسند ہے۔ آپ بھی اس دین کو قبول کرلیں۔ ابوطالب نے جواب دیا کہ اے میرے بھتیجے، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو اور جس پر وہ تھے اسے چھوڑ دوں (انی لا استطیع ان افارق دین آبائی وما کانوا علیہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی کو انھوں نے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے اس بابت دریافت کیا کہ یہ کون سا دین ہے جس پر میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ حضرت علی نے کہا کہ اے میرے ابا میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں اور جو کچھ وہ لائے ہیں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ میں نے نماز پڑھی ہے اور ان کی پیروی کی ہے۔ اس کے جواب میں ابوطالب نے اپنے بیٹے سے کہا: انھوں نے تم کو بھلائی کے سوا کسی اور چیز کی دعوت نہیں دی ہے۔ تم اس پر جمے رہو (اما انہ لم یدعك الا الی خیر فالزمہ) سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۶۵

اپنے آبائی بزرگوں کو ماننے کے لیے ابوطالب کو کوئی نیا فیصلہ نہیں کرنا تھا۔ مگر اپنے معاصر پیغمبر کو ماننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ سچائی کو از سر نو دریافت کریں۔ اور بلاشبہ اس دنیا میں پہلا کام سب سے زیادہ آسان کام ہے اور دوسرا کام سب سے زیادہ مشکل کام۔ "ابوطالب" ایک اعتبار سے ایک شخص کا نام ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک کردار کا نام ہے۔ یہ کردار، کسی نہ کسی شکل میں، ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے۔

بے خبری

نومبر ۱۹۸۸ میں جزیرہ مالدیپ میں ایک واقعہ ہوا۔ مالدیپ کا ایک تاجر جس کا نام عبداللہ لطفی ہے، اس نے پڑوسی ملک سری لنکا میں اپنا خفیہ دفتر قائم کیا۔ وہاں اس نے دہشت پسند نوجوانوں کا ایک دستہ تیار کیا اور ان کو ہتھیار دے کر کشتیوں کے ذریعہ مالدیپ (Male) کے ساحل پر ۳ نومبر ۱۹۸۸ کو اتار دیا۔ اس کا مقصد مالدیپ میں "فوجی انقلاب" لانا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ اور اس کی دیواروں کو گولی کا نشانہ بنانا شروع کیا۔

مالدیپ بحر ہند کا ایک بہت ہی چھوٹا ملک ہے۔ اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ عبداللہ لطفی کا خیال تھا کہ وہ غیر مسلح مالدیپ کو نہایت آسانی سے فتح کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرسکتا ہے۔ مگر اس کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مالدیپ کی جیل میں ہے۔

مالدیپ کے حالات بظاہر لطفی کے موافق تھے۔ اس کے باوجود اس کو اپنے مقصد میں ناکامی کیوں ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لطفی معاملہ کے ایک پہلو کو جانتا تھا، مگر وہ اس کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ مالدیپ کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ مگر وہ اس دوسری حقیقت سے بے خبر رہا کہ جدید مواصلات کے اس دور میں مالدیپ نہایت آسانی سے باہر کے ملک سے فوج منگا سکتا ہے جو اس کا بچاؤ کرسکے۔

مالدیپ کا ٹیلیفونی نظام نہایت عمدہ ہے۔ وہ سٹلائٹ کے ذریعہ کسی بھی ملک سے فوری طور پر ربط قائم کرسکتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی لطفی نے مالدیپ کے صدارتی محل پر حملہ کیا، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم نے ہندستان کی حکومت سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے نئی دہلی کو صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ فوراً ان کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیج دیں۔

ہندستان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس حادثہ نے ہندستان کو یہ موقع فراہم کردیا کہ وہ بحر ہند میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرسکے۔ وہ مالدیپ کے معاملہ میں مداخلت کرکے اس علاقہ میں اپنے آپ کو فوجی نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کرسکے۔ چنانچہ صدر مالدیپ کی درخواست ملنے

کے بعد چھ گھنٹہ کے اندر ہندستانی فوج مالدیپ (Male) کے ہوائی اڈہ پر اتر گئی۔ اس نے چند گھنٹوں کے آپریشن میں لطفی اور اس کے ساتھیوں کو عین اس وقت گرفتار کر لیا جب کہ وہ اپنی سمندری کشتیوں کے ذریعہ سری لنکا کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مامون عبدالقیوم کی حکومت بحال ہو گئی۔

دہلی کے انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے (۳۰ نومبر ۱۹۸۸) نے اس معاملہ کی تفصیلی رپورٹ دی ہے۔ اس نے بجا طور پر لکھا ہے کہ مالدیپ پر حملہ کرنے والے اپنے حملہ میں کامیاب ہو سکتے تھے، اگر انھوں نے احتیاطی تدبیر پر عمل کیا ہوتا۔ اور ٹیلی فون اکسچینج اور ہوائی اڈہ پر قبضہ کر کے ان کو ناقابل استعمال بنا دیتے:

The attackers could have made it if they had taken care to neutralize the telephone exchange and the airport (45).

عبداللہ لطفی کو شاید قدیم صدارتی محل کا علم تھا۔ جس کی حیثیت صرف مقامی قلعہ کی ہوتی تھی۔ اس کو جدید صدارتی محل کا علم نہ تھا جو مواصلات کے سائنسی وسائل کے ذریعہ پورے عالم سے مربوط ہوتا ہے۔ قدیم شاہی محل کے لیے سمندر اور پہاڑ حائل ہو جاتے تھے۔ مگر جدید شاہی محل کی راہ میں کوئی سمندر یا کوئی پہاڑ حائل نہیں۔ وہ خلائی مواصلات کے ذریعہ پیغام رسانی کر سکتا ہے، اور فضائی سواریوں کے ذریعہ اپنے لیے مدد بلا سکتا ہے۔

مالدیپ کا یہ واقعہ علامتی طور پر جدید مسلم تاریخ کی تصویر ہے۔ وہ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے ناکام اقدامات کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بے شمار اقدامات کیے مگر ان کے تمام اقدامات بلا استثنار ناکام رہے ہے۔ اس کی وجہ دوبارہ وہی تھی جو عبداللہ لطفی کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے معاملہ کے ایک پہلو کو جانا مگر وہ معاملہ کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر رہے۔ اور موجودہ دنیا میں جو لوگ اس قسم کی بے خبری کا ثبوت دیں، ان کے اقدامات کے لیے بدترین ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

وضو کی برکت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کیا۔ پھر بہتر طریقہ پر وضو کیا ، اس سے اس کی خطائیں جاتی رہتی ہیں۔ حتی کہ ناخن کے نیچے کی بھی (من توضأ فاحسن الوضوءَ خرجت خطایاہُ حتی تخرج من تحتِ اظفارہ ، رواہ مسلم)

بہتر وضو سے کیا مراد ہے ، اس کی وضاحت دوسری روایتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی وضو کرے ۔ پھر وہ اس کو پوری طرح کرے ۔ اس کے بعد وہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ، اس کا کوئی شریک نہیں ۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں ، وہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے (ما منکم من احد یتوضأ فیبلغ الوضوء ثم قال : اشھدُ ان لَّآ الٰہ الا اللّٰہُ وَحْدَہ لا شریک لہ واشھدُ ان محمداً عبدُہ ورسولُہ الا فُتِحت لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ یدخلُ من ایّھا شاءَ ، رواہ مسلم)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرے تو اس کے بعد یہ دعا پڑھے کہ خدایا مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا ۔ اور مجھ کو پاک صاف لوگوں میں سے بنا (اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین ، الترمذی) ایک اور روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اس کے بعد آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا مجھے خطاؤں سے پاک کر دے جس طرح سفید کپڑا دھو کر میل سے پاک کر دیا جاتا ہے (اللّٰھم نقنی من الخطایا کما ینقی الثوب الابیضُ من الدنس)

مختلف روایتوں میں یہ بات مختلف انداز سے بتائی گئی ہے کہ وضو سے آدمی کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ وضو اس کے گناہوں کے میل کو دھوتا رہتا ہے ، یہاں تک کہ وہ اپنے

رب کے پاس اس حال میں پہنچتا ہے کہ وہ بالکل پاک صاف ہوتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانی سے ہاتھ پاؤں کو دھونا اپنے آپ آدمی کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ خطا اور گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قلبی اعمال ہیں۔ ان کا تعلق آدمی کی نیت اور ارادہ سے ہے۔ اس لیے وہ اسی وقت دھل سکتے ہیں جب کہ آدمی کا قلب دھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں اس انسان کے لیے ہیں جس کا جسمانی وضو اس کے لیے روحانی وضو بن جائے۔ جو وضو کا عمل اس طرح کرے کہ اسی کے ساتھ اس کا قلب اور ذہن بھی دھلتا چلا جائے۔ جس کی نفسیات اس کے وضو میں شامل ہو گئی ہو۔

ایک شخص جس کے دل میں اللہ کا خوف اور آخرت کا فکر سمایا ہوا ہو، وہ جب وضو کرتا ہے تو اس کے اندرونی احساسات کے اثر سے اس کا وضو کا عمل ایک ربانی عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مادی عمل اس کی روحانی کیفیات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ وضو کے ظاہری عمل میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا ذہن دعا اور ذکر کے باطنی عمل میں۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا ــــ جس ہاتھ اور پاؤں اور چہرے کو آپ نے آج کے دن پانی سے دھویا ہے، اس کو کل کے دن اپنی رحمت سے دھو دیجئے۔ جس جسم کو آپ نے دنیا میں مادی اعتبار سے پاک کیا ہے، اس کو قیامت کے دن اپنی رحمت اور مغفرت کے نورانی غسل سے پاک کر دیجئے۔

جب ظاہری وضو کے ساتھ یہ باطنی وضو مل جائے تو یہی وہ وضو ہے جس کے بعد آدمی کے لیے جنت کے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جس دروازہ سے چاہو داخل ہو جاؤ۔

جسمانی وضو جسم کی پاکی ہے، اور روحانی وضو روح کی پاکی۔

مُردہ سے زندہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہونچے تو اللہ تعالیٰ نے ارض مقدس (شام و فلسطین) کو ان کے لیے لکھ دیا۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم لوگ اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ۔ تم کو خدا کی مدد ملے گی اور تم وہاں کے لوگوں پر غالب آجاؤ گے (المائدہ ۲۱)

وہاں جو قوم اس وقت آباد تھی، وہ بظاہر ایک طاقتور قوم تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل ان کا نام سن کر ڈر گئے۔ ان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کی ہدایت کے باوجود ان کے خلاف اقدام کے لیے تیار نہ ہوئے (المائدہ ۲۲) بائبل میں ہے کہ: "تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی۔ اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے۔ اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے۔ اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہائے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے۔ یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اُس ملک میں لے جاکر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں" (گنتی ۱۴: ۱-۴)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس سال (۱۴۰۰-۱۴۴۰ ق م) تک فاران اور شرقِ اُردن کے درمیان صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں جو ۲۰ سال سے نیچے ہیں، صرف وہی زندہ بچیں گے۔ ۲۰ سال سے اوپر کی عمر کے تمام لوگ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۴۰ سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مرکر ختم ہو گئے۔ اس دوران ان کے بچے نئے صحرائی حالات میں پرورش پاکر نئی طاقت کے ساتھ اٹھے۔ اس نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں ارضِ مقدس کو فتح کیا۔

بنی اسرائیل نے ابتداءً حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ان کے مقابلہ میں ہم ہار جائیں گے۔ اور پھر "ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے"۔ مگر یہی بچے بعد کو بڑے ہوکر شام و فلسطین کے علاقہ میں داخل ہو گئے اور وہاں کے حکمراں (عمالقہ) سے لڑکر

اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

بنی اسرائیل کے بچوں میں یہ طاقت کیسے پیدا ہوئی۔ وہ بے حوصلہ سے باحوصلہ کیونکر بن گیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے باپ دادا کے برعکس، لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا۔ بچوں کے باپ جن سخت حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے، انھیں سخت حالات کے اندر داخل ہونے میں ان بچوں کے لیے نئی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں زندگی گزارنا بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر موافق حالات ہمیشہ جمود پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام اعلیٰ خصوصیتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کرکے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گذارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مردہ قوم بن گیے۔ مگر مصر سے خروج کے بعد ان کو غیر آباد صحرا میں زندگی گزارنی پڑی۔ یہ صحرائی زندگی ان کے لیے سراپا چیلنج تھی۔ ان پر مشقت حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہونچے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے انسان تھے۔

بنی اسرائیل کی یہ نسل اخلاق و کردار کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھی۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، جفاکشی، حوصلہ اور حقیقت پسندی جیسی خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ اور بلاشبہ یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کے افراد کو زندہ افراد بناتے ہیں۔ کوئی قوم اگر طول امد (الحدید ۱۶) کے نتیجہ میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کو غیر معمولی حالات میں ڈالا جائے۔ اور اس کو ایسے شدید عمل سے گزارا جائے جس کے دوران اس کی سابقہ غیر مطلوب شخصیت ختم ہو اور نئی مطلوب شخصیت ابھر آئے۔

اسلوب عصر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جو رسول بھی بھیجا اس کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کردے (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم ، ابراہیم ۴)

پیغمبر، اور پیغمبر کے بعد اس کی تبعیت میں داعی، لسانِ قوم میں کلام کرتا ہے۔ اس اندازِ کلام کی اہمیت دعوت کے اعتبار سے بھی ہے اور تربیت کے اعتبار سے بھی۔ جو لوگ دین کے دائرہ سے باہر ہیں، ان کے لیے لسانِ عصر میں کلام کرنے کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ وہ اس کو پوری طرح سمجھیں اور ان کے اوپر خدا کے دین کی حجت تمام ہو سکے۔ اگر لسانِ غیر قوم یا لسانِ غیر عصر میں کلام کیا جائے تو دعوت پہونچانے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر حجت تمام کر دی گئی ہے۔

جو لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہیں، ان کے لیے لسانِ قوم یا زمانہ میں رائج اسلوب کی اہمیت تربیت کے اعتبار سے ہے۔ کوئی بات جب تک مخاطب کی اپنی زبان یا اس کے اپنے قابلِ فہم اسلوب میں نہ کہی جائے وہ اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی، وہ اس کے اندر شعوری انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الید العلیا خیر من الید السفلیٰ (اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے) اگر آپ اس حدیث کا صرف ترجمہ کر دیں یا روایتی طور پر صرف یہ بتادیں کہ صدقہ دینے والا ہاتھ صدقہ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے تو وہ اتنی شدت کے ساتھ سننے والے کے ذہن میں جگہ نہیں بنا سکتا جیسا کہ فی الواقع اس سے مطلوب ہے۔

لیکن اگر آپ اس کو جدید زبان میں اس طرح کہیے کہ اس حدیث میں دینے والے گروہ (Giver group) اور لینے والے گروہ (Taker group) کا فرق بتایا گیا ہے، تو آج کا انسان فوراً اس کی معنوی اہمیت کو سمجھ لے گا۔ کیوں کہ یہ آج کی زبان ہے، اور کسی بات کو جب آج کی زبان میں کہہ دیا جائے تو وہ آج کے ذہن میں پوری طرح اتر جاتی ہے۔ وہ اس کے شعوری فکر کا جزء بن کر اس کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

فخر نہیں

۵ مئی ۱۹۸۹ کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے دہلی کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب نے خطبہ سے پہلے تقریباً ۲۰ منٹ تک ایک پرجوش تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم ایک اللہ کو ماننے والے ہیں

یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی نہایت صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ آج کل کے مسلمان، خاص طور پر ان کا رہنما طبقہ، تقریباً سب کا سب اسی نفسیات میں مبتلا ہے۔ وہ اسلام کو اپنے لیے فخر کی چیز سمجھتا ہے۔ یہ بلاشبہ گمراہی ہے۔ بلکہ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کو خدا کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان انتہائی بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر وہ ان کی بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتیں۔

مذکورہ جملہ میں کیا غلطی ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کچھ لوگ چل رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص کی نظر اچانک قریب کی ایک جھاڑی پر پڑتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہاں ایک زندہ شیر کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے کیا الفاظ نکلیں گے۔ کیا وہ کہے گا کہ :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم اس وقت ایک زندہ شیر کے سامنے ہیں

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شیر کو دیکھ کر آدمی کے اوپر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ اور جو چیز ہیبت طاری کرے، اس کے بارہ میں اس کے اندر عجز کا احساس جاگے گا نہ کہ فخر کا احساس۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اللہ کا ہے جو شیر کا خالق ہے۔ اللہ ایک ایسی ہستی ہے جو سب کے اوپر ہے، جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایسی ایک ہستی کا یقین آدمی کے اندر عجز اور تواضع کا جذبہ پیدا کرے گا نہ کہ فخر اور ۔ کا جذبہ۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا تعارف ہے۔ اللہ کی ہستی کیا ہے، سارا قرآن اس کے بیان سے بھرا ہوا ہے۔

یہاں اس سلسلہ میں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی۔ اور نہ نیند آتی۔ زمین میں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہو سکتا مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے، وہی سب سے بڑا ہے (البقرہ ۲۵۵)

تم لوگ اللہ سے ڈرو اور آپس کے معاملات درست رکھو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (الانفال ۱-۲)

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں (الزمر ۶۷)

اس طرح کی کتنی ہی آیتیں قرآن میں شروع سے آخر تک موجود ہیں جو اللہ کا تعارف ایسے انداز میں کراتی ہیں کہ ان کو پڑھ کر آدمی لرز اٹھے۔ اللہ کے عظمت وجلال سے اس پر ہیبت طاری ہو جائے۔ قرآن میں یہ بات تو کثرت سے مذکور ہے کہ اللہ پر ایمان والے اللہ کی یاد سے کانپ اٹھتے ہیں، اس کے ذکر سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بات سارے قرآن میں کہیں نہیں کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ پر فخر ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے ماننے والوں نے ابھی خدا کو نہیں مانا۔ اگر وہ خدا کو ماننے والے ہوتے تو خدا کا تصور ان کے اندر عجز اور تواضع کی کیفیت پیدا کرتا۔ خدا کا نام لیتے ہوئے ان کی زبان کانپ اٹھتی، نہ کہ خدا کا نام لے کر وہ فخر و ناز کی باتیں کرنے لگیں۔

کہاں سے کہاں

مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا ہندستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ امریکہ میں کلیولینڈ (Cleveland) کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۸۹ کو اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۱۳) میں ان کے حالات درج کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مسٹر بہوگنا نے اپنی زندگی میں غیر معمولی سیاسی شہرت حاصل کی، اور آخر میں تقریباً تنہائی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تمام دوست ایک کے بعد ایک انھیں چھوڑتے چلے گیے۔ ان کے سیاسی شریک کار ان سے جدا ہوگیے۔ اور، ۴۵ سالہ سیاسی زندگی کے آخر میں، انھوں نے اپنے آپ کو تنہائی کے بیابان میں پایا:

> One by one, his friends left him, his political allies deserted him and, at the end of a political career spanning 45 years, he found himself in near wilderness (p. 13).

تبصرہ نگار نے یہاں مسٹر بہوگنا کا جو انجام بتایا ہے، وہی انجام وسیع تر پیمانہ پر ہر شخص کا ہونے والا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی شاندار "۴۵ سالہ" زندگی گزار رہا ہے، صرف اس لیے تاکہ اچانک اس کی شاندار زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور وہ موت کے دروازہ سے گزار کر خدا کی عدالت میں پہونچا دیا جائے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو "۴۵ سال" ملتے ہیں۔ یہ مدت اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنا شاندار سیاسی کیریر بنائے۔ وہ صرف اس لیے ہے کہ آدمی آنے والے مستقبل کی ابتدائی تیاری کرے۔ جو لوگ اپنے "۴۵ سال" کو تیاری کا ابتدائی وقفہ سمجھیں اور اس کے لیے اسے استعمال کریں وہ آنے والے مستقل مرحلہ میں کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے "۴۵ سال" ہی کو سب کچھ سمجھ لیں، ان کا حال اس انسان کا سا ہوگا جو بیج ڈالنے سے پہلے پھل حاصل کرنا چاہے۔ ایسے شخص کے لیے آنے والی دنیا میں ابدی ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

کیسا عجیب ہے انسان کا شاندار حال، اور کیسا غیر شاندار ہے اس کا آخری مستقبل۔

صغیر احمد اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۶۹ میں وہ لاس اینجلیس کی ایک بڑی فرم میں ۲۵ اسٹور کے منیجر تھے۔ ان کو اپنے امریکی افسر کے ساتھ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ جنرل منیجر تقریباً ۲۵ سال کا تھا۔ اور ہوٹل کے زمانہ قیام میں شراب اور عیاشی کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ صغیر اسلم صاحب ایک بااصول آدمی تھے۔ ان کو اس قسم کی باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر ایک سفر میں وہ جنرل منیجر کے کمرہ میں گئے اور دروازہ بند کرکے اس سے نہایت سخت گفت گو کی ——— تم عیاش ہو، تم بالکل نکمے ہو، تم بزنس کرنا نہیں جانتے، وغیرہ۔

صغیر اسلم صاحب جنرل منیجر کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد جب باہر جانے لگے تو جنرل منیجر نے ان کو پکڑ کر واپس بلایا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ ہاں، تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ اس نے کہا کہ پھر تمہارے اندر یہ جرأت (Courage) کہاں سے آئی کہ تم مجھ کو اس طرح خطاب کرو۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ تم یہی تو کر سکتے ہو کہ مجھ کو فائر (برخاست) کر دو، تو میں اس سے پہلے کمپنی سے اپنا استعفا تیار کر چکا ہوں۔ اس نے کہا کہ فائر کرنا تو درکنار، میں تم کو چھوڑوں گا بھی نہیں، تم ہماری کمپنی کے لیے بہت قیمتی ہو۔

اس شخص کا نام جیب اسٹوارٹ میگروڈر (Jeb Stuart Magruder) تھا۔ میں نے صغیر اسلم صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس کے ساتھ اتنی سخت گفتگو کی، پھر بھی وہ آپ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا، اس کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میں کمپنی کے لیے ایک مفید شخص ہوں۔ اپنے ذاتی جذبات پر اس نے کمپنی کے مفاد کو غالب رکھا۔

مذکورہ امریکی نے ذاتی رنجش کے باوجود صغیر اسلم صاحب کی قدردانی کی۔ یہ اعتراف اور یہ بلند حوصلگی جو امریکہ کے ایک شرابی میں پائی جاتی ہے، وہ آج ہماری بڑی بڑی دینی شخصیتوں میں بھی موجود نہیں۔ ذاتی رنجش کے بعد کسی کی صلاحیت کا اعتراف بلاشبہ اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے، مگر ہمارے تمام اکابر اس اخلاقی قدر سے مکمل طور پر خالی ہیں۔

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ایک پاؤں کسی حادثہ میں ضائع ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اس نے مصنوعی پاؤں لگا رکھا تھا۔ یہ نوجوان ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا، مگر پاؤں کا کھونا اس کے لیے ایک ناقابل تلافی محرومی بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ

انسان کا جسم ایک بے حد قیمتی مشین ہے۔ مگر اس مشین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی کارخانہ نہیں جہاں اس زندہ مشین کے اسپیر پارٹ (Spare Parts) تیار ہوتے ہوں۔ انسان کے لیے اپنی کمیوں کی تلافی کی صورت صرف ایک ہے ـــــــ وہ اپنے خالق کو راضی کرے تاکہ بعد کو آنے والی دنیا میں وہ اس کو ایک ابدی اور بے نقص جسم عطا کر دے۔

ایک تعلیم یافتہ عیسائی نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مگر بعض سوالات میرے ذہن کو الجھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون سے سوالات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں غلامی کا مسئلہ، پیغمبر کا کئی شادیاں کرنا، حجر اسود کو چومنا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اسلام یا کسی بھی نظام کا مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں۔ ہر مذہب یا ہر نظام میں کچھ بنیادی چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ فروعی چیزیں۔ ایک سنجیدہ متلاشی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ پہلے زیر مطالعہ مذہب یا نظام کی بنیادی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے جب ان کے بارہ میں پوری واقفیت حاصل ہو جائے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ فروعی یا ضمنی باتوں کو سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ امریکہ کے نظام تہذیب کو سمجھنا چاہیں تو اس کا آغاز آپ یہاں سے نہیں کریں گے کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن اپنی جیب میں ہمیشہ سونے کی نعل کیوں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ درست نہ ہوگا۔ اس کے برعکس آپ یہ کریں گے کہ پہلے امریکہ کی تاریخ، اس کے علوم، اس کے قانون اور اس کے صنعتی اور تجارتی طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہی طریقہ علمی طریقہ ہے اور یہی طریقہ آپ کو اسلام کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔

یہاں بہت سے نومسلم امریکیوں سے ملاقات ہوئی۔ مثلاً ۳۹ سالہ پال یوسف جیول (Paul Yusuf Jewell) جو سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سراج وہاج جو سیاہ فام نسل میں پیدا ہوئے اور پھر اسلام قبول کیا۔ کانفرنس میں بھی بڑی تعداد میں نومسلم امریکی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض نے وہاں تقریریں بھی کیں۔

ایک خاص بات یہ محسوس ہوئی کہ نومسلم امریکیوں میں، دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں، زیادہ ایمانی جوش اور زیادہ جذبۂ عمل پایا جاتا ہے۔ لوگوں کے ذریعہ یہاں کے جو حالات معلوم

ہوئے، ان سے اندازہ ہوا کہ یہاں کی سیاہ فام نسل میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ پوری طرح بیدار ہو جائے اور وہ سیاہ فام نسل میں اسلام کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی پوری قوم اسلام میں داخل ہو جائے۔

امریکہ میں اظہار خیال اور اشاعت افکار کی مکمل آزادی ہے۔ یہاں وہ منافقت بھی نہیں کہ کاغذ پر کچھ لکھا ہو اور عمل کسی اور چیز پر کیا جاتا ہو۔ مسلمان اگر اس امکان کو استعمال کریں اور یہاں کی سیاہ فام نسل کو اسلام کے حلقہ میں داخل کر لیں تو اس کے بعد امریکہ میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے گا۔

امریکہ میں اس وقت یہودی غلبہ قائم ہے۔ اگر مذکورہ واقعہ رونما ہو سکے تو یہ منحوس غلبہ ختم ہو کر یہاں ایک نیا صحت مند غلبہ شروع ہو جائے گا۔ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکیوں کے خیالات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ یہاں کے سنجیدہ لوگ یہودی غلبہ کو بالکل پسند نہیں کرتے مگر اسلام کے سوا کوئی چیز نہیں جو امریکہ سے اس منحوس غلبہ کو ختم کر سکے۔ یہاں آکر اسلام خود امریکہ کی اپنی ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

پاکستان میں راقم الحروف کی تمام کتابیں چھپ گئی ہیں اور وہاں عام طور پر ملتی ہیں۔ یہاں کے ایک پاکستانی مسلمان نے کراچی سے "ظہور اسلام" حاصل کی تھی اور اس کو پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اس کتاب کے ایک باب (حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار) میں نواسۂ رسول کے خلاف قلم اٹھایا ہے، یہ کہاں تک درست ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ حسین کے عمل کے مقابلہ میں حسن کے عمل کو ترجیح دی ہے، اور وہ بھی بہر حال نواسۂ رسول تھے۔

پھر میں نے کہا کہ حسین اور حسن کا معاملہ امت کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دو رول ماڈل (Role models) رکھ دیئے تھے۔ ایک رول ماڈل (نمونۂ عمل) حسین کا، جس سے امت کو باہمی خوں ریزی کے سوا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ دوسرا رول ماڈل حسن کا، جس سے اسلام اور امت اسلام کو زبردست فائدے

حاصل ہوئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ظہور اسلام)

اب اللہ آپ کا امتحان لے رہا ہے کہ آپ دونوں میں سے کس رول ماڈل کو اپنے لیے اختیار کرتے ہیں۔ حسین کے رول ماڈل میں چونکہ جاہ طلب اور سیاست پسند لوگوں کے لیے گنجائش نکلتی ہے، اس لیے لوگ اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس رول ماڈل کو اپنایا، انھوں نے دوبارہ اسلام کی تاریخ میں بربادی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ جب کہ حسن کا رول ماڈل اپنانے والوں نے ہمیشہ تاریخ میں مثبت اضافے کیے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک صاحب روس کو برا کہہ رہے ہیں اور دوسرے صاحب امریکہ کو۔ میں نے کہا کہ روس اور امریکہ میں داخلی حالات کے اعتبار سے ضرور فرق ہے، مگر جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، دونوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں میں سے کسی کی بھی خارجہ پالیسی اصول کی بنیاد پر قائم نہیں۔ وہ تمام تر استحصال کی بنیاد پر چلائی جارہی ہے۔

مثلاً افغانستان اور فلسطین کے معاملہ کو تقابلی طور پر دیکھئے۔ افغانستان میں روس مقامی کمیونسٹ عناصر کا حامی ہے، اور امریکہ مقامی مسلم مجاہدین کا۔ اس کے برعکس فلسطین میں امریکہ اسرائیل کا حامی اور سرپرست بنا ہوا ہے، اور روس فلسطینی مسلمانوں کی تنظیم کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ گویا افغانستان میں روس امریکی کردار ادا کر رہا ہے اور فلسطین میں امریکہ روسی کردار ادا کرنے میں مشغول ہے۔

اس اعتبار سے جنرل ضیار الحق اور ڈاکٹر نجیب اللہ دونوں کا کیس، باعتبار نوعیت تقریباً یکساں ہے۔ ضیار الحق امریکہ نواز پالیسی پر کاربند تھے، اس لیے وہ امریکہ کے مطلوب شخص بن گیے۔ اس کے برعکس نجیب اللہ روس نواز پالیسی پر عامل ہیں، اس لیے وہ روس کے مطلوب شخص بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ امریکہ ظالم اسرائیل کی حمایت کر کے مسلم دنیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پیدا کیے ہوئے ہے۔ ضیار الحق اسی امریکہ کے حامی بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ضیار الحق کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اکابر اور

کو مجاہد اسلام کا ٹائیٹل عطا کریں۔ دوسری طرف نجیب اللہ اشتراکی روس کے حامی بنتے ہیں تو ان کے حصہ میں یہ بدقسمتی آتی ہے کہ اکابر ملت ان کو غدار کے لقب سے نوازتے ہیں۔

ایک دیندار مسلمان سے پاکستان کے الکشن (نومبر ۱۹۸۸) کے بارہ میں گفتگو ہوئی جس میں اسلامی اتحاد کو شکست دے کر بے نظیر بھٹو نے کامیابی حاصل کی ہے، اور اب وہ کسی مسلم ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم کی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مذکورہ مسلمان نے اس پر اپنے درد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا حادثہ ہے"۔ میں نے کہا کہ ایک لفظی ترمیم کے ساتھ مجھے آپ کے تبصرہ سے اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ ——— سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا سبق ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ترک خلافت کی حمایت میں جو ہنگامہ خیز تحریک چلائی گئی، وہ گویا دیمک زدہ لکڑی پر "ملٹی اسٹوری بلڈنگ" کھڑا کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ عین فطری قانون کے مطابق وہ ناکام ہوگئی۔ اسی طرح پاکستان میں اسلامائزیشن کا ساڑھے گیارہ سالہ فوجی عمل کیا گیا۔ وہ بھی گویا بیج ڈالے بغیر سیاہ وڑے کے ذریعہ فصل کاٹنے کی کوشش تھی جو دوبارہ خود فطری قانون کے تحت بے فائدہ ثابت ہوئی۔

پیغمبرانہ طریقہ تزکیہ اور تدریج کا طریقہ ہے۔ یعنی پہلے ذہن بنایا جائے، اس کے بعد دھیرے دھیرے عملی احکام کا نفاذ کیا جائے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر حالات پیدا کیے بغیر نہ بین اقوامی اسلامی خلافت قائم ہوسکتی اور نہ قومی اسلامی حکومت۔ مگر مسلم رہنماؤں نے یہ اصلی اسلامی سبق نہ پہلے لیا اور نہ اب وہ ایسا سبق لے رہے ہیں۔ جس واقعہ سے سبق کی غذا حاصل کرنا تھا، اس کو وہ ماتم سرائی کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں پر مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ بے قیمت ہے تو وہ ہندستانی مسلمان ہے، مگر امریکہ کے سفر میں مجھ کو جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے بعد اندازہ ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان آج سونے اور چاندی سے بھی زیادہ قیمتی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں مجھے معلوم ہوا کہ جو مسلم قائدین ہندستان میں "مسلمان خطرہ میں" والی سیاست کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ہندستانی مسلمانوں کی لاشوں کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ لوگ امریکہ میں (اور اسی طرح دوسرے دولت مند ملکوں میں) جاتے ہیں اور وہاں مسلمانوں کے اوپر ظلم کی داستانیں بتا کر بہت بڑی بڑی رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ ہندستان کے اور دوسرے ملکوں کے مسلمان جو یہاں کافی دولت کما رہے ہیں، ظلم اور تعصب کی داستانیں سن کر ان کے اندر قومی ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے، اور وہ مختلف طریقوں سے بڑی مقدار میں رقمیں جمع کر کے ان نام نہاد قائدین کو دیدیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قائدین لاشوں کے تاجر ہیں، اگرچہ ناداں لوگ ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔

امریکی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تقریباً ہر آدمی مقروض ہوتا ہے۔ کار، مکان اور اس طرح کی دوسری قیمتی چیزیں عام بینکوں سے سودی قرض لے کر حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ قرض محدود آمدنی والے بھی لیتے ہیں اور زیادہ آمدنی والے بھی۔ محدود آمدنی والوں کے لیے وہ ایک ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ اپنا خرچ بڑھائے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ رقم پس انداز نہیں کر پاتے اور قیمتی چیزیں حاصل کرنے کے لیے انھیں بینکوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ تاہم بزنس والے لوگ جن کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے، وہ بھی تقریباً صد فی صد مکانات قرض پر حاصل کرتے ہیں۔

دکتور کمال کامل عبد الحمید نمر (پیدائش ۱۹۳۷) ایک فلسطینی عرب ہیں۔ وہ تقریباً دس سال سے امریکہ میں ہیں۔ آج کل وہ سودی اکیڈمی (واشنگٹن) میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے امریکی مسلمانوں کے بارہ میں کئی سال تک ریسرچ کی ہے اور اس موضوع پر وسیع معلومات رکھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ کولمبس سے بہت پہلے دسویں صدی عیسوی میں اسپین کے آٹھ مسلمان امریکہ کے جنوبی ساحل پر اتر چکے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ آج تو یہاں بسنے والے عرب خاندان اپنی عربی زبان بھول چکے ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کر لی ہیں۔ مگر ان کو ایک بوڑھی عرب خاتون نے بتایا کہ میرے والد ۱۸۸۵ میں امریکہ آنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا امریکہ میں مسجد ہے۔ کشتی والوں نے بتایا کہ نہیں۔ وہ ایسے کافر ملک میں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور فوراً کشتی سے اتر آئے (خشی أن یھاجر الی بلاد الکفر تلك واسرع بمغادرة القارب علی الفور)

اسی طرح انھوں نے اور بہت سی معلوماتی باتیں بتائیں۔ ۱۸۹۲ میں امریکہ کا پہلا عربی رسالہ جاری ہوا جس کا نام "کوکب امریکا" تھا۔ نارتھ ڈاکوٹا کے شہر روس (Russ) میں یہاں کا پہلا جمعہ ۱۹۰۰ میں قائم ہوا۔ مشی گان کے شہر ہائیلینڈ پارک میں ۱۹۱۹ میں پہلی باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی۔ مگر افسوس کہ اب وہ چرچ ہے (وھو الآن مع الاسف كنيسة) اس وقت امریکہ میں ۴۰۰ سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں ہیں۔ گھروں کی سیکڑوں مسجدیں اس کے علاوہ ہیں۔

انھوں نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ ۱۸۵۶ میں امریکہ نے عرب سے ۳۳ اونٹ خریدے تھے جو کشتی کے ذریعہ امریکہ لائے گیے تاکہ یہاں کے جنوبی علاقہ میں ان سے باربرداری کا کام لیا جا سکے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ خود عرب ممالک امریکہ سے کار اور ہوائی جہاز خرید رہے ہیں۔

ان کے بیان کے مطابق، عربوں کے مقابلہ میں دوسری قوموں کے لوگ اپنی زبان اور اپنے کلچر کی حفاظت کے معاملہ میں زیادہ سخت ہیں۔ ایک عرب ایک بار ایک یہودی کے گھر گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا لڑکا ایک کونے میں دونوں ہاتھ اوپر کیے ہوئے ایک پاؤں پر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ دریافت کرنے پر یہودی نے بتایا کہ میں اس سے کہتا ہوں کہ گھر کے اندر عبرانی زبان بولو مگر وہ نہیں بولتا۔ اسی کی یہ سزا ہے۔ ایک بوڑھے عرب نے انھیں بتایا کہ میرے لڑکے عرب اخلاق اور عرب زبان کو بھول چکے ہیں۔ اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا اپنا گناہ ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو امریکہ میں لاکر جرم کیا ہے (إنه ذنبي انا۔ لقد اجرمت باحضار ابنائي الى امريكا)

نئی نسل اگرچہ امریکی سماج میں گھل مل گئی ہے۔ مگر قدیم نسل سخت غیر مطمئن ہے۔ ایک بوڑھا عرب جو امریکہ کا شہری بن چکا ہے اور یہاں خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے دکتور نمر سے کہا کہ میری بدقسمتی ہے کہ میں امریکہ کے موٹر ساز کارخانہ میں محنت کرکے ڈالر کما تا رہا۔ یہی محنت اگر میں خود اپنے ملک میں کرتا تو وہاں بھی میں اپنے لیے ایک اچھی زندگی بنا سکتا تھا (ولسوء الحظ فقد بذلت من الجهد فى مصانع السيارات ما ان لو بذلته فى بلدى لعشت افضل حياة)

امریکہ کے مسلمان مجھے ایک بڑے تضاد میں مبتلا نظر آئے۔ یہاں آپ جس مسلمان سے بھی ملیں

وہ آپ کو اس غم میں مبتلا نظر آئے گا کہ اس کے بچے "اسلامی تہذیب" سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف ان مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص (الا ماشاء اللہ) سودی قرض پر زندگی گزار رہا ہے۔ بچوں کی تہذیبی شناخت کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ ہے، مگر اپنے آپ کو سودی قرض سے بچانے کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ نہیں۔

یہاں عام طور پر لوگ دو سبب سے سودی قرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص ہے جس نے نیا نیا روزگار حاصل کیا ہے۔ اس کے پاس اپنے روزمرہ کے خرچ کے لیے تو معقول رقم ہوگی۔ مگر اس کے پاس اتنی رقم نہ ہوگی کہ وہ فوراً کار اور مکان بھی حاصل کر لے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ دس سال تک کما کر رقم بچائے اور دس سال کے بعد کار اور مکان حاصل کرے۔ مگر ماحول کے زیر اثر وہ اس انتظار پر راضی نہیں ہوتا اور فوراً ہی کار اور مکان کا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ یہاں بینک اس کی مدد کرتا ہے اور کار اور مکان اور دوسری قیمتی چیزوں کے لیے اس کو سودی قرض فراہم کر دیتا ہے۔ اس طرح آدمی سودی قرض میں پھنس جاتا ہے اور پھر تمام عمر اس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس رقم موجود ہوتی ہے (مثلاً تاجر حضرات)، مگر وہ بھی مکان جیسی زیادہ قیمتی چیزوں کو نقد خریدنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بینک سے قرض لے کر مکان خریدتے ہیں۔ اور خود اپنی رقم کو کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بینک کو جتنا سود ادا کریں گے، اس سے زیادہ وہ کاروبار میں نفع کما کر حاصل کر لیں گے۔

امریکی مسلمانوں کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اپنے بچوں کی تہذیبی پہچان کے لیے ان کا غم اسلامی غم نہیں ہے۔ اگر وہ اسلامی غم ہوتا تو اس کا اثر دونوں معاملات میں ظاہر ہوتا۔ یہ قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ حقیقۃً اسلامی جذبہ کے تحت۔ اور یہ قومی جذبہ جس طرح مسلمانوں میں ہے اسی طرح وہ پوری شدت کے ساتھ دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو مسٹر رام بکسانی کا بیان، مطبوعہ قومی آواز، ۴ جنوری ۱۹۸۸، صفحہ ۲)

اس معاملہ کا اس سے بھی زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ یہاں کے تمام مسلمان اس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ امریکہ کی اقتصادیات پر یہودیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہاں

کی بینکنگ پوری طرح ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ یہاں کی دولت پر قبضہ کرکے اس کو بھرپور طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہ بات صرف زبانی مذمت تک محدود ہے۔ عملی طور پر یہاں کا تقریباً ہر مسلمان یہودی اقتصادی اداروں سے سودی قرض لے کر ان کو تاعمر اپنی کمائی کا ایک حصہ ادا کرتا ہے تاکہ وہ خود اس کے اپنے اقرار کے مطابق، اس کو اسلام اور مسلمانوں کی جڑ اکھاڑنے میں لگائیں۔

لاس اینجلیس کی ایک خاتون بلی روتھ (Billie Ruth) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ قبول اسلام کا سبب پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں ۱۸ سال پہلے کی عمر میں چرچ جاتی تھی۔ وہاں مجھے مسیحیت کے بارہ میں عجیب تجربہ ہوا۔ میں نے پایا کہ جو کچھ میں بائبل میں پڑھتی ہوں اور جو کچھ میں چرچ کے اندر سنتی ہوں، دونوں ایک نہیں ہیں۔ میں نے سوال کرنا شروع کیا اور چرچ سوسائٹی کو چھوڑ دیا:

I found that what I read in the Bible and what I heard in the Church was not the same. I started questioning and I dropped out of church society.

بعد کے مرحلہ میں انھوں نے قرآن کو پڑھا اور اسلام قبول کرکے ایک انڈونیشی مسلمان (سلیمان) سے شادی کر لی۔ مطالعہ کے بعد انھوں نے پایا کہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں جو کچھ لکھا ہے وہی بتایا بھی جاتا ہے:

Islam is the only religion that reads and teaches the same.

بعض لوگ اس واقعہ کو اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگیاں اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر یہ صورت حال کسی بھی درجہ میں اسلامی دعوت کی راہ پر رکاوٹ نہیں۔ عیسائیت ایک منظم مذہب ہے، اس بنا پر اس میں مذہب کے دو معیار بن گئے ہیں۔ ایک ان کا چرچ، دوسرے ان کی کتاب مقدس۔ ان دونوں میں اگر فرق یا تضاد ہو تو وہ خود مسیحی مذہب کو مشتبہ قرار دینے کا سبب بن جائے گا۔ اس کے برعکس اسلام میں اصل معیار صرف ایک ہے،

اور وہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا خلافِ اسلام عمل، خالص نظریاتی اعتبار سے، اسلامی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ مسیحیت میں ریڈنگ اور ٹیچنگ کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس، اسلام میں صرف ریڈنگ اور پریکٹس کا۔

امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان نومسلموں کے ذریعہ وہی دعوتی عمل دوبارہ زندہ ہونا چاہیے تھا جو دور اول کے نومسلموں کے ذریعہ ساری دنیا میں زندہ ہوا تھا۔ مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ محمد علی کلے (پیدائش ۱۹۴۲) ایک امریکی نومسلم ہیں۔ ان کے اندر ابتداءً دعوت کا جذبہ تھا۔ مگر شاید میں عظیم ہوں (I am the greatest) کے شوق سے وہ چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ اپنے کو سب سے بڑا ثابت کرنے کے لیے وہ بار بار باکسنگ کا خوفناک کھیل کھیلتے رہے۔ آخری کھیل (۱۹۸۱) ان کے لیے سخت مہلک ثابت ہوا۔ ان کے سر میں ایسی چوٹیں آئیں جس سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔

محمد علی کے پاس شکاگو میں ۱۶ کمروں کا نہایت وسیع مکان ہے۔ وہ دو فارم کے مالک ہیں۔ جدید ترین گاڑیوں کا ایک پورا دستہ موجود ہے۔ بہت بڑا بینک بیلنس اس کے علاوہ ہے۔ مگر محمد علی اب خود کچھ بھی نہیں۔ وہ آج ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) بن چکے ہیں۔ اب وہ عام انسان کی حیثیت سے بھی زندگی گزارنے کے قابل نہیں، اسلامی داعی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا تو درکنار۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب مثال بلی روتھ سلیمان (Billie Ruth Suleiman) کی ہے۔ اس امریکی نومسلمہ سے پوچھا گیا کہ زندگی میں آپ کی خواہش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مدینہ سے گہری محبت ہے۔ اگر مجھے رہنے کے لیے کوئی ایک جگہ دی جائے تو میں پیغمبر کی مسجد کے قریب ترین رہنا پسند کروں گی:

O, I have deep love for Madina. If I were given one place to live, I would choose to be as close as possible to the Prophet's Mosque.

میرا خیال ہے کہ اس قسم کے احساسات موجودہ مسلم سماج کا نتیجہ ہیں نہ کہ اسلامی تعلیمات کا۔ موجودہ مسلمان نہ صرف یہ کہ خود اسلامی دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی شخص اگر قرآن کو پڑھ کر

اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" کا مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام قبول کرکے وہ جس سماج میں داخل ہوتا ہے وہ اس قسم کے نغموں سے گونج رہا ہے :

میرے مولا بلالے مدینے میں

ماہنامہ برہان (نومبر ۱۹۸۸) میں ایک واقعہ پڑھا۔ مطبوعہ الفاظ کے مطابق وہ یہ تھا: "امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ ڈاکٹر عرفان احمد صاحب نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ کو علی گڑھ میں انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن IFSO کے تحت منعقدہ ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک بات نقل کی۔ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں" (صفحہ ۳۱-۳۲)

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بسنے والے مسلمان شدید حساسیت کی حد تک یہ رائے رکھتے ہیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اس کے باوجود ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر اطمینان کے ساتھ امریکہ میں رہ رہے ہیں تاکہ اس سب سے بڑے دشمنِ اسلام کی مشین کا ایک پرزہ بن سکیں۔ حتیٰ کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ امریکہ کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں تاکہ اپنی آنے والی نسلوں تک کو اس عظیم دشمنِ اسلام کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر سکیں۔ واضح ہو کہ امریکی شہریت کسی کو صرف اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ امریکی نظام سے مکمل وفاداری کا فارم بھرے۔

تاہم اس سے قطع نظر، ذاتی طور پر مجھے دونوں میں سے کسی رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ بات بالکل اضافی ہے کہ کون دشمن نمبر ۱ ہے اور کون دشمن نمبر ۲۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ظاہری ناموافق حالات کے باوجود امکانی طور پر مواقع کار کہاں پائے جاتے ہیں۔ موانع کو

دیکھنا اور مواقع کو نہ دیکھنا ہی بے بصیرتی ہے ، اور موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان اسی بے بصیرتی میں مبتلا ہیں ، ان کے اصاغر بھی اور ان کے تمام اکابر بھی۔

محمود السائس ایک مصری انجینیر ہیں۔ انھوں نے مصر کے بعد امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آج کل وہ امریکہ کے ایک بڑے انجینیرنگ ادارہ (Database Systems Services) میں منیجر ہیں۔ یہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی کا ادارہ ہے جو ہوائی جہاز بنانے کا کام کرتی ہے۔

محمود السائس کا کہنا ہے کہ میں (اور اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ ، جو یہاں ہیں ، وہ شناخت کے بحران (Identity crisis) میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے امریکی شہریت حاصل کرنے کے لیے ۲۲ فروری ۱۹۷۸ کو ایک مخصوص فارم بھرا۔ اس کے تحت انھوں نے اس بات کا حلف لیا کہ میں ہر بیرونی وفاداری کو مکمل طور پر ترک کر کے پوری طرح صرف امریکہ کا وفادار رہوں گا۔ "مگر دس سال گزرنے کے بعد بھی میں دہرا جذبات کا شکار ہوں" انھوں نے کہا۔

ایک طرف، محمود السائس کے الفاظ میں، ان کے معاہداتی فرائض (Contractual obligations) ہیں جن کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دوسری طرف ان کے جذباتی احساسات (Sentimental feelings) ہیں جو ان کے سابق وطن مصر سے وابستہ ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے جذباتی انداز میں کہا کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان میں اپنی شخصیت کو متعین نہیں کر پاتا۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ میری اصل قومیت کیا ہے :

Can you tell me what my true nationality is?

میرا اندازہ ہے کہ یہی ان تمام لوگوں کا حال ہے جنھوں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی ہے۔ ہر ایک دہرا شخصیت کا انسان بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کش مکش میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ چھوڑ کر دوبارہ اپنے سابق وطن چلے گیے۔ اور کچھ لوگوں نے اس جھنجھٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس حد تک امریکی بنا لیا کہ اب وہ غیر ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اور "عید" کے بجائے "کرسمس" کو اپنے تیوہار کے طور پر مناتے ہیں۔

مسلمان اگر مغربی ملکوں میں داعی بن کر آتے تو وہ وہی تاریخی کارنامہ انجام دیتے جو صحابہ کرام نے عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں جا کر انجام دیا۔ مگر وہ داعی بن کر نہیں آئے نتیجہ یہ

ہوا کہ وہ صرف دوسری قوموں کے مدعو بن کر رہ گیے۔

امریکی مسلمانوں کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ میں چار ملین کی تعداد میں وہ مسلمان ہیں جو حال میں ہجرت کرکے یہاں آئے ہیں۔ اور چار ملین سے کچھ زیادہ وہ لوگ ہیں جن کو پہلے بلیک مسلم کہا جاتا تھا، مگر اب وہ بقیہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں اور صرف مسلم کہے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان چار ہزار سے زیادہ مسجدوں اور کلچرل مراکز میں اپنے مذہبی اعمال ادا کرتے ہیں :

In the U.S. it is estimated that there are 4 million Muslims of recent immigrants, and more than that of what was referred to, and is no more, of the black Muslims, because now the black Muslims have joined ranks with the rest and are all called Muslims. These Muslims practice their religion in over 400 smaller or larger mosques or cultural centres.

امریکہ کے کالے باشندوں (نیگرو) کو پہلے غلام سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اب انھیں قانونی طور پر یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔ اگرچہ اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر وہ اس قانونی امکان سے ابھی پورا فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

امریکہ کے بعض نئے مفکرین نے سفید فام باشندوں اور سیاہ فام باشندوں کے درمیان یکساں حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ کے سیاہ فام باشندے مختلف مگر یکساں (Different but equal) ہیں۔ یہ نہایت صحیح تعبیر ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ عورت اور مرد کے فرق کا بھی ہے۔ عورت مرد سے مختلف ہے، مگر حقوق اور انسانی احترام میں وہ یکساں ہے۔ لیکن امریکی مفکرین نے جس حقیقت کو سیاہ فام اور سفید فام باشندوں کے معاملہ میں سمجھ لیا ہے، وہ اس حقیقت کو ابھی تک عورت اور مرد کے معاملہ میں سمجھ نہ سکے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سفید فام اور سیاہ فام کے مسئلہ پر انھوں نے کھلے ذہن کے تحت سوچا، اس لیے وہ اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھ گیے۔ مگر عورت اور مرد کے معاملہ میں سوچتے ہوئے ان کی خواہش رکاوٹ بن گئی۔ اس نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر وہ اس دوسرے معاملہ میں اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

امریکہ کے سیاہ فام باشندوں کو نیگرو کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت وہاں بالکل غلام کی سی تھی۔ اس کے ردعمل میں ان کے درمیان مختلف تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک کے قائد الیجا محمد تھے۔ انھوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا مذہب اسلام بتایا۔ ان کے پیرو بلیک مسلم کہے جاتے تھے۔

۱۹۷۵ میں الیجا محمد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے لڑکے وارث دین محمد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ وارث محمد نے جلد ہی پورے نظام کو بدل دیا۔ انھوں نے اپنے فرقہ کے لیے "بلیک مسلم" کے بجائے "امریکن مسلم" کی اصطلاح استعمال کی۔ انھوں نے اس سے انکار کیا کہ ان کے والد پیغمبر تھے۔ انھوں نے خالص اسلام (Pure Islam) کو اختیار کرنے کا اعلان کیا، یعنی وہی اسلام جو دوسرے تمام مسلمانوں کا ہے۔ انھوں نے امریکی حکومت سے وہ رقابت بھی ختم کر دی جو ان کے والد غیر ضروری طور پر قائم کیے ہوئے تھے۔ فرقہ کے کچھ افراد نے ان کی مخالفت کی، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۶۰ میں ان لوگوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر ۱۹۸۵ میں اس فرقہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب ان کی تعداد چار ملین ہے۔ اس فرقہ کے بارہ میں امریکہ میں بہت سی معلوماتی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Charles E. Lincoln, *The Black Muslims in America,* 1982

الیجا محمد نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا۔ تاہم ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ ہندستان یا پاکستان جیسے ملک میں پیدا ہوتے تو ان کا مستقبل بالکل دوسرا ہوتا۔ اب تک وہ اور ان کے متبعین کافر قرار دے کر امت مسلمہ سے الگ کر دیے گئے ہوتے۔ مگر آج الیجا محمد کے جانشین وارث محمد اپنے چار ملین پیروؤں کے ساتھ امت مسلمہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (پروفیسر جارج میسن یونیورسٹی، ورجینیا) نے بتایا کہ ۱۹۷۲ میں وہ وینزویلا کے شہر کارکس (Carcas) گیے۔ وہ ہوائی اڈہ پر اترے تو وہاں آدمیوں کا بہت بڑا ہجوم اکٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں ہوائی اڈہ پر کیوں جمع ہیں۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ نہیں جانتے۔ آج محمد علی آنے والے ہیں۔ سارے لوگ ان کے استقبال کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر

میاں محمد سعید نے کہا کہ محمد علی بلیک مسلم ہونے کی حیثیت سے الیجا محمد کا پیرو تھا۔ مگر ساری دنیا میں اس کا استقبال ایک مسلم ہیرو کی حیثیت سے کیا گیا :

He was welcomed all over the world as a Muslim hero

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کلے اپنے آپ کو مسلم ملت کا ایک فرد سمجھنے لگے۔ امریکہ کے کالے مسلمان عمومی طور پر مسلمانوں کے قریب آ گئے۔ یہ قربت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کالے مسلمانوں کے موجودہ لیڈر وارث محمد نے حج کے لیے جانا چاہا تو ان کو بھی بلا روک ٹوک حج کی اجازت مل گئی۔ وہاں ان کی ملاقات تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہوئی۔ اس سے ان کو اپنے خیالات کی تصحیح میں مدد ملی۔

نیو آرک (Newark) میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں وارث محمد کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جب وہ وہاں پہونچے تو ان کا خصوصی استقبال کیا گیا۔ یہاں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کھلے طور پر اعلان کیا کہ ان کے باپ الیجا محمد عام انسان تھے، وہ پیغمبر نہیں تھے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت آخری طور پر ختم ہو چکی ہے۔ ہم دوسرے مسلمانوں کے عقیدہ کو مانتے ہوئے ان کے ساتھ یکساں طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ان کے والد کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں صرف ان کی جماعت کو امت اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اپنی جماعت کا نام انھوں نے (Lost-Found Nation of Islam) رکھا تھا۔ وارث محمد نے اس کو بدل کر اپنی جماعت کا نام "امریکن مسلم" رکھ دیا۔ وغیرہ

قادیانی لیڈروں اور قادیانی فرقہ کا معاملہ بھی عین یہی تھا۔ مگر یہاں ان کے ساتھ بالکل مختلف سلوک کیا گیا۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان کے معاملہ میں دعوت اور نصیحت کے اصول پر اصلاحی عمل کا آغاز کیا جاتا۔ مگر مسلم علماء نے یہاں نفرت اور مناظرہ بازی اور تکفیر اور بائیکاٹ سے اپنے عمل کا آغاز کیا۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان کے دشمن بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں میں مزید شدت بڑھتی گئی، وہ قریب ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہو گئے۔

مسلمانوں نے محمد علی کلے کو اپنا ہیرو بنایا۔ مگر انھوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنا ہیرو نہیں بنایا۔ حالانکہ محمد علی نے جو کارنامہ باکسنگ کے میدان میں انجام دیا تھا، وہی کارنامہ ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنس کے میدان میں انجام دیا تھا۔ اگر مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کرتے تو

یہ ممکن تھا کہ جس طرح "امریکی قادیانی" تائب ہو کر امت مسلمہ کا جزء بن گیا، اسی طرح "پاکستانی قادیانی" بھی اپنی اعتقادی اصلاح کر کے امت مسلمہ میں شامل ہو جاتا۔

واشنگٹن سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام "الامۃ" ہے۔ اس کے چند شمارے دیکھنے کو ملے۔ یہاں کے انگریزی اخباروں کے مقابلہ میں اس کا معیار صحافت بہت کم تھا۔ اس کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ میں صفحہ اول پر خلیل جبران کے چند اقوال درج تھے۔ ایک قول یہ تھا:

وَیلٌ لامّۃٍ مقسّمۃٍ إلی اَجزاء وکُلّ جزءٍ یَحْسَبُ نَفْسَہُ فیھا اُمَّۃ — اس قوم کے لیے خرابی ہے جو بہت سے حصوں میں بٹ جائے اور ہر جزء یہ سمجھے کہ وہی قوم ہے۔

مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں ہندستان اور پاکستان کے لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ مختلف اسلامی شخصیتوں سے متاثر ہیں اور اس کے مطابق اپنے اجتماعات کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مختلف ناموں سے الگ الگ تنظیمیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

اسی قسم کی ایک تنظیم کا اجتماع امریکہ میں جولائی ۱۹۸۸ میں ہوا۔ اس کی روداد میں نے پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہماری تنظیم نے مختلف مقامات پر "دعوتی اجتماعات" کیے۔ اسی کے ساتھ درج تھا کہ "افغانستان، فلسطین اور ہندستانی مسلمانوں کے حق میں مختلف شہروں میں مظاہرے اور جہاد کانفرنسیں منعقد کی گئیں"۔ میں اس اندازِ کار کو عملاً بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ قومی احتجاج اور دعوتِ حق کا کام، دونوں ساتھ ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

رپورٹ کے مطابق، تنظیم کے جولائی ۱۹۸۸ کے اجتماع میں اس کے صدر نے جو تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارا نصب العین اسلامی نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ اسی میں دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔ انھوں نے گرجدار آواز میں کہا کہ مسلم نوجوان خالد و طارق کو اپنا آئیڈیل بنائیں اور انسان کو انسان کی غلامی سے نکالنے کے لیے مجاہد بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی جذباتی تقریر کے دوران بار بار اللہ اکبر کے نعرے لگتے رہے۔

اس اجتماع میں مشہور انگریز نومسلم یوسف اسلام، سابق کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) کو بھی بلایا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق، یوسف اسلام کی تقریر کے دوران آڈیٹوریم پر مکمل سناٹا چھایا رہا۔ سامعین مبہوت ہو کر ان کی گفتگو سنتے رہے۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا: "روشنی کی طرف سفر"

انھوں نے اپنے قبول اسلام کا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ دولت، شہرت، عزت سب کچھ میرے پاس موجود تھی، مگر دل کا سکون نہ تھا۔ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ شراب اور منشیات کے ذریعہ سکون حاصل کرو۔ اسی دوران مجھے قرآن کا انگریزی ترجمہ مل گیا۔ اس کو پڑھ کر میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سکون کا اصل ماخذ کیا ہے۔ قرآن نے میرے دل کے آخری گوشہ تک اپنی جگہ بنا لی۔

ہندستان اور پاکستان کے "اسلام پسند" جو اپنے ملکوں کو چھوڑ کر امریکہ گئے ہیں۔ وہ وہاں بھی سیاست اور جہاد کی تقریریں کرتے رہتے ہیں، مگر اس قسم کی تقریروں میں وہاں کے باشندوں کے لیے کوئی کشش نہیں۔ البتہ یوسف اسلام جیسے لوگوں کی آواز میں ان کے لیے بے پناہ کشش ہے۔ مغرب کے سامنے سیاسی انداز میں اسلام کو پیش کرنا مغرب کو اسلام سے دور کرنا ہے۔ البتہ اگر مغرب کے سامنے فطرت کے انداز میں اسلام کو پیش کیا جائے تو وہاں کا انسان اس کے اندر اپنے لیے بے پناہ کشش پائے گا۔

امریکہ میں اب خدا کے فضل سے بہت سے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو الرسالہ کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم مامون صاحب نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ عرصہ سے الرسالہ کے قاری ہیں۔ اب انھوں نے پانچ کی تعداد سے الرسالہ کی ایجنسی شروع کر دی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ امریکی پروفیسر ٹامس (Prof. Thomas) ان کے ملاقاتیوں میں تھے۔ ان کو انھوں نے الرسالہ انگریزی دیا اور مرکز کی چھپی ہوئی انگریزی کتابیں پڑھائیں۔ پروفیسر ٹامس کو یہ کتابیں بہت پسند آئیں۔ اب وہ اسلام سے مانوس نظر آرہے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کے مختلف مقامات پر لوگ الرسالہ (اردو یا انگریزی) منگاتے ہیں۔ وہ ان کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔

ہلٹن ہوٹل کے ایک بہت بڑے ہال کے باہر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: بازار۔ اس کے اندر مختلف "اسلامی" چیزوں کی دکانیں تھیں۔ اس کے زیادہ بڑے حصہ میں کتابوں کے اسٹال تھے۔ دو بڑی میزوں پر اسلامی مرکز (دہلی) کا بھی اسٹال تھا جس پر تمام کتابیں اور الرسالہ (اردو، انگریزی) رکھے گئے تھے۔ بڑی تعداد میں

لوگوں نے اسے آکر دیکھا اور کتابیں حاصل کیں۔ کئی لوگوں نے پورے پورے سٹ حاصل کیے۔

صغیر احمد اسلم صاحب یہاں کے ایک بڑے تاجر ہیں۔ ان کو تذکیر القرآن بہت زیادہ پسند ئی۔ انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ پوری تفسیر کو آڈیو کیسٹ پر لے آئیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں امریکہ یں لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں، البتہ سننے کا وقت انھیں مل جاتا ہے۔ اور یہ وقت رہ ہے جب کہ وہ کار پر سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں کے آدمی کے پاس اگر کوئی "خالی وقت" ہے تو وہی ہے جب کہ وہ کار سے سفر کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ وقت روزانہ اس کو کافی مقدار یں ملتا ہے۔ اگر تذکیر القرآن کو کیسٹ پر منتقل کر دیا جائے تو ہر آدمی اس کو اپنی کار میں رکھے گا ور سفر کے وقت روزانہ اس کو سنتا رہے گا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو واپسی ہوئی۔ پین ایم کی فلائٹ نمبر ۱۲۰ کے ذریعہ لاس اینجلیس سے روانہ ہوا۔ دن کے بارہ بجے جہاز کے اندر داخل ہوا تو بڑے جہاز کی بیشتر سیٹیں خالی تھیں۔ یہ غالباً س حادثہ کا اثر تھا جو ۲۱ دسمبر کو پین ایم کے جہاز کے ساتھ پیش آیا۔ انسان زندگی کے بعد پیش نے والی موت سے ڈرتا ہے۔ مگر موت کے بعد پیش آنے والی موت سے کسی کو اندیشہ نہیں۔

اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا لندن کی طرف جا رہا ہے۔ سطح زمین پر بادل چھائے ہوئے تھے، مگر ۳۳ ہزار فٹ اوپر پہونچ کر ماحول بدل چکا تھا۔ ب جہاز نیلے رنگ کے کھلے آسمان میں اڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے تمام جھگڑے نچلی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کو اٹھا کر بلندی پر لے جا سکیں تو تمام جھگڑے اور فساد پنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۶۶ کے ذریعہ سفر ہوا۔ یہ یکم جنوری ۱۹۸۹ کی تاریخ تھی۔ جہاز میں بیشتر ہندستانی مسافر تھے۔ چنانچہ اناؤنسر کی زبان بدل گئی۔ اس سے پہلے انگلش اور جرمن میں اعلانات کیے جا رہے تھے۔ اب جہاز کے اناؤنسر نے انگلش کے ساتھ ہندی میں اعلان شروع کر دیا:

ہمیں آشا ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کی یاترا سکھت رہے گی۔ یدی آپ کسی قسم کی سہائتا چاہیں تو ہم آپ کی سیوا میں اُپستِت ہیں۔ ہم اپنے سب یاتریوں کو

نئے سال کی شبھ کامنائیں دیتے ہیں۔
ایک تاجر کو معلوم ہے کہ اسے اپنے گاہک سے وہی زبان بولنا ہے جو گاہک کی اپنی زبان ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے داعی اس راز کو نہیں جانتے کہ وہ اپنے مدعو سے خود مدعو کی زبان میں کلام کریں۔ اگر کوئی شخص بظاہر مدعو کی زبان میں بولنے والا ہو تو وہ بھی صرف حروف تہجی کے اعتبار سے ہوگا۔ اسلوب کلام اور انداز بیان کے اعتبار سے دیکھئے تو مدعو کے آشنا اسلوب اور اس کے مانوس انداز میں بولنے والے داعی سرے سے دنیا میں موجود ہی نہیں۔

فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ یعنی سورج کے الٹی طرف۔ چنانچہ دن بہت تیزی سے ختم ہوا۔ فرینکفرٹ سے روانگی ہوئی تو دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ آٹھ گھنٹہ کا سفر طے کر کے جب دہلی پہونچے تو یہاں رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ یعنی "آٹھ گھنٹہ" میں "تیرہ گھنٹہ" کا سفر طے ہوا۔

۲ جنوری ۱۹۸۹ کو رات کے ڈیڑھ بجے جہاز دہلی پہونچا۔ آٹھ گھنٹہ کی لمبی اڑان کے بعد جب جہاز حفاظت کے ساتھ زمین پر اترا تو مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ہم جس زمین پر اترے وہ خود بھی ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا میں دوڑ رہی ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم ایک جہاز سے اتر کر دوسرے جہاز پر سوار ہوئے۔ ہم انسانی سواری سے نکل کر خدائی سواری میں بیٹھ گیے۔

انسانی سفر مسلسل جاری ہے۔ انسانی سفر کی منزل موت ہے نہ کہ کوئی ایرپورٹ۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو (کن فی الدنیا کانک عابر سبیل)

۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہندستان سے امریکہ کے لیے روانگی ہوئی تھی۔ یکم جنوری اور ۲ جنوری ۱۹۸۹ کی درمیانی رات کو دوبارہ میں نے ہندستان کی زمین پر قدم رکھا۔ یہ سفر اگرچہ بہت محدود مدت کے لیے تھا، مگر اس مدت میں پورا کیلنڈر تبدیل ہوگیا۔ تاریخ کے صفحہ پر ۱۹۸۸ کے بجائے ۱۹۸۹ لکھا جاچکا تھا۔ میں "حال" سے نکل کر "مستقبل" میں داخل ہوگیا۔

دہلی سے کیلی فورنیا کے سفر میں میں نے کرۂ ارض کے آدھے سے زیادہ حصہ کا سفر کیا۔

جانے اور آنے کو ملا کر مجموعی طور پر تقریباً ۳۰ ہزار میل کا فاصلہ طے ہوا۔ دس دن کے بعد جب میں اس لمبے سفر سے واپس ہو کر اپنے ٹھکانے پر پہونچا تو میں نے سوچا کہ دنیا کے سفر میں آدمی بہر حال ایک روز اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتا ہے۔ مگر ایک اور سفر ہے جس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔

یہ موت کا سفر ہے جو ہر ایک کو لازمی طور پر کرنا ہے۔ موت کے سفر کے بعد نہ واپسی کا کوئی امکان ہے اور نہ تلافی مافات کی کوئی صورت۔ ہر آدمی کو لازماً ایک ایسی سواری پر بیٹھنا ہے جو کبھی اس کو واپس لے کر نہیں آئے گی کہ وہ اپنی کوتاہی اور اپنی سرکشی کی تلافی کر سکے۔ آہ، کیسا سخت معاملہ انسان کے ساتھ پیش آنے والا ہے اور وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔ دنیا کی تمام عجیب باتوں میں سب سے زیادہ عجیب بات بلاشبہ یہی ہے۔

کشمیر میں پروگرام

انجمن منظہر الحق بیروہ، کشمیر کے زیر اہتمام ایک دینی اجتماع ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کو ہوگا۔ انشاء اللہ دہلی سے مولانا وحید الدین خاں صاحب اس میں شرکت کریں گے۔ پہلا پروگرام بعد نماز ظہر ۲ بجے اقبال پارک سرینگر میں ہوگا۔ اس موقع پر خطاب کا عنوان یہ ہوگا :

اسلام ــــ نئے عہد کے دروازہ پر

اسی روز چار بجے شام لالہ رُخ ہوٹل سرینگر میں قارئین الرسالہ اور الرسالہ کی دعوت و تحریک سے متفق افراد کے ساتھ مولانا موصوف کی ایک مجلس مشاورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل مقامی اخبارات میں شائع کرائی جائے گی۔ نیز حسب ذیل پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں :

سید عبد اللطیف ایم اے، سرپرست انجمن منظہر الحق، بیروہ، 193411 کشمیر

تیوہار اور قومی یک جہتی

تیوہار کو عربی میں عید، ہندی میں تیوہار اور انگریزی میں فیسٹول (Festival) کہتے ہیں۔ تیوہار کا بنیادی مقصد اجتماعی روایات کو زندہ رکھنا اور فرد کو فرد سے جوڑنا ہے۔ انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں تیوہار کا رواج رہا ہے۔ سال کی خاص تاریخوں میں مشترک طور پر قومی تقریب منعقد کرنا، یا مشترک تصور کے تحت کسی یادگار دن کو اجتماعی خوشی منانا، اسی کا نام تیوہار ہے۔

تیوہار عام طور پر سال کی مقرر تاریخوں میں ہوتے ہیں۔ اس روز سب لوگ جمع ہو کر مخصوص انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس طرح تیوہار لوگوں کے اندر اجتماعیت اور یک جہتی پیدا کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ وہ سماج کے ایک حصہ کو اس کے دوسرے حصہ سے قریب لے آتا ہے۔ تیوہار ملاقات اور تعلق کی مضبوط اور پائدار زمین فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

تیوہار کا ایک حصہ عام طور پر کسی مخصوص سماجی گروہ کے اپنے عقیدہ اور اپنی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک حصہ عمومی ہوتا ہے جو صرف ایک سماجی گروہ کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتا بلکہ پورے سماج، اور وسیع تر معنوں میں تمام انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

مثلاً عید میں دوگانہ نماز کا تعلق مسلم عقیدہ سے ہے۔ وہ مسلمانوں کے مذہب کا حصہ ہے۔ مگر عید میں شیرینی کھانا اور کھلانا ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ وہ انسانی سطح پر میل جول کو بڑھانے والا ہے۔ وہ ایک عالمی چیز ہے نہ کہ کوئی گروہی چیز۔ اسی طرح دیوالی میں لکشمی کی پوجا کرنا ہندو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہندو مذہب کا جزء ہے لیکن گھر کی صفائی ایک ایسی چیز ہے جس میں ہر آدمی کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس کو ہر آدمی خوشی سے اختیار کر سکتا ہے۔

میں آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے والے ہندستان میں پیدا ہوا۔ مجھے اپنے بچپن کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب دیوالی کا تیوہار آتا تو مسلمان ہندوؤں کے یہاں تحفے بھیجتے۔ ہم لوگ بھی اپنے

گھروں کی صفائی اسی طرح کیا کرتے تھے جس طرح ہندو لوگ اس تیوہار میں اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب عید کا تیوہار آتا تو ہندو بچے بھی مسلم بچوں کی طرح نئے کپڑے پہنتے۔ ہندو گھروں میں شیرینی کا اہتمام کیا جاتا اور وہ اپنے مسلم پڑوسیوں کی تواضع کرکے خوش ہوتے۔

اس طرح مسلمانوں نے ہندو تیوہاروں میں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پایا تھا اور ہندو، مسلمانوں کے تیوہاروں میں اپنی دلچسپی کا سامان پارہے تھے۔ دونوں فرقوں کے تیوہار ایک اعتبار سے ان کے اپنے فرقے کے تیوہار ہوتے تھے اور دوسرے اعتبار سے ان کی حیثیت مشترک تیوہار کی ہوتی تھی۔ اس دوسرے اعتبار سے دونوں گویا ایک دوسرے کے تیوہاروں کو مل جل کر مناتے تھے۔ اس طرح دونوں فرقوں میں رواداری کو فروغ ملتا تھا۔ دونوں بار بار ایک دوسرے سے قریب ہوتے رہتے تھے۔

اس چیز نے اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر رکھی تھی۔ دونوں میں کسی قسم کی اجنبیت حائل نہ تھی۔ دونوں اپنے آپ کو مسلم اور ہندو سمجھتے ہوئے وسیع تر ہندستانی قوم کا جزء بنے ہوئے تھے۔ دونوں اس عظیم ملک سے یکساں محبت کرتے تھے جس کا نام اب تاریخ میں برصغیر ہند (Indian sub-continent) لکھا جاتا ہے۔

یہی وہ دور ہے جس کی بابت سرسید نے اپنی ایک تقریر (۲۷ جنوری ۱۸۸۳) میں کہا تھا:

"ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے، جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں۔ ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا اور جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ درحقیقت ہندستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی اور بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت اور ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔"

پھر یہی وہ ہندستان ہے جس کا ترانہ اقبال نے اپنے اشعار میں گایا تھا۔ ان کا یہ شعر اس مشترکہ جذبہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے جس کو ہندستان کے تقریباً ہر شخص نے سنا ہے اور بے شمار

لوگوں نے اس کو گایا ہے :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اس طرح کے مشترک ماحول اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں تیوہار نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نفرت اور باہمی دوری کے قاتل ہیں۔ اگر تیوہاروں کو صحیح جذبہ کے ساتھ اور مشترک انداز میں منایا جائے تو ہمارے سماج سے ہر قسم کے جھگڑے اور فساد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

مجھے مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے بتایا۔ وہاں کے ایک قصبہ میں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول تھا۔ ہولی کے تیوہار کا زمانہ آیا تو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس موقع پر فرقہ وارانہ فساد ہو کر رہے گا۔ ہولی کا رنگ انسانی خون کے رنگ میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس وقت ایک بزرگ ہندو، مسلمانوں کے علاقہ میں گئے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ میں آپ لوگوں کا خیرخواہ ہوں اور آپ لوگوں کو ایک مشورہ دینے آیا ہوں جس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اگر آپ میرے اس مشورہ کو قبول کرلیں تو امید ہے کہ ہماری بستی بہت بڑی آفت سے بچ جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ اس وقت ہماری بستی کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے بظاہر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات باقی رہے تو ہولی کے موقع پر ضرور فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا اور ہماری سڑکوں پر رنگ کے بجائے خون بہے گا۔ اس مسئلہ کے حل کی ایک نہایت آسان تدبیر ہے اور اس وقت میں آپ کو وہی تدبیر بتانے آیا ہوں۔

انھوں نے کہا کہ ہولی کے دن جب ہندو لڑکے ہولی کھیلتے ہوئے مسلمانوں کے محلہ کے پاس پہنچیں تو مسلمان اس سے الگ نہ رہیں۔ بلکہ مسلمان لڑکے بھی باہر نکل کر ان کی پارٹی میں شامل ہو جائیں اور ان کے ساتھ ہولی کھیلنا شروع کر دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر بالفرض آپ لوگوں کے کپڑوں میں ہولی کا رنگ لگنے کا کچھ عذاب ہو تو میں بھگوان سے کہتا ہوں کہ وہ اس کو میرے حصہ میں ڈال دے اور اس تدبیر سے فساد کے ٹلنے کا جو ثواب ہے وہ سب آپ لوگوں کے حصہ میں لکھ دیا جائے۔ یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آگئی، چنانچہ انھوں نے ہولی کے موقع پر ایسا ہی کیا۔

ہولی کے دن حسب معمول ہندو نوجوانوں کی پارٹی مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر آئی۔ اس وقت، پہلے سے طے کئے ہوئے منصوبہ کے مطابق، کچھ تفریح پسند مسلم نوجوان اپنے گھروں سے نکلے اور جوش وخروش کے ساتھ ہندو پارٹی میں مل گئے۔ وہ اس وقت انھیں جیسے بن کر ان کے ساتھ ہولی کھیلنے لگے۔

ایسا کرنے کے بعد اچانک ساری فضا بدل گئی۔ جو دن دو دشمنوں کے ٹکراؤ کا دن بنتا وہ دو دوستوں کے ملاپ کا دن بن گیا۔ ہولی کا رنگ جو خون کے چھڑکاؤ کی صورت اختیار کرنے والا تھا، وہ پیار و محبت میں بدل کر لوگوں کے اوپر گلاب جل کا چھڑکاؤ بن گیا۔

اسی طرح مہاراشٹر کے ایک شہر کا قصہ ہے۔ وہاں ہر سال ایک خاص تاریخ کو گن پتی کا جلوس نکلتا ہے جو گویا ان کا ایک سالانہ تیوہار ہے۔ ہندو اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی سال ایسا ہوا کہ جلوس جب مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر پہنچا تو کسی نہ کسی بات پر دونوں فرقوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور فساد کی نوبت آگئی۔

پچھلے سال وہاں کے مسلمانوں نے مشورہ سے یہ طے کیا کہ وہ جلوس کے خلاف روک ٹوک نہیں کریں گے اور نہ اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ جب جلوس آیا تو انھوں نے پچھلے سالوں کے برعکس جلوس کا استقبال اور اس کو راحت پہنچانے کی کوششیں کیں۔ مثلاً یہ گرمی کا موسم تھا۔ چنانچہ انھوں نے راستہ میں جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کا انتظام کر دیا۔ وغیرہ

اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا۔ دو فرقے جو اس سے پہلے ایک دوسرے کو حریف کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ ایک دوسرے کو دوست کی نظر سے دیکھنے لگے۔ جلوس کا قافلہ جو عام حالت میں دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ دونوں کے درمیان دوستی اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

تیوہار کو اگر صحیح طریقہ سے منایا جائے تو بلاشبہ وہ رواداری اور اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ پورے سماج کو مشترک انسانی رشتہ میں جوڑ کر صالح معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اور صالح معاشرہ سے پیدا ہونے والے نتیجہ ہی کا دوسرا نام یک جہتی ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ کو نشر کی گئی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۵۳

۱۔ الرسالہ کے مضامین خدا کے فضل سے ہر حلقہ اور ہر جماعت کے پرچوں میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح وہ ہر حلقہ میں پھیل رہے ہیں اور عام مسلمانوں کے دل کی آواز بنتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جمعیۃ علماء ہند کے موقر ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی نے حسب ذیل مضامین مکمل طور پر اور نمایاں طور پر شائع کیے ہیں:

الجمعیۃ	۹ فروری ۱۹۸۹ میں	تحریک بابری مسجد
الجمعیۃ	یکم جون ۱۹۸۹ میں	حقیقت بے نقاب
الجمعیۃ	۸ جون ۱۹۸۹ میں	تصویر کے دو رُخ

ہم الجمعیۃ کا اور دوسرے ان پرچوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تعمیری افکار کی بیش از بیش اشاعت میں ہمارا تعاون کر رہے ہیں۔

۲۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۹ کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ سفارت خانہ کے افسران کے علاوہ شہر کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر سفیر پاکستان مسٹر نیاز اے نائک نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ صدر اسلامی مرکز کی کتاب پیغمبر انقلاب (انگریزی) کو پاکستان میں ہونے والے انٹرنیشنل سیرت مقابلہ میں اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ مقابلہ عالمی سطح پر کیا گیا تھا اور انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اسپینی، ترکی، فارسی وغیرہ زبانوں کی کئی سو کتابیں ججوں کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ ان میں سے جج صاحبان نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) کو اول درجہ کی کتاب قرار دیا۔ اس تقریب کی رپورٹ انگریزی، ہندی، اردو اخبارات میں ۱۳ مئی کو شائع ہوئی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہفت روزہ نئی دنیا، ۲۹ مئی ۱۹۸۹

۳۔ اسلامی مرکز اور الرسالہ کے مشن کے بارہ میں عالمی سطح پر جاننے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۹۸۹ کو مرکز میں آسٹریلیا کی ایک ٹی وی ٹیم آئی۔ وہ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لینا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت صدر اسلامی مرکز ایک سفر میں تھے، اس لیے انٹرویو نہ لیا جا سکا۔ تاہم وہ مرکز کا انگریزی لٹریچر اپنے ساتھ لے گئے۔

۴۔ الرسالہ کے مضامین اپنی عمومی پسندیدگی کی بنا پر نہ صرف اردو اخبارات اور رسائل میں نقل ہوکر وسیع پیمانہ پر پھیل رہے ہیں بلکہ دوسری زبانوں کے پرچوں میں بھی ترجمہ ہوکر شائع کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً گوالیار کے ہندی روزنامہ دیش بندھو (۷ مئی ۱۹۸۹) نے الرسالہ کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "رمضان" یہ ہندی ترجمہ محمد انوار الحق صدیقی ایم اے نے کیا تھا۔

۵۔ غازی آباد سے ایک ہندی ہفتہ وار نکلتا ہے جس کا نام ھنڈن پتھ ہے۔ اس نے "صدائے حق" کے نام سے ایک مستقل کالم شروع کیا ہے۔ اس کے تحت ہر ہفتہ الرسالہ کا کوئی مضمون ہندی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ ہندی ترجمہ کا کام مسٹر ایس ایس بھٹناگر انجام دے رہے ہیں۔

۶۔ مولانا امیر اللہ خاں (محبوب نگر) لکھتے ہیں: آپ کی نئی کتاب "دین کامل" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں سحر رکھا ہے۔ جو آپ کی تحریر پڑھتا ہے مسحور ہو جاتا ہے۔ "دین کامل" دین کی کامل ترین ترجمانی ہے جو عصری اسلوب میں کی گئی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و ترقی اور دین اسلام کی اشاعت کا اہم ترین تقاضا دعوتی شعور اور عمل دعوت ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور اچھوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

۷۔ الرسالہ کا تعمیری مشن خدا کے فضل سے دن بدن لوگوں کے ذہنوں پر چھاتا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی بولیاں بدل دی ہیں۔ وہ لوگ جو اس سے پہلے شکایت اور احتجاج کو کام سمجھ رہے تھے اب وہ اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں سامنے آ رہا ہے۔ مثلاً ایک مشہور مسلم رہنما نے اپنی ایک تقریر میں کہا: "میں بانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ جو شکایت کرتے ہیں وہ شکایت بجا ہے۔ ہم شکایت کرتے رہیں گے۔ شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔ ہم کو یہ حق ہے کہ اپنے قومی جلسوں میں اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے۔ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ ہم اپنی حکومت سے شکایت

کرتے رہیں گے اور سو بار کریں گے ۔ ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے ۔ ہم ہمیشہ انتظامیہ اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے " (۲۵ مئی ۱۹۸۹) مقرر کے یہ الفاظ واضح طور پر دفاعی نفسیات کے تحت نکلے ہوئے الفاظ ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شکایتی سیاست میں اپنا یقین کھو دیا ہے اور اب لفظوں کے سہارے دوبارہ اس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

۸۔ کچھ نئی انگریزی ، ہندی اور اردو کتابیں اس وقت پریس میں ہیں ۔ اردو میں دو نئی کتابیں چھپ رہی ہیں (۱) اسلام دور جدید کا خالق ۔ (۲) اقوال حکمت ۔

۹۔ ایک کشمیری نوجوان لکھتے ہیں : اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہوں ۔ میرے شبہات ختم ہوگئے ہیں اور یہ سب آپ کی اعلیٰ تحریروں کا کرشمہ ہے ۔ مسلم نوجوانوں کو کسی عالم کا کوئی لٹریچر بدل نہیں سکتا سوا تذکیر القرآن کے ۔ یقیناً اس وقت سب سے اہم کام مسلم نوجوانوں کو تذکیر القرآن کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب کرنا ہے ۔ بے شک تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کا اصلی مقصد (ہدایت و نصیحت) سامنے لایا گیا ہے ۔ اب میں الرسالہ کی ایجنسی لے رہا ہوں ۔ الرسالہ کے مضامین بہت معنی خیز اور بہترین ہوتے ہیں ۔ الرسالہ کے سفرنامے سے ایمان تازہ ہوجاتا ہے ۔ (انجنیئر الطاف حسین ، مٹن)

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : آپ لوگوں کو سنجیدگی اور حوصلہ مندی کی طرف بلاتے ہیں ۔ میں نے آپ کی کتابیں پڑھیں ۔ آپ دور حاضر میں منفرد شخصیت رکھتے ہیں جو حقائق کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرتے ہیں ۔ حالاں کہ دنیا میں بے شمار قائدین ہیں جو کہتے ہیں کہ آنکھ بند کرو اور چٹان سے ٹکرا جاؤ اور پھر دیکھو کامیابی تمہارے قدم چومتی ہے ۔ چنانچہ ہم چٹان سے ٹکرا جاتے ہیں اور پھر کبھی سر نہیں اٹھا سکتے ۔ لیکن آپ کا انداز انتہائی معنی خیز اور دلوں میں اترنے والا ہوتا ہے ۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے طے کیا ہے کہ میں الرسالہ کی ایجنسی قائم کروں اور دس پرچہ ہر ماہ منگا کر پھیلاؤں (سید فرید الحسن ہاشمی ، حیدرآباد)

۔ ایک نئی کتاب زیر طبع ہے ۔ اس کا نام ہوگا : رُشدیات : شتم رسول کا مسئلہ ۔ اس کتاب میں زیر بحث موضوع پر سنت رسول کی روشنی میں تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۴ ستمبر ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

معجزاتی کلام

محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۸۷۵ - ۱۹۳۶) ایک انگریز نومسلم تھے۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو کافی مشہور ہے۔ انھوں نے اپنے ترجمہ قرآن کے ساتھ ایک دیباچہ لکھا ہے۔ اس دیباچہ میں وہ قرآن کے ترجمہ کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ میں متن کے مطابق موزوں زبان اختیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ عربی قرآن کی جگہ انگریزی قرآن تیار ہوگیا ہو۔ عربی قرآن ایک ناقابلِ تقلید نغمگی کا مجموعہ ہے۔ اس کی مجرد آواز ہی آدمی کے اندر ارتعاش پیدا کرکے اس کو رلا دیتی ہے۔ اور اس پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے:

> Every effort has been made to choose befitting language. But the result is not the Glorious Qur'an, that inimitable symphony, the very sounds of which move men to tears and ecstasy.

وہ چیز جس کو فنی اصطلاح میں ساؤنڈ آرٹ کہا جاتا ہے، وہ قرآن کی زبان میں بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ ایک قاری جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کا صوتی آہنگ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ نہ سمجھنے والے لوگ بھی اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

ساؤنڈ آرٹ یا صوتی آہنگ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ذوقی چیز ہے۔ اس کے بعض ظاہری پہلوؤں کو اشاراتی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے مگر اس کی مکمل لفظی تشریح ممکن نہیں۔ یہاں اس کی وضاحت کے لیے ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے۔ قرآن کی ایک آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وکأین من نبی قاتَلَ مَعَہ رِبّیون کثیر (آل عمران ۱۴۶)

اس آیت میں رِبّیون کی جگہ رَبّانیون بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں موجودہ لفظ بدل کر رَبّانیون رکھ دیا جائے تو آیت کا سارا صوتی آہنگ بگڑ جائے گا۔ یہی ہم آہنگ نغمگی پورے قرآن میں اپنے کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔

قرآن ایک معجزہ ہے اپنے معنی کے لحاظ سے بھی اور اپنے الفاظ کے لحاظ سے بھی۔ ایک شخص عربی زبان جانتا ہو اور وہ قرآن میں غور وفکر کرے تو وہ اس کے اندر معانی کے اعتبار سے خدائی عظمت کا ادراک کرے گا۔ لیکن اگر ایک شخص اس کے معانی پر دھیان نہ دے، وہ صرف اس کی آواز سنے تب بھی وہ اس سے غیر معمولی نوعیت کا گہرا تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ میں دونوں قسم کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ پہلی نوعیت کی بھی اور دوسری نوعیت کی بھی۔ فرانس کے پروفیسر ماریس بکائی (Maurice Bucaille) قرآن کی معنوی عظمت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ کتاب لکھی جو حسب ذیل نام سے عمومی شہرت حاصل کر چکی ہے:

The Bible, The Qur'an and Science

انگلستان کے پروفیسر آربری (Arthur J Arberry) ایک بار تیونس میں مقیم ہوئے۔ ان کے پڑوس میں ایک مسلمان کا مکان تھا۔ ایک روز مسلمان ریڈیو پر قرآن کی قرأت سن رہا تھا۔ یہ آواز پروفیسر آربری کے کان میں پہونچی۔ وہ اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا، ان کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے قرآن کا مکمل ترجمہ انگریزی زبان میں کر ڈالا۔ یہ ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حسب ذیل نام کے تحت شائع ہوا ہے:

The Koran Interpreted

قرآن ایک ایسا کلام ہے جو اپنے اندر بے پناہ تسخیری قوت رکھتا ہے۔ اپنی خاموش معنویت کے اعتبار سے بھی، اور اپنی غیر معمولی ربانی آواز کے اعتبار سے بھی۔

غلطی کی اصلاح

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ابتدائی مقابلہ میں ایرانی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں ایرانی گھبرا اٹھے۔

اس وقت رستم ایران کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو جمع کرکے مشورہ کیا کہ عربوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے کس ایرانی بہادر کو مقرر کیا جائے۔ سب نے بہمن جادویہ کا نام لیا۔ چنانچہ رستم نے بہمن جادویہ کو ۱۲ ہزار فوج ۳۰۰ جنگی ہاتھی اور دوسرے ضروری سامان دے کر عربوں کی طرف روانہ کیا۔ بہمن جادویہ کو جو سامان دیئے گیے ان میں درفش کاویانی بھی تھا۔ جس کی نسبت ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ جس فوج کے ساتھ یہ جھنڈا ہو اس کو کبھی شکست نہیں ہوسکتی۔ یہ واقعہ ۱۳ ھ (۶۳۵ ء) کا ہے۔

بہمن جادویہ چلتا ہوا دریائے فرات کے کنارے مقام ناطف میں آکر مقیم ہوا۔ دوسری طرف ابو عبید بن مسعود ثقفی اسلامی لشکر کے ساتھ فرات کے دوسرے کنارے مقام مروحہ میں مقیم تھے۔ بہمن جادویہ نے ابو عبیدہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم دریا پار کرکے ادھر آتے ہو یا ہم دریا پار کرکے تمہاری طرف آئیں۔ ابو عبید ثقفی نے جوش شجاعت میں یہ کہلا دیا کہ ہم دریا پار کرکے آتے ہیں۔

اسلامی لشکر نے ایک چھوٹے پل کے ذریعہ فرات کو پار کیا۔ جب وہ دوسری طرف پہونچے تو صورت حال یہ تھی کہ پیچھے کی طرف فرات کا چوڑا دریا تھا جو وسیع جنگی نقل و حرکت میں مانع تھا۔ دوسری طرف سامنے بہمن جادویہ کا مسلح لشکر تھا جس کے آگے جنگی ہاتھی صف باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان ہاتھیوں پر تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ لشکر اسلام پر بھرپور تیروں کی بارش کرسکیں۔

مسلمان اس وقت گھوڑوں پر تھے۔ ان کے گھوڑوں نے اس سے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکنے لگے۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے گھوڑے ان کے قابو سے باہر ہورہے ہیں تو وہ گھوڑوں سے کود کر زمین پر آگیے اور پیادہ پا لڑنے لگے۔ مگر یہ طریقہ مزید خطرناک ثابت ہوا۔ ہاتھیوں نے جب آگے بڑھ کر مسلمانوں کی صفوں پر حملہ کیا اور انھیں کچلنا شروع کیا تو مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔

اس خونی معرکہ کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے کئی سردار اور خود ابو عبید

مسعود ثقفی کو ہاتھیوں نے اپنے پیروں کے نیچے کچل دیا۔ مسلمانوں نے پیچھے ہٹنا چاہا تو وہاں دریا ان کی راہ میں
تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ دریا میں غرق ہوگیے۔ مسلم فوجیوں کی تعداد اس وقت ۹ ہزار تھی۔ اس
سے تقریباً ۶ ہزار افراد جنگ میں کام آگیے۔

مسلمانوں کی بچی کھچی فوج دریائے فرات کے دوسری طرف جمع ہوئی۔ اب ایک صورت یہ تھی
ان کے شاعر اور خطیب اٹھتے اور اپنی شکست کو شہادت قرار دے کر اس کو گلوریفائی کرتے۔ جیسے
موجودہ زمانہ کے مسلمان کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے پورے معاملہ
پر نظر ثانی کی اور اس کا اعتراف کیا کہ دریا کے اُس پار میدانِ جنگ بنا کر انھوں نے غلطی کی تھی۔

اب ایک طرف مسلمان مزید فوج جمع کر کے تیاری کرنے لگے، اور دوسری طرف ایرانیوں نے
اپنے سردار مہران ہمدانی کو سالارِ جنگ بنا کر بہت بڑی فوج کے ساتھ دوبارہ مسلمانوں سے لڑنے
کے لیے بھیجا۔ مہران ہمدانی جب فرات کے کنارے پہونچا تو اس نے مسلم فوج کے سردار مثنیٰ کو
یہ پیغام بھیجا کہ تم دریائے فرات کو پار کر کے ہماری طرف آتے ہو یا ہم دریائے فرات کو پار کر کے
تمہاری طرف آئیں۔ مسلم سردار نے دوبارہ وہ غلطی نہیں کی جو پہلی بار ان سے ہوگئی تھی۔ انھوں
نے کہلا دیا کہ تم ہی فرات کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب دونوں فوجوں میں جب لڑائی ہوئی تو معاملہ برعکس تھا۔ ایرانی فوج کے پیچھے دریا تھا اور
سامنے اسلامی لشکر۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے آگے ایرانی فوج تھی اور پیچھے کھلی
زمین۔ اس طرح میدانِ مقابلہ ایرانیوں کے خلاف اور مسلمانوں کے موافق ہوگیا۔ ایرانی فوج نے حسبِ معمول
زبردست حملے کیے۔ انھوں نے اپنے ہاتھیوں کو بھی استعمال کیا مگر آخر کار انھیں شکست ہوئی۔ اسلامی
سپہ سالار مثنیٰ ابن حارثہ نے دریا کے اوپر لکڑی کے پل کو توڑ دیا تھا۔ چنانچہ ایرانی فوج جب پیچھے کی طرف
بھاگی تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی تلوار سے بچنے کی کوشش میں دریا کی موجوں
میں غرق ہو جائے۔ ابن خلدون کی روایت کے مطابق ایرانی لشکر کے تقریباً ایک لاکھ آدمی مقتول
ہوئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں جو لوگ اس جنگ میں کام آئے ان کی تعداد صرف ایک ہزار
تھی۔ یہ واقعہ رمضان ۱۳ھ میں پیش آیا۔

شکست کے بعد فتح کا یہ عظیم واقعہ اپنی غلطی کی اصلاح کا کرشمہ تھا۔

عورت جنگ میں

روسی زبان میں ایک کتاب عورتوں کے بارہ میں چھپی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ماسکو سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے :

S. Alexiyerich, *War's Unwomanly Face*, Progress Publishers, Moscow

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۱) چھڑی تو روسی حکومت نے اپنے شہریوں سے جذباتی اپیلیں کیں اور مادر وطن (Motherland) کو بچاؤ کا نعرہ دیا۔ اس سے متاثر ہو کر جو روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ان میں ۸ لاکھ (800,000) عورتیں تھیں جن کی عمریں ۱۵-۱۶ سال کے درمیان تھیں۔

مذکورہ کتاب انھیں خواتین سے متعلق ہے۔ خاتون مصنف نے اپنی ۴ سالہ تحقیق کے دوران ایک سو شہروں کا سفر کیا، انھوں نے دوسو شریک ہونے والی عورتوں کا انٹرویو لیا۔

یہ کتاب مذکورہ عورتوں کے بارے میں بہت سبق آموز معلومات پیش کرتی ہے۔ مثلاً کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد اکثر عورتوں نے اس حقیقت کو چھپانا شروع کیا کہ وہ جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔ "ہم نے چاہا کہ دوبارہ عام لڑکیوں کی طرح ہو جائیں، شادی کے قابل لڑکیاں"۔

We wanted to become ordinary girls again. Marriageable girls.

کتاب کی مصنف جنگ میں شریک ہونے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون سے ملیں جن کا نام ویرا سفرمونا ڈوڈوا (Vera Safrmovna Davdova) تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات کتاب کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ وہ یقین رکھتی ہیں کہ جنگ میں عورتوں کا ردّعمل مکمل طور پر مردوں سے مختلف تھا۔ مردوں کا فیصلہ کسی تجربہ کے بارے میں زیادہ وقتی اور مبنی برحقیقت ہوتا تھا۔ جب کہ عورتیں بہت زیادہ جذباتی انداز میں اپنا ردّعمل ظاہر کرتی تھیں :

She believes that women reacted to war in a completely different way from men. The men were more matter-of-fact and casual about the experience, whereas the women reacted in an overwhelmingly emotional manner.

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی فطرت اور ان کی پیدائشی صلاحیت کے بارہ میں کثرت سے تحقیقات کی گئی ہیں۔ عورت کی صنف کو خالص سائنسی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ عورت پیدائشی طور پر زود حس ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں جذباتی (Emotional) واقع ہوئی ہے۔ یہ دریافت واضح طور پر بتاتی ہے کہ عورتوں کو زندگی کے ایسے شعبوں میں داخل کرنا درست نہیں جہاں ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو۔ جہاں حالات کا تاثر قبول کیے بغیر رائے قائم کرنا پڑے۔ جہاں "مردانگی" کی ضرورت ہو نہ کہ "نسوانیت" کی۔

سیاست کا شعبہ، جنگ کا میدان، بین اقوامی معاملات، عدالتی قضیے، بڑے بڑے صنعتی منصوبے، اس طرح کے تمام شعبوں میں ذہنی ڈسپلن اور غیر جذباتی فیصلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ان امور میں وقتی محرکات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے تمام مواقع پر عورتیں اپنی فطری جذباتیت کی بنا پر غیر موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد نسبتاً غیر جذباتی ہونے کی بنا پر زیادہ بہتر ردعمل پیش کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

عورت اور مرد کا یہی پیدائشی فرق ہے جس کی بنا پر اسلام میں دونوں کا میدان کار الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ درجہ کے فرق کی بات نہیں ہے بلکہ عمل کے میدان میں فرق کی بات ہے۔ یہ تفریق سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں نام نہاد آزادئ نسواں کے علمبرداروں کا طریقہ غیر سائنسی ہے نہ کہ اسلام کا طریقہ۔

کتنا فرق

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مدینہ میں نفاق نے سر اٹھایا اور عرب اور عجم میں ارتداد پھیل گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے عرب کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ اس وقت خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کہا کہ ان عربوں نے اپنی بکریوں اور اپنے اونٹوں کو روک دیا ہے۔ اور اپنے دین سے پھر گیے ہیں۔ اور عجم کے لوگ نہاوند میں جمع ہیں تاکہ ہم سے جنگ کریں۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ وہ شخص جس کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی تھی وہ وفات پاگیا۔ اے لوگو اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد لوگ سر جھکا کر خاموش ہو گیے اور دیر تک خاموش رہے۔ آخر حضرت عمر بن الخطاب گویا ہوئے اور انھوں نے کہا (فأطرقوا طويلاً ثم تكلم عمر بن الخطاب رضي الله عنه، فقال) حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۴۳۲)

حضرت ابوبکر صدیق کے سوال کے بعد لوگ کیوں دیر تک خاموش رہے۔ اس کی وجہ ان کی سنجیدگی اور ان کا تقویٰ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے سوچتے تھے اور اس کے بعد بولتے تھے۔ وہ ہر قول اور ہر فعل سے پہلے اللہ سے ہدایت اور رہنمائی کی دعا کرتے تھے۔ جب خلیفۂ اول نے مذکورہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو اپنے مزاج کے مطابق سب کے سب سوچ میں غرق ہو گیے۔ ہر ایک دل ہی دل میں اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ہر ایک پر خاموشی طاری کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ خاموشی ایک عظیم گفت گو تھی، ان کا یہ سر جھکانا سب سے بڑا اقدام تھا۔ چنانچہ وہ جب بولے تو ان کا بول تمام بولوں پر بھاری ہو گیا۔ جب وہ اٹھے تو ان کا اٹھنا تمام دشمنوں کو پست کرنے کے ہم معنی بن گیا۔ کیوں کہ ان کا بول خدا کی رہنمائی کے تحت تھا، ان کے اقدام میں خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

اب دیکھیے کہ اس معاملہ میں موجودہ مسلمانوں، خاص طور پر ان کے رہنماؤں، کا کیا حال ہے۔ اس کا منظر دیکھنا ہو تو مسلمانوں کی کسی ایسی مجلس میں شریک ہو کر دیکھ لیجیے جو اس نوعیت کے

ہنگامی مسئلہ پر اکٹھا ہوئی ہو۔ مثلاً فلسطین، فرقہ وارانہ فساد، بابری مسجد، سلمان رشدی۔ جیسے مسائل۔
پ دیکھیں گے کہ موضوع کا ذکر چھڑتے ہی ہر آدمی لسانی جہاد کا شہنشاہ بن گیا ہے۔ ہر آدمی پرجوش
طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بولے، اور آتشیں الفاظ کی پوری ڈکشنری کو بیک وقت
پنی زبان سے دہرا ڈالے۔

مگر یہ لفظی جوش دکھانے والے عمل کے وقت پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔ مارچ کے موضوع
پر تقریروں کا دریا بہانے والے مارچ کی تاریخ آنے کے بعد خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ رہتے ہیں۔
ول میں آگے رہنے والے عمل میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بحث میں سب سے پہلے کھڑے ہونے والے اس
وقت سر جھکا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں جب کہ عملی اقدام کا وقت سر پر آگیا ہو۔

جو برتن جتنا زیادہ خالی ہو، وہ اتنا ہی زیادہ آواز دیتا ہے۔ اسی طرح جو آدمی جتنا زیادہ بے عمل
ہو اتنا ہی زیادہ وہ پُرشور الفاظ بولتا ہے۔ بولنے والے کرتے نہیں، اور کرنے والے بولتے نہیں۔
اور حقیقت کی دنیا میں کرنے کی قیمت ہے نہ کہ بڑے بڑے الفاظ ہوا میں بکھیرنے کی۔

قیمت میں اضافہ

مہنگائی میں غیر معمولی اضافہ کی بنا پر تمام اخبار اور رسالے اپنی قیمتیں بڑھا چکے ہیں۔ مجبوراً
فیصلہ کیا گیا ہے کہ الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ ماہ اکتوبر
۱۹۸۹ سے دونوں کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی:

فی شمارہ	پانچ روپیہ
سالانہ چندہ	ساٹھ روپیہ

صاحبانِ ایجنسی اگر تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو فوراً مطلع فرمائیں۔

الٹا نتیجہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز عرب کے شہر مکہ سے کیا۔ اس وقت مکہ میں قبیلہ قریش کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ وہ آپ کے سخت مخالف ہوگیے۔

اس ابتدائی زمانہ میں قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کارروائیاں کیں، ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ وہ ولید بن المغیرہ کے پاس جمع ہوئے جو ان کے درمیان اپنی دانشمندی اور اپنی تجربہ کاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ انھوں نے ولید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ محمد کے بارے میں ایسی باتیں لوگوں کے درمیان پھیلادیں کہ وہ ان سے متوحش ہوجائیں اور ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کے درمیان مشورہ ہوا کہ لوگوں کے سامنے محمدؐ کی تصویر کس طرح پیش کی جائے۔ کسی نے کہا کہ ہم یہ مشہور کریں کہ وہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو دیوانہ بتائیں۔ کسی نے یہ کہا کہ ہم ان کو شاعر کہیں۔ ولید نے اس قسم کی تمام رایوں کو رد کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہم کاہن اور دیوانہ اور شاعر کو جانتے ہیں۔ محمد کا کلام ان میں سے کسی کے کلام کے مشابہ نہیں۔ تم اس قسم کی جو بات بھی لوگوں سے کہوگے، اس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہو جائے گا (وَمَا انتم بقائلين من هذا شيئاً الا عُرِف أنه باطل) صفحہ ۲۸۴

لوگوں نے ولید سے کہا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم محمدؐ کو کیا کہیں۔ اس نے کہا کہ سب سے قریب تر بات یہ ہے کہ ان کو جادوگر بتایا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا ساحرانہ کلام پیش کر رہے ہیں جس کے ذریعہ سے خاندان کے افراد میں جدائی ہوگئی ہے اور ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے کٹ گیا ہے۔

قریش کے لوگ اس رائے پر متفق ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گیے۔ اس کے بعد جب حج کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ زیارت کعبہ کے لیے مکہ آنے لگے تو قریش کے مخالفین مکہ کے چاروں طرف راستوں پر بیٹھ گیے۔ جو شخص ان کے پاس سے گزرتا اس کو روکتے اور بتاتے کہ دیکھو، یہ شخص (محمدؐ) جادوگر ہے۔ وہ ساحرانہ باتیں کرتا ہے۔ تم

اس سے بچ کر رہو۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے اس متفقہ رائے پر باقاعدہ عمل کیا۔ چنانچہ حج کے بعد جب یہ تمام آنے والے لوگ اپنی بستیوں کو واپس ہوئے تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ خبر بھی اپنے ساتھ لے گیے۔ اور جو لوگ زیارت کعبہ کے لیے مکہ نہیں آسکے تھے ان کو قریش کی بات بتانے لگے۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ عرب کے تمام شہروں میں پھیل گیا۔ (فانتشر ذکرہ فی بلاد العرب کلھا) سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، ۲۸۶۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر رفع ذکر (الانشراح ۴) کہا گیا ہے۔ جب حق کا ایک داعی حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن کے قیادتی مصالح یا معاشی مفادات اس سے ٹکرا رہے ہوں۔ وہ دعوت اور داعی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف بے بنیاد الزامات گڑھتے ہیں اور ان کو چاروں طرف پھیلاتے ہیں تاکہ داعی لوگوں کے درمیان بدنام ہو جائے۔ لوگ اس کی باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دیں۔

مگر لوگوں کی مخالفانہ کوششوں کا عملی نتیجہ برعکس صورت میں نکلتا ہے۔ داعی کو بدنام کرنے کی کوشش داعی کے پیغام کو پھیلانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بدنام کرنے کی کوشش عملاً لوگوں کے اندر تجسس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ وہ داعی اور دعوت کے بارہ میں مزید جاننے کے شائق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دعوت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک معقولیت پسند مخلوق ہے۔ وہ کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس کی عقل بھی اس کے حق میں گواہی دے رہی ہو۔ چنانچہ مخالفین جب اپنی بے بنیاد باتیں لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں تو خود اپنی اندرونی فطرت کے تقاضے کے تحت لوگ اس کا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں مزید تفصیلات جانیں اور پوری معلومات کی روشنی میں اپنی رائے قائم کریں۔

اس طرح داعی کے مخالفین اس بات کا ذریعہ بنتے ہیں کہ داعی جن لوگوں تک بذات خود نہیں پہونچا تھا ان لوگوں تک بھی داعی کی بات پہونچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ داعیٔ حق کے خلاف پروپیگنڈا ہمیشہ داعی کے خانہ میں جاتا ہے۔ اس طرح زیادہ وسیع حلقہ میں داعی کی بات پہونچ

ہے۔ وہ خود تلاش کر کے داعی کے کلام تک پہونچتے ہیں اور اس کو سن کر یا پڑھ کر تفصیلی بات حاصل کرتے ہیں۔ اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی کی طلب تھی وہ داعی کے دین کو اختیار کر کے اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

آدمی اگر صحیح معنوں میں حق کو لے کر اٹھے تو نہ صرف اس کا براہ راست عمل دعوت کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ مخالفین کا مخالفانہ عمل بھی بالواسطہ طور پر اس کی دعوت کی توسیع واشاعت کا ذریعہ بن جاتا ہے ـــــ مخالف کی مخالفت سے نہ گھبرائیے، بلکہ اپنے آپ کو پوری طرح حق پر کھڑا کر لیجئے۔ اور اس کے بعد آپ کے مخالفین کا منفی شور وغل بھی آپ کے حق میں ایک مثبت سرمایہ بن جائے گا۔

ایک اور اقلیت

مسٹر بی ایم بھاٹیا کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۸۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— ہندستان میں دو قومیں ہیں، ایک مغربی تعلیم یافتہ، اور دوسرے بقیہ لوگ :

Two Nations In India: Western Educated And Others

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مارکس نے صاحب جائداد اور بے جائداد کی بنیاد پر انسانوں کو دو طبقہ میں تقسیم کیا ہے۔ ہندستان میں ایسی کوئی تقسیم موجود نہیں۔ البتہ ایک اور تقسیم ہے جس نے ہندستان کو ایک طبقاتی سماج (Class society) بنا دیا ہے۔ ان میں سے ایک انگریزی تعلیم یافتہ مغربی طبقہ (English educated, westernised class) ہے۔ اور دوسرا عوام کا طبقہ جو جاہل یا غیر انگریزی تعلیم یافتہ ہے۔ ثانی الذکر طبقہ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔ جب کہ اول الذکر طبقہ بمشکل پوری آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ ہے۔

ملک کی دولت کا ۵۰ فی صد حصہ اسی ۲۰ فی صد آبادی کے پاس ہے۔ وہی انتظامی عہدوں پر قابض ہے، اسی کے ہاتھ میں ملک کی صحافت ہے۔ وہی تمام علمی اور تعلیمی اداروں پر چھایا ہوا ہے۔ وہی عملاً، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، پورے ملک کو چلا رہا ہے۔ ہندستان میں انگریزی تعلیم برٹش انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ میں شروع کی تھی۔ اب ڈیڑھ سو سال بعد یہ طبقاتی عمل اپنی آخری حد (Culmination) پر پہونچ چکا ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان کی آزادی طبقاتی تقسیم کے اس عمل کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ (صفحہ ۶)

اس واقعہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو مسٹر بھاٹیا نے بیان کیا ہے۔ تاہم اس میں ایک خوش آئند پہلو بھی ہے۔ اس تقسیم نے اس ملک میں کسی حقیقی اصلاحی کام کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ آپ یہاں کی آبادی کے ۲۰ فی صد حصہ پر کام کر کے پوری آبادی تک پہونچ سکتے ہیں۔ آپ غالب اقلیت پر براہِ راست اشاعتِ افکار کا کام کیجئے، اور بقیہ ۸۰ فی صد اکثریت تک آپ کی دعوت بالواسطہ انداز میں پہونچ جائے گی ——— ہر تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے، بشرطیکہ استعمال کرنے والے اس کو استعمال کر سکیں۔

بڑی ترقی

علم النفس کے ماہرین نے انسانی سوچ کی دو قسمیں کی ہیں ـــــــ کنورجنٹ تھنکنگ (Convergent thinking) اور ڈائورجنٹ تھنکنگ (Divergent thinking) کنورجنٹ تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک ہی نقطہ کی طرف مائل رہے۔ ایک چیز اس کے فکر کی گرفت میں آئے مگر دوسری چیز اس کے فکر کی گرفت میں نہ آسکے۔ یہ غیر تخلیقی فکر ہے۔

ڈائورجنٹ تھنکنگ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ڈائورجنٹ تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک رخ سے دوسرے رُخ کی طرف مڑ جائے، وہ ایک چیز کو دیکھے اور اس کے بعد اس کا ذہن دوسری چیز کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسی کا دوسرا نام تخلیقی فکر ہے۔ (۲۴ جنوری ۱۹۸۹)

ایک شخص کسی بستی میں جوتا خریدنے گیا۔ وہاں کی آبادی کافی بڑی تھی۔ مگر وہاں جوتے کی دکان موجود نہ تھی۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس تجربہ سے صرف یہ جانے کہ مذکورہ بستی میں جوتے کی دکان نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے اندر صرف کنورجنٹ تھنکنگ ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس پر یہ تجربہ گزرا تو اس کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس بستی میں جوتے کے گاہک ہیں مگر جوتے کی دکان نہیں، اس لیے اگر یہاں جوتے کی دکان کھول جائے تو وہ بہت کامیاب ہو گی۔ اس نے فوراً وہاں جوتے کی ایک دکان کھول دی اور پھر زبردست نفع کمایا۔

یہ دوسرا شخص وہ ہے جس کے اندر ڈائورجنٹ تھنکنگ ہے۔ اس نے جوتے کی دکان میں ایک نئے کاروبار کی تصویر دیکھ لی۔ اس نے دکان کے نہ ہونے میں دکان کا ہونا دیکھ لیا۔

ڈائورجنٹ تھنکنگ کی صفت ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کے اندر تخلیقیت (Creativity) کی صلاحیت ہو۔ یہی تخلیقیت تمام بڑی ترقیوں کی سب سے اہم شرط ہے۔ انھیں لوگوں نے بڑی بڑی سائنسی دریافتیں کی ہیں جن کے اندر تخلیقی ذہن ہو۔ انھیں لوگوں نے بڑے بڑے سیاسی کارنامے انجام دیے ہیں جو تخلیقی ذہن کے مالک ہوں۔ وہی لوگ اعلیٰ تجارتی ترقیاں حاصل کرتے ہیں جو تخلیقی فکر کا ثبوت دے سکیں۔

اس دنیا میں پانے والا وہ ہے جس نے کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لیا ہو۔

سلیقہ مندی

کمانا مشکل ہے مگر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جو شخص صحیح طور پر خرچ کرنا جانے، وہ کم آمدنی میں بھی زیادہ آمدنی والی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی صحیح طور پر خرچ کرنا نہ جانے، وہ زیادہ آمدنی میں بھی کم آمدنی والے مسائل میں مبتلا رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سلیقہ اور کفایت کے ساتھ خرچ کرنا جانے، اس کو گویا اپنی آمدنی کو بڑھانے کا ہنر معلوم ہو گیا۔ اس نے اپنی آمدنی میں مزید کمائے بغیر اضافہ کر لیا۔ خرچ کرنے سے پہلے سوچئے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آپ کمانے سے پہلے سوچتے ہیں۔ جو کچھ کیجئے منصوبہ بند انداز میں کیجئے، اور پھر آپ کبھی معاشی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے۔

فضول خرچی کا دوسرا نام معاشی تنگی ہے۔ اور کفایت شعاری کا دوسرا نام معاشی فارغ البالی۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے یہاں دو واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

مجھے ایک صاحب کا واقعہ معلوم ہے۔ انھوں نے ایم ایس سی کیا۔ اس کے بعد ان کو ۴۰۰ روپیہ ماہوار کی سروس ملی۔ انھوں نے طے کیا کہ اس رقم میں سے صرف دو سو روپیہ کو میں اپنی آمدنی سمجھوں گا اور بقیہ دو سو کو سیونگ اکاونٹ میں جمع کروں گا۔ ان کی تنخواہ بڑھتی رہی ــــ ایک ہزار، ۲ ہزار، ۳ ہزار، ۴ ہزار، ۵ ہزار۔ مگر انھوں نے ہمیشہ کل تنخواہ کے نصف کو اپنی آمدنی سمجھا اور بقیہ نصف کو ہر ماہ بینک میں جمع کرتے رہے۔

اس طرح کی دس سالہ زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے اپنا اکاؤنٹ دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم جمع ہو چکی ہے۔ اب انھوں نے سروس چھوڑ کر بزنس شروع کر دیا۔ آج وہ اپنے بزنس میں کافی ترقی کر چکے ہیں۔ مگر زندگی کا جو طریقہ انھوں نے ابتدا میں اختیار کیا تھا اسی پر وہ آج بھی قائم ہیں۔ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

اب اس کے برعکس مثال لیجئے۔ ایک صاحب کو وراثتی تقسیم میں یک مشت ایک لاکھ روپیہ ملا۔ انھوں نے اس کے ذریعہ سے کپڑے کی ایک دکان کھولی۔ دکان بہت جلد کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر چند سال کے بعد ان کی دکان ختم ہو گئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے آمدنی اور لاگت کے فرق کو نہیں سمجھا۔ مثلاً ان کی دکان پر اگر ۵ ہزار روپیہ کا کپڑا بکے تو اس میں ساڑھے چار ہزار روپیہ لاگت کا ہوتا تھا اور ۵۰۰ روپیہ آمدنی کا۔ مگر وہ دکان میں آئی ہوئی رقم کو اس طرح خرچ کرنے لگے جیسے کہ ۵ ہزار کی پوری رقم آمدنی کی رقم ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ فضول خرچی کی بدترین شکل تھی۔ چنانچہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہو کر ختم ہو گیے۔

اس دنیا میں سلیقہ مند زندگی کا نام خوش حالی ہے اور بے سلیقہ زندگی کا نام بدحالی۔

تخریب، تعمیر

ٹائمس آف انڈیا ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ (سکشن ۲، صفحہ ۴) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— سپر کمپیوٹر میں امریکہ سے آگے بڑھ جانے کے لیے جاپان کی کوشش:

Japan's bid to excel the US in supercomputers

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سپر کمپیوٹر کے میدان میں امریکہ کا طویل مدت کا غلبہ اب مشتبہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کی ایک کارپوریشن کے تجزیہ کاروں نے مطالعہ کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ جاپان کا بنایا ہوا ایک سُپر کمپیوٹر ۱۹۹۰ میں مارکیٹ میں آجائے گا۔ یہ دنیا کی سب سے زیادہ تیز کام کرنے والی مشین ہوگی۔

جاپانیوں نے اس نئے کمپیوٹر کا نام ایس ایکس ایکس (SX-X) رکھا ہے۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ ہے کہ وہ ایک سکنڈ میں سائنٹفک قسم کے حساب کے ۲۰ بلین آپریشن کر سکتا ہے۔ یہ جاپانی کمپیوٹر امریکہ کے تیز ترین کمپیوٹر سے ۲۵ فیصد زیادہ تیز رفتار ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ کامل صحت کارکردگی کے ساتھ نسبتاً وہ کم خرچ بھی ہے۔

اس سُپر کمپیوٹر کی اہمیت صرف سائنٹفک ریسرچ، تیل کی تلاش اور موسم کی پیشین گوئی جیسی چیزوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ نیشنل سیکورٹی کے لیے بھی بے حد اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

نئے جاپانی کمپیوٹر نے دنیا کو ایک نئے صنعتی دور میں پہونچا دیا ہے۔ موجودہ کمپیوٹر جو کسی زمانہ میں "جدید" سمجھے جاتے تھے، اب وہ روایتی اور تقلیدی بن کر رہ گیے ہیں۔ حتی کہ جاپان کی اس ایجاد نے اس کو خود فوجی میدان میں بھی برتری عطا کر دی ہے۔

امریکہ نے "سپر بم" بناکر ۱۹۴۵ میں جاپان کو تباہ کر دیا تھا۔ مگر وہ جاپان سے یہ امکان نہ چھین سکا کہ وہ "سُپر کمپیوٹر" بناکر دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لے اور صرف ۴۵ سال کے اندر تاریخ کا رُخ موڑ دے۔ تخریب، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، وہ تعمیر کے مواقع کو ختم نہیں کرتی، اور تعمیر کی طاقت، بہر حال تخریب کی طاقت سے زیادہ ہے۔

یکساں انجام

کارل مارکس کی لڑکی لورا (Laura) اور اس کے داماد پال لافراگ (Paul Lafargue) نے ۱۹۱۱ میں اجتماعی خودکشی کر لی تھی۔ اس خودکشی کا سبب مفلسی تھا۔ اشتراکی مفکر نے اپنے مشن کی تبلیغ میں اپنا سارا اثاثہ ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی اور داماد کے معاشی حالات بے حد سخت ہوگئے۔ آخر کار دونوں نے تنگ آکر یک وقت اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

کارل مارکس کی وفات کے بعد اس کے اشتراکی خیالات روس میں پھیلے۔ یہاں تک کہ روس میں اشتراکی انقلاب آگیا۔ ولادیمیر لینن پہلی اشتراکی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے زیادہ طاقت ور حکمراں تھا جو ایک وسیع ملک پر مکمل کنٹرول رکھتا تھا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ کو اس کا انتقال ہوگیا۔

وفات سے پہلے لینن پر فالج کا حملہ ہوا۔ ایک عرصہ تک وہ اس طرح اپنے کمرہ میں پڑا رہا کہ وہ نہ ٹھیک طرح چل سکتا تھا اور نہ کچھ بول سکتا تھا۔ آخر کار زندگی سے عاجز آکر اس نے جوزف اسٹالن کو خط لکھا کہ وہ اس کو تھوڑی سی پوٹاشیم سائنائڈ (Potassium cyanide) فراہم کرے۔ تاکہ وہ اس کو کھا کر اپنا خاتمہ کر سکے۔ واضح ہو کہ پوٹاشیم سائنائڈ نہایت مہلک زہر ہے۔ منھ میں داخل ہوتے ہی وہ آدمی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

یہ انکشاف روس کے ممتاز ناول نگار الکزینڈر بک (Alexander Bek) کے ذاتی آثار سے ہوا ہے۔ ان کے ذاتی آثار میں لینن اور اسٹالن کی وہ تحریر مل گئی ہے جس سے مذکورہ واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۱۶)

یہ واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں غریبی اور امیری، محکومیت اور حاکمیت دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ ایک دولت مند آدمی بھی بالآخر اسی بے کسی کے مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے جس سے ایک غریب اور مفلس آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔

یہاں ایک اور دوسرے میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔

نیند ایک نعمت

موجودہ زمانہ میں نیند کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ امریکہ (نیویارک) سے ایک سائنٹفک جرنل شائع ہوتا ہے جس کا نام نیند (Sleep) ہے۔ یہ جرنل جس ادارہ سے نکلتا ہے اس کا نام حسب ذیل ہے:

Association of Professional Sleep Societies

امریکہ میں جو لوگ نیند کے اکسپرٹ سمجھے جاتے ہیں ان میں سے ایک ڈاکٹر جیمز اے ہارن (James A. Horne) ہیں۔ انھوں نے نیند سے متعلق سائنسی انداز سے ریسرچ کی ہے اور اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ ان کی رپورٹ نیویارک ٹائمز میں چھپی ہے جس کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ جنوری ۱۹۸۹) میں مختصر طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے کہ سوؤ، اگر تم تخلیقی بننا چاہتے ہو:

Sleep—if you want to be creative.

ڈاکٹر جیمز ہارن کا کہنا ہے کہ نیند کے متعلق نئی دریافتیں بتا رہی ہیں کہ نیند کا ایک خاص عمل یہ ہے کہ وہ انسان کے دماغ میں شعور سے ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو درست کرتی ہے:

The new findings seemed to support the view that one primary function of sleep is to "repair the cerebral cortex from the wear and tear of consciousness."

عام تجربہ یہ ہے کہ آدمی شام کو تھکا ہوا ہوتا ہے۔ دن بھر کے واقعات و حوادث اس کے ذہن میں تناؤ کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ مرجھائی ہوئی روح کے ساتھ بستر پر لیٹتا ہے۔ مگر چند گھنٹے سو کر جب وہ صبح کو دوبارہ اٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو تروتازہ پاتا ہے۔ وہ از سر نو اس قابل ہو جاتا ہے کہ زندگی کے معرکے میں بھرپور طور پر اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ دوبارہ ایک نیا انسان بن جائے۔

آدمی کو یہ نئی زندگی نیند کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ نیند اس کے ذہن کی مرمت کر کے اس کو تازہ دم بنا دیتی ہے۔ اگر نیند کا نظام نہ ہو تو انسانی مشین تھوڑے ہی دنوں میں ناکارہ ہو کر رہ جائے۔

کراہتِ حق

قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر کہا گیا ہے کہ ہم نے لوگوں کے پاس حق بھیجا۔ مگر اکثر لوگ حق سے بیزار رہے (المومنون ۷۰، الزخرف ۷۸) قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اسلام قبول کر۔ آدمی نے کہا کہ آپ مجھ کو ایک ایسی چیز کی طرف بلاتے ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تمہیں پسند نہ ہو تب بھی (قال قتادة : ذكر لنا ان النبي صلى الله عليه وسلم لقي رجلاً فقال : اسلم۔ فقال الرجل انك لتدعوني الى امر انا له كاره۔ فقال نبي الله صلى الله عليه وسلم : وان كنت كارهاً)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے لیے عمل کے دو راستے ہیں۔ ایک، اتباع حق۔ اور دوسرے، اتباع اہوار (المومنون ۷۱) حق پر چلنے کے لیے آدمی کو سوچ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اہوار (خواہشات) کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر سے اپنے آپ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں آدمی ابتدائی طور پر خواہشات کے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اور حق پر چلنے کے لیے خواہشات کو دبانا اور نفس کے تقاضوں پر صبر کرنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں اگر کوئی ایسی تحریک اٹھے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو تو اس کا ساتھ دینے کے لیے لوگوں کو کسی محنت یا قربانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ تو وہی راستہ ہوتا ہے جس پر لوگ عملاً پہلے ہی سے قائم ہوتے ہیں۔ ایسی تحریک کے ساتھ چلنے کے لیے لوگوں کو اپنا راستہ بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کے گرد بہت جلد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو وہ گویا راستہ بدلنے کی دعوت ہوتی ہے۔ اس کو ماننا یہ تقاضا کرتا ہے کہ آدمی اپنی سوچ کو بدلے۔ اپنے جذبات پر روک لگا کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف موڑ دے۔ مزید یہ کہ حق کی دعوت کو ماننا لوگوں کے لیے عزت اور ساکھ کا سوال بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ حالتِ موجودہ میں حق کو ماننا دوسرے لفظوں میں یہ کہنے کے ہم معنی ہوتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"

یہی وجہ ہے کہ جب بھی بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو اکثر لوگ اس کو ماننے میں کراہت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

ایک آیت

فاستقم کما امرت ومن تاب معك ولا تطغوا انه بما تعملون بصير ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود ۱۱۲-۱۱۳)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جس نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے ۔

اس آیت میں جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے وہ بے آمیز دعوت پر استقامت ہے۔ ور عدم رکون (نہ جھکنے) سے مراد یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہرگز کوئی خارجی اثر قبول نہ کرو۔ ہر حال میں سی دعوتِ توحید پر قائم رہو جس کی تمہیں تلقین کی گئی ہے ۔

انسانی سماج میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ غیر خدا کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کبھی خدا لو چھوڑ کر اور کبھی خود خدا کے نام پر۔ اسی لیے جب بھی سچی خدا پرستی کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ نام لوگ بھپر اٹھتے ہیں جو غیر خدائی بنیاد پر اپنی زندگی کا ڈھانچہ کھڑا کیے ہوئے ہوں۔

یہاں داعی بیک وقت دو سخت ترین آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ مدعو کی شتعال انگیزی کے باوجود وہ مکمل طور پر صبر کی روش پر قائم رہے، وہ کسی حال میں صبر و اعراض کی اہ سے نہ ہٹے۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لیے قابلِ قبول بنانے کی خاطر وہ دعوت میں کسی بھی قسم ں لچک نہ دکھائے۔ گویا ایک طرف اصل نکتۂ دعوت پر جماؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں مدعو کا ردِ عمل ندید سے شدید تر کیوں نہ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اپنی داعیانہ تصویر کو برقرار رکھنے کی خاطر عو کے ہر ظلم کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا۔

یہاں جس عدمِ رکون کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی قومی شناخت کو قائم کھنے پر پوری طرح جمے رہو۔ ایسا ہرگز مت کرو کہ ٹوپی اور شیروانی اتار کر ہیٹ اور پتلون پہننے لگو۔ ی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حکمرانوں کے خلاف اپنی تحریک میں کسی قسم کی مصالحت نہ

دکھاؤ، ان کو تخت سے بے دخل کرنے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہ ہو۔ آیت کی ایسی ہر تشریح بالکل لغو ہے۔ قومی عدمِ رکون یا سیاسی عدمِ رکون کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ آیت سراسر آدابِ دعوت سے متعلق ہے۔ یہاں عدمِ رکون سے مراد پیغامِ توحید کے بارہ میں عدمِ رکون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ توحید کے خالص پن (Purity) کو پوری طرح باقی رکھو۔ اس میں کسی بھی قسم کی آمیزش نہ کرو۔ قومی حقوق کا مطالبہ، مادی زیادتیوں کے خلاف احتجاج۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اسلوب دعوت کو بدلنا، عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ان کی دل پسند بولی بولنا۔ دعوت کے اصل نکتہ کے ساتھ ایسی باتوں کو شامل کرنا جس سے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوتی ہو۔ یہ سب رکون میں شامل ہے۔ اور ایسی ہر چیز سے کامل پرہیز داعی کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دعوت کا کام سراسر ایک مثبت کام ہے۔ مگر اس کی صحیح انجام دہی کے لیے دو منفی شرطیں ہیں۔ ایک عدمِ طغیان، اور دوسرے عدمِ رکون۔ امام حسن بصری نے اس بات کو اس طرح بیان کیا کہ اللہ نے دین کو دو لا (نہیں) کے درمیان رکھا ہے۔ تجاوز نہ کرنا، اور جھکاؤ نہ دکھانا۔ (عن الحسن، جعل الله الدين بين لاءين ولا تطغوا ولا تركنوا، تفسير النسفی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں بہت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مکہ میں ۱۳ سال تک مدعو قوم آپ اور آپ کے اصحاب کے اوپر ہر قسم کا ظلم کرتی رہی۔ مگر آپ نے ان کے خلاف کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ یک طرفہ صبر کی روش پر قائم رہے۔ ان کی زیادتیوں کے باوجود آپ نے نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ حقوق طلبی کی مہم چلائی۔

اسی طرح مکہ کے سرداروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم آپ کی دشمنی چھوڑ دیں گے، آپ ہماری صرف ایک شرط کو پورا کر دیں۔ وہ یہ کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ یہ تمام بت دراصل ان کے فوت شدہ بزرگ تھے۔ ان بزرگوں کی تصویر بنا کر وہ ان کو پوجتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنقیدوں کی زد ان پر پڑتی تھی جس سے ان کی عقیدتمندیوں کو سخت ٹھیس لگتی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ ان کی غیر خدائی عقیدتمندیوں پر ضرب نہ لگے تو وہ آپ کو اور آپ کے مشن کو گوارا کر لیں گے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

یہ دونوں چیزیں انسان کے لیے بے حد سخت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے زیادہ سخت چیز اور کوئی اس دنیا میں نہیں۔

مذکورہ آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، اس کی اسی سنگین نوعیت کی بنا پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت شدید ثابت ہوئی تھی۔ البغوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی آیت نہیں اتری جو آپ پر اس آیت سے زیادہ شدید ہو۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ سورہ ہود نے مجھ کو بوڑھا کر دیا (ما نزلت علیٰ عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم آية هي اشد عليه من هذه الآية ولذلك قال: شَيَّبَتْنِيْ سورة هود)

قومی رجحان

ہر قوم کا ایک قومی رجحان ہوتا ہے۔ اس رجحان کا ساتھ دینے سے قوم کے اندر قیادت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس رجحان کے خلاف بولے، وہ قوم کے اندر بے جگہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قوم کے اندر نہ مقبولیت حاصل ہوتی اور نہ قیادت۔

اس معاملہ کو وقت کی ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ہے۔ ہندستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک حل شدہ معاملہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک غیر حل شدہ اور متنازعہ معاملہ ہے۔ چنانچہ دونوں ملک کے لیڈر جب اس مسئلہ پر بولتے ہیں تو وہ اپنے یہاں کے قومی رجحان کی پوری رعایت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کے خلاف بولتے ہی وہ ختم ہو جائیں گے۔

اس کی مثال دونوں ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہندستان میں آنجہانی راج گوپال اچاری نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی ہے، اس کے بعد وہ ملک کے اندر بالکل غیر مقبول ہو گئے۔ اسی طرح پاکستان میں خان عبد الغفار خاں کا کہنا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ آخری طور پر طے ہو چکا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پاکستان میں غیر مقبول ہو کر رہ گئے ——— اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو قرآن میں رکون (ھود ۱۱۳) کہا گیا ہے۔

رکون (جھکاؤ) اگر کسی گروہ کی طرف ہو تو اس سے آدمی کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن جب آدمی گروہی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خالص حق کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے تو وہ لوگوں کے درمیان اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رکون کا راستہ سب سے زیادہ آسان راستہ ہے۔ اور عدمِ رکون کا راستہ سب سے زیادہ مشکل راستہ۔

قوم کا رجحان خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس داعی اصول کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ اب اگر داعی اصول کی بات کہے تو وہ قوم سے کٹ جائے گا، اور اگر وہ قومی رجحان کے مطابق بولے تو حق کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ یہ بے حد نازک امتحان ہے۔ مگر داعی کو لازماً حق بات کہنا چاہیے۔ اگر اس نے "قومی آگ" سے بچنے کی خاطر حق کا اعلان نہیں کیا تو اس کو "خدائی آگ" پکڑ لے گی، اور یقیناً خدا کی آگ، قوم کی آگ سے زیادہ سخت ہے۔

امر المسلمین

ہندستان کے مسلم رہنما جس چیز کو مسلمانوں کے ملی مسائل کہتے ہیں، وہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں۔ یہ مسلمانوں کے اپنے قومی حقوق اور مادی مفادات کا جھگڑا ہے جو انھوں نے اس ملک کی حکومت اور یہاں کے اکثریتی فرقہ کے خلاف بے معنی طور پر چھیڑ رکھا ہے۔ اس قومی عمل کو اسلامی عمل ثابت کرنے کے لیے ان کے رہناؤوں نے ایک حدیث دریافت کر لی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: من لم یہتمّ بامر المسلمین فلیس منھم (جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کے لیے فکرمند نہ ہو وہ ان میں سے نہیں)

ہمارے رہناؤں نے اس حدیث سے "امر المسلمین" کا لفظ لیا اور اس کو موجودہ مسلمانوں کے تمام قومی جھگڑوں پر منطبق کر دیا۔ مگر استدلال کا یہ طریقہ لغویت کی حد تک غلط ہے۔ امر المسلمین سے کون سا "امر" مراد ہے، اس کا تعین قرآن وسنت سے ہوگا، نہ کہ موجودہ مسلمانوں کے اپنے قومی رواجوں سے۔

اس حدیث میں امر المسلمین کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان نامی گروہ جس چیز کو بھی اپنا امر (معاملہ) سمجھ لے، وہ مسلمانوں کا امر بن جائے گا، اور اس کے لیے فکرمند ہونا اور اس کے لیے تدبر کرنا ضروری ہو جائے گا۔ امر المسلمین وہ ہے جو خدا ورسول کے نزدیک امر المسلمین ہو نہ کہ خود مسلمانوں کے نزدیک امر المسلمین۔

مکہ کے مسلمانوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی مظلومیت کو ختم کرنے کے ظالموں سے جنگ کریں، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین نہیں مانا اور ان کو یکطرفہ طور پر صبر کرنے کا حکم دیا۔ حدیبیہ کے معاہدہ کی دفعات صحابہ کرام کو "ملی غیرت" کے خلاف معلوم ہوئیں۔ انھوں نے چاہا کہ اسے رد کر دیں اور قریش سے لڑیں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین تسلیم نہیں کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اس معاہدہ کو قبول کر لیں۔ فتح مکہ کے بعد مہاجرین نے چاہا کہ مکہ میں اپنے چھوڑے ہوئے مکانوں پر دوبارہ قبضہ کریں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی امر المسلمین کی حیثیت نہ دی اور مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنے

مقبوضہ مکانوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر مدینہ واپس چلے جائیں۔ وغیرہ، وغیرہ

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی امر کا امر المسلمین ہونا خدا و رسول کی مرضی سے طے ہوگا نہ کہ خود مسلمانوں کی اپنی خواہشات یا اپنی رایوں سے۔

مسلمانوں کے ساتھ پہلے بھی معاملات پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی پیش آئیں گے۔ مگر ان معاملات کے مقابلہ میں مسلمانوں کی روش کیا ہو، اس کا فیصلہ مسلمانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہوگا۔ بلکہ کتاب وسنت کے بے لاگ مطالعہ سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ کس معاملہ میں کون سی روش اختیار کی جائے۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت دو قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ایک، ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑے۔ دوسرا، مسلمانوں کے باہمی اختلافات۔ ان دونوں معاملات میں قرآن وسنت کی واضح رہنمائی موجود ہے۔ مسلم رہنما اگر ان معاملات میں مذکورہ حدیث پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو وہی کام کرنا چاہیے جس کا حکم قرآن و حدیث میں دیا گیا ہے۔

"ہندو مسئلہ" کے متعلق بنیادی بات یہ ہے کہ ہندو ہمارے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ مدعو ہوں، ان کے بارہ میں حکم ہے کہ ان سے نہ مادی اجر طلب کرو اور نہ ان سے قومی نزاع برپا کرو۔ حتی کہ داعی کے اوپر فرض ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں سے یک طرفہ طور پر اعراض کرے۔ مگر ہندستانی مسلمان اس کے سراسر خلاف عمل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں اہتمام بامر المسلمین یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش کی مذمت کی جائے اور ان کو صبر اور اعراض کی روش پر قائم رہنے کی تاکید کی جائے۔

اس کے برعکس اگر مسلم رہنما یہ کریں کہ وہ "ملی مسائل" کے نام پر مسلمانوں کی قومی لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ وہ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات سے ان کی تصدیق اور ہمت افزائی کرنے لگیں تو یہ واضح طور پر حدیث کے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

مسلم رہنماؤں پر فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو بتائیں کہ ہندو ان کے لیے مدعو گروہ کے حکم میں ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں سے قومی اور مادی مسائل پر ہرگز کوئی نزاع نہ چھیڑیں۔ وہ حقوق طلبی کے بجائے محنت کشی پر اعتماد کریں۔ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ مسلم اور ہندو کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنائیں تاکہ اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز کیا جا سکے جو مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت کے نتیجہ میں صدیوں

سے رکا ہوا پڑا ہے۔

"امر المسلمین" کا دوسرا پہلو وہ ہے جو مسلمانوں کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اپنے آخری درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ ہر شہر، ہر محلہ، ہر ادارہ میں اس کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات اور نزاعات میں براہِ راست دخل دیں اور ہر ممکن تدبیر استعمال کرکے اس کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

اس کوشش کا مطلب جلسہ اور تقریر نہیں ہے۔ مسلمانوں کے باہمی نزاعات جلسوں اور تقریروں سے ختم نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی شکل صرف ایک ہے۔ اور وہ اسلام کے اصولِ عدل کے مطابق عملی مداخلت ہے۔ مثلاً انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے۔ اب تمام مسلم لیڈر وہاں پہونچ کر اس غاصب اور خائن کو پکڑیں۔ اس پر ہر قسم کا قولی اور عملی دباؤ ڈال کر اس کو مجبور کریں کہ وہ اپنے غصب اور خیانت سے باز آئے اور حق کو اس کے حق دار کے حوالے کرے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم کا حوالہ دیتے ہیں، مگر وہ مذکورہ بالا دونوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اپنی جھوٹی تقریروں اور سطحی بیانات کے ذریعہ مسلمانوں کی لایعنی قومی مہم میں شریک ہیں۔ یہ صورت حال مذکورہ حدیث کے سراسر خلاف ہے۔ مسلم رہنماؤں نے اگر اپنی موجودہ روش نہ بدلی تو شدید اندیشہ ہے کہ ان کا موجودہ عمل سرکشی اور فساد انگیزی کے خانہ میں لکھا جائے نہ کہ خدا و رسول کے حکم کی بجا آوری کے خانہ میں۔

ضروری اعلان

کشمیر کے غیر معتدل حالات کی وجہ سے ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کو سرینگر کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں کو تکلیف ہوئی اُن سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ناظم ادارہ

قربانی کا تصور اور ہمارا معاشرہ

عید اضحیٰ کے موقع پر ہر سال جو قربانی کی جاتی ہے، اس کا تعلق انسانی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ وہ صحت مند زندگی کی تعمیر کی علامت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں قربانی ایک سالانہ رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب وہ ایک بے روح مذہبی روایت کے طور پر زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سال کے مخصوص دنوں میں رسمی طور پر جانور تو ذبح کر دیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نظر نہیں آتا۔ قربانی کا عمل اگر زندہ اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو ہمارا پورا معاشرہ بالکل بدل جائے۔

قرآن میں قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو اس کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷) گوشت اور خون جانور کے جسم میں ہوتا ہے جس کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اور تقویٰ اس آدمی کے دل کی چیز ہے جو ذبح کرنے والا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اگرچہ جانور کو خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مگر یہ حقیقۃً اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قربانی جانور کا ذبیحہ نہیں بلکہ خود اپنا ذبیحہ ہے۔ یہ ذبح ہونے والے سے زیادہ ذبح کرنے والے کی تصویر ہے۔ بظاہر وہ ایک خارجی عمل ہے مگر باعتبار حقیقت وہ ایک اندرونی عمل ہے۔ اسی شخص کی قربانی صحیح قربانی ہے جس کی ظاہری قربانی اس کی اندرونی قربانی میں ڈھل جائے۔

جانور کو ذبح کرکے آدمی اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خدا کی خاطر اپنی انا کو ذبح کرے گا۔ وہ اپنے مفادات کو قربان کرکے سچائی کے طریقہ پر قائم رہے گا۔ وہ مصلحتوں کو نظر انداز کرکے خدا کے حکم پر چلنے والا بنے گا۔ اس کا نفس اگر خدا کے راستہ میں چلنے میں رکاوٹ بنے گا تو وہ اپنے نفس پر چھری چلا دے گا مگر خدا کے راستہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کرے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو (الکوثر) یہ آیت ایک اعتبار سے، دین کے دو پہلوؤں کو بتاتی ہے۔ ایک عجز و تواضع، اور دوسرے

ایثار و قربانی۔ نماز عجز کی علامت ہے اور جانور کا ذبیحہ قربانی کی علامت۔ یہ گویا دو بنیادیں ہیں جن کے اوپر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ایک اعتبار سے اس کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں عجز مطلوب ہے، اور بندوں کے مقابلہ میں قربانی درکار ہے۔ اللہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں۔ اللہ دینے والا ہے، ہم پانے والے ہیں۔ اللہ آقا ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں واحد چیز جو مطلوب ہو سکتی ہے، وہ عجز و تواضع ہی ہے۔ یہاں بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے بے کمال ہونے کو مانے، وہ اللہ کے مقابلہ میں عاجزی اور فرماں برداری کا طریقہ اختیار کرے۔

قربانی کا عمل کئی اعتبار سے بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس اخلاقی برتاؤ اور انسانی سلوک کا خلاصہ ہے جو قربانی کرنے والے کو اپنے معاشرہ کے اندر پیش آتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کے لئے لٹانا چاہا تو حضرت اسماعیل نے اپنے مقدس باپ سے کہا کہ آپ کو خدا کی طرف سے جو حکم ملا ہے، اس کو کر ڈالئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے (الصافات ۱۰۲) اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کی حقیقت صبر ہے۔ قربانی اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتی کہ آدمی پوری طرح صبر و برداشت کرنے والا بن جائے۔ قربانی کر کے آدمی علامتی طور پر اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں حضرت اسماعیل کی طرح صبر کرنے والا بنے گا۔

صبر اچھے معاشرہ کی واحد بنیاد ہے۔ صبر کے بغیر کبھی صالح اور صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بہت سے آدمی مل کر رہتے ہیں تو ان میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ایک دوسرے کے لئے ناخوشگواری کا باعث ہوتی ہیں۔ ایسا ایک گھر کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ایک بستی میں بھی ہوتا ہے اور ایک پوری قوم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک کمرہ میں پتھر کے بہت سے اسٹیچو رکھے ہوئے ہوں تو ان کے درمیان آپس میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ مگر جہاں زندہ انسان بستے ہوں وہاں اختلاف اور شکایت کا پیش آنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں معاشرہ کو انتشار اور فساد سے بچانے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کے افراد

کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کرلیا کریں۔ لوگ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔

یہ صبر ہمیشہ قربانی مانگتا ہے۔ قربانی کے بغیر صبر و برداشت کا رویہ ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے رویہ سے کسی کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ کسی کا سلوک کسی کی انانیت کو بھڑکا دیتا ہے۔ کسی کی کوئی روش کسی کے لئے اشتعال پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے ہر موقع پر گویا آدمی کے اندر ایک حیوان جاگ اٹھتا ہے۔ اب آدمی کو اپنے اندر جاگنے والے اس حیوان کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اس اندرونی حیوان کی قربانی ہی در اصل حقیقی قربانی ہے۔ کیوں کہ اسی قربانی سے سچی حق پرست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ صالح معاشرہ بنتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں صالح اور صحت مند معاشرہ کہا جاسکے۔

اختلاف اور شکایت کے مواقع پر جاگنے والے اندرونی حیوان کو ذبح کرنا ہی وہ اصل قربانی ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اس قربانی کو پیش کرکے آدمی اس اعلیٰ عمل کا ثبوت دیتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ (الحج، ۳۷) کہا گیا ہے۔

جب آدمی اس نفسیاتی حیوان کی قربانی دیتا ہے، اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ مطلوب صفت پیدا ہوتی ہے جس کو صبر کہا گیا ہے۔ صبر و برداشت اور عفو و اعراض صالح معاشرہ کے قیام کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ صفتیں اندرونی حیوان کو ذبح کرنے کے بعد ہی حقیقی طور پر کسی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن میں قربانی کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ لوگ حج کے لئے آئیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں دئے ہیں۔ پس تم اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ (الحج ۲۸)

اس آیت سے قربانی کے دو مزید پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، خواہ وہ ذبیحہ کا جانور ہو یا کوئی اور ضرورت کی چیز، ان سب کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ چیزوں کے استعمال پر اللہ کا نام لینا، در اصل اس واقعہ

کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ سب چیزیں براہ راست خدا کا عطیہ ہیں۔ اس نے انسانوں کی حاجت اور ضرورت کے لئے یہ تمام چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اب ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہم ان کو خدا کا عطیہ سمجھ کر انھیں استعمال کریں نہ کہ ان کو اپنی عقل یا اپنے دست و بازو کا کارنامہ سمجھ لیں۔

قربانی کے موقع پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حکم ہے کہ اس کو کھاؤ اور کھلاؤ۔ اس طرح قربانی کا عمل آدمی کے اندر فیاضی اور باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ ابھارتا ہے۔ وہ سبق دیتا ہے کہ تم خود کھانے پر اکتفا نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ تم اپنی کمائی کو صرف اپنی چیز نہ سمجھو بلکہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ سمجھو۔ تم صرف اپنا معاملہ درست کر کے مطمئن نہ ہو جاؤ بلکہ دوسروں کے معاملات بھی درست کرنے کی کوشش کرو۔ تم ایک انفرادی انسان بن کر نہ رہو بلکہ معاشرہ کے ایک مفید فرد کی حیثیت سے زندگی گزارو۔ تم انسانیت کے کُل کا ایک صالح جزء بن جاؤ۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قربانی ایک زندہ عمل ہے، نہ کہ محض ایک بے روح قسم کی تاریخی رسم۔ قربانی کا پیغام یہ ہے کہ اپنے وجود کے حیوانی حصہ کو دباؤ اور اپنے وجود کے انسانی حصہ کو زندہ کرو۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے اور یہی قربانی کا اصل پیغام۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

ایک سفر

اپریل ۱۹۶۹ میں میں نے پہلی بار الور (راجستھان) کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد وہاں کے کئی سفر ہوئے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ "میوات کا سفر" نامی کتاب میں موجود ہے۔ الور کا موجودہ سفر ۲۰ مئی ۱۹۸۹ کو ہوا، اور ۲۵ مئی کو دوبارہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔

۵.۰۵ سپر فاسٹ اکسپریس شام کو دہلی سے روانہ ہوئی تو ابھی فضا میں اجالا تھا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ رات آگئی۔ اب ٹرین رات کی تاریکی میں چلنے لگی۔ راستہ میں جب کوئی چھوٹا اسٹیشن آتا تو وہ بالکل سادہ انداز میں آجاتا۔ تاریکی میں چلتے چلتے ہم دیکھتے کہ ٹرین خاموشی سے ایک عمارت میں داخل ہوگئی۔ جہاں چند معمولی روشنیاں بتا رہی ہیں کہ یہ ایک اسٹیشن ہے۔ مگر جب کوئی بڑا اسٹیشن آنے والا ہوتا تو اس کے بہت پہلے سے اس کے آثار دکھائی دینے لگتے۔ عمارتوں اور کارخانوں کے سلسلے نظر آتے۔ اس کے بعد ٹرین کے دونوں طرف روشنیوں کا ہجوم بتاتا کہ ہم ایک بڑے اسٹیشن پر پہونچ گئے ہیں۔

یہی معاملہ چھوٹی یافت اور بڑی یافت کا ہے۔ چھوٹی یافت آدمی کو اس طرح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کوئی بڑی تمہید پیش نہیں آتی۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سادہ طور پر اس کمرہ سے نکل کر اس کمرہ میں داخل ہوگیا۔ مگر بڑی یافت ہمیشہ بڑی تمہید کے ساتھ آتی ہے۔ بڑی یافت سے پہلے طوفانی کڑک چمک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ آدمی کی زندگی زبردست ہلچل سے دوچار ہوتی ہے۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کا ایک دور دھماکہ کے ساتھ ختم ہوگیا، اور دوسرا دور دھماکہ کے ساتھ شروع ہوگیا۔

جو لوگ معتدل زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھیں، جو ہر مصلحت کا آخری حد تک لحاظ رکھتے ہوں، ایسے لوگ صرف چھوٹی یافت تک پہونچتے ہیں۔ وہ کبھی بڑی یافت سے آشنا نہیں ہوتے۔ بڑی یافت صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اپنی زندگی کو طوفانوں میں ڈالیں۔ جو ہیجان خیز لمحات سے دوچار ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ زندگی کے سفر میں چھوٹے اسٹیشن بھی ہیں اور بڑے اسٹیشن بھی۔ یہ مسافر کے اپنے حوصلہ کی بات ہے کہ وہ دونوں میں سے کس

اسٹیشن پر اپنے آپ کو اتارنا پسند کرتا ہے۔

ٹرین میں تقریباً تین گھنٹہ گزارنے کے بعد میں الور پہنچا۔ یہاں اسٹیشن پر مولانا مفتی جمال الدین صاحب اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر مدرسہ اشرف العلوم آیا۔ یہاں میرا قیام اسی مدرسہ کے مہمان خانہ میں تھا۔

الور، راجستھان کا ایک قدیم شہر ہے۔ وہ ایک پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا ہے جس کے اوپر اب بھی ایک پرانے قلعہ کی عمارتیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں پہاڑی قلعے حکمرانوں کی حفاظت کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں وہ صرف ایک تاریخی دور کو یاد دلانے کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ معاشی دوڑ کی مشغولیت نے بہت کم لوگوں کو اس قابل رکھا ہے کہ وہ ماضی کے ان کھنڈروں کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔

الور ۱۷۷۱ میں راجپوت حکمراں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۷۷۵ میں وہ ریاست الور کی راجدھانی بنا۔ ۱۸۰۳ میں الور برٹش اقتدار کے تحت آگیا۔ ۱۹۴۹ سے وہ راجستھان کا حصہ ہے۔

الور کے راجہ ونے سنگھ فارسی اور اسلامیات کے شیدائی تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علما، عرصہ تک ان کے دربار میں رہے۔ انھوں نے تقریباً ۶۰ سال پہلے دو لاکھ روپیہ خرچ کر کے گلستاں اور بوستاں کا ایک نسخہ تیار کرایا تھا جس پر سنہری کام بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ۴۰ ہزار روپیہ خرچ کر کے قرآن کا ایک نسخہ تیار کرایا۔ اس قسم کے بہت سے نوادر آج بھی الور کے میوزیم میں موجود ہیں جو زائرین کو گزرے ہوئے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔

۱۹۳۲ میں مہاراجہ سوائی جے سنگھ (الور) نے اپنی کونسل میں اسپیچ دی تو انھوں نے فارسی اور اردو کے کئی اشعار پڑھے۔ صائب کا ایک شعر یہ تھا:

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد   اگر خارے بود گلدستہ گردد

ان کا نظریہ تھا کہ ان کی ریاست میں ہندو اور مسلمان پیار اور محبت کے ساتھ رہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ تھے۔ اپنی اس پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کونسل کی تقریر میں یہ شعر پڑھا:

دنیائے جہاں میں اے یارو جو کوئی رہے دلشاد رہے
گلشن بھی رہے گلچیں بھی رہے بلبل بھی رہے صیاد رہے

مولانا مفتی جمال الدین صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ الور کے ایک ہندو وکیل کے یہاں گیے۔ اس کے دفتر کی دیوار پر ایک خوبصورت فریم تھا۔ اس میں جلی حرفوں میں یہ فارسی شعر لکھا ہوا تھا :

بترس از خدا و میازار کس رہِ رستگاری ہمین است و بس

انھوں نے مزید بتایا کہ الور میں ایک بار وہ ایک ہندو دکاندار کے یہاں گیے۔ وہ زیادہ عمر کا تھا اور پرانا زمانہ دیکھے ہوئے تھا۔ اس نے اردو کے بہت سے اشعار سنائے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا :

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

الور کے مسافر کو اس طرح کے تاریخی واقعات یہاں کثرت سے سننے کے لیے ملتے ہیں۔ یہ " الور " اور اس طرح کے لاتعداد دوسرے الور ہندستان میں موجود تھے۔ مگر وہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے نتیجہ میں برباد ہو کر رہ گیے۔ مسلمان ۱۹۴۷ کے انقلاب کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ناقابل فہم حد تک احمقانہ قیادت کے سوا کوئی نہیں ہے جس کو اس دردناک المیہ کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ اس نام نہاد قیادت نے مسلمانوں کو دیا کچھ نہیں، البتہ اس کو جو کچھ حاصل تھا اس سے اسے محروم کر دیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں الور کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ یہاں، دوسری تاریخی عمارتوں کے علاوہ، کئی قدیم مسجدیں بھی پائی جاتی ہیں :

It contain..... several ancient mosques (I/285).

مگر یہ بیان صحیح نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ تک الور میں ایک سو سے زیادہ تعداد میں پر رونق مسجدیں موجود تھیں۔ مگر یہ سب مسجدیں آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کی نذر ہو گئیں۔ اب یہاں صرف دو باقاعدہ مسجدیں ہیں جو آزادی کے بعد کے دور میں از سر نو تعمیر کی گئی ہیں۔ ایک، مدرسہ اشرف العلوم کی مسجد، دوسرے، میو بورڈنگ کی مسجد۔ ان کے علاوہ ایک قدیم چھوٹی سی مسجد ہے جہاں ایک " شرنارتھی " خاندان آباد ہے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا مفتی جمال الدین صاحب ۱۹۴۹ میں دوبارہ الور میں آئے۔ موجودہ جگہ اس وقت چٹیل میدان کی صورت میں تھی۔ صرف کچھ ٹوٹے ہوئے پتھر اس بات کی علامت

ٹ کہ یہاں کبھی کوئی عمارت یا کوئی مسجد کھڑی ہوئی تھی ۔ انھوں نے ایک چھپر ڈال کر یہاں تعمیر نو کا آغاز کیا۔
میں پہلی بار اپریل ۱۹۶۹ میں الور آیا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولانا ابراہیم صاحب ایک نیم
ے درخت کے نیچے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دور چھپے ہوئے مستقبل کو تصوراتی آنکھوں
ے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ۲۰ برس بعد آج یہاں دوبارہ ایک پورا ادارہ کھڑا ہو گیا ہے۔
سجد اور مدرسہ کی شکل میں اسلامی سرگرمیاں جاری ہیں ۔ اس علاقہ میں چونکہ یہ واحد اسلامی ادارہ ہے،
س لیے اطراف کے مسلمان اس سے جڑ گئے ہیں ——— ہر بربادی کو دوبارہ آبادی میں تبدیل کیا جاسکتا
ہے ۔ اس دنیا میں کوئی بربادی آخری بربادی نہیں ۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں یہ روایت تھی کہ مسلم ریاست میں ہندو افسران ہوا کرتے تھے،
ر ہندو ریاست میں مسلم افسران ۔ الور کا راجہ ایک ہندو تھا، مگر اس روایت کے تحت یہاں کے
تر بڑے بڑے فوجی اور غیر فوجی عہدے مسلمانوں کے پاس تھے ۔ شہر میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً
۵ فی صد تھی ۔ بہت سے شعبوں (مثلاً طب، وکالت وغیرہ) پر مسلمانوں کو اجارہ داری حاصل تھی۔
ر ۱۹۴۷ کا انقلاب آیا تو یہاں سے تمام مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا ۔ یہاں کی ۱۰۱ مسجدیں ڈھا دی گئیں۔
ب غالباً صرف ایک قدیم مسجد باقی رہ گئی ہے جو ایک "شرنارتھی" کے قبضہ میں ہے ۔

ماسٹر ایوب صاحب نے الور کا سول ایریا دکھایا ۔ چلتے ہوئے ہم لوگ ایک مقام پر پہونچے
ہاں ایک چوک پر اشوک کی لاٹ تھی اور اس کے اندر پارک بنا ہوا تھا ۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے
س چوک پر ایک مسجد تھی جو ننگلی والی مسجد کہی جاتی تھی ۔ ۱۹۴۷ میں یہ مسجد ڈھا دی گئی ۔ اس کے بعد جب
ہر کا ڈولپ منٹ ہوا تو مسجد کی جگہ پر سڑک بن گئی ۔

ماسٹر ایوب صاحب (سابق ایم ایل اے) نے بتایا کہ انھوں نے فروری ۱۹۷۸ میں راجستھان
مبلی میں اس مسجد کی بابت سوال اٹھایا تھا ۔ حکومت کی طرف سے جو تحریری جواب دیا گیا، اس میں
ہا گیا تھا کہ مسجد کے گرنے کے بعد وہاں سڑک تعمیر ہو گئی ہے ۔ تاہم مسجد کے رقبہ کے بقدر ایک پلاٹ
ریب ہی سڑک کے کنارے مسجد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اس پلاٹ کا نمبر بھی انھیں بتایا گیا ۔

ماسٹر ایوب صاحب نے کہا کہ وہ پلاٹ میں نے دیکھا تھا اور وہ پانچ سال سے زیادہ مدت
ک مسجد کے نام پر خالی پڑا رہا ۔ مگر مسلمان اس کو استعمال نہ کر سکے ۔ یہاں تک کہ حسب قاعدہ ضروری مدت

گزرنے کے بعد حکومت نے وہاں اپنی تعمیرات کرالیں ——— موجودہ زمانہ کے مسلمان کھوئے ہوئے مواقع کے لیے فریاد کرنے میں سب سے آگے ہیں مگر ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرنے میں وہ سب سے پیچھے ہو گیے ہیں۔

مولانا محمد حنیف خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۲) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اس کے نقطہ نظر سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی تجربات بتائے۔ ان میں سے دو یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

لال داس کی درگاہ (شیر پور) میں لال داس کی قبر ہے۔ ہندو ان کو ہندو کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔ اس درگاہ کے احاطہ میں تین مسجدیں بھی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۶ میں یہاں جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی۔ کچھ مسلمانوں نے یہاں کی ایک مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر اذان دی اور نماز باجماعت ادا کی۔ اس پر ہندوؤں کو اعتراض ہوا اور دونوں فرقوں میں لڑائی کی نوبت آگئی۔

الور کے ہندی اخباروں (خاص طور پر الور بازار پتریکا) نے خبر کو اس انداز میں شائع کیا کہ مسلمانوں نے لال داس جی کے مندر پر قبضہ کر لیا اور اس کے اندر گھس کر زبردستی نماز پڑھی۔ اور ہندوؤں کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ یہ خبریں چھپیں تو الور میں حالات بگڑ گیے اور فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا کہ شیر پور میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا ہے۔

اس موقع پر مقامی مسلمانوں نے صحیح حالات مرتب کر کے مقامی ہندی اخباروں میں چھپوانا چاہا۔ مگر اخباروں نے ان کے بیانات نہیں چھاپے۔ ہندوؤں سے ملاقات کر کے زبانی وضاحت کی کوشش کی گئی تو وہ بھی بے فائدہ ثابت ہوئی۔ اس وقت کچھ مسلمانوں نے قومی ایکتا منچ کی میٹنگ کی۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ لوگ بھی شریک ہوئے۔

تاہم منچ کی میٹنگ میں کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ لوگوں کے ذہنوں میں ہندی اخبارات میں چھپنے والی رپورٹیں اور افواہیں چھائی ہوئی تھیں۔ آخر میں کچھ مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ قومی ایکتا منچ کے کچھ ذمہ دار افراد شیر پور جائیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک پترکار (اخبار نویس) اور فوٹو گرافر بھی لے جائیں۔ وہ براہ راست معلومات کے ذریعہ رپورٹ تیار کریں اور جائے وقوع کا فوٹو بھی لیں۔

اس کے بعد قومی ایکتا منچ کے تحت ایک وفد شیر پور گیا۔ وہاں اس نے براہ راست مشاہدہ کیا
ور تصویریں لیں۔ واپس آکر انھوں نے ہندی اخبار ارن پربھا میں مفصل رپورٹ شائع کی۔ انھوں
نے بتایا کہ لال داس کی درگاہ میں باضابطہ مسجدیں ہیں اور وہاں مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ انھوں نے مسجدوں
کی تصویریں بھی چھاپیں۔ الور کے ہندوؤں نے جب اس باتصویر رپورٹ کو پڑھا تو اچانک ان کا ذہن بدل
گیا۔ ہر ایک یہ کہنے لگا کہ آر ایس ایس والے ہی غلط ہیں۔ وہ جھوٹا جھگڑا کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں
نے مان لیا کہ مسلمانوں نے کسی مندر پر قبضہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ مسجد کے اندر پرامن طور پر نماز پڑھی ہے۔

ہندی اخباروں کی خبروں اور افواہوں کے خلاف یہاں کے مسلمان اگر مشتعل ہوتے اور تعصب
کی شکایتیں کرتے رہتے تو یقیناً الور میں فساد ہو گیا ہوتا۔ مگر جب انھوں نے دانش مندانہ تدبیر کی تو فرقہ وارانہ آگ
ٹھنڈی ہو گئی۔ اور فرقہ وارانہ فساد کے دہانہ پر پہنچنے کے باوجود الور فساد سے بچ گیا۔

مولانا محمد حنیف خاں صاحب نے میو بورڈنگ (الور) کا واقعہ بتایا۔ وہ میو بورڈنگ کی مسجد میں
امام اور خطیب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں یہاں بورڈنگ کے سامنے مسلمانوں نے کچھ چھوٹی
چھوٹی دکانیں لگالیں۔ میونسپل کمیٹی کے لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا کہ یہ سرکاری جگہ پر بلا اجازت بنائی
گئی ہیں۔ انھوں نے پولیس کی مدد سے دکانیں ہٹوادیں۔ میوؤں کا ایک وفد کلکٹر کے پاس فریاد لے کر
گیا۔ مگر کلکٹر نے ان کو سخت جواب دے کر واپس کر دیا۔

اس کے بعد کچھ مسلمانوں نے دوسری تدبیر کی۔ انھوں نے ہندو طلبہ (مینا برادری اور جاٹ برادری)
کی ایک تعداد کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ یہ جو واقعہ ہوا ہے اس کو صرف میوؤں کا واقعہ نہ سمجھئے۔ آج
جو کچھ میوؤں کے ساتھ ہوا ہے، وہی کل خود آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ہندو طلبہ کی سمجھ میں
آ گئی۔ وہ فوراً کلکٹر کے پاس گئے۔ کلکٹر نے انھیں بھی سخت جواب دیا۔ طلبہ نے کلکٹر سے کہا کہ اس کو آپ
چند نوجوانوں کی بات نہ سمجھیں۔ الور کے سات ہزار اسٹوڈنٹ ہمارے پیچھے ہیں۔ آپ اگر سختی کرتے
ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو سات ہزار اسٹوڈنٹ سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور اس معاملہ میں ہندو مسلمان سب
ایک ساتھ ہوں گے۔ یہ دھمکی سن کر کلکٹر دب گیا اور سابقہ حکم کو واپس لے لیا۔

اس طرح کے مواقع پر مسلمان اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ پولیس سے خود لڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں
کہ خود لڑنے کے بجائے برادران وطن کو سامنے کر دیں تو صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ اس ملک میں

سلمانوں کی ہار کی تاریخ جیت کی تاریخ بن جائے گی۔

مذکورہ واقعہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں۔ اس طرح کے چھوٹے بڑے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس ملک میں کسی بھی شخص کے لیے زندگی بالکل ناممکن ہو جائے۔

مگر مسلم رہنما اس قسم کے واقعات کا چرچا نہیں کرتے اور نہ مسلمانوں کے اخبارات ان کو اپنے صفحات میں نمایاں کرتے۔ ہمارے رہنما اور ہمارے اخبارات دونوں صرف ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کہ جو بڑھتے بڑھتے گولی اور فساد تک پہونچ جائیں۔ اگرچہ فساد تک نہ پہونچنے والے واقعات سو میں ۹۹ ہوتے ہیں اور فساد تک پہونچنے والے واقعات سو میں صرف ایک ——— "فساد ہو گیا" کی خبر ہر ایک کو معلوم ہے، مگر "فساد ہوتے ہوتے رہ گیا" کی خبر کسی کو معلوم نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ مسلمانوں کے اندر ایک مہلک بیماری کا پتہ دیتی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ مسلمانوں کا بگاڑ اس حد تک پہونچا ہے کہ اب انھوں نے مثبت ذہن کو کھو دیا ہے۔ وہ منفی نفسیات میں جینے والی ایک قوم بن گئے ہیں۔ بغض اور نفرت اور انتقام ان کی روح کی غذا ہیں۔ محبت، درگزر، انسانیت دوستی کی خبروں میں ان کی روح کے لیے کوئی غذا نہیں۔

الور کے متعلق عام شہرت یہ ہے کہ وہ ایک سخت متعصب علاقہ ہے۔ مگر اس طرح کی باتیں ہمیشہ جنرلائزیشن ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تعصب ہو وہیں انصاف بھی موجود ہوتا ہے۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ مسٹر آروند مایارام (IAS) الور میں کلکٹر ہو کر آئے۔ وہ نہایت منصف مزاج آدمی تھے۔ انھوں نے یہاں کے مسلمانوں (میوؤں) کو اٹھانے کے لیے بہت کام کیا۔ انھیں کی وجہ سے مدرسہ اشرف العلوم کو موجودہ قیمتی زمین رعایتی قیمت پر مل سکی جب کہ وہ محکمہ ریلوے کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ وغیرہ، وغیرہ۔ مسٹر آروند مایارام ڈھائی سال تک الور میں رہ کر ۱۹۸۸ میں یہاں سے چلے گئے۔ آج کل وہ دہلی میں ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب رعایت اور ریزرویشن کی بات کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک میں مسلمان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے کہ ان کو ریزرویشن دیا جائے اور ان سے رعایت والا معاملہ کیا جائے۔

میں نے کہا کہ یہ معاملہ سادہ طور پر رعایت مانگنے کا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خدا کی طرف سے

مایوسی کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ آپ کے پیدا کرنے والے نے آپ کو کچھ نہیں دیا، اب آپ انسانوں سے مانگ کر اپنی محرومی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔

۲۱ مئی کی شام کو مدرسہ میں کچھ مقامی تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہوگئے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوگئے ہیں۔ ہمارے رہنما اس کی ذمہ داری انگریزوں کی سازش اور ہندوؤں کے تعصب پر ڈالتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کی تمام تر ذمہ داری خود مسلم رہناؤں کے اوپر ہے۔

موجودہ زمانہ میں ملک کے اندر بے شمار اسکول اور کالج کھلے۔ انھیں عیسائیوں اور ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ مگر مسلمان تحفظ کے ذہن کے تحت اس سے دور رہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری قوموں کی طرف سے ہمارے اوپر تہذیبی حملہ ہو رہا ہے، ہمیں اس سے بچاؤ کی فکر کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں نے ان اسکولوں اور کالجوں کو مسلمانوں کے لیے "قتل گاہ" بتایا۔ اکبر الٰہ آبادی نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ فکر میرے نزدیک سراسر لغو تھا۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ انھیں اسکولوں اور کالجوں سے بے شمار لوگ ہماری دینی جماعتوں کو ملے۔ اگر یہ ادارے واقعۃً قتل گاہ ہوتے تو یہ تمام لوگ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے قتل ہو چکے ہوتے، پھر وہ ہماری دینی جماعتوں کو کیسے ملتے۔

میں نے کہا کہ اصل مسئلہ تحفظ اور بچاؤ کا نہ تھا بلکہ جوابی فکری اقدام کا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ اسلام کی تعلیمات کو جوابی نظریہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں میں اسلام پر اتنا یقین اور حوصلہ پیدا کر دیا جائے کہ وہ جدید تہذیبی حملوں کے مقابلہ میں پر عزم طور پر ٹھہر سکے۔

میں نے کہا کہ ہمیں ملک کے تعلیمی نظام سے کٹنا نہیں تھا، بلکہ اپنی نسلوں کو ان اداروں میں پڑھاتے ہوئے ان کی ذہنی تعمیر کا کام کرنا تھا۔ اس طرح کے کام کی ایک مثال تبلیغی جماعت ہے۔ تبلیغی جماعت کا کام اگرچہ خالص روایتی انداز میں چل رہا ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ یہی ہے۔ وہ فکر کا جواب فکر سے دیتی ہے۔ مادی تہذیب کے پرستاروں کا کہنا تھا کہ "چیزوں سے ہوتا ہے" اس کے جواب میں تبلیغ نے کہا کہ "چیزوں سے نہیں خدا سے ہوتا ہے" یہ گویا

ب نظریہ کے جواب میں دوسرا نظریہ تھا۔ اس جوابی نظریہ نے بہت سے زیر تعلیم نوجوانوں کو متاثر کیا اور
ہ مادی فکر سے کٹ کر دینی فکر سے جڑ گیے۔
محمد حنیف خاں صاحب نے بتایا کہ "میوات کا سفر" نامی کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں نے
ان سے کہا کہ اس کتاب کے بارے میں بعض میواتیوں نے اس تاثر کا اظہار کیا ہے کہ اس میں میووں
کی خرابیوں کا ذکر ہے، مگر اس میں ان کی اچھائیوں کا ذکر نہیں۔
محمد حنیف خاں صاحب جو خود بھی ایک میو ہیں، انھوں نے کہا کہ میرا تاثر اس کے بالکل برعکس
ہے۔ میں نے یہ کتاب (میوات کا سفر) دو مہینہ پہلے پڑھی ہے۔ اس کو پڑھنے سے پہلے میں
میووں کے مستقبل کے بارے میں مایوس تھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میری مایوسی امید میں بدل گئی۔
میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں بیک وقت
دو باتیں ہیں۔ ایک بالفعل، دوسرے بالقوہ۔ میووں کی بالفعل تصویر تو وہی ہے جس کا نقشہ اس
کتاب میں دکھایا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی اس میں بہت طاقتور انداز میں بتائی گئی
ہے کہ میووں کے اندر بالقوہ صلاحیت نہایت اعلیٰ سطح پر موجود ہے، اگر ان کے بالقوہ کو بالفعل
بنایا جاسکے تو وہ اسی طرح شاندار ترقی کر سکتے ہیں جس کی ایک مثال موجودہ جاپان میں نظر
آتی ہے۔
۲۴ مئی ۱۹۸۹ کو سیلی سیرٹھ، سارِسکا اور ٹائیگر ڈین دیکھے۔ یہ سفر محمد چاولہ خاں صاحب
کی معیت میں ہوا۔ یہ سب راجہ کے محل تھے، اور اب وہ ہوٹل میں تبدیل کر دیئے گیے ہیں۔ تینوں
محل پہاڑوں اور قدرتی مناظر کے درمیان ہیں۔ وہاں پہونچ کر آدمی کچھ دیر کے لیے ماحول کی خوبصورتی
میں گم ہو جاتا ہے۔
تاہم یہ تفریح بے حد وقتی ہے۔ ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف مسحورکن
قدرتی مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ خود ہوٹل کا تعمیری حسن بھی غیر معمولی تھا۔ ہوٹل کا منیجر ہمارے پاس
آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بات کرتے ہوئے پوچھا کہ موجودہ جاب آپ کے لیے کیسا ہے۔ انھوں نے
کہا کہ سخت بورنگ۔ میں تو اس کو ایک پنشمنٹ سمجھتا ہوں۔ کوئی آدمی جب یہاں آتا ہے تو ایک
دو دن کے لیے تو اس کو یہاں کا ماحول بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ بور ہو کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیاپن کا نام زندگی ہے، اور یکسانیت کا نام موت۔ انسان کسی جامد چیز سے مستقل طور پر محظوظ نہیں ہو سکتا۔ مستقل طور پر محظوظ ہونے کے لیے ایک ایسی چیز درکار ہے جو ارتقاپذیر ہو۔ ایسا مقام صرف جنت ہو سکتا ہے۔ دنیا میں اس قسم کی لذت گاہ کا حصول ممکن نہیں۔

۲۱ مئی کو مفتی جمال الدین صاحب کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب میں شرکت کی۔ الور سے تقریباً ۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر کیما سا نامی گاؤں کا سفر ہوا۔ سفر کا نصف حصہ الور۔ دہلی روڈ پر طے ہوا۔ سڑک دونوں طرف سے اونچے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جنتین عن یمین وشمال کا منظر تھا۔ یہ پورا سفر سرسبز چھتری کے نیچے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب وغریب احسان یاد آیا۔ اس دنیا میں ہر کثیف چیز اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہے۔ درخت واحد استثنا ہے جو نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے۔ درخت کی یہی خصوصیت ہے جس کے نتیجہ میں یہ ممکن ہوا کہ وہ ہمارے راستوں کے اوپر سرسبز چھتری بن کر سایہ فگن ہو سکے۔ درخت میں اگر یہ استثنائی صفت نہ ہوتی تو زمین پر سرسبز میدان تو ہوتے مگر سرسبز سائے ہم کو نصیب نہ ہوتے۔

صبح ۸ بجے جدید طرز کی ماروتی وین قدیم طرز کے کیما سا میں داخل ہوئی۔ دل نے کہا کاش یہ واقعہ میوؤں کی قدیم زندگی میں جدید امکانات کے داخلہ کی علامت بن جائے۔ ۲۰ سال پہلے راقم الحروف نے "میوات کے سفر" میں میوات کی جو تصویر دیکھی وہ تقریباً مکمل طور پر روایتی تھی۔ آج اس قدامت میں جدت کی کچھ نشانیاں نظر آنے لگی ہیں۔ مگر ابھی وہ اتنی کم ہیں کہ وہ صرف اس زمرہ میں جاتی ہیں جس کے متعلق غالب نے کہا تھا:

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

گاؤں کی مسجد میں نکاح کی سادہ تقریب ہوئی۔ قاضی صاحب نے رجسٹر نکاح بھرتے ہوئے پوچھا کہ مہر کتنی رکھی جائے۔ نوشہ (محمد الیاس ۲۲ سال) کے والد نے کہا ۳۲ ½ تولہ چاندی رکھ لو۔ معلوم ہوا کہ میوؤں میں سیکڑوں سال سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ ساڑھے ۳۲ تولہ چاندی مہر نکاح مقرر کرتے ہیں۔ اس قسم کی روایت کسی گروہ کے لیے بہت قیمتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ چند روز پہلے نئی دہلی میں ہمارے دفتر کے سامنے والے پارک میں ایک شادی کی تقریب تھی۔ پارک میں بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا۔ روشنیوں کی کثرت سے نگاہ ٹھہرانا مشکل تھا۔

ساری رات لاؤڈ اسپیکر سے گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ رات بھر رسوم ادا کرنے کے بعد صبح ہوئی تو شادی والے اور شامیانہ والے میں تکرار ہوگئی۔ شامیانہ والا ۵۰ ہزار روپیہ مانگ رہا تھا۔ شادی والے کا کہنا تھا کہ ۴۵ ہزار میں بات طے ہوئی تھی۔

قاضی صاحب "جو انسان سے نہ چاہے وہ خدا سے پاتا ہے" سب سے بڑی دولت استغنا ہے۔

کیاسہ کی آبادی تقریباً ایک ہزار ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں اور علاقہ کے دوسرے مقامات پر زیادہ تر میو (مسلمان) آباد تھے۔ وہی یہاں غالب حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد بیشتر میو یہاں سے چلے گئے۔ زمینیں تقریباً سب کی سب شرنارتھیوں کو دے دی گئیں۔ تھوڑے سے میو جو یہاں باقی تھے ان کی حیثیت زرعی مزدور کی ہوگئی۔ ان میوؤں کے لیے زندگی کی صورت صرف یہ تھی کہ وہ شرنارتھیوں کی زمینوں پر محنت کرکے اپنی معاش حاصل کریں۔

مگر شرنارتھی یہاں جم نہ سکے۔ ان کے اندر شہر جانے کا ذہن ابھرا۔ وہ اپنی زمینوں کو بیچ کر شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے۔ اب میوؤں کی باری تھی۔ انھوں نے ان زمینوں کو شرنارتھیوں سے خریدنا شروع کر دیا۔ اس طرح یہاں کی زمینیں اب دوبارہ میوؤں کے قبضہ میں آچکی ہیں۔

دس سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو میوؤں کو یہ شکایت کرتے ہوئے سنا تھا کہ ہماری زمینیں شرنارتھیوں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ مگر اب دس سال بعد دوسرا سفر ہوا تو تاریخ بدل چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے آنے والے وقت تک انتظار نہیں کر پاتے۔ لوگ اگر کل کے امید افزا حالات کو جانیں تو وہ کبھی آج کے مایوس کن حالات پر دل شکستہ نہ ہوں۔

یہاں کی مسجد دوبارہ زیادہ بہتر اور وسیع انداز میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ ۲۵ مئی کو صبح روانگی سے پہلے میں مسجد کے اندرونی حصہ میں کھڑا ہوا اس کی تعمیرات کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ قدیم مسجد پہلی بار ۱۹۴۷ میں مکمل طور پر ڈھادی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی نئی تعمیر ہوئی۔ یہ نئی تعمیر بھی دوبارہ ۱۹۸۸ میں پوری کی پوری ڈھادی گئی۔

میں نے سوچا کہ "ڈھانے" کے اعتبار سے ۱۹۴۷ کا واقعہ اور ۱۹۸۸ کا واقعہ، دونوں بظاہر یکساں ہیں۔ مگر نوعیت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلا واقعہ

دشمنوں نے کیا تھا، دوسرا واقعہ دوستوں نے کیا ہے۔ پہلا انہدام مسجد کو ختم کرنے کے لیے تھا، دوسرا انہدام مسجد کو از سرِ نو زیادہ بہتر بنانے کے لیے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو چیزوں کی شکل بظاہر یکساں ہوتی ہے۔ مگر دونوں کی حقیقت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں، وہ کبھی اس دنیا میں کامیاب روش اختیار نہ کر سکیں گے۔

جس مدرسہ میں میرا قیام تھا، اس سے اسٹیشن قریب ہے۔ یہ سفر میں نے بالقصد سائیکل رکشہ کے ذریعہ کیا۔ اسٹیشن پہونچ کر رکشہ والے سے کرایہ پوچھا تو اس نے دو روپیہ بتایا۔ میں نے فوراً اس کو دو روپیہ دیا اور اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔ یہاں مدرسہ کے لوگوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے رکشہ والے کو کرایہ کی رقم ادا کر دی تھی۔ اس قصہ کو سن کر مدرسہ کے ایک استاد حافظ محمد اسماعیل صاحب (۳۵ سال) بولے: دو روپیہ لے جانے سو کون سا اس کا رکشہ چلانا چھوٹ جائے گا۔ چلائے گا تو وہ رکشہ ہی۔

ہماری ٹرین (سپر فاسٹ اکسپریس) الور اسٹیشن پر پہونچی تو وہ پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ مگر دہلی پہنچتے پہنچتے وہ پورے ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ اس کی وجہ ایک مسافر نے اپنے لفظوں میں اس طرح بتائی: لیٹ ہونے کے بعد پٹتی جاتی ہے گاڑی۔ جو ٹرین ایک بار لیٹ ہو جائے تو اس کو مزید لیٹ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ریلوے کا اصول یہ ہے کہ جو ٹرین اپنے صحیح وقت پر چل رہی ہو اس کو پہلے راستہ دیا جائے۔ اور جو ٹرین لیٹ ہو گئی ہو اس کو روک دیا جائے۔ چنانچہ آگے سے آنے والی ٹرین کو راستہ دینے کی خاطر ہماری ٹرین بار بار درمیانی اسٹیشنوں پر روکی جاتی رہی۔ اس طرح ایسا ہوا کہ جو گاڑی ابتدا میں پندرہ منٹ لیٹ تھی وہ آخر میں ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔

یہی وسیع تر زندگی کا معاملہ ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں ایک بار پیچھے ہو جائے وہ مزید پیچھے ہوتا چلا جائے گا، خواہ اس نے اپنی سواری کا نام "سپر فاسٹ" کیوں نہ رکھ لیا ہو۔

ٹرین مجھے لیے ہوئے الور سے دہلی کی طرف جا رہی تھی۔ ذہن میں مختلف قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک عورت اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے سنا کہ بچی اپنی ماں سے کہہ رہی ہے: ممی، نانی کا گھر کب آئے گا۔

میں نے سوچا کہ بے خبر بچی صرف اپنی نانی کو جانتی ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ وہ نانی کے گھر

جارہی ہے۔ حالانکہ بچی اور دوسرے تمام مسافر حقیقۃً " خدا کے گھر" کی طرف جارہے ہیں۔ دہلی ہمارا درمیانی اسٹیشن ہے نہ کہ آخری اسٹیشن۔

یہ سوچتے ہوئے ایسا محسوس ہوا گویا کہ میں ٹرین پر نہیں ہوں، بلکہ کسی خدائی سواری پر بیٹھا ہوا ہوں۔ خدا کے فرشتے مجھے دنیا سے آخرت کی طرف لے جارہے ہیں۔ ۲۵ مئی کی صبح کو جب ٹرین دہلی اسٹیشن پر رکی تو چھوٹی بچی کے لیے وہ " نانی کا گھر" تھا جس کی نانی اس کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھی۔ مگر میرے لیے وہ " خدا کا گھر" تھا جہاں خدا کے فرشتے ہر آنے والے کو اپنے قبضہ میں لے رہے تھے۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی مذکورہ چھوٹی بچی کی مانند ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی " نانی کے گھر" جارہا ہے۔ حالاں کہ وہ " خدا کے گھر" کی طرف جارہا ہے۔ وہ استقبال کے اسٹیشن پر نہیں بلکہ احتساب کے اسٹیشن پر اترنے والا ہے۔ کتنا زیادہ فرق ہے لوگوں کی سوچ میں اور اصل حقیقتِ واقعہ میں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ــ ۴۵

۱۔ ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا: ایثار اور قربانی کی تجدید کا دن۔ اس تقریر میں بتایا گیا کہ عید اضحیٰ کا دن اس حقیقت کو یاد دلانے کا دن ہے کہ افراد کی قربانی سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر افراد قربانی کے لیے تیار نہ ہوں تو انسانیت کی اعلیٰ ترقی بھی ممکن نہیں۔

۲۔ دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے اپنے شمارہ ۱۲ جون ۱۹۸۹ میں اپنے کرسپانڈنٹ کے حوالہ سے ایک نوٹ شایع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: Unusual Maulana اس نوٹ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Delhi-based Maulana Wahiduddin Khan was in the news recently. His book *Muhammad the Prophet of Revolution*, has been acclaimed on both sides of the border. The Maulana was born in a well-to-do Zamindar family of U.P., of which he sadly saw little. His father died at a young age and the "Zamindari", as of yore, went into litigation. But his mother, choosing to leave litigation to the "court above" took charge of the family a la Gorky's Mother. She has obvioulsly contributed a lot to the Maulana's upbringing — and a good upringing it indeed has been. The Maulana believes in his God, that's what his mother taught him. He believes in staying away from the limelight, in quiet constructive work, individually and collectively. It is really remarkable how a village boy who grazed livestock in the tradition of the prophet turned to theology and other subjects and went on to write in English, Urdu and Hindi. Some of his works have been translated into the major languages of the world. He is the only Maulana I have heard speak about the big bang theory, start a purely religious address with an example of Gandhi and show the eagerness of a child to know how exactly an aeroplane flies — aero-dynamics and all. But then he is the only Maulana who draws turbaned Sardars in the front row along with the Hindus in his religious discourses. The composition of his audiences does not influence the substance of his talk one way or the other. What we need today is more and more Maulana Wahiduddins and less and less Shahabuddins and Bukharis.

۳۔ سیکولر ڈیموکریسی (قومی ایکتا ٹرسٹ) کے تحت ۲۴ جون ۱۹۸۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک راونڈ ٹیبل ڈسکشن ہوا۔ اس کا موضوع روس میں جمہوریت (Soviet experiment with democracy) تھا۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں شرکت اور اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر بعض مصروفیات کی وجہ سے ان کی شرکت ممکن نہ ہو سکی۔ البتہ موضوع سے متعلق کچھ لٹریچر منتظمین کے پاس بھیج دیا گیا۔

۴۔ مئی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے الور اور میوات کے بعض دیہاتوں کا سفر کیا۔ اس کا سفرنامہ لکھ لیا گیا ہے۔ آئندہ انشاء اللہ کسی شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔

۵۔ ۸-۹ جولائی ۱۹۸۹ کو دہلی میں "مسلم سیاسی کنونشن" ہوا۔ اس کنونشن کے داعی بیشتر طور پر الرسالہ مشن کے مخالف ہیں۔ مگر ماؤلنکر ہال جہاں اس کنونشن کی دوروزہ کارروائیاں ہوئیں، اس کے گیٹ پر شرکت کرنے والی ایک مسلم تنظیم کی جانب سے ایک بینر لگا ہوا تھا جس پر نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا: "اتحاد کیا ہے، اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا" یہ پیغام واضح طور پر الرسالہ کا پیغام ہے۔ مذکورہ مسلم کنونشن میں اس پیغام کے بینر کا ہونا بتاتا ہے کہ الرسالہ کا مشن خدا کے فضل سے اب اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کی گونج اس کے مخالفین کے کیمپ میں بھی سنائی دیتی ہے۔

۶۔ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ (عمر ۸۳ سال) علامہ اقبال کے شاگرد ہیں۔ اور کلکتہ میں رہتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ نیز انھوں نے اسلامی مرکز کی مطبوعات بھی پڑھی ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: واقعی اس دور میں اسلام جیسے دین کامل کو صحیح طور پر پیش کرنے کا سہرا الرسالہ کے سر ہے۔ ورنہ جس قدر غلط تعبیرات کا نشانہ اسلام رہا ہے کوئی اور نہیں رہا۔ آپ کی نیک کوششوں نے اس کا ازالہ کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی کسی مسلم مجلس میں مجھے جانے کا موقع میسر ہوتا ہے تو میں آپ کی نیک کوششوں کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ آپ نے واقعی اسلام کو اسلام بنا دیا ہے۔ اور ہر شخص آپ کے اور آپ کے پیش کردہ اسلام کی تعبیر کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: اللہ اکبر کا مطالعہ کیا۔ اس سے پہلے اسلام دین فطرت وغیرہ کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں۔ ۱۹۸۰ میں جب میں کالج میں پڑھ رہا تھا، علامہ اقبال کا یہ شعر ——— "سکوتِ لالۂ و گل سے کلام پیدا کر" میری نظر سے گزرا۔ مگر آج تک میری لالۂ و گل سے ملاقات نہ ہوئی۔ الحمد للہ آپ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد میں نے کائنات کے ذرہ ذرہ سے بات کرنے کا طریقہ سیکھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے کتاب "خطبات" پڑھی۔ اس نے مجھے یہاں تک پہونچایا کہ اسلام ایک سیاسی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ

ج اسی سیاسی عمارت کے کھمبے ہیں ۔ علامہ اقبال نے مجھے ایک طوفانی سمندر میں ڈالا جہاں لہروں کے ساتھ لڑنا اور پھر ہلاک ہونے کے سوا کچھ اور نہیں، آپ نے مجھے ایک ایسی کائنات دکھائی جہاں ہر ایک شئے ذرہ سے ستاروں تک قانون الٰہی کی پابندی کر رہی ہے ۔ اب کوئی چیز مجھے دل شکستہ نہیں کر سکتی جس کا آج سے چند سال قبل میں شکار تھا ۔

(عبدالرحمٰن میر، کشمیر)

۸۔ انجمن مظہر الحق کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے کشمیر کا سفر کیا۔ ۲۹ جون کو وہاں پہونچے اور ۳ جولائی ۱۹۸۹ کو واپسی ہوئی ۔ اس سلسلہ میں سرینگر اور بعض دوسرے مقامات پر خطاب کیا ۔ ایک خطاب کا عنوان " اسلام اور خدمت خلق تھا۔ دوسرے خطاب کا عنوان ـــــ اسلامی عبادت ۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی ۔

۹۔ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں : ایک مقامی مسلمان لیڈر آپ کی بعض تنقیدوں سے برہم تھے۔ کیونکہ اس کی زد ان کے اوپر پڑتی تھی ۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کے "مولوی " کے خلاف لیگل کارروائی کروں گا ۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے انتخابی حلقہ میں سب سے زیادہ الرسالہ پڑھا جارہا ہے ۔ ایک ایک پرچہ کو بسا اوقات سو سو آدمی پڑھتے ہیں یا پڑھوا کر سنتے ہیں ۔ اگر آپ نے الرسالہ کے خلاف کوئی کارروائی کی اور انھوں نے آپ کا قصہ الرسالہ میں چھاپ دیا تو آپ کے ووٹ یقیناً کٹ جائیں گے ۔ اس پر وہ خاموش ہوگیے ۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ الرسالہ کے اثرات کہاں تک پہونچ چکے ہیں ۔

۱۰۔ عبدالرؤف خاں صاحب (عمر کھیڑ) نے ۱۶ جون ۱۹۸۹ کی ملاقات میں بتایا کہ عمر کھیڑ (مہاراشٹر) کے اسپتال کے سول سرجن ڈاکٹر اشوک امبھورے نے انگریزی الرسالہ کے بعض شمارے دیکھے ۔ پھر کچھ لوگوں نے ان کو اردو الرسالہ کے بعض مضامین پڑھ کر سنائے ۔ اب ان کی دل چسپی الرسالہ سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اردو الرسالہ کو براہ راست پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھ رہے ہیں ۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ٹیوٹر کی خدمات حاصل کی ہیں ۔ اس طرح کی خبریں دوسرے مقامات سے بھی مل رہی ہیں ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۶ نومبر ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

حوصلہ مندی

سرسی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ایک مشہور ہندستانی سائنس داں ہیں۔ انھوں نے روشنی کی سائنس میں ایک نیا اصول دریافت کیا جو انھیں کے نام پر رمن ایفکٹ Raman Effect کہاجاتا ہے۔ اسی دریافت کی بنا پر انھیں ۱۹۳۰ میں فزکس کا نوبیل انعام دیا گیا۔

رمن تمل ناڈو کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ پڑھا۔ یہاں تک کہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں انھوں نے مدراس یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ وہ نہایت حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر آسوتوش مکرجی کے سامنے یہ عہد کیا کہ میں نوبیل انعام کو نہر سوئز کے مشرق میں لے آؤں گا:

I will bring the Nobel prize east of the Suez.

اس عہد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بے پناہ محنت شروع کی۔ تاہم ریسرچ کی آسانیاں انھیں حاصل نہ تھیں۔ معاشی ضرورت کے تحت انھوں نے کلکتہ میں ایک سرکاری ملازمت کر لی تھی۔ ایک روز وہ ٹرام کے ذریعہ بہو بازار (کلکتہ) سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک عمارت پر حسب ذیل الفاظ کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے:

The Indian Association for the Cultivision of Science

یہ بورڈ دیکھ کر وہ چلتی ٹرام سے کود پڑے۔ اس ادارہ میں جا کر معلومات کیں۔ پتہ چلا کہ یہاں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ صبح سویرے وہاں پہونچ جاتے اور آفس کے وقت تک مسلسل اپنے تحقیق اور تجربے میں لگے رہتے۔ اسی طرح شام کو آفس سے چھٹی پاتے ہی دوبارہ وہاں پہونچ جاتے اور رات تک وہاں مشغول رہتے۔ اس طرح پندرہ سال کی مسلسل محنت سے انھوں نے وہ سائنسی قانون دریافت کیا جس پر انھیں دنیا کا معزز ترین علمی انعام (نوبیل پرائز) دیا گیا۔

رمن کو یہ دھن تھی کہ وہ نوبیل انعام کو سوئز کے مشرق میں لے آئیں اور وہ اس کو لے آئے۔ مگر آج خدا کے بندوں میں کوئی نہیں جو اس لیے تڑپ اٹھا ہو کہ وہ خدا کے دین کو سوئز کے مغرب میں لے جائے گا۔ خدا کا دین "سوئز" کو پار کرنے کے لیے آج بھی کسی حوصلہ مند کا انتظار کر رہا ہے۔

انشاء اللہ

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب کسی کام کے بارے میں اپنے ارادہ کا اظہار کرے تو اس کے ساتھ انشاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) بھی ضرور کہے۔ مثلاً ایک شخص دہلی سے بمبئی جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس طرح نہ کہے کہ کل میں بمبئی جاؤں گا، بلکہ یوں کہے کہ: انشاء اللہ کل میں بمبئی جاؤں گا۔

یہ کلمہ گویا اس حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے کہ میری چاہ صرف اس وقت پوری ہوگی جب کہ اللہ کی چاہ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ یہ اپنے چاہنے میں اللہ کے چاہنے کو ملانا ہے، اپنے ارادے کے ساتھ اللہ کے ارادے کو شامل کرنا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان ارادہ کرتا ہے اور اس کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ مگر کسی کوشش کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی شامل ہو جائے۔ اسی کو عربی میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے ہے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السعی منی والاتمام من اللہ)

اس اعتبار سے خدا اور بندے کا معاملہ گویا دندانہ دار پہیہ Cog wheel کا معاملہ ہے۔ ایک پہیہ خدا کا ہے اور دوسرا پہیہ انسان کا۔ جب دونوں کے دندانے ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی مشین چل پڑتی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ خدا کے پہیہ سے الگ ہو کر اپنا پہیہ چلانا چاہے تو بظاہر حرکت کے باوجود وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ پوری مشین کے چلنے کے لیے ضروری تھا کہ خدا کے پہیہ کا دندانہ بھی انسان کے پہیہ کے ساتھ شامل ہو۔

انشاء اللہ کا کلمہ، باعتبار حقیقت، ایک دعا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ انسان کے کاگ میں اپنا کاگ ملا دے تاکہ زندگی کی مشین چل پڑے اور اپنے مطلوبہ انجام تک پہنچے۔ انشاء اللہ کہنا گویا زندگی کے سفر میں مالک کائنات کو اپنے ساتھ لینا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ خود مالک کائنات اس کا ہم سفر ہو جائے۔ اس کو منزل تک پہنچنے سے کون روک سکتا ہے۔

چپ رہیے

قرآن میں ہے کہ کان اور آنکھ اور دل ، ہر چیز کے بارہ میں انسان سے پوچھ ہوگی (بنی اسرائیل ۳۶)
حدیث میں آیا ہے کہ تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں زیادہ جری ہے وہ جہنم کے اوپر زیادہ جری ہے
(اجرؤکم علی الفتویٰ اجرؤکم علی النار)

اس بنا پر صحابہ کرام فتویٰ دینے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ عبداللہ ترازو میں اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہیں ۔ (عبد اللہ اثقل فی المیزان من احد) اس کے باوجود ان کا یہ حال تھا کہ وہ کوفہ میں تھے ۔ ان سے ایک معاملہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب نہیں دیا ۔ لوگ ان سے مہینہ بھر پوچھتے رہے ۔ یہاں تک کہا کہ اگر آپ ہی فتویٰ نہ دیں تو ہم کس سے پوچھیں ۔ پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا (فی سنن ابی داؤد ان ابن مسعود کان فی الکوفۃ فسئل عن امر فلم یجب ۔ فاختلفوا الیہ شھراً ولم یجب ۔ وفی روایۃ ؛ من نسأل اذا لم تفتنا)

حضرت عبداللہ بن عمر ہمیشہ فتویٰ دینے سے پرہیز کرتے تھے ۔ لوگ جب زیادہ اصرار کرتے تو کہتے کہ ہماری پیٹھ کو جہنم کے لیے سواری نہ بناؤ (لا تجعلوا ظھورنا مطایا الی جھنم)

ان روایات میں فتویٰ سے مراد کوئی محدود فتویٰ نہیں ہے ۔ اس کا تعلق ان تمام امور سے ہے جو مسلمانوں کو پیش آتے ہیں اور جن میں وہ اپنے علماء اور اپنے رہناؤں سے رائے پوچھتے ہیں ۔ ایسے امور میں علماء اور رہناؤں کا فرض ہے کہ وہ بولنے سے زیادہ سوچیں ۔ وہ اس وقت تک کوئی بیان نہ دیں جب تک اس معاملہ میں مشورہ اور مطالعہ اور غور وفکر کی تمام شرطوں کو آخری حد تک پورا نہ کر چکے ہوں ۔ ایسے امور میں نہ بولنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی غیر ذمہ دارانہ طور پر بولنے لگے ۔

اجتماعی معاملات میں رائے دینا انتہائی نازک ذمہ داری ہے ، کیوں کہ اگر رائے غلط ہو تو لوگوں کو نامعلوم مدت تک اس کا نقصان بھگتنا پڑتا ہے ۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اگر وہ بولنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی تمام شرطوں کو پورا کرے ، اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے ۔

عبادت گاہ

ڈاکٹر رالف سسن Ralph R. Sisson اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک (امریکہ) میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۹ کو ان سے اسلامی مرکز میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میں نے انھیں اسلام کے تصور توحید، تصور رسالت اور تصور آخرت سے متعارف کیا۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کیا آپ چرچ جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے جاتا تھا، مگر اب نہیں جاتا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چرچ کے اندر بڑا عجیب ماحول ہوتا ہے۔ نقش ونگار، موسیقی، مختلف آوازیں اور طرح طرح کے رسمی اعمال۔ مجھ کو تو چرچ عبادت گاہ کے بجائے ایک کلب جیسا معلوم ہوتا ہے:

It looks like a club, not a place of worship

امریکی پروفیسر نے جو بات چرچ کے بارہ میں کہی، وہی تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی بگاڑ نے تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے بجائے کلب کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلہ میں اسلامی مسجد انتہائی سادہ ہوتی ہے۔ اسلامی مسجدیں واقعی عبادت گاہ نظر آتی ہیں۔ جب کہ دوسری عبادت گاہیں اپنے ظاہری حلیہ کے اعتبار سے کلب دکھائی دیتی ہیں۔ مساجد کی اس سادگی اور ان کے اندر فطری عبادت کے ماحول نے ان مساجد کو ایک قسم کی زندہ تبلیغ بنا دیا ہے۔ ان کو دیکھنا بذات خود اپنے اندر ایک تاثیری طاقت رکھتا ہے۔ مسجد اپنی ذات میں اسلام کی تبلیغ ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے اوپر بند کر رکھے ہیں۔ اگر کسی تاریخی مسجد میں سیاحوں کو داخلہ کی اجازت ہو تو وہاں بھی نماز کے وقت انھیں باہر کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے آزادانہ طور پر کھول دیں۔ یہ واقعہ انشاءاللہ غیر مسلموں کے دل کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

ٹارچ کے بغیر

گاؤں کا ایک شخص اندھیری رات میں چل رہا تھا۔ کھیتوں کی پگڈنڈی پار کرتے ہوئے اچانک اس کو محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے پیروں میں پھنس رہی ہے۔ اس نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ اگلے لمحہ اس کی انگلیاں ٹارچ کے سوئچ پر پہونچ چکی تھیں۔ ٹارچ روشن ہوئی تو نظر آیا کہ اس کے دائیں طرف ایک سانپ خشمگیں نظروں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔

آدمی کے پاس ٹارچ تھی۔ مگر وہ اس کو جلائے بغیر اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ اس بنا پر اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ ٹارچ اگر روشن ہوتی تو راستہ میں سانپ کی موجودگی کا اس کو پہلے ہی علم ہو جاتا۔ مگر ٹارچ روشن نہ کرنے کی وجہ سے سانپ کی موجودگی کا علم اس کو صرف اس وقت ہوا جب کہ وہ اس کو کاٹ چکا تھا۔

یہی حالت ایک اور اعتبار سے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس خدا کی کتاب ہے۔ مگر وہ اس سے اپنے معاملات میں ہدایت حاصل نہیں کرتے۔ وہ خدائی ٹارچ کو روشن کیے بغیر زندگی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہوتے ہیں۔

مثلاً خوف کی ایک صورت مسلمانوں کے سامنے آتی ہے۔ مسلمان اس کو اغیار کا مسئلہ سمجھ کر ان کے خلاف لاحاصل شور وغل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی ٹارچ جلائے ہوئے ہوں تو انھیں فوراً یہ معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اغیار کی خشیت سے محفوظ کر دیا ہے۔ اب ان کے لیے صرف خشیتِ خداوندی کا مسئلہ ہے نہ کہ خشیتِ انسانی کا۔ (المائدہ ۳)

اسی طرح ایک گروہ مسلمانوں کے خلاف فساد کرتا ہے اور ان کو نقصان پہونچاتا ہے۔ یہاں بھی مسلمان یہی کرتے ہیں کہ دوسروں کے خلاف تیز و تند الفاظ بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگتے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی ٹارچ روشن کر کے دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ اس قسم کا شور وغل بے فائدہ ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا داخلی جائزہ لیا جائے اور اپنی اندرونی کمزوریوں کا پتہ کر کے ان کی اصلاح کی جائے (آل عمران ۱۵۲، التوبہ ۲۵)

ترتیب کار

صحیح بخاری (باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہ کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں پہلے وہ آیتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے ذہن اسلامی قانون کے لیے تیار ہو گیے، اس وقت قرآن میں حلال وحرام کی آیتیں اتریں۔ اگر قرآن میں پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم زنا نہ چھوڑیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تحریک کے دو بڑے مرحلے ہیں۔ ایک، مرحلۂ دعوت۔ اور دوسرا، مرحلۂ نفاذِ احکام۔ اسلامی عمل کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے دعوتی جدوجہد کے ذریعہ لوگوں کا ذہن بنایا جائے۔ ان کے دلوں میں آمادگی پیدا کی جائے۔ جب یہ ابتدائی کام ہو چکا ہو اس وقت انھیں حلال وحرام کے عملی احکام سنائے جائیں اور حسب مقدور ان کی تعمیل کی جائے۔

اسلامی عمل کی یہ ترتیب غیر مسلم اقوام کے لیے بھی مطلوب ہے اور مسلم معاشروں کے لیے بھی۔ غیر مسلم اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچانا فرض کے درجہ میں مطلوب ہے۔ مگر یہ ایک مرحلہ وار کام ہے۔ نہ کہ کوئی یکبارگی عمل۔ اولاً اسلام کی بنیادی تعلیمات کو ان کے سامنے موثر انداز میں پیش کیا جائے گا۔ جب یہ کام قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد وہ اسلام کے عملی قوانین کے مخاطب بنائے جائیں گے۔

یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ تاریخی تجربہ بتاتا ہے اور قرآن سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلیں ایمانی کمزوری، یا قرآن کے لفظ میں قساوت (الحدید ۱۶) کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں از سر نو اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان پر دوبارہ وہی عمل کیا جائے جو دور اول میں کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے ان کے اندر دعوتی جدوجہد کے ذریعہ اسلامی ذہن بنانا، اس کے بعد حالات کے مطابق ان کے اوپر اسلام کے عملی قوانین کا نفاذ۔

اس ترتیب و تدریج کے بغیر کوئی بھی نتیجہ خیز کام نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبر کا طریقہ

سیرت رسول کے مشہور راوی ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا، جیساکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ انھوں نے آپ کا انکار کیا۔

یہاں تک کہ آپ نے ان کے بتوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگائے۔ جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کے معاملہ کو اہمیت دی اور آپ سے اجنبیت برتنے لگے۔ وہ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گیے۔ سوا ان لوگوں کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ بچا لیا۔ ایسے لوگ تھوڑے تھے اور چھپے ہوئے تھے:

فلما بادیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصدع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومہ ولم یردّوا علیہ۔ حتی ذکر آلہتہم وعابہا۔ فلما فعل ذلک اعظموہ وناکروہ واجمعوا خلافہ وعداوتہ الامن عصم اللہ تعالیٰ منہم بالاسلام وہم قلیل مستخفون (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۵-۲۷۶)

قدیم عرب کے مشرکوں کے بُت در اصل ان کے قومی اکابر تھے جن کی تصویر بنا کر وہ ان کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک توحید اور اخلاق کی بات کرتے رہے، تو مشرکین نے آپ کی بات کو برا نہ مانا۔ مگر جب آپ نے غیر خداؤں کی تقدیس اور پرستش کو غلط بتایا اور مشرکین کی غیر خدا پرستانہ روش پر تنقید کی تو وہ بگڑ گیے۔ یہی ہر زمانہ کا معاملہ ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے عمومی انداز میں صرف اخلاق اور انسانیت کی باتیں کیجئے تو ہر ایک آپ سے راضی رہے گا۔ لیکن اگر حق کی عمومی دعوت کے ساتھ لوگوں کی خلافِ حق روش پر تنقید کی جائے اور ان کے اکابر کا تجزیہ کیا جانے لگے تو فوراً لوگ بھڑ اٹھیں گے۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہی ہے کہ دعوت کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جائے۔ نصیحت کے ساتھ تنقید بھی کی جائے۔

جو لوگ غیر خدا کو خدا کا مقام دیئے ہوئے ہوں وہی تنقید پر بھڑتے ہیں۔ جو لوگ ایک خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں، وہ کسی انسان پر تنقید سے کبھی نہیں بھڑیں گے۔

ایک حقیقت

جو شخص ایک معاملہ میں غلط ثابت ہو وہ ہر معاملہ میں غلط ہے۔ اس میں صرف اس آدمی کا استثناء ہے جو غلطی کرنے کے بعد شرمندہ ہو اور کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔

یہ ایک نفسیاتی اصول اور زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک کُل ہے۔ انسان سے کسی غلطی کا سرزد ہونا ایسا ہی ہے جیسے گلاس سے ایک قطرہ کا باہر آنا۔ گلاس کے قطرہ کو دیکھ کر سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر کیا چیز بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح انسان کی ایک روش کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بقیہ اعتبار سے وہ انسان کیسا انسان ہے۔

تاہم گلاس میں اور انسان میں ایک فرق ہے۔ گلاس جامد چیز ہے، اور انسان ایک متحرک مخلوق ہے۔ انسان اس پر قادر ہے کہ غلطی کرنے کے بعد وہ اپنی اصلاح کرسکے۔ اسی کا نام توبہ ہے توبہ کی صلاحیت نے انسان کو ایک خود اصلاحی مشین بنادیا ہے۔

انسان سے جب ایک غلطی ہو، اس وقت اگر اس کا شعور جاگ اٹھے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے طور پر اعتراف کرے کہ میں نے غلطی کی تو، مشینی اصطلاح میں، گویا اس نے اپنے نقص کو درست کرلیا۔ وہ دوبارہ ایک نیا انسان بن گیا۔

غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ بے حد اہم بات ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا تو اس کے پیچھے کوئی خاص سبب ہوتا ہے۔ مثلاً بڑائی کا احساس۔ ذاتی مفاد کا خطرہ۔ وغیرہ۔

اسی قسم کی ایک یا دوسری کمزوری ہوتی ہے جس کی بنا پر آدمی کھلی ہوئی غلطی کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس کا اقرار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلطی کے اقرار کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر چھپی ہوئی بہت سی کمزوریوں کو مٹاتا ہے۔ وہ گویا نفسیاتی معنوں میں ایک غسل صحت کرتا ہے۔ گندا انسان از سرِ نو ایک پاک صاف انسان بن جاتا ہے۔

یہی معاملہ برعکس صورت میں اس شخص کا ہے جو غلطی کا اعتراف نہ کرے۔ اس کی روح بدستور گندگی میں پڑی رہے گی، وہ ہمیشہ پیچھے جاتا رہے گا، روحانی میدان میں وہ آگے کی طرف سفر نہیں کرسکتا۔

قومی اتحاد

بھارت وکاس پریشد (نئی دہلی) ۱۹۶۹ میں قائم ہوئی۔ یہ ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کے موجودہ سرپرست ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اور صدر جسٹس ایچ آر کھنہ ہیں۔ ۱۱-۱۲ فروری ۱۹۸۹ میں اس کی طرف سے ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ سمینار کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔ ۱۲ فروری کی شام کو "کلوزنگ سیشن" میں میرا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت مذکورہ سمینار میں شرکت ہوئی۔ اس سمینار کا موضوع تھا قومی اتحاد اور ہندستان کی مذہبی اقلیتیں :

National unity and religious minorities in India

۸۹ - ۱۹۸۸ کے درمیان مجھے اس قسم کے کئی سمیناروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا مختصر ذکر الرسالہ میں "خبرنامہ اسلامی مرکز" کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تمام سمینار راجدھانی دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے ہندو دماغ شریک تھے۔ لوگوں کی تقریریں سننے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ "ہندو دماغ" ملک کی موجودہ صورت حال پر سخت تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کا مسئلہ ختم ہو۔ ملک میں قومی اتحاد آئے۔ تمام فرقے اور گروہ یک جہتی کے ساتھ مثبت عمل کی راہ پر لگ جائیں کیوں کر اس کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔

فکری سادگی

تاہم ان اجتماعات کو سننے اور دیکھنے کے بعد میرا مشترک احساس یہ تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا احساس تو ضرور لوگوں کے اندر شدید طور پر پیدا ہوا ہے، مگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہو، اس کے بارے میں ان کا ذہن ابھی تک واضح نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ سسٹم یا قانون میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ سمینار میں یہ تجویز کیا گیا کہ ہندستان کے دستور میں جہاں اقلیتی حق (Minority right) کا لفظ لکھا ہوا ہے، وہاں اس کو بدل کر انسانی حق (Human right) کا لفظ لکھ دیا جائے۔ اقلیتی کمیشن کو ختم کر کے اس کی جگہ انسانی کمیشن مقرر کیا جائے، وغیرہ۔

اس قسم کی تجویزوں کے پیچھے یہ ذہن ہے کہ ملک میں جو گروہ بندی اور فرقہ وارانہ امتیاز ہے،

یہ اس لیے ہے کہ ہمارا دستور "اقلیتوں کے حقوق" کا لفظ بولتا ہے۔ وہ ملک میں کئی گروہ تسلیم کرکے ان کے الگ الگ حقوق مقرر کرتا ہے۔ اس سے علیحدگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دستور میں "انسانی حقوق" کا لفظ درج کر دیا جائے تو ملک کے تمام لوگ ایک ہی نوع (انسان) نظر آئیں گے۔ اس کے بعد اپنے آپ علیحدگی کا ماحول ختم ہوکر یگانگت کا ماحول قائم ہو جائے گا۔

مگر یہ اصل معاملہ کو بہت سادہ سمجھنا (Oversimplification) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ امر واقعہ کو بدلنے کا ہے نہ کہ کسی لفظ کو بدلنے کا۔ درخت کی دنیا میں اگر پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہیں تو آپ کانٹوں کے مسئلہ کو اس طرح ختم نہیں کر سکتے کہ اپنی درخت کی ڈکشنری سے کانٹے کا لفظ نکال دیں، اور ہر جگہ صرف پھول ہی پھول لکھ دیں۔ درخت میں کانٹے کا مسئلہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ایک حقیقی مسئلہ کو حقیقی سطح پر عمل کرکے حل کیا جا سکتا ہے نہ کہ لفظی سطح پر عمل کرکے۔

مذکورہ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقلیت" اور "اکثریت" کا لفظ امتیاز اور علیحدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سماج میں طبقات پیدا ہوتے ہیں، اس کے برعکس اگر دستور میں "انسان" کا لفظ لکھ دیا جائے تو امتیاز کا تصور ختم ہو جائے گا اور سماج میں طبقاتی علیحدگی ختم ہوکر طبقاتی یکسانیت کا دور آجائے گا۔

مگر اس قسم کی سوچ سادہ لوحی (Naive thinking) کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی سماج اور اسی طرح تمام ملکوں کے سماج میں مختلف نسلی اور مذہبی طبقات پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔ ان کو اس طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کہ قانون میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا جائے۔

اس کی ایک عملی مثال ہریجن کا مسئلہ ہے۔ ہریجنوں کے سلسلہ میں وہ چیز عملاً حاصل کی جا چکی ہے جس کا مطالبہ اقلیتوں کے سلسلہ میں کیا جا رہا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق، ہندو اونچی ذات کے لوگ ہیں اور ہریجن (شودر) نیچی ذات کے لوگ۔ آزادی کے بعد جو قانون سازی ہوئی ہے، اس میں دونوں کو لفظی طور پر ایک کر دیا گیا ہے، چنانچہ ہمارا موجودہ دستور دونوں کو یکساں طور پر ہندو قرار دیتا ہے۔

مگر کیا اس لفظی یکسانیت کی وجہ سے ہندو (اونچی ذات) اور ہریجن (نیچی ذات) کا فرق ختم

ہوگیا۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ لفظی یکسانیت پیدا کرنے کے باوجود دونوں میں سماجی یکسانیت نہیں آئی، دونوں کے درمیان سابقہ تفریق بدستور پوری طرح باقی ہے۔

سبق آموز مثال

جو لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر گفت گو کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ شمالی ہندستان کو کل ہندستان سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا تجزیہ بھی نا درست ہوتا ہے اور ان کا پیش کردہ حل بھی نا درست۔

زیر بحث مسئلہ کا ایک اہم ترین عملی پہلو یہ ہے کہ یہ ملک دو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک شمالی ہند، اور دوسرے جنوبی ہند۔ پچھلی نصف صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جتنے بھی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب شمالی ہند میں ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا جنوب کے علاقہ میں ہوا ہے، تو وہ شمالی ہند کے لوگوں ہی کا پیدا کردہ تھا جو کسی وجہ سے وہاں پہنچ گئے۔ خود جنوبی ہند کے لوگوں نے کبھی اس قسم کا کوئی جھگڑا برپا نہیں کیا۔ جب کہ وہ تمام فرقے جنوبی ہند میں بھی موجود ہیں جو شمالی ہند میں موجود ہیں۔ اور وہ تمام گروہی فرق وہاں بھی پائے جاتے ہیں، جو یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند میں ہم جس مسئلہ کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ جنوبی ہند میں عملاً حل شدہ ہے، جب ایسا ہے تو سب سے پہلے ہمیں ملک کے دونوں علاقوں کے فرق کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند تک وسیع کر دیں۔ جو کچھ ملک کے ایک حصہ میں جاری ہے، اس کو ملک کے دوسرے حصہ میں جاری کر دیں۔

راقم الحروف نے جنوبی ہند کے کئی سفر کیے ہیں اور اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ جنوبی ہند کے لوگوں میں تحمل (Tolerance) ہے، جب کہ شمالی ہند کے لوگوں میں تحمل نہیں۔ جنوبی ہند کے لوگ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں کرتے۔ جب کہ شمالی ہند کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اختلاف کا کوئی واقعہ سامنے آتے ہی وہ فوراً ٹکراؤ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کا مزاج تحمل ہے، اور شمالی ہند کا مزاج عدم تحمل۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں علاقوں کے درمیان

یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ شمالی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑے زندگی کا معمول بن گئے ہیں، جب کہ جنوبی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔

اوپر کی مثال ایک عملی واقعہ کی صورت میں بتاتی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے باوجود فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ زندگی گزاریں۔ جو صورت حال آج بھی ملک کے ایک حصہ میں قائم ہے، وہی صورت حال ملک کے دوسرے حصہ میں قائم کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حقیقی اور پائدار حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کی سوچ کو درست کیا جائے۔ ہمارے ملک کا یا دوسرے لفظوں میں شمالی ہند کا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے یہاں کے لوگوں کی سوچ بگڑ گئی ہے۔ یہی جڑ کی بات ہے۔ اور اس جڑ پر عمل کر کے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ اور دوسرے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

کسی سماج میں مختلف فرقوں کا ہونا بالکل فطری بات ہے، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ہمارے موجودہ سماج کی اصل برائی خود فرقوں کی موجودگی نہیں، بلکہ مختلف فرقوں کے درمیان تحمل (Tolerance) کی غیر موجودگی ہے۔ فرقہ واریت کا مسئلہ عدم تحمل کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ خود فرقوں کی موجودگی کا پیدا کردہ۔

برداشت کی ضرورت

سماج میں مختلف سطحوں پر فرق اور اختلاف کا ہونا بالکل لازمی ہے۔ آپ سماج کے اوپر یکسانیت کا بلڈوزر نہیں چلا سکتے۔ روسی ڈکٹیٹر اسٹالن نے اپنے ملک میں بے طبقاتی سماج (Classless society) قائم کرنے کے لیے ۲۵ ملین انسانوں کو پیس ڈالا۔ پھر بھی وہ بے طبقاتی سماج بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر آپ اس ناممکن کام کو کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ انھیں اختلاف میں اتحاد (Unity in diversity) کا سبق دیا جائے۔ قومی اتحاد ہم کو اختلاف کے باوجود قائم کرنا ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر۔ کیونکہ وہ ممکن ہی نہیں۔

قوم کے افراد کے اندر تحمل کا مطلوبہ مزاج پیدا کرنے کے لیے ہمیں وہی عمل کرنا ہے جس کو فیبین

سوسائٹی نے نفوذ کرنے (Permeation) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی شعور کو بدلنے کی مہم جاری کر کے لوگوں کے ذہنوں میں گھسنا اور ان کو اندر سے اس طرح بدل دینا کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ وہ ہو جائے جو کہ دراصل ہونا چاہیے۔

قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کا لفظ تو اس ملک میں پچھلی نصف صدی سے بولا جا رہا ہے، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی حقیقی کام مطلق نہیں کیا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ کانفرنس کرنا، یا پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر مارچ کرنا وہ کام نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اس کام کے لیے شعور کی تربیت کی ایک طویل اور مسلسل مہم درکار ہے، مگر قومی اتحاد کا نعرہ لگانے والوں میں سے کوئی بھی اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ نہ کر سکا۔

مثال کے طور پر صحافت اس ذہنی انقلاب کو لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اخبار یا رسالہ نہیں جو اس مقصد کے لیے وقف ہو۔ ہمارے تمام اخبار حقیقۃً سیاسی اخبار ہیں۔ اس کے بعد جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامے ہیں وہ سنسنی خیز مضامین چھاپ کر سستی تجارت کرنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ شعور سازی کے اداروں کا جب یہ حال ہو تو وقتی اپیل جاری کرنے سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف پچھلے ۲۵ سال سے اپنے آپ کو تعمیری صحافت کو وجود میں لانے کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ ماہنامہ الرسالہ (اُردو اور انگریزی میں) ملک کا واحد ماہنامہ ہے جو تعمیر شعور کا کام کر رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کام اس سے زیادہ بڑا ہے کہ ایک یا دو ماہنامہ اس کو انجام دے سکے۔

رہنماؤں کی ذمہ داری

حقیقت یہ ہے کہ عوام کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے عوام کے رہنماؤں کو بدلنا ہے۔ ہماری قوم کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، جن کو سن کر اور پڑھ کر لوگ اپنی رائیں بناتے ہیں، ان کی ایک فی صد تعداد بھی اگر اس قربانی پر آمادہ ہو جائے جو پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان انگلینڈ کے فیبین لوگوں نے دی تھی۔ تو یقینی طور پر ہمارے ملک کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

یہ لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ سستی شہرت اور سستی تجارت کے راستہ کو چھوڑ کر خاموش تعمیری کام میں

اپنے آپ کو وقف کریں گے۔ وہ قوم کے اندر مثبت ذہن اور تعمیری مزاج بنانے میں اپنے زبان و قلم کی ساری طاقت خرچ کر دیں گے۔ اور اس کام کو مسلسل جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ اسی پر ان کی موت آجائے۔ اگر ہماری قوم کے ذہین طبقہ کا ایک فی صد حصہ بھی یہ عزم کر لے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا عزم ہمارے ملک کی تاریخ کو بدل سکتا ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ جس آزادی کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں، وہ آزادی کب آئے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں آزادی کا وقت تو نہیں جانتا، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی تو میری لاش پر آزادی کا محل تعمیر ہو کر رہے گا۔

میں کہوں گا کہ ہمارے ملک کا دانشور طبقہ اگر تربیتِ شعور (Consciousness raising) کی مہم میں اپنے کو فنا کرنے کا عزم کر لے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے کچھ نہ پا سکے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس کی قربانی قوم کو نئی زندگی دینے کا سبب بن جائے گی۔

چھوٹا کام

تعمیر قوم کا کام تعمیر ذہن سے شروع ہوتا ہے، یہ ایک نہایت واضح بات ہے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آج کوئی شخص نہیں جو اس اہم ترین کام میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے کام جن میں لوگ مصروف ہیں، وہ کہنے اور سننے میں بڑے کام معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فوراً اخبار میں چھپتے ہیں۔ ان کے ذریعہ صبح و شام میں آدمی کو شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تمام حوصلہ مند افراد جوق در جوق ان کاموں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور تعمیر شعور کا میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔

تعمیر شعور کا کام بظاہر ایک چھوٹا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اخباروں میں نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے نام پر بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی اپیل پر بڑے بڑے چندے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کام کی اہمیت کو جانتے ہوئے بھی اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

اگر قوم کے اندر چند ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہوں، اور اسی کے ساتھ وہ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ چھوٹے کام کو بڑا کام سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اس کے فوراً بعد

ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا، اور جب ایک صحیح کام شروع ہو جائے تو وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ راستہ کی کوئی بھی چیز اس کو روکنے والی نہیں۔

احتساب غیر، احتساب خویش

آج ہمارے تمام اخبارات اور تمام جلسے، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے سیاسی باتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں کو سیاسی موضوعات کے سوا کسی اور موضوع پر کچھ کہنا آتا ہی نہیں۔

یہ صورت حال دراصل خود لکھنے اور بولنے والوں کی اپنی کمزوری پر مبنی ہے۔ سیاست کے موضوع پر کلام کرنا گویا دوسروں کے خلاف کلام کرنا ہے، اور تعمیر کے موضوع پر کلام کرنا خود اپنے خلاف کلام کرنا۔ سیاسی موضوعات میں خارجی پارٹیاں، خارجی شخصیتیں، خارجی واقعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کے برعکس تعمیری موضوعات میں داخلی مسائل اور اندرونی کمزوریاں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ سیاسی موضوع پر بولنا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے، تعمیری موضوع پر بولنا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا۔ ایک لفظ میں، سیاست دوسروں کا احتساب ہے اور تعمیر خود اپنا احتساب۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ دوسروں کا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز ہے اور اپنا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز۔

لیکن اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کو لازماً یہی مبغوض کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا مستقبل کی تعمیر کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

جنگ اور امن اسلامی نقطۂ نظر سے

قرآن میں ہے کہ تم یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف کرلو ، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے ، اس کے بنائے کو بدلنا نہیں ہے ، یہی سیدھا دین ہے (الروم ۳۰)

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) وہ اس ابدی فطرت کے عین مطابق ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں اور عقل عام (Common sense) میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت چاہتا ہے کہ دنیا میں امن ہو۔ امن ہر آدمی کی پہلی خواہش ہے۔ فطرت کی آواز امن کی آواز ہے۔ کیوں کہ امن کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہر آدمی کو یکساں طور پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ عقیدہ اور نظریہ کے اختلاف کے باوجود سوسائٹی میں پر امن فضا برقرار رہے۔

انسانی فطرت کا یہ تقاضا اسلام کا تقاضا بھی ہے۔ اس معاملہ میں یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا بے امنی کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) خدا کو وہ لوگ پسند نہیں جو انسانی سماج کے اندر بگاڑ پیدا کرنے والے ہوں (المائدہ ۶۴)

فساد فی الارض

اسلام کا تصور امن یہ ہے کہ زمین کا نظام ابتدائی مرحلہ میں خالق نے جس طرح قائم کیا ہے اس کو ویسا ہی قائم رکھا جائے۔ اس میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔ اس خدائی بندوبست میں گڑبڑ کرنا ، اسی کا نام فساد فی الارض ہے (ہود ۱۱۶)

اس فساد فی الارض کے دو خاص پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ زمین پر خدا نے تقسیم رزق کا جو نظام بنایا ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک دریا جس وسیع رقبہ زمین پر بہتا ہے ، اس رقبہ کے تمام لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اگر کچھ لوگ بند بنا کر پانی کو اپنے لئے خاص کریں اور اسے دوسروں تک پہنچنے نہ دیں تو یہ فساد فی الارض

ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک ملک اپنی صنعتی سرگرمیوں کے ذریعہ ہوا میں گیسوں کے تناسب کو بدل دے اور لوگوں کو سانس لینے کے لئے ضرورری مقدار میں آکسیجن نہ ملے تو یہ بھی فساد فی الارض ہوگا۔ اسی طرح ایسا اقتصادی نظام جو دولت کی گردش کو یک طرفہ کردے یا اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کے نتیجہ میں مصنوعی قلت پیدا ہو جائے، یا جنگی جنون کے نتیجہ میں زمین کی دولت کا بڑا حصہ انسانی تعمیر کے بجائے انسانی تخریب میں استعمال ہونے لگے، تو یہ سب فساد فی الارض ہے، وغیرہ۔

عالمی نمونۂ عمل

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی دنیا کے نظام کو طبیعی دنیا کے نظام کے مطابق ہونا چاہئے۔ طبیعی دنیا کا نظام براہ راست خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ ربانی معیار پر قائم ہے۔ دوسری طرف انسانی دنیا کا نظام خود انسان اپنے ارادہ سے قائم کرتا ہے۔ یہاں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو طبیعی دنیا کے نمونہ پر قائم کرے۔ طبیعی دنیا کے نمونہ کی پیروی کا نام اصلاح ہے اور اس سے انحراف کا نام فساد۔ اس کی ایک مثال ستاروں کا نظام ہے۔ خلا میں بے شمار ستارے ہیں۔ وہ سب کے سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر یہ تمام ستارے ہمیشہ اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل نہیں ہوتے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اور سورج، وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ یہ عزیز وعلیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔ (۳۶ : ۳۸-۴۰)

خلا میں لاتعداد چھوٹے بڑے ستارے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار (Orbit) پر گھومتا ہے۔ کوئی ستارہ دوسرے ستارہ کی حد میں مداخلت نہیں کرتا۔ یہ گویا خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا ایک نمونۂ عمل (Role-model) ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اسی نمونہ پر عمل کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں دخل اندازی کئے بغیر اپنی پوری زندگی

کا سفر جاری رکھے۔

یہی وہ بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے شخص پر فخر نہ کرے، اور ایک شخص دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے (ان اللہ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد علی احد، مشکوٰۃ المصابیح الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۷۲)

جبر و اکراہ نہیں

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں جو احکام دئے گئے ہیں، ان میں سے ایک اہم حکم عدم اکراہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر جبر نہ کرے، کوئی کسی کو اس کی ناپسندیدہ چیز کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے۔ قرآن میں اس سلسلہ میں بنیادی اصول کے طور پر کہا گیا ہے کہ:
لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں)

اکراہ نہ کرنے کا یہ اصول یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دو طرفہ ہے۔ یہی اصول داعی کے لئے ہے، اور یہی اصول مدعو کے لئے۔ اسی اصول کی پابندی ہر انسان کو کرنی ہے، خواہ وہ ایک مذہب یا نظام سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب اور نظام سے۔ اس کی تائید میں یہاں دو مثالیں قرآن سے نقل کی جاتی ہیں۔

قرآن میں ایک پیغمبر (حضرت شعیب) کی دعوتی مہم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کے جواب میں کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان کی قوم کے بڑے، جو متکبر تھے، انھوں نے کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ۔ شعیب نے کہا کیا ہم اس کو ناپسند کرتے ہوں تب بھی (الاعراف ۸۸)

پیغمبر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ پیغمبر نے اصولاً اس کو درست نہیں قرار دیا کہ ان کی قوم کے لوگ انھیں اپنے دین (شرک) کو اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ پیغمبر اپنی قوم کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنا دین پیش کریں، جس طرح خود پیغمبر اپنا دین ان کے سامنے

پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ انھیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ "تبلیغ" سے تجاوز کر کے "اکراہ" کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ وہ کہنے سننے سے آگے بڑھ کر ان پر جبر کرنے لگیں۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جو حضرت نوح کے تذکرہ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ قوم کے بڑوں نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد حضرت نوح نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں۔ اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہیں آتی تو کیا ہم تم کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں، جب کہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو (ہود ۲۸)

پیغمبر کا یہ جواب جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اگرچہ اپنے آپ کو صدفی صد برسرِ حق سمجھتا تھا، اس کے باوجود اس کے نزدیک یہ درست نہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے۔

قرآن کے مطابق اکراہ (مجبور کرنا) ہر حال میں قابل ترک ہے۔ نہ داعی اور مصلح کو یہ حق ہے کہ وہ مدعو کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے اور نہ مدعو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ داعی کو اپنے جبر کا نشانہ بنائے۔ دونوں فریقوں کے لئے ایک ہی صحیح پالیسی ہے اور وہ رواداری (Tolerance) ہے۔ یعنی دونوں کو اپنی بات کے اظہار کا پورا حق ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی کو بھی جبر کا کوئی حق نہیں۔ کوئی شخص اپنی بات کو منوانے کے لئے اول و آخر جو چیز استعمال کر سکتا ہے وہ دلیل ہے نہ کہ عملی جبر یا دباؤ۔

جنگ برائے دفاع

اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم ہے، اور وہ دفاع (Defence) ہے۔ جارحانہ جنگ کسی بھی حال میں اسلام کے اندر جائز نہیں۔ قرآن میں ہے کہ ـــــ وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی۔ پھر جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں کے اوپر کچھ الزام نہیں۔ الزام صرف ان پر ہے جو لوگوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک

عذاب ہے۔ اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں (الشوریٰ ۳۹ - ۴۳)

اسلام میں جنگ کی حیثیت ایک ناگزیر برائی (Necessary evil) کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے جارحیت پیش آنے کے بعد بھی اگر صبر اور اعراض اور گفت وشنید کے ذریعہ امن قائم کرنے کی امید ہو تو جنگ کے بدلے جنگ نہیں کی جائے گی۔ بلکہ صبر و اعراض اور گفت وشنید کے ذریعہ منصفانہ حل تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام میں جنگ صرف اس وقت ہے جب کہ جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار سرے سے باقی نہ رہے۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں آپ کے خلاف ہر قسم کی جارحیت کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جنگ کو اوائڈ (Avoid) کریں۔ آپ کی پوری قولی اور عملی زندگی اسی اصول اعراض (Principle of avoidance) کا نمونہ ہے۔

مثلاً حدیبیہ (۶ ھ) کے سفر میں خالد بن الولید ایک فوج لے کر آپ سے لڑنے کے لئے مکہ سے روانہ ہوئے۔ جب آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو جوابی تیاری کا حکم نہیں دیا بلکہ سادہ طور پر اپنا راستہ بدل دیا تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی طرح غزوۂ احزاب (۵ ھ) کے موقع پر آپ کے مخالفین بہت بڑا لشکر لے کر آئے تاکہ مدینہ پر حملہ کریں۔ آپ کو دشمن کی روانگی کی خبر ملی تو یہاں بھی آپ نے جوابی مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کی سرحدوں پر لمبی خندق کھود دی تاکہ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان ایک آڑ قائم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت نہ آئے۔ حدیبیہ (۶ ھ) کے موقع پر آپ کے حریف قریش آپ سے لڑنے کے لئے تیار تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ہر قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی۔ مگر آپ سب کچھ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے اور قریش پر کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ آخر میں آپ نے خود قریش کی یک طرفہ شرائط کے تحت دس سالہ ناجنگ معاہدہ پر دستخط کر دئے۔

پیغمبر کا اسوہ

پیغمبر اسلام ۶۳ سال تک دنیا میں رہے۔ آپ کی پیغمبرانہ عمر ۲۳ سال تھی۔ اس مدت میں

آپ کے خلاف مسلسل طور پر بدترین قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی گئی۔ مگر اس پوری مدت میں آپ نے ایک بار بھی اپنے مخالفین کے اوپر جارحانہ حملہ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں براہ راست طور پر صرف تین بار جنگ کی ہے، اور یہ تینوں جنگیں یقینی طور پر مدافعانہ تھیں ــــ بدر (۲ ھ) احد (۳ ھ) اور حنین (۸ ھ) صرف یہی تین جنگیں ہیں جن میں آپ نے براہ راست شرکت فرمائی۔ مگر یہ تینوں جنگیں وہ تھیں جن میں خود آپ کے مخالفین آپ کے اوپر حملہ آور ہوئے تھے۔ چوں کہ ان تینوں مواقع پر مدافعت کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان کا مقابلہ کیا۔

اسلام میں امن ہے مگر جنگ نہیں، اسلام میں مدافعت ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں رواداری ہے مگر تشدد نہیں۔ اسلام انسان کو دارالسلام (سلامتی کے گھر) کی طرف لے جانا چاہتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی: واللہ یدعوا الی دار السلام (یونس ۲۵)

فطرت کے مطابق

ماسکو سے نکلنے والے انگریزی ماہنامہ اسپٹنک (Sputnik) کے شمارہ نومبر ۱۹۸۶ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر ہے جو بہت سبق آموز ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت یونین کے سابق پریسڈنٹ یوری اینڈروپوف (Yuri Andropove) ۱۹۸۳ میں امریکہ گئے۔ جب وہ وہاں ایر پورٹ پر اترے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں ۱۱ سال کی ایک امریکی لڑکی بھی تھی۔ اس کا نام سمنتھا اسمتھ (Samantha Smith) تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایر پورٹ پر پہنچی تھی۔ وہ روسی صدر سے ملی اور اپنے معصومانہ انداز میں ان سے کہا کہ آپ جنگ چاہتے ہیں یا امن:

Are you for war or peace?

روسی صدر پر چھوٹی بچی کے اس سادہ جملہ کا بہت اثر ہوا۔ واپس لوٹنے کے بعد بھی وہ اس کو بھلا نہ سکے۔ جلد ہی بعد سمنتھا اسمتھ کو روسی صدر کا ایک خط ملا۔ جس میں اس کو حکومت روس کے مہمان کی حیثیت سے سوویت روس کا سفر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق جون ۱۹۸۳ میں سمنتھا اسمتھ نے سوویت روس کا سفر کیا۔ سوویت روس کے دو ہفتہ دورہ کے بعد سمنتھا اسمتھ

نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب میں مطمئن ہوں کہ روسی جنگ نہیں چاہتے :

Now I'm sure—the Russians don't want war.

یہ چھوٹا سا واقعہ اپنے اندر ایک زبردست سبق رکھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے امن چاہتا ہے۔ ۱۱ سال کی ایک بچی جو ابھی اپنی ابتدائی فطرت پر تھی۔ جو ابھی مصنوعی تمدن کے اثرات سے آزاد تھی، اس کا مذکورہ سوال درحقیقت فطرت کا سوال تھا۔ اس کی فطرت ایک ایسی دنیا سے مطابقت نہیں کر پا رہی تھی جہاں جنگ کے نعرے ہوں، جہاں گولی کی منطق سے معاملات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ جہاں انسان اپنے جان و مال کو محفوظ نہ پاتا ہو۔ اسی نفسیات کے تحت اس نے روسی صدر سے مذکورہ سوال کیا۔

اسلام درحقیقت انسانی فطرت کی اسی پکار کا جواب ہے۔ جس خدا نے انسان کے اندر امن پسند فطرت بنائی ہے، اسی خدا نے دین اسلام بھی اتارا ہے جو سراسر امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا میں امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارے، تاکہ آخرت میں اس کو ابدی امن و سلامتی کے باغوں میں بسایا جائے۔ آخرت کی پرامن دنیا انھیں لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے موجودہ دنیا میں پرامن رہنے کا ثبوت دیا ہو۔ کسی مومن کے لئے یہ سب سے بڑا محرک ہے جو اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں لوگوں کے ساتھ پرامن بن کر رہے۔ وہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا مسئلہ حل کرے۔

عمر ونشر الدعوة الإسلامية

عمل عمر جهده وصرف عنايته على نشر الدعوة الإسلامية بتبليغها للناس ودعوتهم إليها بالحسنى ، فصار يرسل إلى القادة وإلى الأمراء والحكومات يدعوهم إلى الإسلام ويرسل الفقهاء لدعوة الناس وتعليمهم الدين الصحيح وحقيقة التوحيد ، وقد آتى ذلك ثماره ودخل الناس في دين الله أفواجاً ، فوضع عمر الجزية عمن أسلم ، فكان ذلك دافعاً لدخول الناس في الدين الجديد حين علموا صفاءه ونقاءه وأنه لايرهق الناس ولايبخسهم حقهم ، ولقد لامه بعض عمال الأقاليم على سياسة وضع الجزية ، ولكن عمر يجابهه بالقول الفصل « ضع الجزية عمن أسلم قبح الله رأيك فإن الله إنما بعث محمداً ﷺ هادياً ولم يبعثه جابياً ، ولعمري لعمر أشقى من أن يدخل الناس كلهم في الإسلام على يديه » .

وفي خراسان أقلق بعض من لهم مصالح خاصة دخول الناس بكثرة في الإسلام فتقدموا إلى الجراح عاملها أن يمتحن هؤلاء الناس بالختان ليعرف رغبتهم الحقيقية ، فنقل الجراح ذلك إلى عمر . فرد عليه رداً حاسماً قاطعاً : « إن الله بعث محمداً ﷺ داعياً ولم يبعثه خاتنا » . وتأتي إليه رسالة عامله على البصرة التي يقول فيها : « الناس قد كثروا في الإسلام وخفت أن يقل الخراج » فيجيبه عمر : « فهمت كتابك والله لوددت أن الناس كلهم أسلموا حتى نكون أنا وأنت حراثين نأكل من كسب أيدينا » .

وتوسع عمر في دعوته فأرسل الرسائل إلى جميع ملوك الأرض يدعوهم إلى الدخول في الإسلام فأرسل إلى الهند وإلى ماوراء النهر ، فاستجاب له خلق كثير ، ونشط عمال الولايات حين رأوا هذه الرغبة من عمر حتى أنه ليقال : إنه قد دخل على يد الجراح عامله على خراسان أكثر من أربعة آلاف شخص في الإسلام .

عمر بن عبد العزیز

مجلہ البحوث الاسلامیہ (ریاض) ایک علمی مجلہ ہے۔ اس کے شمارہ ۲۳ (۱۴۰۸ھ) میں خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے بارے میں ایک مفصل مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

عمر بن عبد العزیز نے اسلامی دعوت کو پھیلانے کی کافی کوشش کی۔ اور لوگوں کے درمیا اسلام کی تبلیغ کے لیے اپنی توجہ صرف کی۔ انھوں نے بڑے بڑے سرداروں اور حکمرانوں کو اس کی طرف دعوت دی۔ اور علما کو بھیجا کہ وہ اسلام کی سچی تعلیمات اور دینِ توحید سے انھیں باخبر کریں ان کی ان کوششوں نے پھل دیا اور لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوئے۔ عمر بن عبد العزیز نے ان لوگوں کا جزیہ معاف کر دیا جو اسلام لائے تھے۔ یہ لوگوں کے لیے اسلام میں داخل ہونے کا مزید سبب بنا، جب انھوں نے جانا کہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کے حقوق کم نہیں ہوتے بلکہ اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔

ان کے گورنروں میں سے ایک گورنر نے انھیں جزیہ ساقط کرنے کے طریقہ پر ملامت کی۔ عمر بن عبد العزیز نے فیصلہ کن لہجہ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جو اسلام قبول کرے اس کا جزیہ ساقط کر دو۔ تمہاری یہ رائے بہت بری ہے۔ کیوں کہ اللہ نے محمدؐ کو ہدایت دینے والا بنا کر بھیجا، اس نے انھیں ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اور میری جان کی قسم، عمر اس سے زیادہ شقی ہے کہ سارے لوگ اس کے ہاتھ پر اسلام میں داخل ہو جائیں۔

خراسان میں بعض لوگ اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر کثرت سے لوگوں کے داخلِ اسلام ہونے پر متردد ہوئے۔ انھوں نے وہاں کے گورنر الجراح سے کہا کہ وہ نومسلموں کی آزمائش کریں اور انھیں ختنہ کرنے کا حکم دیں تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ کیا وہ حقیقی رغبت کی وجہ سے مسلمان ہوتے ہیں۔ الجراح نے اس بارے میں عمر بن عبد العزیز کو لکھا۔ انھوں نے سخت جواب دیتے ہوئے کہا کہ اللہ نے محمدؐ کو دعوت دینے والا بنا کر بھیجا، اس نے آپ کو ختنہ کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اسی طرح بصرہ کے گورنر نے انھیں لکھا کہ لوگ بہت زیادہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ خزانہ کی رقم کم ہو جائے گی۔ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کو میں نے جانا

خدا کی قسم مجھے یہ پسند ہے کہ تمام لوگ اسلام قبول کرلیں اور میں اور تم ہل چلانے والے بن جائیں، اور اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی معاشش حاصل کریں۔

عمر بن عبد العزیز نے وسیع دائرہ میں اسلام کی دعوت پھیلائی۔ انھوں نے تمام بادشاہوں کے نام خط لکھے اور انھیں اسلام میں داخل ہونے کی طرف بلایا۔ مثلاً ہندستان اور ماوراء النہر وغیرہ۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ عمر بن عبد العزیز کے گورنروں نے جب خلیفہ میں دعوتی رغبت دیکھی، تو انھوں نے بھی اس میدان میں کافی سرگرمی دکھائی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ خراسان کے گورنر الجراح کے ہاتھ پر ۴ ہزار سے زیادہ افراد مسلمان ہوئے۔

عمر بن عبد العزیز غالباً اسلامی تاریخ کے آخری معلوم شخص ہیں جن کے اندر دعوت کا شعور پوری طرح زندہ تھا۔ جو کامل طور پر جانتے تھے کہ دعوت کیا ہے اور دعوت کیا نہیں ہے۔ وہ اس اس راز سے واقف تھے کہ اسلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز دعوت ہے۔ جب دعوت کی مصلحت اور دوسری مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو تو دعوت کی مصلحت کو ترجیح دی جائے گی اور دوسری تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ اہم نظر آتی ہوں۔

موجودہ زمانہ میں، کم از کم معروف مسلمانوں کے درمیان، دعوت کا شعور مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ حتی کہ ان میں سے جو لوگ دعوت کا نام لیتے ہیں، وہ بھی دعوت کی حقیقت سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کہ نام نہ لینے والے لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف دعوت کا نام لیتے ہیں اور دوسری طرف ایسی باتیں کرتے ہیں جو دعوت کے لیے زہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ داعی کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے دعوت کو سمجھا ہو، بغیر اس کے کہ انھوں نے اپنے آپ کو داعیانہ ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے تیار کیا ہو۔

دعوت اور عمل

کوئی داعی اس وقت اللہ کی نظر میں داعی ہے جب کہ وہ داعی ہونے کے ساتھ عامل بھی ہو۔ آدمی جب کسی دوسرے شخص کو نیکی کی تلقین کرے تو سنجیدگی کا تقاضا ہے کہ وہ خود بھی اس پر کاربند ہو۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں (ہود ۸۸)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل، دعوت کی شرط ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام ہر حال میں جاری رکھا جائے گا خواہ داعی عامل ہو یا نہ ہو۔ مفسر ابن کثیر نے سورۃ البقرہ (آیت ۴۴) کے تحت لکھا ہے:

فکل من الامر بالمعروف وفعله واجب لا يسقط احدهما بترك الآخر على اصح قولي العلماء من السلف والخلف وذهب بعضهم الى ان مرتكب المعاصي لا ينهى غيره عنها۔ وهذا ضعيف واضعف منه تمسكهم بهذه الآية فانه لا حجة لهم فيها، والصحيح ان العالم يامر بالمعروف وان لم يفعله وينهى عن المنكر وان ارتكبه۔ وقال مالك عن ربيعة سمعت سعيد بن جبير يقول لو كان المرء لا يامر بالمعروف ولا ينهى عن المنكر حتى لا يكون فيه شئ ما امر احد بمعروف ولا نهى عن منكر۔ قال مالك وصدق من ذا الذي ليس فيه شئ۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۸۵)

پس معروف کی تلقین کرنا اور اس پر عمل کرنا دونوں ہی واجب ہیں، ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ترک سے ساقط نہیں ہوتا۔ علماء سلف اور علماء خلف کا صحیح ترین قول یہی ہے۔ ان میں سے بعض اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا مرتکب ہو وہ دوسرے کو انھیں گناہوں سے نہ روکے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضعیف بات یہ ہے کہ اس کو سورۃ البقرہ کی آیت (اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم) سے نکالا جائے، کیوں کہ اس میں ان کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ عالم معروف کی تلقین کرے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو اور وہ منکر سے روکے گا اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب ہو۔ مالک نے ربیعہ سے نقل کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے سعید بن جبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر ایسا ہوتا کہ آدمی صرف اس وقت معروف کی تلقین

کرے اور منکر سے روکے جب کہ اس کے اندر کوئی چیز پائی نہ جارہی ہو تو کسی شخص نے بھی معروف کی تلقین نہ کی ہوتی اور نہ وہ منکر سے روکتا۔ امام مالک نے کہا اور سچ کہا کہ کون شخص ہے جس کے اندر کوئی چیز نہیں۔

اس معاملہ میں علماء اسلام کا اتفاق اس لیے ہے کہ یہ ایک اصول کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے لیے عمل کی شرط دعوت کو ہمیشہ کے لیے نا قابل عمل بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ ایک سچا عامل اور صالح انسان اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایسا آدمی آخرت کے احساس سے کانپتا رہتا ہے۔ اس کا احساسِ احتساب اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے بظاہر عمل کو بھی بے عمل سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں کون ہوگا جو اپنے صالح اور باعمل ہونے کا یقین کرے اور اس کے بعد وہ دعوت اسلامی کا آغاز کرے۔

اصل یہ ہے کہ دعوت احساس ذمہ داری کے تحت ظاہر ہونے والا عمل ہے نہ کہ احساس صالحیت کے تحت۔ مدعو بھی جب اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسلام کی اپنی صداقت کی بنا پر ایسا اقدام کرتا ہے نہ کہ مسلمانوں کو باعمل ہونے کو دیکھ کر۔ اگر داعی کے باعمل ہونے کو دیکھ کر لوگ حق کو قبول کرتے تو تمام انبیاء کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی۔ مگر معلوم ہے کہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی بھی پیغمبر کے گرد انسانوں کی کوئی بڑی جماعت اکٹھا نہیں ہوتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ دعوت ہر حال میں دینا ہے اور ہر شخص کو دینا ہے، اس کے لیے مذکورہ قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی۔

عبرت ناک

عرابی پاشا (۱۹۱۱ - ۱۸۳۹) مصر کے ایک سیاسی لیڈر تھے۔ ان کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لیے) ان کے زمانہ میں مصر میں خدیو اسماعیل پاشا کی حکومت تھی۔ انھوں نے خدیو کو غدار قرار دیا۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ خدیو اسماعیل پاشا مغربی طاقتوں کا ایجنٹ ہے چنانچہ انھوں نے خدیو اسماعیل پاشا کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ ۱۸۸۱ کا واقعہ ہے۔ مگر ان کی بغاوت مکمل طور پر ناکام رہی۔ خدیو اسماعیل پاشا نے اپنے بچاؤ کے لیے برطانیہ سے مدد مانگی۔ برطانیہ نے فوراً ان کی پکار پر لبیک کہا۔ چنانچہ برطانی فوجوں کی مدد سے بغاوت کچل دی گئی اور عرابی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا۔ مزید یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ میں مصر پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اس بغاوت میں عرابی پاشا کا جن لوگوں نے ساتھ دیا ان میں فوجی لوگوں کے علاوہ مشہور دینی مصلح شیخ محمد عبدہٗ (۱۹۰۵ - ۱۸۴۹) اور ان کے ساتھی بھی شامل تھے۔ تاہم شیخ محمد عبدہ اور ان کے ساتھیوں کی شمولیت کے باوجود بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔ "اسلام" کو مصر کا تخت دلانے کی کوشش میں "انگریز" مصر کے تخت پر قابض ہو گیے۔

شیخ محمد عبدہ اسلام کے علم بردار تھے۔ دوسری طرف انگریز غیر اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ مگر اس کے مقابلہ میں اسلام کے علم بردار مکمل طور پر ناکام رہے۔ اور غیر اسلام کے علم برداروں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ ایک واضح مثال تھی کہ محض اسلام کے نام پر جھنڈا لے کر اٹھنا مقابلہ کی اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ کامیابی کے لیے حقیقی حالات کی مساعدت بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ اسی مصر میں ٹھیک یہی ناکام کہانی دوبارہ ۱۹۵۲ میں دہرائی گئی۔ ۱۸۸۱ کے "اسلامی جہاد" کا نشانہ خدیو اسماعیل پاشا تھا۔ اور ۱۹۵۲ کے "اسلامی جہاد" کا نشانہ شاہ فاروق الاول تھا۔ پہلے جہاد کے قائد عرابی پاشا تھے اور ان کے ساتھ مفتی محمد عبدہٗ اور ان کی جماعت شریک تھی۔ دوسرے جہاد کے قائد جمال عبدالناصر تھے اور سید قطب اور ان کی جماعت حامیٔ انقلاب بن کر ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ مگر جو انجام پہلے جہاد کا ہوا تھا، عین وہی انجام

دوسرے جہاد کا بھی ہوا۔

ان دونوں کوششوں میں ظاہری اعتبار سے بعض فرق تھے۔ مگر جہاں تک "اسلامی مجاہدین" کا تعلق ہے، دونوں مواقع پر ان کا بالکل یکساں انجام ہوا۔ غیر اسلامی عناصر دونوں بار غالب رہے اور مسلم مجاہدین دونوں بار مکمل طور پر ناکامی کا شکار ہو کر رہ گیے۔

یہی کہانی زیادہ بری شکل میں پاکستان میں دہرائی گئی ہے۔ پاکستان میں سابق صدر جنرل محمد ایوب خاں کو اسلام کی راہ میں اصل رکاوٹ سمجھ لیا گیا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کے اسلام پسند ساتھی تنہا اپنی طاقت سے اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دوسری طاقتوں کو ساتھ لے کر ایوب خاں کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلائی۔ اس مہم کو وہ اتنا زیادہ ضروری سمجھتے تھے کہ ایوب خاں کے مقابلہ میں انھوں نے ایک خاتون کو صدر کی حیثیت سے کھڑا کیا۔ حالاں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ کوئی خاتون حکمران کسی ملک یا قوم کو فلاح کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ مگر جب یہ مہم کامیاب ہوئی تو صدر ایوب کی جگہ دوسرے "اسلام دشمن افراد" ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ یہی مہم دوبارہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف شروع کی گئی۔ اسلام پسندوں اور غیر اسلام پسندوں کی متحدہ کوشش سے مسٹر بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود "غیر اسلام" کو پھانسی پر چڑھانا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بھٹو کے خاتمہ کے بعد بھی پاکستان میں پوری طرح زندہ ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لا یلدغ من جحر مرتین) اس لحاظ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مسلم رہنما ایک ہی غلطی کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ مثالیں حیرت انگیز طور پر بتاتی ہیں کہ وہ ایک ہی سیاسی بل سے بار بار ڈسے جا رہے ہیں۔ وہ ایک ہی ناکام سیاسی تجربہ کو بار بار دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کے دین کی یہ کیسی عجیب عملی تفسیر ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کرنا نہیں جانتے تو کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کچھ نہ کریں۔ اگر انھیں بولنا نہیں آتا تو کیا انھیں یہ بھی نہیں آتا کہ وہ اپنی زبان کو بند رکھیں۔

آہ وہ لوگ، جنھیں کرنا نہیں آتا۔ پھر بھی وہ کرتے ہیں۔ جنھیں بولنا نہیں آتا پھر بھی وہ بولتے ہیں، صرف اس لیے کہ جو مواقع کار ابھی باقی ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں، یہاں تک کہ نہ کسی کے لیے کرنے کا کچھ موقع ہو اور نہ کچھ بولنے کا۔

ایک سفر

شیو گنج ، راجستھان کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔ یہاں کے لئے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۷۶ میں ہوا تھا۔ اس کی رو داد لکھی نہ جا سکی۔ دوسرا سفر فروری ۱۹۷۸ میں ہوا۔ اس سفر کی رو داد الرسالہ اپریل ۱۹۷۸ میں شائع ہو چکی ہے۔

پہلے سفر کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں نے وہاں اپنے میزبان سے کہا کہ میں بالکل سادہ کھانا پسند کرتا ہوں۔ اس کے بعد جب دستر خوان بچھایا گیا تو حسب معمول تمام دعوتی کھانے موجود تھے۔ اسی کے ساتھ دستر خوان کے ایک طرف میرے لئے "سادہ کھانا" بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے میزبان سے کہا کہ یہ تو میں نے آپ کو دہرا زحمت دے دی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ جو دستر خوان پر ہیں ان کی رعایت کی بنا پر ایسا کیا گیا ہے۔

اس طرح کے چند تجربات کے بعد میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ سفر کے موقع پر سادہ کھانے کے بارے میں اپنی پسند کا ذکر نہ کروں۔ اس کے بجائے اب میں ایسا کرتا ہوں کہ دستر خوان پر جب چیزیں رکھی جائیں، تو ان میں جو چیز نسبتاً سادہ ہو اس کو لے کر خاموشی سے اسے کھالوں۔ کیونکہ موجودہ حالت میں سادہ کھانے کی فرمائش کرنا میزبان کو دہرا مشقت میں مبتلا کرنا ہے۔

شیو گنج کے لئے میرا تیسرا سفر موجودہ سفر ہے جو جولائی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں ہوا۔ اس سفر میں راجستھان کے کئی مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور بہت سے مقامات کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح اس سفر کے دوران تقریباً پورے راجستھان کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے روانگی ہوئی "آشرم سپر فاسٹ ایکسپریس ۶ بجکر ۱۰ منٹ پر پلیٹ فارم نمبر ۷ سے روانہ ہوگی" اسٹیشن کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا۔ جیسے ہی گھڑی کی ایک سوئی ۶ پر تھی اور دوسری سوئی ۱۰ پر، حرکت شروع ہوئی اور گاڑی چلنے لگی۔ اب جو سوار تھا وہ اتر نہیں سکتا تھا، اور جو سوار نہیں تھا وہ چڑھ نہیں سکتا تھا۔

یہی وسیع تر زندگی کا معاملہ ہے۔ کبھی ایک شخص پیچھے لوٹنا چاہتا ہے، مگر وہ لوٹ نہیں سکتا۔

کیوں کہ زمانہ کی رفتار آگے جا چکی۔ اسی طرح کبھی ایک شخص آگے جانا چاہتا ہے، مگر وہ نہیں جاسکتا۔ کیوں کہ وہ زمانہ سے پیچھے رہ گیا۔

گاڑی تیزی کے ساتھ لوہے کی پٹری پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ پٹریاں اگر مٹی کی ہوں، کیا تب بھی گاڑی اسی طرح دوڑے گی۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ پھر میری نظر دونوں طرف پھیلے ہوئے سرسبز درختوں کی طرف گئی۔ میں نے سوچا کہ ان درختوں کی جڑوں میں اگر مٹی کے بجائے لوہا ہو، تب بھی کیا یہ درخت اسی طرح ہرے بھرے ہو کر کھڑے رہیں گے۔ دل نے دوبارہ کہا کہ نہیں۔ گاڑی مٹی پر نہیں چل سکتی۔ درخت لوہے پر نہیں اُگ سکتا۔

یہ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون ہے۔ یہاں وہی شخص اپنی گاڑی تیز دوڑا سکتا ہے جس نے اس کے نیچے لوہے کی پٹریاں بچھائی ہوں۔ اسی طرح یہاں وہی شخص ہرے بھرے باغ کا مالک بن سکتا ہے جس نے اپنے درخت کو نرم مٹی میں اگایا ہو۔ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک قانون ہے۔ یہاں وہی شخص کسی چیز کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے مخصوص قانون کے مطابق اس کو پانے کی کوشش کی ہو۔

ٹرین تیزی کے ساتھ دہلی سے راجستھان کی طرف دوڑ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو سورج افق کے نیچے جا رہا تھا تاکہ کچھ دیر کے بعد غروب ہو جائے۔ بظاہر یہ دونوں الگ الگ واقعات تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک تھے۔ دونوں خود ٹرین کے دو سفروں کو بتا رہے تھے۔ ٹرین اپنے انجن کے زور پر دہلی سے راجستھان کی طرف دوڑ رہی تھی۔ دوسری طرف زمین کی گردش کے تحت اس کا دوسرا سفر جاری تھا۔ یہ سفر اس کو دن سے رات کی طرف لے جا رہا تھا۔ ٹرین ایک اعتبار سے دہلی سے راجستھان کی طرف جا رہی تھی اور دوسرے اعتبار سے دن سے رات کی طرف۔

اس دنیا میں آدمی کا ایک سفر وہ ہے جو وہ اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ دوسرا سفر وہ ہے جو قضا و قدر کے حکم کے تحت جاری ہے۔ اسی سے جبر و قدر کے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں آدمی جبر و اختیار کے درمیان ہے۔ ایک اعتبار سے وہ آزاد ہے کہ وہ جدھر چاہے جائے۔ دوسرے اعتبار سے وہ مجبور ہے کہ وہ اسی انجام کو پہنچے جو خدا نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے۔

موجودہ سفر میری زندگی کا بڑا عجیب سفر تھا۔ دہلی میں ۲۲ جولائی کو میرے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام

خاں کا ایکسڈنٹ ہوگیا۔ وہ ایک بھاری گاڑی کے نیچے آگئے۔ ان کو سخت زخم آئے اور ان کے دائیں پاؤں کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوقت سفر وہ ولنگڈن نرسنگ ہوم (کمرہ نمبر ۳۸) میں داخل تھے۔ اس حادثہ کی تفصیل بڑی دردانگیز اور غم انگیز ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں نہایت دل شکستہ حالت میں دہلی سے روانہ ہوا۔ رات کے وقت ٹرین میں سویا تو نیند نہیں آرہی تھی۔ تین گھنٹہ تک اپنی برتھ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے بعد جھپکی کے ساتھ ایک نیند آئی۔ اسی حالت میں خواب دیکھا کہ ظفر الاسلام کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے ہیں اور بالکل نارمل انداز میں چلتے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔

یہ خواب ۲۷ جولائی اور ۲۸ جولائی کی درمیانی رات میں ٹرین کے اندر دیکھا۔ اس کو میں نے اللہ کی طرف سے بشارت سمجھا۔ اس کے بعد دل کو سکون آگیا اور پھر جلد ہی نیند آگئی۔ اسی قسم کا خواب دہلی واپس آنے کے بعد دوبارہ ۸ اگست اور تیسری بار ۱۵ اگست ۱۹۸۹ کو دیکھا۔ حادثہ کے تین مہینے بعد اب خدا کے فضل سے یہ خواب واقعہ بن چکا ہے —— اس دنیا میں حادثات بھی ہیں، اور اسی کے ساتھ حادثات کی تلافی کے لئے خدا کی طرف سے خصوصی انتظام بھی۔

دہلی کا ایک سہ روزہ مسلم اخبار ہے۔ اس کی پیشانی پر قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ ان لفظوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: اس شخص سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اس اخبار کے شمارہ ۲۲ جولائی ۱۹۸۹ میں راجستھان کے بارہ میں "ایک خصوصی رپورٹ" نقل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

"آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے مل کر گزشتہ پانچ مہینوں سے پورے راجستھان کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونک دیا ہے"۔

یہ "راجستھان کے سترہ اضلاع میں فسادات کی سازش" کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد جب میں ۲۷ جولائی کی شام کو راجستھان جانے کے لئے آشرم ایکسپریس پر سوار ہوا تو میں سمجھا کہ میں ایک ایسی دنیا میں جا رہا ہوں جہاں ہر طرف آگ کے شعلے مجھے جلانے کے لئے بھڑک رہے ہوں گے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اردو اخبار کا یہ راجستھان سفر میں نظر نہ آیا مجھے

تو ریاست میں ہر طرف برسات کی ہوائیں چلتی ہوئی نظر آئیں۔ اخبارات (خاص طور پر اردو اور ہندی کے اخبارات) آگ کا کارخانہ ہیں۔ وہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں کوئی چنگاری ہو تو اس کو بھڑکا کر آتش فشاں بنا دیں۔ جب کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ ٹھنڈی ہوائیں بھیج کر آگ کو بجھا دے۔

میں جس ڈبہ میں تھا، اس میں بظاہر میرے ایک مسافر کے سوا سب کے سب ہندو تھے۔ میں نے اس ڈبہ میں دو وقت کی نماز پڑھی۔ مغرب اور عشاء کی۔ لوگوں نے بہت احترام کے ساتھ نماز کے لئے جگہ خالی کر دی۔ شام کو کھانے کا وقت آیا تو ایک ہندو ہم سفر نے کھانا پیش کیا جس کو میں قبول نہ کر سکا۔ دن کے وقت میں کھڑکی کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہندو باپ نے بطور خود محسوس کر کے وہاں سے اپنے لڑکے کو ہٹا دیا اور کہا کہ آپ یہاں بیٹھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ فساد ایک استثنار ہے نہ کہ عمومی واقعہ۔ مگر صحافی اور لیڈر صرف انھیں استثنائی واقعات کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ استثنائی حالت کو عمومی حالت بتاتے ہیں۔ وہ "جزر راجستھان" کو پورا راجستھان بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اخبارات کا نام دعوت اور نشیمن رکھا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ اپنے اخبار کا نام عداوت اور خرابات رکھتے تو کم از کم سچ بولنے کا کریڈٹ انھیں ملتا۔ موجودہ حالت میں تو انھیں کوئی بھی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

اس مفصل "رپورٹ" کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "فرقہ پرست تنظیمیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں اور فرقہ وارانہ صورت حال روز بروز بھیانک ہوتی جا رہی ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی رپورٹیں اور سازشوں کا انکشاف اور ایڈمنسٹریشن کے نکمے پن کا اعلان اور احتجاجی بیانات کا طریقہ سراسر ناکام ہو چکا ہے۔ اب ہمیں کچھ اور سوچنا ہے۔

رپورٹ میں اس "کچھ اور" کے لئے اشاراتی رہنمائی موجود ہے۔ مثال کے طور پر اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھلواڑہ ضلع کے بیگو قصبہ میں ۳۰ مارچ کو فساد کی آگ بھڑکی۔ شیتل اشٹمی کے دن جلوس اپنے روایتی راستہ سے مالکڑ والی مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا، تبھی جلوس سے کسی نے مسجد میں گلال پھینک دیا۔ جس کے جواب میں مسجد کے اندر سے پتھراؤ کیا گیا۔ ۱۲ آدمیوں کو چوٹیں لگیں۔ پولیس کے ۴۰ جوان بھی زخمی ہوئے۔ حالات کو قابو میں کرنے کے لئے پولیس نے آنسو گیس چھوڑے۔ پھر لاٹھی چارج کیا۔ اور ہوائی فائرنگ بھی کی۔ تب جا کر بھیڑ منتشر ہوئی۔ اتنے میں شہر میں

کے محلہ سے کچھ لوگ راماکوٹ بازار میں جا گھسے اور آٹھ دکانوں کو آگ لگا دی۔ پانچ مکانوں کو بھی پھونک دیا۔ ۲۰ منٹ تک یہ تباہی و بربادی بلا رکے ٹوک چلتی رہی ....صفحہ ۲

اس واقعہ کی روشنی میں فساد کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ "گلال" پھینکنے پر مشتعل ہونے والے لوگ مشتعل نہ ہوں اور ردہ مسجد سے پتھر پھینکنے کی دوسری غلطی نہ کریں۔ اس کے بعد فساد اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے گا۔ مگر دوسری غلطی فساد کو بڑھا دیتی ہے، وہ ایک معمولی واقعہ کو بھیانک حادثہ بنا دیتی ہے۔

راجستھان (قدیم نام راجپوتانہ) کا مطلب ہے راجاؤں کی سرزمین۔ آزادی (۱۹۴۷) سے قبل یہاں چھوٹی بڑی ۲۶ ریاستیں تھیں۔ یہ سب راجپوت تھے جو ہمیشہ سے نہایت بہادر قوم رہے ہیں۔ مغل حکمرانوں کے لئے سب سے بڑا فوجی چیلنج راجپوتوں ہی کی طرف سے تھا۔ اکبر نے اس مسئلہ کے حل کے لئے مصلحت کا انداز اختیار کیا۔ اس کی بعض غیر ضروری حماقتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے راجپوتوں کے سلسلہ میں اس کی پالیسی مفید رہی۔ اس نے راجپوتوں کو اس حد تک اپنے ساتھ لے لیا کہ واحد قابل ذکر راجپوت باغی مہارانا پرتاپ سنگھ کا مقابلہ کرنے کے لئے اکبر کو جو بہترین جنرل ملا وہ راجہ مان سنگھ تھا جو خود بھی ایک بہادر راجپوت تھا۔

آزادی سے قبل ہندستان میں بہت سے راجہ، نواب تھے۔ ان کی ریاستوں کی تعداد ۶۰۱ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں بڑی ریاستیں یہ تھیں: حیدرآباد، کشمیر، میسور، ٹراونکور، بڑودہ، گوالیار، اندور، کوچین، جے پور، جودھپور، بیکانیر، بھوپال اور پٹیالہ۔

راجستھان کی قدیم ریاست جودھپور کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جودھپور کی تاریخ سے واقف تھے۔ ان سے جو باتیں ہوئیں، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جودھپور کی بنیاد راجہ راؤ جودھا نے ۱۴۵۹ء میں ڈالی تھی۔ انھیں کے نام پر اس کا نام جودھاپور پڑا جو بعد کو جودھپور ہو گیا۔ آزادی سے پہلے یہ ایک راجپوت ریاست تھی۔ جودھپور یونیورسٹی ۱۹۶۲ء میں قائم ہوئی۔ جودھپور ضلع کا شمالی اور شمال مغربی حصہ صحرا ہے۔ اس ضلع میں صرف ایک ندی ہے جو لونی کہلاتی ہے۔ اگر آپ شہر کے کنارے کھڑے ہوں تو ایک طرف آپ کو میدانی علاقہ میں شہر کی آبادی پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔ دوسری طرف پہاڑی کے اوپر پرانے قلعہ کی عمارتیں دکھائی

دیں گی جو گویا ایک تاریخی مشاہدے کے طور پر بلندی پر کھڑے ہو کر نئے شہر کو دیکھ رہی ہیں۔

جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ کی وفات ۱۶۷۸ میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کے یہاں فروری ۱۶۷۹ میں ایک لڑکا لاہور میں پیدا ہوا جس کا نام اجیت سنگھ رکھا گیا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جسونت سنگھ کے درباری اجیت سنگھ کو دہلی لے گئے اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکے کو جسونت سنگھ کی جگہ جودھپور کا راجہ تسلیم کر لے۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ اس کو یہاں چھوڑ دو تاکہ اس کی پرورش ہمارے محل میں ہو سکے۔ یا ایک اور معاصر بیان کے مطابق جودھپور کا تخت اجیت سنگھ کو اس شرط پر پیش کیا گیا کہ وہ مسلمان ہو جائے:

The emperor offered to bring him up in his harem, or according to another contemporary account "the throne of Jodhpur was offered to Ajit on condition of his turning a Muslim."

An Advanced history of India, p. 495.

ایک اور روایت اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ اس کے مطابق مغل حکمراں اورنگ زیب نے ۱۶۷۹ میں مارواڑ کو فتح کیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے باشندے اسلام قبول کر لیں۔ اس کے جواب میں جودھپور، جے پور اور اودے پور کے راجہ متحد ہو گئے اور مسلم جوئے کو اپنے اوپر سے اتار پھینکا:

The Mughal emperor Aurangzeb invaded and plundered Marwar in 1679, ordering the conversion of its inhabitants to Islam. In reply, the princely states of Jodhpur, Jaipur, and Udaipur formed an alliance and threw off the Muslim yoke.

یہ دونوں روایتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں جسونت سنگھ راٹھور جودھپور کا راجہ تھا۔ وہ اورنگ زیب کا معتمد تھا۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے اس کو کابل اور پشاور کا گورنر بنا دیا۔ یہیں ۱۶۷۸ میں جسونت سنگھ کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد فروری ۱۶۷۹ میں اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام اس کے گھر والوں نے اجیت سنگھ رکھا۔ جودھپور کے راجپوتوں کی خواہش تھی کہ اورنگ زیب اسی اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ مان لے۔ مگر اورنگ زیب نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے ناگور

کے راناؤ اندر سنگھ کو جودھپور کے تخت پر بیٹھا دیا۔ اور نوعمر اجیت سنگھ کی بابت اس نے حکم دیا کہ وہ دہلی میں رہے اور مغل ماحول میں تربیت پائے۔

غالباً راجپوتوں نے سمجھا کہ اورنگ زیب اجیت سنگھ کو اپنے یہاں رکھ کر اس کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو لے کر دہلی سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اودے پور کے راجہ کے ساتھ مل کر اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی۔ حتی کہ خود اورنگ زیب کے لڑکے اکبر کو بھی انھوں نے اس بغاوت میں اپنے ساتھ ملالیا۔ یہ بے فائدہ لڑائی مختلف صورتوں میں جاری رہی۔ تاہم اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ نہیں مانا۔ یہاں تک کہ ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا۔

اورنگ زیب کے بعد بہادر شاہ اول نے پالیسی بدلی۔ اس نے ۱۷۰۹ میں اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ مان لیا۔ مگر یہ بعد از وقت تھا۔ چنانچہ دوبارہ اس کا کوئی فائدہ مغل سلطنت کو حاصل نہ ہو سکا۔

اجیت سنگھ کے معاملہ میں اورنگ زیب کا فیصلہ یقیناً غلط تھا۔ اس کے نتیجہ میں وفادار راجپوت غیر ضروری طور پر مغلوں کے دشمن بن گئے۔ اورنگ زیب کو تقریباً ۵۰ سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے دور کا بیشتر حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ یہ لڑائیاں اس کی بہادری کو ثابت کرتی ہیں۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان لڑائیوں کا کوئی تعلق دانشمندی سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی اکثر لڑائیاں صرف اس لئے پیش آئیں کہ وہ "شمشیر" کی طاقت کو ضرور جانتا تھا۔ مگر حکمت اور دانش مندی کی طاقت کی اسے خبر نہیں تھی۔

اورنگ زیب بلاشبہ مغل خاندان کا ایک بہادر بادشاہ تھا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ مغل خاندان کا ایک بے دانش بادشاہ تھا۔ یہ اورنگ زیب ہی ہے جس نے اپنی غیر دانش مندانہ کارروائیوں سے مغل سلطنت کے زوال کے اسباب پیدا کئے۔

۲۸ جولائی کی صبح کو فالنا پہنچا۔ یہاں ٹرین چھوڑ دی اور ساتھیوں کے ہمراہ بذریعہ روڈ سفر کر کے شیو گنج پہنچا۔ شیو گنج میں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام سب سے زیادہ مشتاق احمد صاحب نے کیا ہے۔ وہ الرسالہ مشن کے خاموش

کارکن ہیں اور الرسالہ اور کتابیں لوگوں کو برابر پہنچاتے رہتے ہیں۔

۲۸ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ سے پہلے شیو گنج کی جامع مسجد میں تقریباً پون گھنٹہ کا خطاب ہوا۔ اس کا موضوع یہ حدیث تھی کہ المساجد بیوت المتقین (مسجد متقیوں کا گھر ہے) مختلف پہلوؤں سے اس حدیث رسول کی وضاحت کی گئی۔ اسی دن شام کو ۴ بجے ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے لوگ موجود تھے۔ بستی کے معزز ہندوؤں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی تعداد شریک تھی۔ تقریر کا موضوع "قومی ایکتا" تھا۔ میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بتایا کہ ملک میں ایکتا کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ ۲۹ جولائی کو جامع مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک خطاب ہوا۔ اس کا موضوع تھا "ایمان و اسلام کی حقیقت"۔

اس کے علاوہ قیام گاہ پر لوگ بڑی تعداد میں برابر آتے رہے۔ اور مجلس کے انداز میں گفتگو اور تفہیم کا سلسلہ جاری رہا۔ شیو گنج کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے بھی کچھ لوگ ان مجالس میں شریک ہوئے۔

۲۸ جولائی کو شیو گنج کے اجتماع میں بستی کے جو معزز افراد شریک ہوئے ان میں سے ایک پنڈت کشن لال جی بھی تھے۔

اس سال (۱۹۸۹) شیو گنج میں ایسا ہوا کہ یہاں کے چوک پر جو ہولی کھڑی کی گئی تھی، کسی نے ایک دن پہلے اس میں آگ لگا دی۔ یہ بڑا نازک واقعہ تھا۔ چنانچہ بستی میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں فرقہ وارانہ فساد نہ ہو جائے۔ اس وقت پنڈت کشن لال جی نے ایک اہم تعمیری کام کیا۔ وہ برہمن ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہولی جل گئی تو کیا ہوا۔ میں دوسری ہولی لگا دیتا ہوں۔ چنانچہ لکڑیاں جمع کر کے دوسری ہولی تیار کی گئی۔ اس کے بعد پنڈت جی نے قاعدہ کے مطابق منتر وغیرہ پڑھا۔ اس طرح انھوں نے بروقت مداخلت کر کے دوسری ہولی لگوا دی۔ اور اس کے بعد [illegible] ختم ہو گئی۔

۲۹ جولائی کی شام کو شیو گنج کی جامع مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو مسجد کی [illegible] لئے ہوئے دعا کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ منظر پہلے [illegible] تھا۔ اب وہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ اس عزت و احترام

کی ایک علامت ہے جو ماضی میں مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کے دلوں میں پایا جاتا تھا۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں مسلم تاریخ کے دو دور ہیں۔ ایک ۱۹۴۷ سے پہلے کا دور، دوسرا ۱۹۴۷ کے بعد کا دور۔ قدیم دور میں ہمارے معاشرہ پر صوفیا کا غلبہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے معاشرہ پر لیڈروں کا غلبہ ہے۔ صوفیا محبت کی باتیں کرتے تھے، اس کے مقابلہ میں لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ نفرت کی باتیں کرتے ہیں۔ صوفیا کے زمانہ میں ہندوؤں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر ایک قابل احترام گروہ کی تھی۔ لیڈروں کے زمانہ میں معاملہ اس کے برعکس ہوگیا ہے۔ اب ہندوؤں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر ایک قابل حقارت گروہ کی ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کے واحد ذمہ دار ان کے نام نہاد لیڈر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں الائمۃ المضلون کہا گیا ہے۔ لیڈروں کی جھوٹی لیڈری نے خود ان کی ذات کو تو یقیناً فائدہ پہنچایا ہے مگر قوم کو صرف بربادی کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ جس دن مسلمان اپنے ان جھوٹے رہنماؤں سے نجات حاصل کرلیں گے، اسی دن ان کے مستقبل کی صبح بھی طلوع ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ میرے چار لڑکے ہیں۔ چاروں آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ میں ان کی طرف سے سخت پریشان ہوں۔ میں نے چاروں لڑکوں کو جمع کرکے انھیں سمجھایا۔ پھر ان کی رضامندی سے ایک تحریر تیار کی۔ اس میں لکھا تھا کہ "ہم چاروں بھائی آج ۲۹ جولائی ۱۹۸۹ کو یہ پکا وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے بڑے بھائی کو اپنا سردار مانیں گے۔ ساری زندگی ان کے کہے پر چلیں گے، خواہ ہم کو پسند ہو یا ناپسند" اس تحریر پر چاروں بھائیوں نے دستخط کئے۔

میں نے کہا کہ اتحاد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو غیر مشروط طور پر بڑا بنا لیا جائے۔ پھر ان کو سمجھایا کہ بڑے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آئے۔ اور چھوٹوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے کا احترام کریں۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کی مدد فرمائے۔

شیوگنج میں ایک صاحب نے اپنے یہاں کھانے پر بلایا۔ میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے بفات شریف (۰۰ سال) بتایا۔ وہ "بارہ وفات" کو پیدا ہوئے تھے، اس لئے ان کا

نام لفافت شریف یا وفات شریف رکھ دیا گیا۔ وہ بہت معمولی پڑھے لکھے تھے۔ وہ الرسالہ جیسی کسی تحریر کا مطالعہ نہیں کرسکتے۔ اور نہ کبھی انھوں نے میرا نام سنا تھا۔ ان کی شخصیت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جب وہ مجھ کو اپنے گھر لے گئے اور دسترخوان پر کھانا رکھا گیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "پہلے فاتحہ دے دیجئے" مجھے حیرانی کے عالم میں دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے مدد کی۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر "فاتحہ پڑھا" اور اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ بھی۔ یہ بتائیے کہ آج کے مقابلہ میں پہلے کا زمانہ کیسا تھا۔ انھوں نے راجستھانی زبان میں کہا: "بات چیت اور ڈھنگ اچھو تھو۔ ہر ایک اجت سے بلاوتا۔" انھوں نے بتایا کہ پہلے زمانہ میں ہندو مسلم جھگڑے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب بھائی چارہ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ ہر معاملہ میں ہندو مسلم، ہندو مسلم ہونے لگا ہے۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب راجستھان (راجپوتانہ) جیسی ہندو ریاست کا یہ حال تھا کہ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ ہر ایک دوسرے کو عزت کے ساتھ بلاتا تھا تو وہ "ہندو ہندستان" کہاں تھا جس کا ہوا کھڑا کرکے تقسیم پسند لیڈروں نے تمام مسلمانوں کو ورغلایا۔ وہ ہندو ہندستان نام نہاد لیڈروں کے اپنے خودساختہ دماغوں میں تھا۔ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کو مبالغہ اور تعمیم کے ساتھ پیش کرکے انھوں نے عام مسلمانوں کو بھڑکا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تمام بگاڑ تقسیم کی سیاست کا نتیجہ ہے۔ مسلم لیڈروں نے دو قومی تحریک ہندو مسلم مسئلہ ختم کرنے کے لئے اٹھائی تھی۔ مگر ان کی نام نہاد تحریک نے ہندو مسلم مسئلہ کو ہزار گنا زیادہ بڑھا دیا۔ شیو گنج قدیم سروہی ریاست کا حصہ تھا۔ اس ریاست کے والی مہاراجہ سروپ رام سنگھ تھے۔ وہ بہت نیک نفس آدمی تھے۔ آخر عمر میں انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۴۶ کو دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دہلی میں وہ ۲۴-۲۶ علی پور روڈ پر رہتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مہاراجہ نے اپنا نام محمد عمر رکھا تھا۔

مہاراجہ کی بیوی نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام سعید النسار رکھا تھا۔ ان کی ایک ذاتی زمین (۶۰ بیگھہ) شیو گنج میں تھی۔ اس زمین کو انھوں نے مہاراجہ کی زندگی ہی میں ۸ اجن

۱۹۴۷ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام وقف کر دیا۔ یہ وصیت نامہ ۹۰۷۸ روپیہ کے اسٹمپ پیپر
پر اردو میں ہے اور اس پر سابق جارج پنجم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔
اس وقف نامہ کی فوٹو کاپی میں نے یہاں دیکھی۔ اس میں درج ہے کہ اس وقف سے سرو ہی
اور راجستھان کے مسلم نوجوانوں، نیز دوسرے مسلمانوں کی تعلیمی امداد کی جائے۔ وقف نامہ کے مسودہ
میں مزید یہ درج ہے کہ "یونیورسٹی مذکور کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ جائداد موقوفہ کے جزیا کل کو فروخت
کر کے اس کے حاصل سے دیگر جائداد جس مقام پر چاہے خرید لے۔ اور جو جائداد اس طرح
خرید کی جائے وہ اس وقف کی متذکرہ مد میں خرچ کی جائے۔"
اس موقوفہ جائداد کو میں نے خود دیکھا۔ اس وقت وہ کروروں روپیہ کی مالیت رکھتی ہے۔
مگر یہ قیمتی زمین ۴۵ سال سے بالکل بے کار پڑی ہوئی ہے۔ فاصلہ کی وجہ سے یونیورسٹی اگر اس
اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تو وقف کے مطابق وہ اس کو فروخت کر کے دوسرا موزوں انتظام کر سکتی
ہے۔ مگر یونیورسٹی کے ذمہ داران نے اب تک یہ بھی نہیں کیا۔ شاید اندرونی جھگڑوں کی وجہ
سے انھیں یہ موقع نہیں کہ وہ یونیورسٹی کے بیرونی مسائل کی طرف توجہ دے سکیں۔
مولانا خدا بخش بلوچ (۳۵ سال) اپنے الفاظ میں، الرسالہ کے شیدائی ہیں۔ ہر شمارہ کو کئی
کئی بار پڑھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بتایا۔ ہیڈگوار جنم شتابدی (فروری ۱۹۸۹)
کے موقع پر شیو گنج میں ہندو نوجوانوں کا ایک جلوس نکلا۔ وہ چلتا ہوا جامع مسجد کے سامنے
پہنچا جس میں مولانا خدا بخش صاحب امام اور خطیب ہیں۔ جلوس اس وقت مختلف قسم کے اشتعال انگیز
نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً "جس کو چاہئے پاکستان، اس کو بھیجو قبرستان" اور "بھارت میں رہنا ہوگا، وندے
ماترم کہنا ہوگا"۔ وغیرہ۔
مولانا خدا بخش صاحب اس وقت مسجد میں تھے۔ وہ شور سن کر باہر آئے۔ انھوں نے کسی بھی قسم
کا غصہ یا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ حتی کہ یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ کیا نعرے لگا رہے ہو۔ اس کے بجائے
انھوں نے یہ کیا کہ مجمع پر نظر ڈالی۔ چند نوجوان انھیں اپنی پہچان کے نظر آئے۔ انھوں نے لپک کر ان سے
آداب کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دئے۔ یہ دیکھ کر جلوس کے دوسرے لوگ بھی "مولوی
صاحب نمستے، مولوی صاحب نمستے" کرنے لگے۔ مخالفانہ نعرہ بازی موافقانہ ملاقات میں تبدیل ہوگئی۔

ان سے میں نے پوچھا کہ اس پوری کارروائی میں آپ کا کتنا وقت لگا۔ انھوں نے کہا کہ صرف پانچ منٹ۔

مولانا خدا بخش جب یہاں کی مسجد میں آئے تو ایک شخص سے ان کی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ ان کی روایت کے مطابق یہ گفتگو حسب ذیل تھی :

" مولانا ، آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی "

" بھائی میں تو راجستھانی ہوں "

" نہیں ۔ میں عقیدہ کی بات کر رہا ہوں "

" عقیدہ کوئی مکانی چیز نہیں۔ اگر مکان کی نسبت سے عقیدہ بنتا تو مکی عقیدہ اور مدنی عقیدہ کہا جاتا " اس کے بعد گفتگو اپنے آپ ختم ہو گئی۔

میں شیو گنج میں مشتاق احمد صاحب (۵۶ سال) کے ساتھ مقیم تھا۔ انھوں نے بتایا کہ شیو گنج میں ہماری مسجد کی دیوار پر کسی نے ہندی میں نعرے لکھ دئے " ہندو جاگے گا ، دیش جاگے گا " دیش کے لئے جینا سیکھو " وغیرہ۔ ان نعروں پر غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے انھوں نے اس کو پانی سے دھو ڈالا۔ اس کے بعد سالانہ موقع پر مسجد میں سفیدی ہوئی اور قصہ ختم ہو گیا —— اس دنیا میں ہر برائی کو ختم کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ آپ لوگوں کی سیاہی کے اوپر اپنی طرف سے سفیدی پھیر دیا کریں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اس ملک کے ہندو اور مسلمان آج اپنے اپنے مذہب پر نہیں ہیں بلکہ انگریز کے دئے ہوئے مذہب پر ہیں۔ انگریز نے اپنے مقصد کی خاطر یہاں " لڑاؤ اور حکومت کرو " کی پالیسی چلائی۔ اس نے مذہب کو محبت کے بجائے نفرت کا عنوان بنا دیا۔

میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ برتن ہوا کرتے تھے۔ یہ رجحان بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ ہر معاملہ میں ہندو مسلم، ہندو مسلم کیا جانے لگا۔ مثال کے طور پر کسی اسکول کا نام ہندو اسکول یا کسی کالج کا نام ہندو کالج تھا، یا وہاں ہندو ٹیچر بچوں کو پڑھاتے تو مسلمان وہاں داخلہ لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

اس طرح کی تقسیم سراسر احمقانہ تھی۔ حتی کہ وہ خود سنت رسول کے خلاف تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر کے لئے ایک مشرک عبد اللہ بن ارقط کو اپنا رہنما بنایا۔ اسلام

کا پہلا مدرسہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قائم ہوا ، اس کے تمام ٹیچر مشرک بلکہ دشمن اسلام تھے۔ یہ مدرسہ وہ تھا جو مدینہ میں بدر کے مشرک قیدیوں کے ذریعہ قائم کیا گیا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ صحیح حدیث کے مطابق ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو (لا تفضلونی علی یونس بن متی) مگر تمام مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء کہتے ہیں۔ شارحین حدیث نے اس اشکال کے جوابات دئے ہیں لیکن ان سے میری تسلی نہ ہو سکی۔

میں نے کہا کہ دو باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک ہے باعتبار حقیقت کسی پیغمبر کا دوسرے پیغمبروں سے افضل ہونا۔ اور دوسرا ہے ، ایک پیغمبر کو دوسرے پیغمبروں پر افضل بتانا۔ اس حدیث میں افضل ہونے کی تردید نہیں ہے بلکہ افضل بتانے کی تردید ہے۔ علم الٰہی میں یقیناً پیغمبروں کے درجات ہیں۔ مگر ہمارا کام اتباع رسول ہے نہ کہ تفضیل انبیاء کی بحث چھیڑنا اور اس پر تقریر کرنا۔

سیہ پور پالی بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ کاروبار کے اعتبار سے یہ شیوگنج سے بڑا ہے۔ حکومت نے حال ہی میں یہاں بہت بڑی منڈی نئے طرز کی تعمیر کرائی ہے۔ یہ زرعی پیداوار کی منڈی ہے اس کی کشادہ سڑکوں پر جگہ جگہ کبوتروں کے غول بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ غلّہ اتارتے اور چڑھاتے ہوئے اس کے دانے سڑک پر گرتے ہیں۔ ان کو کھانے کے لئے یہ کبوتر یہاں جمع رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل میں اتنے منہمک تھے کہ جب تک ہماری گاڑی کے پہیے ان کے سر تک نہ پہنچ جاتے ، وہ وہاں سے نہ اڑتے۔

سیہ پور کی سڑکوں اور بازاروں سے چلتے ہوئے یہی منظر وہاں کے انسانوں کا بھی نظر آیا۔ ہر آدمی انتہائی یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کاروبار کے سوا کسی اور چیز کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

میں نے سوچا کہ جب یہ لوگ کاروبار میں اتنا زیادہ منہمک ہیں تو آخر وہ کون ہے جو فرقہ وارانہ دنگے اور فساد کرتا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ دنگا اور فساد کرنے والے یہ لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ دراصل چھوٹے طبقہ کے لوگ ہیں جو دنگا اور فساد کرتے ہیں۔ بقیہ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ ان کے فرقہ کے

چھوٹے لوگ جب فساد کرتے ہیں تو وہ ان کی مذمت نہیں کرتے ۔ اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ خاموشی حوصلہ افزائی فساد کو جاری رکھتی ہے۔ اگر وہ اپنے فرقہ کے فسادیوں کی مذمت کریں تو ان کی حوصلہ شکنی ہو اور فساد کی جڑ کٹ جائے۔

مگر یہاں "ایں گنا ہے است کہ در شہر شما نیز کنند" والا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے۔ کہ ان کے "خوش پوش" لوگ خود کبھی فساد میں شریک نہیں ہوتے۔ جو مسلمان فساد چھیڑتے ہیں یا فساد کے اسباب پیدا کرتے ہیں وہ ہمیشہ مسلمانوں کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں بھی مسلمانوں کا خوش پوش طبقہ یہی جرم کرتا ہے کہ وہ ان غلط کار مسلمانوں کی مذمت نہیں کرتا۔ مثلاً ایک مقام پر ہندوؤں کے جلوس میں سے کسی شخص نے مسجد کی دیوار پر گلال پھینک دیا تو کچھ مسلمانوں نے جلوس کے اوپر پتھراؤ کیا۔ اس سے فساد برپا ہو گیا۔ ایک مقام پر ایک آدمی واسی لڑکی کے ساتھ ایک مسلمان ملوث پایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں فساد ہو گیا۔ مگر ان مواقع پر مسلمانوں کے نمائندہ طبقہ نے اپنے فرقہ کے غلط کار افراد کی مذمت نہیں کی۔ وہ یا تو ایڈمنسٹریشن کو برا کہتے رہے یا ہندو فرقہ پرستوں کو۔

یہی صورت حال فساد کی جڑ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے اعلیٰ طبقہ کو یہ ڈر رہتا ہے کہ اگر وہ اپنے فرقہ کے غلط کار افراد کی مذمت کریں گے تو وہ اپنی قوم سے کٹ جائیں گے ــــ آدمی اپنی قوم سے نہ کٹنے کے لیے حق سے کٹ جاتا ہے۔

ایک صاحب نے پالی (راجستھان) کا واقعہ بتایا۔ ایک مسلم نوجوان چوڑی کے اوزار کا کاریگر بننا چاہتا تھا۔ یہ اوزار لوہے کے ہوتے ہیں۔ نوجوان اوزار بنانا سیکھنا چاہتا تھا مگر استاد لوگوں نے اس کی مدد نہیں کی۔ نوجوان پریشان ہوا کہ استاد کے بغیر اوزار بنانا کس طرح سیکھے۔ آخر اس نے منت مانی۔ اس نے کہا کہ اگر مجھ کو اوزار بنانا آجائے تو میں چاندی کا اوزار بنا کر تعزیہ پر چڑھاؤں گا۔

اس منت کے بعد اس نے کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ استاد کے بغیر اس نے اوزار بنانا سیکھ لیا۔ اس نے پہلا اوزار چاندی کا بنا کر اس کو تعزیہ پر چڑھایا۔ یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔

(باقی آئندہ)

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۵۶

۱- پانچ جنیہ ہندی کا مشہور ہفت وار پرچہ ہے۔ اس کے نمائندہ مسٹر موکیش کوشک ۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو مرکز میں آئے اور اپنے پرچہ کے لیے صدر اسلامی کا مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور مسلم لیڈر شپ کے بارہ میں تھے۔

۲- مدینہ ایجوکیشن سنٹر، پبلک اسکول، جونیر بوائز کالجس و ہاسٹل، حیدرآباد کی جانب سے ایک مضمون " ذرا غور کیجیے " کے عنوان سے مختلف اخبارات میں شائع کیا گیا ہے۔ وہ مضمون یہ ہے: " مرکز اسلامی ہند نے، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے مقصد کے تحت، حمایت نگر حیدرآباد میں دو منزلہ عمارت خرید کر اس کی ذمہ داری ایک مولانا کو سونپ دی تھی۔ مگر ہائے افسوس وہی مولانا، اشاعتی کاموں کو ٹھپ اور عمارت میں قانونی پیچیدگیاں پیدا کر کے پہلی منزل پر خود مولانا کا قیام اور نچلی منزل میں شراب کا گودام، اور اکابرین خاموش " یہ مضمون حسب ذیل انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہوا ہے ــــــ دکن کرانیکل، سکندرآباد، ۳ ستمبر ۱۹۸۹۔ منصف، حیدرآباد، ۲ ستمبر ۱۹۸۹ رہنمائے دکن ویکلی، حیدرآباد، ۴ — ۱۰ ستمبر ۱۹۸۹۔

۳- قطر (عرب امارات) سے عمر اسماعیل صاحب لکھتے ہیں: آپ کا رسالہ کچھ ماہ پہلے نظروں سے گزرا۔ میری ۵۴ سالہ زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اسلامی لٹریچر میں پڑھنے جیسی کوئی چیز ہے۔ ورنہ مولاناؤں کے اسلام نے کم سے کم مجھے بغاوت پر اتروایا۔ میں اپنی زندگی کے دس سال غیر مسلموں کے ماحول میں بتا چکا تھا جہاں ہر غیر مسلم مجھے مسلم سے اچھا لگا، بھلا لگا۔ اور آہستہ آہستہ میرے خیالات اور جذبات ہر مسلم ملّا کے خلاف ہوتے گیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا رسالہ نظروں سے گزرا اور آپ حضرات کی ہستی نے مجھے کفر کرتے کرتے بچادیا۔

۴- نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ٹائمس آف انڈیا گروپ کی طرف سے " آنکھ کا حلیہ اور مذہب " کے موضوع پر سیمنار ہوا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک پیپر پیش کیا جس کا عنوان تھا:

ٹائمس آف انڈیا ۷ ستمبر ۱۹۸۹ (صفحہ ۳) پر اس کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں سب سے زیادہ کوریج صدر اسلامی مرکز کی تقریر کو دیا گیا ہے۔ اس سیمنار میں مختلف مذاہب کے چالیس اہل علم اور اسکالر شریک ہوئے تھے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم علمار اگر ایسے اجتماعات میں شریک ہوں تو اس سے اسلامی دعوت کو کتنا زیادہ فائدہ ہو۔ مگر موجودہ صورت حال یہ ہے کہ سارے ملک میں کوئی بھی عالم نہیں جو مشترک اجتماعات یا مختلف مذاہب کانفرنسوں میں شرکت کرتا ہو۔ صدر اسلامی مرکز تنہا عالم ہیں جو ہندستان اور ہندستان کے باہر اس قسم کے مواقع پر شرکت کرتے ہیں اور بین مذاہب اجتماعات میں اسلامی دعوت پیش کر رہے ہیں۔

۵۔ مرکز کی دو کتابیں، سچا راستہ اور دینی تعلیم اس سے پہلے تلگو زبان میں شائع کی گئی تھیں۔ اب "سچا راستہ" کا تلگو ترجمہ دوبارہ زیادہ اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کا پتہ یہ ہے:

الرسالہ اکیڈمی، ۷۸۰/۱۹/۲ - ۵ - ۳، اعظم منزل، کنگ کوٹھی، حیدرآباد

۶۔ جناب ولی محمد صاحب انصاری (دھولیہ) نے جینت بابوراو شمپی صاحب کو انگریزی کتاب گاڈ ارائزز پڑھنے کے لیے دی۔ جناب شمپی صاحب کو پڑھنے کے بعد یہ کتاب پسند آئی اور انھوں نے مرہٹی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اب انھوں نے پوری کتاب کا مرہٹی ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ جناب جینت بابوراو شمپی صاحب نے یہ پورا ترجمہ رضاکارانہ طور پر کیا ہے۔

ہندستان سے مسلم قانون دانوں کا ایک وفد ماریشش گیا جو وہاں کی سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے ایک مقدمہ میں مسلمانوں کی طرف سے بیان اور شہادت دے۔ یہ سماعت اکتوبر ۱۹۸۹ کے پہلے ہفتہ میں ہوئی۔ اس وفد میں انگریزی داں عالم کی حیثیت سے صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر انھیں دنوں ایک اور بیرونی سفر پیش آنے کی وجہ سے موصوف اس وفد میں شرکت کی دعوت قبول نہ کر سکے۔

۸۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: ماہ نومبر ۱۹۸۸ میں پہلی بار خاتونِ اسلام نظر سے گزری۔ اس سے کافی قبل الرسالہ کے ذریعہ آپ کا تعارف ہو چکا تھا۔ چوں کہ دین کی طرف دل چسپی کم تھی۔ اس لیے پہلے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ خاتونِ اسلام کے پڑھنے کے بعد آپ کے لٹریچر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ خاتونِ اسلام کے بعد پرانے رسالوں کا مطالعہ شروع کیا۔ میرا شوق دن بدن بڑھتا گیا۔ جیوں جیوں مطالعہ کرتا تیوں تیوں آپ سے ملنے کی خواہش بڑھتی گئی۔ اور ساتھ ساتھ یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الرسالہ کے ذریعہ آپ کا تعارف کراؤں جب میں دعوت دیتا تھا تو کئی پڑھے لکھے لوگوں نے کہا کہ مولانا مسلمانوں کو بزدلی سکھلاتے ہیں۔ میری کم علمی یا کم عقلی سمجھئے کہ میں بھی اس مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ ۲۵ مئی کو آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے میری غلط فہمی کو دور کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی کتاب "حل یہاں ہے" پڑھنے کا مشورہ دیا۔ جس کا میں بہت مشکور ہوں۔ میں مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ جو کچھ پیش کرتے ہیں قرآن اور حدیث کی روشنی میں پیش کرتے ہیں پھر بھی بہت سے لوگ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میرے خیال میں لوگ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں، اور میری طرح اس قسم کے لوگ آپ کے لٹریچر کے مطالعہ سے کورے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حق کی بات کرنے والوں کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ حق ہمیشہ باطل پر غالب رہا ہے اور رہے گا۔ (حمید اللہ خاں، کلکتہ)

۹۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: ماہنامہ الرسالہ ہمارے یہاں آتا ہے۔ میں برابر اس کو پڑھتا ہوں۔ ہر ماہ الرسالہ کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ میرے پاس جب دو چار الرسالہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کو میں جناب ابراہیم یوسف باوا کو انگلینڈ بھیج دیتا ہوں۔ باوا صاحب انگلینڈ میں رہتے ہیں اور وہاں ادارہ اشاعت الاسلام کے نام سے ایک ادارہ چلاتے ہیں۔ باوا صاحب نے اپنے خط میں الرسالہ کی ہر لحاظ سے کافی تعریف کی ہے۔ (سید مجیب الرحمٰن، دہلی)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۷ دسمبر ۱۹۸۹

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333. 611128

صاحبِ معرفت

ایک روایت کے مطابق ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور کلام سے عاجز ہونا ایمان میں سے ہے ۔ (الحیاء والعیّ من الایمان) بعض صوفیار کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ کی پہچان ہو جائے ، اس کی زبان گویائی سے تھک جائے گی (من عرف اللہ کلّ لسانہ)

جس طرح خالی برتن زیادہ آواز دیتا ہے ، اور جو برتن بھرا ہوا ہو اس میں آواز کم ہو جاتی ہے۔ کم پانی میں پتھر پھینکیں تو بہت زیادہ تموج ہوگا ۔ مگر سمندر میں پتھر پھینکئے تو اس میں اس کی وجہ سے کوئی تموج نہیں ہوتا ۔ یہی معاملہ انسان کا ہے ۔ خالی انسان زیادہ بولتا ہے اور بھرا ہوا انسان ہمیشہ کم بولتا ہے ۔

اللہ کی معرفت سب سے بڑی حقیقت کی معرفت ہے ۔ آدمی جب اللہ کو اس کی اتھاہ عظمتوں اور اس کے بے پایاں کمالات کے ساتھ پاتا ہے تو اپنا وجود اس کو بالکل حقیر معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ سب کچھ ہے ، اور اس کے مقابلہ میں میں کچھ نہیں ہوں ۔ یہ احساسِ فروتنی اس کی زبان کو بند کر دیتا ہے ۔ وہ حیرانی کی کیفیت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے ۔

مزید یہ کہ اللہ کی معرفت آدمی کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کے شعور کو جگاتی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہر ہر کام اور ہر ہر بول کا مجھے قادرِ مطلق کے سامنے حساب دینا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ناپ تول کر بولے ۔ وہ کہنے سے پہلے سوچے اور اظہار سے پہلے احتساب کرے ۔ خدا کی معرفت آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتی ہے ، اور سنجیدگی ، عین اپنے مزاج کے مطابق ، آدمی کو خاموش کر دیتی ہے ۔

خاموشی کوئی سلبی کیفیت نہیں ، وہ عین ایجابی عمل ہے ۔ خاموش آدمی یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ گہرا آدمی ہے ۔ وہ بلند تر حقیقتوں کو پائے ہوئے ہے ۔ خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچتا ہے ۔ وہ کرنے سے پہلے اپنے کرنے کو تولتا ہے ۔ خاموشی فرشتوں کے ساتھ مشابہت ہے ۔ کیوں کہ فرشتے خاموش زبان میں بولتے ہیں ۔ جس آدمی کو فرشتوں کی ہم نشینی حاصل ہو جائے ، وہ خاموش زیادہ دکھائی دے گا اور بولتا ہوا کم ۔

چیلنج نہ کہ خطرہ

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے میری ملاقات ایک ہندو ڈاکٹر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جب یہ کہا جائے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو مسلمان بہت غصہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام اپنی سچائی کے زور پر پھیلا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اس جواب پر خود ہی یقین نہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مسلمان بات بات پر شور کرتے ہیں کہ "اسلام خطرہ میں ہے"

ہندو بھائی نے کہا کہ اسلام کی اصل طاقت اگر اس کا سچا مذہب ہونا ہے تو یہ طاقت تو اب بھی اس کے پاس پوری طرح موجود ہے، پھر اس کو خطرہ کیوں۔ مسلمانوں کا شور وغل ثابت کرتا ہے کہ اسلام کی اصل طاقت تلوار ہے۔ موجودہ زمانہ میں چوں کہ اسلام سے یہ طاقت چھن گئی ہے، اس لیے وہ خطرہ میں پڑگیا ہے۔ اگر اسلام کی اصل طاقت سچائی ہوتی تو اس کے خطرہ میں پڑنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ کیوں کہ کسی کے پاس اگر سچائی ہے تو وہ ہمیشہ اس کو حاصل رہے گی۔ سچائی ایسی چیز نہیں جس کو کوئی شخص کسی سے چھین سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک نظریہ ہے۔ کسی نظریہ کے لیے خطرہ کی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ نظریاتی طور پر غلط ثابت ہوجائے۔ اسلام نظریاتی طور پر غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنی نظریاتی صداقت کو مسلسل طور پر تاریخ میں باقی رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے اسلام کو کوئی خطرہ بھی نہیں۔

البتہ اسلام کو چیلنج پیش آتے ہیں اور وہ پیش آتے رہیں گے۔ ماضی میں اسلام کو چیلنج پیش آئے۔ مثال کے طور پر، عباسی دور میں فکر یونانی کا چیلنج۔ اس وقت کسی نے "اسلام خطرہ میں" کا نعرہ نہیں لگایا۔ بلکہ علمی سطح پر چیلنج کا جواب دیا۔ موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح اسلام کو فکری چیلنج پیش آئے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان جدید چیلنج کا جواب دینے کے لیے نااہل تھے۔ اس لیے وہ "اسلام خطرہ میں" کا نعرہ لے کر کھڑے ہوگیے۔ موجودہ صورت حال مسلم رہنماؤں کی رہنمایانہ حیثیت کے لیے خطرہ تھی۔ مگر انھوں نے اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلادینے واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

There has never been and there never will be a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۴۴ - ۶۵۶) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انھوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا مستحکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کرسکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ میں ممکن ہوسکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل مہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ کا پورا سال اس نے باسفورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جاسکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۳۱ جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کروایا تاکہ سمندر کے راستہ سے موثر حملہ کیا جاسکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلاکر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے حد اہم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جاسکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط یک طرفہ طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیبر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہود کی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری مہم کے دوران وہ بذات خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی مہم کی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوبل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۸) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش وخروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

بددعا نہیں

قال الامام احمد حدثنا ابوالنضر حدثنا ابوعقیل حدثنا عمرو بن حمزۃ عن سالم عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اللّٰھم العن فلانا وفلانا، اللّٰھم العن الحارث بن ھشام اللّٰھم العن سھیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیۃ۔ فنزلت الآیۃ (لیس لک من الامر شیٔ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون) فتیب علیھم کلھم۔ وقال احمد حدثنا ابومعاویۃ الغلابی حدثنا خالد بن الحارث حدثنا محمد بن عجلان عن نافع عن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو علی اربعۃ فانزل اللہ (لیس لک من الامر شیٔ) قال وھداھم اللہ للاسلام (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۲)

ترجمہ: امام احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ میں) یہ کہتے تھے کہ اے اللہ، فلاں اور فلاں پر لعنت کر، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ، سہیل بن عمرو پر لعنت کر، اے اللہ، صفوان بن امیہ پر لعنت کر، تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا، کیوں کہ وہ ظالم ہیں (آل عمران ۱۲۸) پھر ان سب کو توبہ کی توفیق ملی (اور وہ ایمان لائے) امام احمد نے ایک اور روایت اس طرح نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مشرکوں میں سے) چار آدمیوں کے خلاف بددعا کرتے تھے تو اللہ نے یہ آیت اتاری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ نے ان چاروں آدمیوں کو اسلام کے ذریعہ ہدایت دی۔

اس حدیث میں جن کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے، انھوں نے خود قرآن کے بیان کے مطابق "ظلم" کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کی برائی اتنی واضح تھی کہ خود پیغمبر اسلام کی زبان سے ان کے خلاف لعنت اور بددعا کے کلمات نکلنے لگے۔ اس کے باوجود نہ صرف ایسا ہوا کہ ان کے خلاف لعنت اور بددعا سے روک دیا گیا بلکہ ان سب کے اندر آخر کار نیا ذہن ابھرا، اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔

زندہ لوگ

مسٹر ایڈون رین گولڈ (Edwin M. Reingold) ایک سینیر امریکی جرنلسٹ ہیں۔ وہ ۱۹۶۹ میں ٹائم میگزین کے ٹوکیو بیورو کے چیف مقرر ہوئے۔ اس طرح وہ پچھلے ۲۰ سال سے جاپان اور جاپانیوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔

مسٹر رین گولڈ نے اپنے ۲۰ سالہ تجربہ کی روشنی میں جاپان کے بارہ میں ایک مضمون لکھا ہے جو ٹائم (۵ جون ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ جاپانی اگرچہ بظاہر جامد قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ ایک چیز کے بارہ میں طے کر لیں کہ وہ ان کے لیے مفید ہے تو اس کے بعد وہ نہایت تیزی سے متحرک ہو سکتے ہیں:

> Even though the Japanese appear to be quite rigid, they can move quickly once they've decided it's to their advantage (p. 5).

یہی زندہ قوم کی سب سے زیادہ یقینی پہچان ہے۔ زندہ انسان کے لیے ماننے اور کرنے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ زندہ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان پر کسی اصول کی صداقت واضح ہو جائے تو عین اسی وقت وہ اس کے لیے پوری طرح متحرک ہو جاتے ہیں۔ وہ جس چیز کا اقرار کرتے ہیں اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اور جس چیز پر عمل کرتے ہیں وہ وہی ہوتی ہے جس کا وہ اقرار کر چکے ہیں۔

یہی صلاحیت مومن کے اندر کمال درجہ میں ہوتی ہے۔ عام انسان کو اس کا مفاد متحرک کرتا ہے۔ مومن کو حرکت میں لانے کے لیے یہ کافی ہے کہ کسی چیز کی صداقت اس کے اوپر واضح ہو جائے۔ مومن اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ ایک بات جو دلیل سے برحق ثابت ہو گئی ہو، اس کے لیے وہ حرکت میں نہ آئے۔ وہ اپنی زندگی اس کے لیے وقف نہ کر دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس صفت کا کامل ترین نمونہ ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب دلیل سے ان کے اوپر حق واضح ہو گیا تو انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ ان کی راہ میں دشواریاں آئیں۔ طرح طرح کے اونچ نیچ ان کے لیے رکاوٹ بنے۔ مگر وہ متزلزل نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اسی راہ میں اپنی جان دیدی۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق پر (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۸۶۶-۱۹۴۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا پہلا پیراگراف اہل اسلام کے درمیان مال اور خون کے تمام جھگڑے کو کالعدم کر رہا ہے۔ اس کا آخری حصہ ایک کالے حبشی کو خلیفہ کے برابر کا درجہ دے رہا ہے۔ انھوں نے دنیا میں باوقار اور منصفانہ معاملہ کی عظیم روایت قائم کی۔ انھوں نے لوگوں میں فیاضی کی روح پھونکی۔ انھوں نے ایک ایسا سماج بنایا جو تاریخ کے کسی بھی پچھلے سماج سے زیادہ بے رحمی اور اجتماعی ظلم سے پاک تھا:

The reader will note that the first paragraph sweeps away all plunder and blood feuds among the followers of Islam. The last makes the believing Negro the equal of the Caliph... they established in the world a great tradition of dignified fair dealing, they breathed a spirit of generosity, and they are human and workable. They created a society more free from widespread cruelty and social oppression than any society had ever been in the world before.

H.G. Wells, *The Outline of History*, London 1963, p. 606.

اس دنیا میں حقیقت سے انکار کی مثالیں ہیں اور اسی کے ساتھ حقیقت کے اعتراف کی مثالیں بھی۔

مہنگی قیمت

۱۱ مئی ۱۹۸۹ کو محمد نظیر امام الدین صاحب (۷۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ دھولیہ (مہاراشٹر) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے دھولیہ میں ہونے والے ایک فرقہ وارانہ فساد کی تفصیل بتائی۔ جو مارچ ۱۹۸۹ میں ہوا تھا۔

دھولیہ میں مچھلی بازار کی مسجد کے سامنے پانی کا نل لگا ہوا ہے۔ یہ نل مسجد کا ہے، تاہم عام لوگ بھی اس سے پانی بھرتے ہیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ کو ہولی کا دن تھا۔ کچھ ہندو نوجوان ایک ٹینکر لے کر آئے اور اس نل سے پانی بھرنے لگے۔ ایک ٹینکر وہ بھر کر لے گیے۔ اس کے بعد وہ دوسرا ٹینکر لے کر آئے اور دوبارہ اس نل سے پانی بھرنا شروع کیا۔ ان میں سے کسی نے مسجد کی دیواروں پر پانی پھینک دیا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جس سے پانی اندر تک چلا گیا۔ مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ ابھی تک تو آپ ٹینکر بھر رہے تھے، اب آپ مسجد پر ہولی کا پانی بھی ڈال رہے ہیں۔

پہلے دونوں کے درمیان لفظی تکرار ہوئی۔ اس کے بعد ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ شور وغل سن کر دونوں فرقہ کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گیے۔ اب باقاعدہ لڑائی ہونے لگی۔ آخر میں پولیس آئی۔ اس نے فائرنگ کی۔ اس فائرنگ میں دو مسلمان مر گیے۔ تقریباً دس مسلمان زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچا ئے گیے۔ ۸۰ مسلمانوں پر مقدمہ قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

میں نے محمد نظیر امام الدین صاحب سے کہا کہ ہولی کے دن ہندو لوگ اکثر شراب اور بھنگ کے نشے میں ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے الجھنا ہرگز عقل مندی کی بات نہیں۔ مسلمانوں کو اگر مسجد پر پانی پھینکنے یا دو ٹینکر بھرنے پر اعتراض تھا تو وہ خوش تدبیری سے بھی اس کا حل نکال سکتے تھے۔ ایسے موقع پر مشتعل ہو کر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح بھی دانش مندی نہیں۔

میں نے کہا کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ عقلمندی نہ تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دو ٹینکر بھرے جانے پر صبر کر لیں تاکہ دو مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں۔ وہ دیوار پر پانی یا رنگ چھڑکنے کو برداشت کر لیں تاکہ سڑک پر ان کا خون نہ چھڑکا جائے۔ محمد نظیر امام الدین صاحب نے میری رائے سے پورا اتفاق کیا۔

چُپ کی طاقت

پرانا مثل ہے کہ "ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے" یہ بہت بامعنی ہے اور طویل انسانی تجربہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بذاتِ خود ایک طاقت ور ہتھیار ہے، بشرطیکہ اس ہتھیار کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

غالباً ۱۹۶۶ کی بات ہے۔ میں لکھنؤ اور شاہ گنج کے درمیان ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ یہ دہرہ دون اکسپرس تھی اور میں پرانے نام کے مطابق تھرڈ کلاس اور نئے نام کے مطابق سکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں تھا۔ پورے ڈبہ میں بظاہر میں اکیلا مسلمان تھا۔

سفر کے درمیان ایسا ہوا کہ مجھے ٹائلٹ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر ڈبہ کے ٹائیلٹ کے پاس گیا۔ میں نے حسبِ عادت دروازہ آہستگی سے کھولا۔ مگر دروازہ ذرا سا کھلا تھا کہ اندر سے کپڑے کی صورت دکھائی دی۔ میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ٹائیلٹ کے اندر ایک ہندو خاتون موجود تھیں۔ مگر انھوں نے قاعدہ کے مطابق دروازہ کا بولٹ نہیں لگایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دروازہ کسی قدر کھل گیا۔

عورت کا ہندو شوہر میرے قریب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی وہ بگڑ گیا۔ وہ غصہ اور نفرت سے بھر کر میرے اوپر پل پڑا۔ وہ جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بری طرح ڈانٹنا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور مجھ کو معلوم نہ تھا کہ اندر کوئی ہے، ورنہ ہرگز میں دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر میری وضاحت کا ہر لفظ اس کو اور زیادہ برہم کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھے کھڑکی کے راستہ سے باہر پھینک دے گا۔

لمبی بوگی پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ مگر سارے ڈبہ میں کوئی ایک شخص بھی میری حمایت کے لیے نہیں اٹھا۔ آخر میں میں بالکل خاموش ہو گیا۔ میں مذکورہ شخص کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میرے چہرے پر خوف یا اشتعال کا ذرا سا بھی کوئی اثر نہ تھا۔ میں انتہائی غیر جذباتی انداز میں اسٹیچو کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اب وہ ٹھنڈا پڑنے لگا، یہاں تک کہ بالکل چپ ہو گیا۔ دوسرے کو چپ کرنے کی سب سے آسان تدبیر صرف ایک ہے ـــــ اپنی زبان کو یک طرفہ طور پر بند کر لینا۔

بے بصیرت، بابصیرت

دن اور رات کا فرق اس شخص کے لیے ہے جو بینا ہو۔ جو شخص بینا نہ ہو اس کے لیے دن اور رات کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اس کے لیے دن بھی ویسا ہی ہے جیسے رات۔ اس کے لیے زندگی تاریکیوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے جہاں کوئی اجالا نہیں۔ اس کے لیے دنیا ایک لامحدود تاریک خلا ہے جس میں روشنی کی کوئی کرن نہیں۔

یہی حال معانی کے اعتبار سے اس انسان کا ہے جو بصیرت سے خالی ہو۔ ایسے انسان کے لیے حق اور ناحق میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے نزدیک سچ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا جھوٹ۔ اس کے لیے ظلم بھی ویسا ہی ہوگا جیسے انصاف۔ اس کے لیے غصب اور خیانت کے کام بھی ویسے ہی ہوں گے جیسے حق پرستی اور دیانت داری۔

بے بصیرت اور بابصیرت انسان کے درمیان اس سے بھی زیادہ بڑا فرق وہ ہے جو حقائق کے فہم کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ بصیرت والے آدمی کے اندر ایک قوت تمیز زندہ ہوتی ہے جو سچائی کو سچائی کے روپ میں اور جھوٹ کو جھوٹ کے روپ میں دکھاتی ہے۔ اس کا کلام سطحیت اور تضاد اور ظاہری لفاظی سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ تلی ہوئی بات کہتا ہے۔ اس کی زبان حقیقت کے مطابق کھلتی ہے۔ وہ وہی بات کہتا ہے جو کہنا چاہیے، اور وہ بات نہیں کہتا جو ازروئے حقیقت کہنے والی بات نہیں۔

اس کے برعکس جو آدمی بے بصیرت ہو، اس کی سمجھ اندھیروں میں بھٹکنے والی سمجھ ہوتی ہے۔ وہ کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ اس کا کلام سطحیت اور متضاد باتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کی باتیں معانی سے خالی اور الفاظ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کا کلام مطابق واقعہ کلام نہیں ہوتا۔ اس کا بیان صحتِ رائے سے خالی ہوتا ہے۔

آپ ایک بینا آدمی کو دیکھیں تو اس کے چہرے پر رونق دکھائی دے گی۔ اس کے برعکس نابینا آدمی کے چہرے پر ایک قسم کی بے رونقی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی حال بے بصیرت کلام اور بابصیرت کلام کا ہے۔ ایک صاحب ذوق آدمی چند جملے سن کر یا چند سطریں پڑھ کر یہ جان لیتا ہے کہ صاحبِ کلام بے بصیرت انسان ہے یا بابصیرت انسان۔

قومی توہین

مسجد کے سامنے سے ہندوؤں کا جلوس گزرے تو مسلمان فوراً اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر اسی مسجد کے سامنے سے مسلمانوں کا شادی کا جلوس گزرے تو کوئی مسلمان اس کو روکنے کے لیے نہیں اٹھتا۔ کوئی ہندو اگر مسجد کے اندر ٹرانسسٹر بجائے تو مسلمان اتنا مشتعل ہوں گے کہ پوری بستی میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اسی مسجد میں اگر مسلمان ٹرانسسٹر بجائے تو کسی مسلمان کو غصہ نہیں آتا۔ کوئی ہندو مسجد میں بت رکھ دے تو فوراً ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ مگر مسلمان بزرگوں کی درگاہوں میں ان کی قبر کو بت بنا کر پوجتے ہیں اور اس پر کوئی شور نہیں مچتا۔

ایک ہی قسم کے دو واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ مسلمان ایک ہندو کے جس فعل پر بھڑکتے ہیں، وہی فعل ایک مسلمان کرے تو وہ نہیں بھڑکتے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی خود ساختہ قومی شریعت ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی اسلامی شریعت۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اپنی پڑوسی قوم کے ساتھ پچھلی نصف صدی سے رقابت (Rivalry) قائم کر رکھی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا واقعہ دیکھتے ہیں جس میں ان کے خیال کے مطابق، ہندو قوم، مسلم قوم کی بڑائی کو پامال کر رہی ہو تو وہ اس میں اپنی قومی توہین محسوس کرتے ہیں اور قومی جذبہ کے تحت بھڑک اٹھتے ہیں اور فریق ثانی سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں نے بطور خود ان چیزوں کو ملی غیرت یا اسلامی غیرت کا نام دے رکھا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ ایک جھوٹے قومی عمل کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرنا ہے۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا ہر فعل اللہ کی نظر میں صرف ان کے وزر کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو انعام کا مستحق نہیں بناتا۔

اس قسم کا لڑائی جھگڑا کرنے والے اگرچہ ہمیشہ عوام ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے رہنما بھی اس معاملہ میں یکساں طور پر مجرم ہیں۔ کیوں کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں، مسلم رہنما کبھی ان کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح عوام اگر براہ راست طور پر اس کے ذمہ دار ہیں تو خواص اور رہنما بالواسطہ طور پر۔ اور قرآن و حدیث کے مطابق، اس طرح کے معاملہ میں بالواسطہ شرکت بھی اتنی ہی بری ہے جتنی براہِ راست شرکت۔

اردو نسل

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ ۱۹۸۹) میں ایک باتصویر خبر چھپی ہے۔ یہ مسٹر موہن سروپ ملک کے بارے میں ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ وہ ٹائمس آف انڈیا کے ایک اسٹاف رپورٹر تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۹ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج سے انگلش میں بی اے کیا۔ بمبئی سے انھوں نے جرنلزم کا ڈپلوما حاصل کیا۔ وہ انگلش، پنجابی، ہندی، اردو اور جرمن بخوبی طور پر جانتے تھے:

He graduated in English from St. Stephen's College, Delhi, and also obtained a diploma in journalism from the Bombay College of Journalism. He was well-versed in English, Punjabi, Hindi, Urdu and German.

موہن سروپ ملک کی اس نسل کے ایک فرد تھے جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں تیار ہوئی۔ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگ عام طور پر اردو زبان جانتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہی لوگ ہندستان کے مختلف شعبوں کے انچارج بنے۔ مزید یہ کہ تقسیم کے نتیجہ میں جو لوگ پاکستان کو چھوڑ کر ہندستان آئے وہ بھی سب کے سب اُردو داں تھے۔

یہی "اُردو داں" لوگ تھے جو آزاد ہندستان کے مختلف شعبوں کے انچارج بنے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے لے کر ایک اخباری رپورٹر اور پٹواری تک بیشتر لوگ وہی تھے جو بخوبی طور پر اردو جانتے تھے۔ تقسیم کے بعد کے ہندستان میں یہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم الشان سرمایہ تھا۔ مگر وہ اس سرمایہ کو ایک فیصد بھی استعمال نہ کر سکے، یہاں تک کہ ملک میں وہ دوسری نسل اوپر آگئی جو اردو سے نابلد تھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ انھیں امکانات نظر نہیں آتے۔ وہ کھوئی ہوئی چیز کی بابت تو خوب جانتے ہیں، مگر جو چیز کھوئی نہیں گئی ہے، جو اب بھی امکانی طور پر انھیں حاصل ہے، اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی کم از کم ایک وجہ یقیناً یہی ہے۔

نیا روس

اے پی کی ایک خبر ٹائمس آف انڈیا (۱۶ مارچ ۱۹۸۹، سکشن ۲) کے صفحہ اول پر چھپی ہے۔ اس کے مطابق تاشقند (سوویت روس) میں خلاف معمول مسلمانوں کا ایک جلوس نکلا۔ آنسوؤں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کئی ہزار مسلمانوں نے ۱۴ مارچ ۱۹۸۹ کے ساتویں صدی عیسوی کے قرآنی نسخہ کی واپسی پر خوشی منائی اور اس کا خیر مقدم کیا۔ سرکاری طور پر ملحد روس میں اس قسم کا مذہبی جوش شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ یہ قرآنی نسخہ وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے تیار کرایا تھا۔ کئی سو سال پہلے یہ نسخہ روس کے شہنشاہ زار کو ملا۔ وہ ان کی راجدھانی سینٹ پیٹرس برگ میں محفوظ رہا۔ ۱۹۱۷ کے بالشویک انقلاب کے بعد وہ تاشقند کے سرکاری میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ قرآن کا یہ نسخہ اب تک الماریوں میں بند رہتا تھا۔ اب اس کو عوامی زیارت کے لیے کھول دیا گیا ہے (صفحہ ۱۱)

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ نئے روسی حکمراں گورباچوف کے بعد کس طرح اشتراکی روس میں مذہبی امور کے لیے نئے آزاد مواقع کھل گئے ہیں۔ روس میں اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) کے بعد سے پورے ستر سال تک وہاں مذہبی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اوپری پابندیوں کے نیچے لوگوں کے دلوں میں اور ان کے گھروں میں مذہب بدستور زندہ رہا۔ یہاں تک کہ خود روس کے اشتراکی حکمرانوں کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مذہب سے لڑنا حقیقت واقعہ سے لڑنا ہے۔ اس طرح کی لڑائی میں حقیقت واقعہ تو نہیں بدلتی البتہ لڑنے والے کے حصہ میں بے فائدہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کے معاملہ میں اپنی پالیسی بدل دی۔

تاہم روسی مسلمان ان نئے مواقع سے صرف اس وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ وہ حکمت اور تدبر کے ساتھ اس کو استعمال کریں۔ اگر انھوں نے غیر حکیمانہ اور غیر دانشمندانہ انداز اختیار کیا تو مواقع بدستور موجود ہوں گے مگر مسلمان اس کا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

ہر آزادی محدود آزادی ہے۔ خواہ اشتراکی ملک ہو یا جمہوری ملک، خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ہر نظام اپنے شہریوں کو محدود آزادی ہی دیتا ہے۔ جو لوگ اس راز کو جانیں، وہ ہر جگہ کامیاب رہیں گے اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہر جگہ ناکام۔

آدھا حل

واشنگٹن میں مختلف انتظامی اور تجارتی شعبوں کے ماہرین کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں پورے امریکہ سے ۲۳ ٹاپ کے افراد شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک جیمز ہاروے (James Harvey) تھے جو ٹرانس امریکہ کارپوریشن (Transamerica Corp.) کے چیرمین ہیں۔ جیمز ہاروے نے امریکہ کے بعض اہم داخلی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا پہلا کام مسئلہ کی اصل نوعیت کو جاننا ہے۔ تجارت میں آدھا حل سادہ طور پر یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو جان لیں:

In business, half the solution is simply knowing the problem.

ٹائم میگزین (۱۲ مئی ۱۹۸۹) کے صفحہ ۵ پر میں نے یہ قول پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ کہنے والے نے اس چھوٹے سے جملہ میں بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یقیناً مسئلہ کے حل کی طرف کامیاب پیش قدمی کا پہلا زینہ یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو صحیح طور پر جان لیں۔ اگر آپ مسئلہ کو صحیح طور پر نہ جانیں تو آپ غیر متعلق راہوں میں دوڑنا شروع کر دیں گے۔ اور غیر متعلق راہوں میں دوڑنا صرف اپنی کوششوں کو ضائع کرنا ہے نہ کہ حل کی کوشش کرنا۔ غلط جدوجہد اس دنیا میں کبھی کسی حقیقی انجام تک نہیں پہونچتی۔

ہندستان کی سروسوں میں مسلمانوں کو کم جگہ ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح اعلیٰ سائنسی اداروں میں وہ داخلہ نہیں پاتے۔ مسلم رہنما تعصب کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے وہ تعصب کے خلاف لفظی طوفان برپا کیے ہوئے ہیں مگر اس لمبی جدوجہد کا ایک فی صد بھی کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہ مل سکا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلم رہناؤں نے مسئلہ کی نوعیت ہی کو نہیں جانا۔ پھر وہ اس کا حل نکالنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

یہ مسئلہ جو موجودہ مسلمانوں کو درپیش ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اپنے رہناؤں کی نادان رہنمائی کی بنا پر وہ تعلیم میں پیچھے ہو گیے۔ سروسوں اور داخلوں میں ان کے پیچھے ہونے کا یہی واحد سبب ہے۔ اب اس مسئلہ کا آدھا حل یہ ہے کہ وہ اس راز کو جان لیں اور پھر تعلیمی میدان میں اپنی محنت شروع کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو صرف دس سالہ عمل کے ذریعہ وہ مسئلہ حل ہو جائے گا جو غلط رُخ پر ۵۰ سالہ چیخ پکار کے باوجود حل نہ ہو سکا۔

جھوٹی توجیہہ

کیمونسٹ ملکوں میں اس وقت جو سماج بنا ہے ، اس میں کچھ لوگ خوش حال ہیں اور کچھ لوگ بدحال ۔ کچھ لوگوں کی آمدنی بہت زیادہ ہے اور کچھ لوگوں کی آمدنی بہت کم ۔ یہ عین وہی صورت حال ہے جو بدنام سرمایہ دار ملکوں میں پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ کیمونسٹ ملکوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس صورت حال پر تنقید کی اور کہا کہ ساری قربانیوں کے بعد ہم نے جو کچھ پایا وہ کمتر شکل میں عین وہی ہے جو سرمایہ دار ملکوں میں پہلے سے موجود ہے ۔

اس کے جواب میں کیمونسٹ چین میں ایک نیا نعرہ اختیار کیا گیا ہے ۔ اس چینی نعرہ کا ترجمہ یہ ہے کہ عوامی خوش حالی کا مطلب یہ نہیں کہ سب لوگ ایک ہی وقت میں یکساں طور پر خوش حال ہوں :

Common prosperity does not mean simultaneous prosperity.

انسان اپنی غلطی کی توجیہہ کرنے میں کتنا زیادہ ذہین ہے ، مگر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے وہ کتنا زیادہ بیوقوف بن جاتا ہے ۔ ایک معاملہ میں وہ حد درجہ ذہین ہے ، اور دوسرے معاملہ میں حد درجہ بیوقوف ۔

یہی موجودہ دنیا کے بیشتر انسانوں کا حال ہے ۔ وہ ایک اقدام کرتے ہیں ۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ ان کا اقدام غلط تھا ۔ مگر وہ سیدھی طرح اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے ۔ اس کے بجائے وہ اپنے اقدام کو درست ظاہر کرنے کے لیے ایک جھوٹی توجیہہ تلاش کر لیتے ہیں ۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو صحیح ثابت کر لیا ۔ حالاں کہ ایسی ہر توجیہہ صرف آدمی کی غلط کاری میں اضافہ کرتی ہے ۔ وہ اس کو غلط کار سے آگے بڑھا کر سرکش اور ظالم کے مقام پر پہونچا دیتی ہے ۔

غلطی کو چھپانا ، ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا ہے ۔ ایسے آدمی سے پوچھا جائے گا کہ جب تم نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے الفاظ پالئے تو اپنی غلطی کے اعتراف کے لیے تم نے الفاظ کیوں نہیں پائے ۔

حل کی طرف

ہندستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو مسٹر ایم جے اکبر نے مرتب کیا ہے اور وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے :

M.J. Akbar, *Nehru: The Making of India*, 1988

اس کتاب میں نہرو کی زندگی سے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔ اس کے باب ۲۸ میں مولف نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ کے الکشن کے بعد جب کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی نے وزارت بنائی تو نئی دہلی کی ایک مجلس میں اس کا ذکر آیا۔ ایک ہال میں حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ نہرو بحیثیت وزیر اعظم شریک تھے۔ گفتگو کے دوران مسٹر وائی ڈی گنڈیویا نے کہا کہ جناب، کیرالا میں کمیونسٹوں نے اپنی حکومت بنالی ہے۔ اگر وہ کل کے الکشن میں دوبارہ جیت جائیں اور دہلی کی حکومت پر قبضہ کرلیں تو اس کے بعد مرکز کا کیا حال ہوگا۔

نہرو نے جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بولے "کمیونسٹ، کمیونسٹ، کمیونسٹ، آخر آپ لوگ کمیونسٹوں سے اور کمیونزم سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں کہ کمیونسٹ مرکز میں اقتدار حاصل کرلیں گے "۔ اس کے بعد نہرو دوبارہ چپ ہوگیے۔ پھر رک رک کر اور اعتماد کے لہجہ میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ " ہندستان کے لیے خطرہ، اچھی طرح جان لیجئے، کمیونزم نہیں، یہ دائیں بازو کی ہندو فرقہ پرستی ہے :

The danger to India, mark you, is not Communism.
It is Hindu right-wing communalism (p. 580).

مسٹر گنڈیویا جنھوں نے اپنی کتاب Outside the Archives میں یہ واقعہ لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نہرو نے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اپنے مذکورہ جملہ کو کئی بار دہرایا۔

جواہر لال نہرو کو مہاتما گاندھی نے اپنا سیاسی جانشین (Political successor) کہا تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد وہ ہندستان کے وزیر اعظم بن گیے۔ تاہم جواہر لال اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک نرم آدمی تھے۔ دوسری طرف کیبنٹ میں ان کے رفیق سردار پٹیل ایک آہنی انسان کہے جاتے

تھے۔ سردار پٹیل مزاجاً سخت متعصب تھے، اسی کے ساتھ مرکزی حکومت میں امور داخلہ کا شعبہ ان کے پاس تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) کے فوراً پہلے اور اس کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ ان کو دبانے کی اصل ذمہ داری سردار پٹیل کی تھی۔ مگر انھوں نے اس معاملہ میں ڈھیل دینے کی پالیسی اختیار کی۔ جواہر لال نہرو کو اس مسئلہ پر سردار پٹیل سے سخت اختلاف تھا۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اگر نہرو نے اس معاملہ میں اس وقت مضبوط موقف اختیار کیا ہوتا، وہ سردار پٹیل کی مخالفت کرتے جب کہ ابھی مہاتما گاندھی زندہ تھے تو ہندستان کی سیاست کا رخ بالکل دوسرا ہوتا:

If he had taken a stand then, opposing Sardar Patel while Gandhi was still alive, Indian politics would have taken quite a different turn.
Badruddin Tayabji, *Memoirs of An Egoist*, vol. I, p. 186.

میرے نزدیک یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ نہرو ایک طرف آزاد ہندستان کے مسائل رکھتے تھے جن سے نمٹنے کے لیے انھیں ایک سخت ہاتھ کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ۵۰۰ دیسی ریاستوں کا مسئلہ، اس کو سردار پٹیل کے سخت ہاتھ نے جس طرح حل کیا، غالباً نہرو کے لیے اس طرح اس کا حل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ پٹیل کسی ایک شخص کا نام نہ تھا، وہ دراصل ہندو فرقہ پرستی کے پورے گروپ کی علامت تھا۔ یہ گروپ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اسی سوال پر خود گاندھی کو قتل کر دیا۔ پھر نہرو کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اس پر قابو پالیتے۔

کسی دوسرے کی کمزوری سے زیادہ یہ خود ہندو فرقہ پرستی کی طاقت تھی جس نے نہرو کو دبالیا۔ اسی نے مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ راج گوپال اچاری کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور لکشمی برہم چاری جیسے کتنے منصف مزاج ہندوؤں کو عاجز کرکے چھوڑ دیا۔ وغیرہ

نہرو نے جس خطرہ کی نشاندہی کی تھی، وہ آج ایک واقعہ بن چکا ہے۔ آج ہندو فرقہ پرستی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھی ہے اور اپنے بھیانک نتائج دکھا رہی ہے۔ آج بھی ہندوؤں میں ایسے ہوش مند اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے

ہیں۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے برابر اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک مثال کا ذکر کرتے ہیں۔

مشہور ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (۶ نومبر ۱۹۸۸) میں مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو ہر محب وطن کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان اس پورے انٹرویو کا خلاصہ ہے :

پرتی کریا میں جناجاگرن پیچھے ڈھکیلتا ہے

یعنی ردّعمل کے ذریعہ جو بیداری آئے، وہ قوم و ملک کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتی ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں بہت سے لوگ مسلمانوں کی ردعمل کی تحریکوں کو صحوہ اسلامیہ کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں بہت سے خوش فہم لوگ ہیں جو ہندوؤں کے درمیان مسلم ردّعمل کے تحت اٹھنے والی لہر کو "ہندو بیداری" کا نام دے رہے ہیں۔ مسٹر باجپئی نے ایسے ہندوؤں کو آگاہی دی ہے کہ یہ ایک منفی بیداری ہے، اور منفی بیداری ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے، وہ تعمیر کا سبب نہیں بنتی۔

کوئی شخص خواہ کتنے ہی بڑے سیاسی عہدہ پر ہو، اس کو کبھی بے قید اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ جنرل محمد ضیاء الحق ساڑھے گیارہ سال (۸۸ – ۱۹۷۷) تک پاکستان کے مطلق حکمراں رہے۔ مگر پاکستان کی جو طاقتیں ملک کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ ہاتھ نہ ڈال سکے ——— مثلاً بڑے بڑے جاگیردار، اسمگلر، منشیات اور ہتھیاروں کا کاروبار کرنے والے، بیوروکریسی، رشوت لینے اور دینے والے، ٹیکس کی چوری کرنے والے، علٰحدگی پسند سیاست داں، وغیرہ

میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی وزیر یا حکمراں ہندستان کے اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے جس کو نہرو نے "ہندو فرقہ پرستی" کہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی تمام تر مسلم فرقہ پرستی کا ردعمل ہے، اور یہ صرف مسلمان ہیں جو قرآن کے اصول کے مطابق، صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کرکے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان اس "ہندو فرقہ پرستی" کے جواب میں آج بھی ٹھیک وہی طریقہ

اختیار کیے ہوئے ہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگی لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا تھا، یعنی ہندو فرقہ سے براہ راست لڑنا، اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا، اس کی مذمت میں اپنے تمام الفاظ خرچ کردینا۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے جو سیاست اختیار کی، اس کے تجربہ نے بتایا کہ مذکورہ بالاقسم کی جوابی تحریک صرف فرقہ پرستی کے مسئلہ کو بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اسے کم نہیں کرتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ سے پہلے جس درجہ کی ہندو فرقہ پرستی سے دوچار تھے، آج اس میں سوگنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، ایسی حالت میں سابقہ پالیسی پر قائم رہنے کا آخر کیا جواز ہے۔ کیا مسلمان ایک بل میں دوبار ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق، ان کو مومنانہ بصیرت حاصل نہیں، وہ سرے سے ایمان کی روشنی ہی سے محروم ہیں۔

مدعو نہ کہ حریف

مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہندستان کی فرقہ پرستی کا واحد حل وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ یعنی صبر اور اعراض۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے، وہ ہر حال میں ردّ عمل کی روش سے بچیں گے۔ یہی پہلے بھی ان کے مسئلہ کا حل تھا اور آج بھی یہی ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا وہ تدبیریں جو ان کے بے ریش اور باریش رہنما ان کو بتا رہے ہیں، وہ صرف ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ ہرگز منزل کی طرف لے جانے والی نہیں۔

مسلمان اب تک ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ سراسر باطل ہے۔ وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔ مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس ملک میں خدا کے دین کے داعی ہیں۔ ہندو ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ مدعو اپنے داعی کا محبوب ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں کے تئیں اپنے نفرت کے جذبات کو کھرچ کر نکال دیں۔ اور ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ معاملہ کریں۔ یہی ان کے سارے مسائل کی کنجی ہے۔ یہی ان کی منزل کا آغاز ہے اور یہی ان کی منزل کا اختتام بھی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو انگریزی الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے چار صفحہ کے

خط میں اپنا تبصرہ روانہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں ایک پیدائشی ہندو ہوں مگر میں کسی بھی مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ خواہ وہ ہندو مذہب ہو یا اور کوئی مذہب۔ البتہ میں انسانیت اور انسانی شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ وہ مزید لکھتے ہیں :

A large number of Hindus are orthodox and they are routinely busy making money and performing rituals and ceremonies for serving their selfish ends, at the same time trying to "buy" a berth in *swarg* in the next world. And because they have lots of material possessions, they know they will stand to lose much in consequence of riots. But when they are goaded to the end of their tether by other communities, they sometimes let their resentment erupt but not for a long period of time.

K.L. Dutta, W. 6/110, Premnagar, Dehra Dun

ہندوؤں کی بڑی تعداد کٹر مذہبی ہے مگر وہ صبح وشام پیسہ کمانے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور رسوم وروایات کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں تاکہ اپنے خودغرضانہ مقاصد کو پورا کرسکیں۔ اور اسی کے ساتھ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا میں سورگ میں اپنے لیے ایک جگہ خرید سکیں۔ ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ فساد جیسی پرتشدد چیزوں میں حصہ لیں۔ اور چوں کہ ان کے پاس مادی سازوسامان کافی موجود ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فسادات کے نتیجہ میں وہ بہت کچھ کھو دیں گے۔ مگر جب وہ دوسرے فرقوں کی طرف سے آخری حد تک چھیڑ دیے جاتے ہیں تو بعض اوقات ان کی ناراضگی ابل پڑتی ہے۔ مگر بہت زیادہ دیر تک کے لیے نہیں۔

مسٹر کے ایل دتہ کے اس نقطۂ نظر سے میں متفق ہوں۔ ہندو بنیادی طور پر ایک تاجر پیشہ قوم ہیں۔ اور فساد اور اس کے نتیجہ میں کرفیو کا سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ ہی کو پہونچتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ہندو، بحیثیت قوم، فساد کو پسند نہیں کرسکتے۔

پھر فساد کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو سب کے سب تاجر نہیں ہیں۔ ان میں ایک طبقہ غیر تاجروں اور غریبوں کا ہے۔ یہی دوسرا طبقہ اکثر اوقات فساد کا ابتدائی سبب بنتا ہے۔ اس دوسرے طبقہ کا کوئی فرد ایک مسلمان کے ساتھ کوئی اشتعال انگیز کارروائی کرتا ہے، اور ایسا ہونا کسی آزاد سماج میں بالکل فطری ہے۔ اس وقت مسلمان بے برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ اشتعال انگیزی کی صورت میں مشتعل ہو کر لڑنے لگتا ہے۔

اس کے بعد خود مسلمانوں کی دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد کا مسئلہ دو قوم کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی قوم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قومی شکایات جو سوئی ہوئی تھیں، اچانک جاگ پڑتی ہیں۔ قومی ساکھ اور قومی حمیت کا مسئلہ بن جانے کی وجہ سے دونوں فرقوں میں سے کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ اپنے فرقہ کے خلاف بولے۔ تمام لکھنے اور بولنے والے یک طرفہ طور پر اپنے فرقہ کی حمایت اور دوسرے فرقہ کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ قومی حمایت کا یہی انداز ہندو بھی اختیار کرتے ہیں اور یہی انداز مسلمان بھی۔

اب فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنے کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان پورے عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں صرف اعراض کی پالیسی اختیار کریں گے نہ کہ لڑنے اور مقابلہ کرنے کی پالیسی۔

اگر مسلمان پوری طرح یہ فیصلہ کر لیں تو یقینی طور پر وہ فساد کی جڑ کاٹ دیں گے۔ اس کے بعد ہر چنگاری اپنے ابتدائی مرحلہ میں بجھ کر رہ جائے گی، وہ فساد اور قتل و خون کے مرحلہ تک نہ پہونچے گی۔ جہاں بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہاں لازمی طور پر ایسا ہی پیش آیا ہے۔

مسلمان اگر پوری طرح اعراض کی پالیسی اختیار کر لیں تو ابتدائی اشتعال کا ہر واقعہ صرف ایک شخصی واقعہ بن کر رہ جائے گا۔ وہ دو قوموں کے وقار کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ اس کے بعد پولیس سے بھی مسلمانوں کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ پولیس مسلمانوں کے لیے اس وقت ظالم بنتی ہے جب کہ مسئلہ دو قومی صورت اختیار کر لے۔ دو قومی صورت اختیار کرنے کے بعد مسلمان پولس کی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر مسئلہ دو قومی نہ بنے تو وہ افراد پولیس کی گولی کا نشانہ بنیں گے جنھوں نے ابتدائی طور پر شرارت کی تھی۔

مفاد کی سیاست

سابق شاہ ایران محمد رضا پہلوی (۱۹۸۰ - ۱۹۱۹) کے آخری دنوں کے حالات پر ایک معلوماتی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

William Shawcross, *The Shah's Last Ride*,
Chatto & Windus, London.

ایران کے سیاسی حالات جب شاہ کے لیے بہت زیادہ غیر موافق ہو گیے تو ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ کو وہ اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ امریکہ روانہ ہو گیے۔ اس کے بعد وہ مختلف ملکوں میں قیام کی کوشش کرتے رہے ـــــ مراکو، بہاماس، پناما، وغیرہ مگر کسی ملک نے ان کو قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ کے نکلنے کے بعد ایران کے انقلابیوں (صحیح تر لفظ میں تخریب کاروں) نے امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کر کے پچاس سے زیادہ امریکیوں کو یرغمال (Hostage) بنا لیا تھا۔ اس انجام سے بچنے کے لیے کوئی ملک ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی جلاوطنی کی حالت میں قاہرہ میں ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شاہ کے عروج کے زمانہ میں برطانیہ ان کا بہت بڑا دوست سمجھا جاتا تھا۔ شاہ نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ ان کو اپنے یہاں داخلہ کی اجازت دیدے۔ مگر برطانی حکومت نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ موجودہ وزیر اعظم برطانیہ مسز مارگریٹ تھیچر اس وقت اپوزیشن میں تھیں۔ اس وقت انھوں نے برطانی حکومت کے انکار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ انھیں برطانی باشندہ ہونے پر شرم ہوگی اگر برطانیہ اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے:

She would be ashamed to be British if the UK did not stand by its friends.

اس کے جلد ہی بعد مئی ۱۹۷۹ میں برطانیہ میں الکشن ہوا۔ اس الکشن میں مسز مارگریٹ تھیچر کی پارٹی کامیاب ہوئی اور وہ برطانیہ کی وزیر اعظم بنا دی گئیں۔ اس وقت شاہ اور ان کی ملکہ بہاماس میں تھے۔ انھوں نے مارگریٹ تھیچر کی جیت پر خوشی منائی۔ مگر ان کی امیدوں کے خلاف

مارگریٹ تھیچر نے دوبارہ انھیں برطانیہ میں داخلہ کی اجازت نہ دی۔ مصنف کے نزدیک اس کی دو وجہ تھی۔ تہران میں برطانی سفارت خانہ کے عملہ کو یرغمال بننے سے بچانا اور ایران کے ساتھ برطانیہ کے تجارتی مفادات کا تحفظ :

It was partly a question of the security of Britain's Tehran diplomats, partly a matter of UK trading interests.

مارگریٹ تھیچر جب وزیر اعظم نہیں تھیں، اس وقت انھوں نے کہا کہ شاہ ایران کو پناہ نہ دینا برطانیہ کے لیے ایک شرم کی بات ہے۔ مگر یہی مارگریٹ تھیچر جب خود برطانیہ کی حکمراں بن گئیں تو انھوں نے بھی یہی کیا کہ شاہ ایران کو برطانیہ میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

بظاہر دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں ایک ہیں۔ دونوں ہی کا اصل محرک ذاتی مفاد ہے۔ مارگریٹ تھیچر جب اپوزیشن میں تھیں تو ان کا مفاد اس میں تھا کہ وہ حکمراں پارٹی کو مطعون کرنے کے لیے شاہ کی حمایت کریں۔ اس کے بعد جب مارگریٹ تھیچر خود حکمراں بن گئی تو ان کا مفاد یہ بن گیا کہ وہ بھی وہی کریں جو ان سے پہلے کی حکمراں جماعت کر رہی تھی۔

بے اصول سیاست کی یہ قسم صرف "کفر پسندوں" کی اجارہ داری نہیں، وہ یکساں درجہ میں "اسلام پسندوں" کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ میں پاکستان میں صدر کے عہدہ کے لیے الکشن تھا۔ اس موقع پر وہاں کے اسلام پسندوں نے محمد ایوب خاں کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا۔ اس وقت انھوں نے زور وشور کے ساتھ دعویٰ کیا کہ اسلام میں عورت کی حکمرانی جائز ہے۔ مگر دسمبر ۱۹۸۸ کے الکشن کے بعد جب بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں تو اب یہی اسلام پسند اپنی ساری طاقت یہ ثابت کرنے میں لگائے ہوئے ہیں کہ اسلام میں عورت کو حکمراں بنانا جائز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مذہب مفاد پرستی ہے، غیر مسلموں کا بھی اور ان لوگوں کا بھی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

آخر سے آغاز

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر فسادات کے معاملہ میں آپ کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ آپ صبر واعراض کو فساد کے مسئلہ کا حل بتاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ صبر واعراض کہاں تک۔ اگر فرقہ پرست لوگ ہمارے گھروں میں گھس آئیں اور ہماری ماں بہن کو بے عزت کرنے لگیں تو کیا اس وقت بھی ہم صبر واعراض کی پالیسی پر عمل کرتے رہیں گے۔

میں نے کہا کہ آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ کہانی کو آخر سے شروع کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ کی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ فرقہ پرستوں کا گھر کے اندر گھس جانا یہ کہانی کا آخری حصہ ہے۔ یہی وہ چیز نہیں جہاں سے کہانی شروع ہوتی ہو۔

پھر میں نے کہا کہ ہندستان کا کوئی فرقہ وارانہ فساد ایسا نہیں ہے جو یہاں سے شروع ہوا ہو کہ اچانک فرقہ پرست لوگ مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر غنڈہ گردی کرنے لگے ہوں۔ اگر آپ ایسے کسی فساد کا نام بتائیں تو میں سفر کر کے وہاں جاؤں گا اور اس کی تحقیق کروں گا۔ مگر وہ ایسے کسی فساد کا نام و پتہ نہ بتا سکے۔

اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فساد ہمیشہ "سڑک" سے شروع ہوتا ہے نہ کہ "گھر" سے۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے۔ مسلمان انتہائی ناقابلِ فہم طور پر اس کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں روک ٹوک شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں سے بات بڑھتی ہے جو بالآخر فساد تک پہونچتی ہے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں صبر واعراض کا طریقہ اختیار کر لیں تو "سڑک" کا واقعہ سڑک تک رہ جائے، وہ "گھر" کے اندر تک نہ پہونچے۔

اس قسم کے تمام جھگڑے صرف نادانی ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات در اصل مسلمانوں کی نادانی کی قیمت ہیں۔ نادانی نے انھیں پیدا کیا ہے، اور نادانی کو ختم کر کے ہی ان کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری ہر تدبیر صرف فساد کو بڑھانے والی ہے نہ کہ فساد کو گھٹانے والی۔

ایک موت

ویر بہادر سنگھ ۱۸ فروری ۱۹۳۵ کو ہرناہی (گورکھپور) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کانگرس میں شریک ہوگیے اور ترقی کرتے کرتے وزارت کے عہدے تک پہونچے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ کو انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ وہ تین سال سے زیادہ عرصہ تک اس عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد انھیں دہلی کی مرکزی حکومت میں مواصلات کا وزیر بنا دیا گیا۔ مرکزی وزیر کی حیثیت سے وہ ٹیلی کمیونی کیشن کی بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس گیے ہوئے تھے۔ وہاں مین کانفرنس کی کارروائی کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا، اور ۳۰ مئی ۱۹۸۹ کو پیرس کے اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یوپی میں بابری مسجد اور میرٹھ کے واقعات ویر بہادر سنگھ ہی کے زمانہ میں پیش آئے تھے۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ بدنام ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا کے لکھنؤ اڈیشن کے اڈیٹر مسٹر وی ایم بادولا نے ویر بہادر سنگھ کے حالات پر ایک مضمون لکھا ہے جو ٹائمس آف انڈیا (۳۱ مئی ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے :

> He displayed an utter lack of political farsightedness. He never cared to look back, as he often boasted, but then, he was also incapable of looking ahead. A case in point was his handling of the Babri Masjid issue and he is said to have masterminded the opening of the locks of the disputed property at the instance of Mr. Arun Nehru, then Union minister for internal security, only to appease the Hindus. The mishandling of the Muslim problem in general and the Meerut riots in particular did not particularly endear him to the people (p. 13).

انھوں نے سیاسی دور اندیشی کے کامل فقدان کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ وہ اکثر پُرفخر طور پر کہا کرتے تھے، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ آگے کی طرف دیکھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ایک بہت واضح مثال بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی اس کا دماغ تھے اور انھیں نے سابق مرکزی وزیر مسٹر ارون نہرو کے اشارہ پر اس متنازعہ

عمارت کا تالا کھلوایا تھا ۔ صرف اس لیے کہ اس طرح وہ ہندوؤں کو خوش کر سکیں گے ۔ مسلمانوں کے مسئلہ کو ، خاص طور پر میرٹھ کے فسادات کو برے طریقہ سے انجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عوام کے اندر مقبولیت حاصل نہ کر سکے (صفحہ ۱۳)

مسٹر بادولا کے یہ الفاظ پڑھ کر میں نے سوچا کہ ویر بہادر سنگھ کے بارہ میں اتنا کھلا ہوا تبصرہ شاید کوئی مسلم دانشور بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ بلاشبہ یہ انتہائی منصفانہ اور جرأت مندانہ تبصرہ ہے اور مسٹر بادولا اس کے مستحق ہیں کہ ملک کے نمبر ایک انگریزی اخبار میں ایسا تبصرہ شائع کرنے پر انھیں مبارکباد دی جائے ۔

مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں آجکل جو لکھنے اور بولنے والے ہیں ، وہ اس ملک کے بارہ میں تعصب اور ظلم کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں جانتے ۔ انھیں " ویر بہادر سنگھ " کی خبر ہے ، مگر انھیں " دی ایم بادولا " کی کوئی خبر نہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اعلان کیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر بھی موجود رہتا ہے ۔ مگر موجودہ مسلمان لیڈر " یسر بلائنڈ " ہو چکے ہیں ۔ ان کو یہاں صرف عُسر دکھائی دیتا ہے ، یسر کے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں مگر وہ انھیں نظر نہیں آتے ۔

دوسری بات ویر بہادر سنگھ سے متعلق ہے ۔ انھوں نے اپنی وفات سے صرف چند ماہ پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں آج میں جیتا ہوں ، میں کل کی پروا نہیں کرتا ۔ انھوں نے "میرٹھ" اور "بابری مسجد" کے معاملہ میں جو کچھ کیا ، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ صرف اپنے آج کو دیکھتے تھے ، وہ کل کی فکر نہیں کرتے تھے ۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ ان کا آج چند دن بعد " ۳۰ مئی " کو ختم ہو جانے والا تھا ۔ اس کے بعد جو کل ان کے لیے مقدر تھا ، وہ یہ کہ وہ ایک عام انسان کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں جواب دہی کے لیے حاضر کر دیے جائیں ۔ ویر بہادر سنگھ اگر اس حقیقت کو جانتے تو وہ آج سے زیادہ کل کے لیے فکر مند ہوتے ، اس کے بعد وہ اس سے بالکل مختلف انسان بن جاتے جیسا کہ وہ اپنی زندگی کے آخر تک بنے رہے ۔ "آج" کو جاننا آدمی کو سرکش اور بے انصاف بناتا ہے ، اور "کل" کو جاننا ذمہ دار اور انصاف پسند ۔ لوگ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ وہ سرکش اور بے انصاف بنے ہوئے ہیں ۔ اگر وہ اپنے کل کو جانیں تو ان کی زندگیاں بالکل بدل جائیں ۔

روس میں اسلام

بیس سال پہلے ٹائم میگزین کا نمائندہ ماسکو سے نکال دیا گیا تھا۔ اب موجودہ روسی وزیر اعظم گورباچیف کی نئی پالیسی گلاسناسٹ (Glasnost) کے تحت دوبارہ مواقع ملے تو ٹائم کے ادارہ نے جدید اشتراکی روس پر تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کا پروگرام بنایا۔ ایک درجن رپورٹر اور ۵ فوٹو گرافر امریکہ سے روس گئے اور چار مہینہ تک روس کے مختلف حصوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے جو رپورٹ تیار کی، وہ ٹائم (۱۰ اپریل ۱۹۸۹) کے ۶۲ صفحات میں شائع ہوئی ہے۔

یہ رپورٹ سوویت یونین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی براہ راست معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کا صفحہ ۵۸-۶۹ روس میں اسلام کی موجودہ حالت کے بارے میں ہے۔ عنوان ہے —— اسلام اپنی آواز دوبارہ حاصل کرتا ہے :

Islam Regains its Voice

ان دونوں صفحات میں جو مضمون ہے، اس کے ساتھ روسی مسلمانوں کی دینی زندگی سے متعلق تین رنگین تصویریں دی گئی ہیں۔ یہ دونوں صفحے اپنی ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے اس قدر پرکشش اور شاندار ہیں کہ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کا ایک بھی ایسا میگزین نہیں جو "روس میں اسلام" کے بارے میں ایسی براہ راست اور اتنی خوبصورت رپورٹ پیش کرسکے۔ صحافت موجودہ زمانہ میں قومی تعمیر کی بنیاد ہے۔ جس قوم کے پاس طاقت ور صحافت نہیں، اس کو قبرستان میں تو یقیناً جگہ مل سکتی ہے، مگر آج کی دنیا میں زندگی کے میدان میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

یہ رپورٹ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہے : اللہ اکبر اللہ اکبر، تاشقند کے مینارے اسلامی عبادت کی پکار بلند ہوتی ہے۔ رپورٹ میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ روسی گورنمنٹ آج کل اسلام کے بارے میں فراخی کا ثبوت دے رہی ہے۔ ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد روس میں ۲۶ ہزار مسجدیں اور ۲۴ ہزار مذہبی مدرسے بند کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے ۱۴۰۰ مسجدیں دوبارہ کھول دی گئی ہیں۔

روسی حکومت آج کل اسلام کے بارے میں زیادہ روادار ہے ۔ نئی مسجدیں کھولنے کے علاوہ حکومت نے عملی طور پر اینٹی مسلم پروپیگنڈے کو تقریباً بند کر دیا ہے ۔ اسلام دوسرے مذہبوں کی طرح روس کی نئی سوچ سے فائدہ اٹھانے والوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے :

> Yet the government is more tolerant of Islam these days. Besides opening new mosques, the regime has virtually ended official anti-Muslim propaganda... Islam, like the country's other religions, is a major beneficiary of "new thinking" (p. 59).

سوویت روس کے نظام میں یہ تبدیلی مختلف اسباب سے ہوئی ہے ۔ تاہم اس نے روسی مسلمانوں کو کام کرنے کا نیا موقع دے دیا ہے ۔ مگر اس موقع سے فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ روس کے مسلمان یہ بھی جانتے ہوں کہ موجودہ آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود ۔ وہ حاصل شدہ کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنائیں نہ کہ غیر حاصل شدہ کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیں ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کا خاص سبب ان کی غیر حکیمانہ سرگرمیاں ہیں ۔ وہ ممکن پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ناممکن پر دوڑتے ہیں ۔ وہ طے ہوئے کے بجائے نہ طے ہوئے پر اپنی نظریں جمائے رہتے ہیں ۔

ان کا حال یہ ہے کہ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں بولتے ہیں ۔ جہاں گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنا چاہیے وہاں ایجی ٹیشن کی دھوم مچاتے ہیں ۔ جہاں محبت کی فضا پیدا کرنا چاہیے وہاں عداوت کا طوفان کھڑا کرتے ہیں ۔ جہاں صبر و اعراض پر قائم ہونا چاہیے وہاں لڑائی اور ٹکراؤ کی مہم شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ موقع جب کہ گھروں میں بیٹھنا چاہیے وہاں جلوس بنا کر سڑکوں پر نعرہ بازی کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں ۔

اس دنیا میں " ممکن " کو استعمال کرنے کا نام عمل ہے ، نہ کہ " ناممکن " کے پیچھے بے فائدہ دوڑنے کا ۔ مگر یہی وہ سادہ سی بات ہے جس کو نہ مسلمانوں کے اصاغر جانتے ہیں اور نہ ان کے اکابر ۔

تجارت کا میدان

ایک روایت کے مطابق ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (کنز العمال) یعنی روزی کے ۹۰ فی صد حصے تجارت میں ہیں۔

یہ حقیقت قدیم روایتی زمانہ میں ایک قسم کی پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیوں کہ قدیم زمانہ میں اصل اہمیت زراعت کی تھی نہ کہ تجارت کی۔ مگر آج پیغمبر کا یہ کلام ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نئے طریقوں کی دریافت نے تجارت کی وسعت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔

آج تجارت دوسرے ذرائع معاش پر بدرجہا زیادہ فائق ہو چکی ہے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے پارسی ہیں۔ ہندستان میں پارسیوں کی تعداد بمشکل ایک لاکھ ہے۔ مگر تجارت کے میدان میں عمل کرکے انھوں نے ملک کی دولت کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔

موجودہ زمانہ میں تجارت کی فوقیت صرف ملازمت اور زراعت جیسے روایتی ذرائع ہی پر قائم نہیں ہوئی ہے ، بلکہ اس نے سیاست اور فوج اور ہتھیار جیسی چیزوں پر بھی فیصلہ کن غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے اپنی تجارتی ترقی کے ذریعہ یہاں تک بالاتری حاصل کی کہ اس نے امریکہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کو اپنے مقابلہ میں بے اثر بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو دیکھئے اور اس کے بعد موجودہ مسلمانوں کی روش پر غور کیجئے۔ ہندستان کے مسلمان آج سب سے زیادہ جس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جاتا۔ ملازمتوں اور داخلوں کے کوٹہ میں ان کے لیے رزرویشن نہیں ہے۔

مسلمانوں کی یہ روش پیغمبر اسلام کے خلاف عدم اعتماد کے اظہار کے ہم معنی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ فرمار ہے ہیں کہ رزق کا ۹۰ فی صد حصہ تجارت میں ہے۔ پیغمبر اسلام کی اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ اور تابعین بہت بڑے پیمانہ پر تجارتوں میں داخل ہوگیے۔ چنانچہ صحابہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خشکی اور تری میں تجارت کیا کرتے تھے (انّ الصحابۃ کانوا یتجرون فی البرّ والبحر۔)

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبرؐ کے اس کلام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تجارت کا میدان ان کے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے مگر وہ اس میں محنت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اس ذریعۂ معاش کی طرف اپنی نظریں لگائے ہوئے ہیں جو پیغمبر کے ارشاد کے مطابق، معاشی ذرائع کے صرف دس فی صد حصہ پر مشتمل ہیں۔ وہ اس ذریعہ معاش کو عملاً چھوڑے ہوئے ہیں جو ۹۰ فی صد معاشی ذرائع سے تعلق رکھتا ہے۔

موجودہ مسلم رہناؤں نے ایسے اخبار اور رسالے نکال رکھے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ مسلمانوں کو اس بات کی خبر دیں کہ فلاں سروس میں ان کا تناسب اتنا کم ہے اور فلاں داخلہ میں وہ اتنی کم تعداد میں لیے گئے ہیں۔ اس قسم کے پرچے نکالنے والے بیک وقت دو جرم کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ پیغمبر اسلام کی، نعوذ باللہ تحقیر کر رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ارشاد سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی دے رہے ہیں کہ اگر تمہارے لیے دس فی صد ذرائع والے میدان میں مواقع نہیں ہیں تو اس کی پروا نہ کرو۔ تم اس میدان میں داخل ہو جاؤ جو ذرائع معاش کے ۹۰ فی صد حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جو آج بھی تمہارے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ مگر مسلمانوں کے جھوٹے لیڈر رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کر کے چیخ رہے ہیں کہ اصل معاشی میدان تو ملازمتوں کا میدان ہے اور وہاں مسلمانوں کے لیے دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

قرآن کے مطابق، جو شخص رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرے اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (الحجرات ۲) اس آیت کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد لیڈر حبطِ اعمال کے اس قانون کی زد میں آگیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ۵۰ سالہ چیخ پکار مکمل طور پر بے فائدہ ثابت ہوئی۔ وہ اپنے دعویٰ کے مطابق، ملازمتوں کی فہرست میں، مسلمانوں کا اضافہ کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

مسلمانوں نے اگر بالفرض اس ملک میں "۱۰ فی صد" رزق والے میدان کو کھو دیا ہو تب بھی "۹۰ فی صد" رزق والا میدان اب بھی ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اس دوسرے وسیع تر میدان میں داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد انھیں اپنے ماحول کے خلاف تعصب اور امتیاز کی شکایت نہ ہو گی۔

شکایت یا تدبیر

آپ راستہ چل رہے ہیں ۔ درمیان میں ایک جھاڑی کے کانٹے سے آپ کا دامن الجھ جاتا ہے۔ ایسے وقت میں آپ کیا کرتے ہیں ۔ آپ " شکایت " کے بجائے " تدبیر" کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ جھاڑی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے ، بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کون سی صورت اپنائیں جس سے مسئلہ حل ہو جائے ۔

عقل مند آدمی جانتا ہے کہ یہی طریقہ اس کو انسان کے معاملہ میں بھی اختیار کرنا ہے ۔ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے ۔ کسی سے کوئی تکلیف پہونچ جاتی ہے ۔ کسی شخص کے متعلق ہمارا احساس ہوتا ہے کہ اس نے ہمارا حق ہم کو نہیں دیا ۔ ایسے ہر موقع پر دوبارہ ہمیں شکایت کے بجائے تدبیر کا انداز اپنانا چاہیے ۔

زندگی کا ہر مسئلہ ایک چیلنج ہے نہ کہ ایک شخص کے اوپر دوسرے شخص کی زیادتی ۔ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ پیش آئے ، اور آپ اس کو زیادتی سمجھیں تو اس سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوگا ۔ حتی کہ یہ ذہن آپ کو یہاں تک لے جا سکتا ہے کہ آپ مایوسی کا شکار ہو جائیں ۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ موجودہ ماحول میں آپ کے لیے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں ۔ شکایت کا ذہن مایوسی تک لے جاتا ہے ، اور مایوسی کا ذہن نفسیاتی خودکشی تک ۔

اس کے برعکس اگر آپ کا یہ حال ہو کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آپ اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں ، تو اس سے آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوں گی ۔ آپ کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا ۔ اول الذکر صورت میں آپ کا ذہن اگر منفی رخ پر چل رہا تھا تو اب آپ کا ذہن تمام تر مثبت رخ پر چل پڑے گا ——— یہی ایک لفظ میں ، موجودہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے ۔ اس دنیا میں جو شخص مسائل سے شکایت اور احتجاج کی غذا لے ، اس کے لیے یہاں بربادی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں ۔ اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ مسائل کا سامنا پیش آنے کے بعد اس کا ذہن تدبیر تلاش کرنے میں لگ جائے ، وہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا ، کیوں کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا ایک حل ہے اور ہر مشکل کی ایک تدبیر ۔

اب وہ نوجوان اوزارسازی کا ماہر ہوگیا ہے اور اس کے ذریعہ اچھی کمائی کر رہا ہے۔
بہت سے مسلمان آپ کو اس قسم کی منت ماننے والے ملیں گے۔ آپ ان کو منع کریں تو وہ کہیں گے کہ "ہمارا مقصد پورا ہوتا ہے تو ہم کیوں نہ کریں"۔ مگر یہ صرف غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں بے پناہ صلاحیت بھری ہوئی ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اس صلاحیت کو حرکت میں لایا جائے۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز یقین ہے۔ نوجوان نے "اوزار" اپنی عقل سے بنایا۔ البتہ اس کی عقل کو متحرک کرنے کے لئے یقین اور حوصلہ کی طاقت درکار تھی۔ جب اس نے تعزیہ پر چاندی کا اوزار چڑھانے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت پیدا کرلی۔ اس کی نفسیات یہ ہوگئی کہ اب میں نے تعزیہ کو چڑھاوا دینے کی منت مان لی ہے، اب تو میں اس کی مدد سے ضرور یہ کام کرلوں گا۔ اس طرح چڑھاوے کی منت سے اس کو یقین اور حوصلہ کی طاقت مل گئی۔ اس کے ذریعہ اس نے اوزار بنایا۔ اس یقین کا حقیقی سرچشمہ اللہ کا عقیدہ ہے۔ مگر نادان آدمی دوسری چیزوں پر عقیدہ کو اپنے یقین کا سرچشمہ بنالیتا ہے۔

عبدالقیوم صاحب (۳۸ سال) پالی کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پالی میں اتنا تعصب ہے کہ اگر سڑک پر کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے تو لوگ سب سے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کرنے والا کون ہے۔ چوڑی بازار میں آگ لگ گئی تو پوچھنے والے صرف یہ پوچھتے تھے کہ آگ کس نے لگائی۔ لوگوں کو آگ بجھانے سے دل چسپی نہیں، بلکہ یہ جاننے سے دل چسپی ہے کہ آگ لگانے والا کون ہے۔

حالت یہ ہے کہ پوچھنے والے کو اگر یہ بتایا جائے کہ آگ لگانے والا یا ایکسیڈنٹ کرنے والا مسلمان ہے تو ہندو طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اور اگر یہ بتایا جائے کہ آگ لگانے والا یا ایکسیڈنٹ کرنے والا ہندو ہے تو مسلمان بپھر کر ہنگامہ کرنے لگیں گے۔

عبدالقیوم صاحب پالی میں پینٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ ان کا کام ۹۰ فی صد ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ وہ سچائی کے ساتھ اور محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام ہندو ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو ان پر اتنا اعتماد ہوگیا ہے کہ گھر کی کنجی انھیں دے کر باہر چلے جاتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں پالی میں فساد ہوگیا۔ بہت سی دکانیں جلادی گئیں۔ شہر میں کرفیو

ٹ گیا۔ اس وقت وہ ہندو محلہ میں تھے۔ ہندوؤں نے ان کی پوری حفاظت کی۔ کھانے پینے کی
وئی تکلیف نہیں ہونے دی۔" اصل چیز اپنا اخلاق ہے"۔ عبد القیوم صاحب نے اپنے سادہ
فظوں میں کہا " ہم اپنا اخلاق اور اپنی بول بات ٹھیک رکھیں تو وہ ہمارا پورا احترام کریں گے"۔
ایک بزرگ نے ایک صاحب کا ذکر کیا جنھوں نے ہمارے مشن کے ساتھ غصب اور
یانت کا معاملہ کیا ہے اور کچھ لوگ "بغض معاویہ" کی نفسیات کے تحت ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔
یں نے کہا کہ یہ تحسبونہ ھیناً وھو عند اللہ عظیم کا معاملہ ہے۔ قیامت میں یہ
وگ اپنے جرم پر اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوؤں کا سیلاب ہی ان کو غرق کرنے کے لئے کافی
ہو جائے گا۔

راجستھان کا ایک قصبہ مکرانہ ہے جو سنگ مرمر کے لئے مشہور ہے۔ مکرانہ جانے کا اتفاق
و نہیں ہوا۔ البتہ یہاں کے بعض اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار ۱۶۰۶ میں
یہاں سنگ مرمر کی موجودگی کا پتہ چلا۔ ہندستان میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مقام ہے۔ مسٹر
ی ایل کٹاریا (اسسٹنٹ مائننگ انجینئر، مکرانہ) کے بیان کے مطابق، یہاں تقریباً ۵۰ ملین
ن سنگ مرمر کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ذخائر ۵۰ فٹ نیچے شروع ہو جاتے ہیں اور ۲۵۰ فٹ تک
جاتے ہیں۔ یہ ذخائر تقریباً ۲۵ کلو میٹر کے رقبہ میں زیر زمین پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے ریاست
کے خزانہ کو سالانہ چار کرور روپیہ بطور ٹیکس وصول ہوتا ہے۔ شاہجہاں نے مکرانہ کے پتھروں
ہی سے آگرہ کا تاج محل بنوایا تھا۔ اسی وقت سے مکرانہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت
مکرانہ میں ۶۵۰ کانیں ہیں۔

پنجاب اور یوپی اگر درختوں کے باغ ہیں تو راجستھان طرح طرح کے پتھروں کا باغ ہے۔ خدا
کے جو کلمات درخت کے نازک پتوں پر لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، وہی کلمات پتھروں کی دنیا میں سنگی
تحریروں کی صورت میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے مکرانہ کے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا مکرانہ میں کچھ
ایسے لوگ ہیں جنھوں نے پتھروں کے ورق پر لکھی ہوئی خدا کی کتاب پڑھی ہو۔ اس سوال کو سن کر وہ میری
طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میں نے روسی یا جاپانی زبان میں ان سے کوئی سوال کر دیا ہو۔

۳۰ جولائی کو دوپہر بعد شیوگنج سے سروہی کے لئے روانہ ہوا۔ سروہی ایک پر سکون اور

صحت بخش مقام ہے۔ اس سفر میں حاجی عبد الکریم صاحب، ظفر مسعود رضوی صاحب اور کچھ دوسرے لوگ ساتھ تھے۔

ظفر مسعود رضوی صاحب (۴۸ سال) سروہی میں رہتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ ان کے یہاں الرسالہ کے کیسٹ بھی موجود ہیں۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ ایک روز ان کے یہاں "تعمیر ملت" نام کا کیسٹ بج رہا تھا۔ ان کے پڑوس میں مسٹر کرشن کمار ماتھر نیچے کے حصہ میں رہتے ہیں۔ مسٹر ماتھر کے کان میں اس کی آواز گئی تو انھیں دل چسپی ہوگئی۔ انھوں نے کیسٹ کو مانگ کر دوبارہ اس کو مکمل طور پر سنا۔ اب ان کی دل چسپی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہر مہینہ الرسالہ (اردو) کو پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے کئی اور ہندو بھی۔

سروہی میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ میں نے مسلمانوں کے بعض اجتماعات میں شرکت کی ہے۔ وہ لوگ اجتماع کے آخر میں لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں۔ مگر ساری دعا صرف مسلمانوں کے لئے ہوتی ہے۔ ملک کی خوش حالی یا قوم کی ترقی کے لئے کوئی دعا نہیں کی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو صرف اپنے گروہ سے دل چسپی ہے۔ ملک و قوم سے آپ لوگوں کو کوئی دل چسپی نہیں۔ یہ تنقید میرے نزدیک بجا ہے۔ مسلمانوں کو اس پر دھیان دینا چاہئے۔

یہاں ایک معروف شخص ماسٹر من موہن لال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سروہی ضلع (اور اسی طرح دوسرے مقامات پر) ملی جلی کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں۔ اگر کہیں مسلمان زیادتی کرتے ہیں تو ان کے خلاف کمیٹی کے مسلم ممبران آواز اٹھائیں۔ اور اگر کہیں ہندو زیادتی کرتے ہیں تو کمیٹی کے ہندو ممبران اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ ہندو بولنے والے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف بولتے ہیں، اسی طرح مسلمان بولنے والے ہمیشہ ہندوؤں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ یہ بالکل بے فائدہ ہے۔ اگر ماسٹر من موہن لال کی تجویز پر عمل کیا جائے تو یقیناً فساد کی حوصلہ شکنی ہوگی اور ان میں بہت کمی آجائے گی۔

سروہی سے آبو روڈ جاتے ہوئے پنڈواڑہ ملتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اگست ۱۹۸۷ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ یہاں ایک مسلمان کی کرانہ کی دکان ہے۔ یہاں سے مزدور طبقہ

کہ ایک ہندو نے کچھ سامان ادھار خریدا۔ بعد کو ایک روز مسلم دکان دار نے مذکورہ ہندو سے پیسہ کا تقاضا کیا۔ ہندو نے پیسہ نہیں دیا تو دکان دار نے اس کی سائیکل رکھ لی۔ ہندو نے مقامی آر ایس ایس والے سے شکایت کی۔ وہ آئے اور دکان دار سے کہا سنا۔ دکاندار نے سائیکل واپس کر دی۔

بظاہر بات ختم ہوگئی۔ مگر ایک مسلم نوجوان جو مذکورہ دکاندار کا دوست تھا۔ اس کو واقعہ معلوم ہوا تو اس نے مذکورہ ہندو کو بازار میں پکڑا اور اس سے تکرار شروع کی۔ اس دوران مسلم نوجوان نے ایک لکڑی لے کر اس کو مار دیا۔ اب ہندوؤں نے ہندو دھرم دور کی طرف داری کرتے ہوئے مسلم نوجوان کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سخت زخمی ہو کر وہ مسلمان مرگیا۔ تاہم بات اس کے بعد زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ ایڈمنسٹریشن نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا۔

اسی راستہ میں دوسرا قصبہ سوپ گنج آتا ہے۔ یہاں فروری ۱۹۸۹ میں فساد ہوا تھا۔ ہیڈ گوار جنم شتابدی منائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر آدی واسی تقریباً ۵ ہزار کی تعداد میں جمع ہوگئے۔ اس سلسلہ میں ایک جلوس نکالا جانا تھا۔ جلوس کا راستہ ایک مسجد سے گزرتا تھا۔ مسلمانوں کو اس پر اعتراض ہوا۔ اب تناؤ بڑھا۔ انتظامی افسران نے چند ہندوؤں اور چند مسلمانوں کو بلا کر گفتگو کی۔ ہندوؤں نے کہا کہ اگر آپ ہمارے جلوس کو اپنے علاقہ سے گزرنے سے روکیں گے تو ہم بھی آپ کا کوئی جلوس اپنے علاقہ سے گزرنے نہیں دیں گے۔ آخر کار مسلمان راضی ہوگئے اور یہ طے ہوگیا کہ ہندوؤں کا جلوس مسجد کی طرف سے گزر جائے۔

مگر مسلم صاحبان نے واپس آکر اس سمجھوتہ کی خبر فوراً مسلمانوں کو نہ دی۔ اور نہ وہ جلوس کے وقت مسجد کے پاس موجود رہے کہ اعلان کرکے مسلمانوں کو اس کی بابت بتائیں۔ چنانچہ عام مسلمان سابقہ ذہن میں رہے۔ جلوس جب مسجد کے سامنے سے گزرا تو کسی مسلمان یا چند مسلمانوں نے جوش میں آکر جلوس پر پتھر پھینک دیا۔ اس پر فساد بھڑک اٹھا۔ جانی نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ مگر مسلمانوں کی تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی جائداد جلادی گئی۔

آبو روڈ کی ایک دیوار پر ہندی میں لکھا ہوا تھا "درگھٹنا چالک کے لئے کلنک ہے" یعنی حادثہ ڈرائیور کے لئے داغ ہے۔ یہ بات جس طرح ایک گاڑی کے ڈرائیور کے لئے

صحیح ہے، اسی طرح وہ قوم کے لیڈر کے بھی صحیح ہے۔ لیڈر اپنی قوم کو ایک راستہ پر دوڑائے اور قوم اس پر چل کر بربادی کے گڑھے میں جاگرے، تو حساس لیڈر کے لئے ایسا کوئی واقعہ موت کا حکم رکھتا ہے۔ بے حس لیڈر ایسے موقع پر دوسروں کو بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر مطمئن ہوجائے گا۔ مگر حساس لیڈر کے لئے وہ ایسا حادثہ ہوگا کہ اس کی زبان بند ہوکر رہ جائے۔

راستہ میں بناس ندی پر ایک قدیم پل ہے۔ اس کا نام رجواڑہ پل ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کا بنا ہوا ہے۔ آج بھی وہ پوری طرح مضبوط ہے۔ مگر چوڑائی میں اتنا کم ہے کہ بیک وقت اس سے صرف ایک بڑی گاڑی گزر سکتی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے انسان کو "مضبوطی" کی اہمیت معلوم تھی، مگر اس کو "چوڑائی" کی اہمیت معلوم نہ تھی۔ یہ انسانی عقل کی محدودیت ہے۔ وہ صرف حال کو جان سکتا ہے، مستقبل کو یقینی صورت میں جاننا اس کے لیے ممکن نہیں۔

آبو روڈ سے ماؤنٹ آبو کا فاصلہ تقریباً ۲۸ کلو میٹر ہے۔ یہ پورا راستہ چکردار پہاڑی سڑک پر طے ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے پہاڑ اور گہری کھائی کے مناظر تھے۔ سبز درختوں سے پورا ماحول ڈھکا ہوا تھا۔ یہ ۳۰ جولائی کی شام کا وقت تھا۔ ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ گاڑی کی کھڑکیاں بند کرلی گئیں۔ اب شیشہ کے باہر درخت زور زور سے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ کہیں کہیں پورے درخت گرے ہوئے نظر آئے۔ مگر ہم گاڑی کے اندر شیشہ کے پیچھے بالکل محفوظ حالت میں بیٹھے ہوئے چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اگر طوفان رکھا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یہاں ایسے اسباب بھی رکھ دئے ہیں کہ آدمی خارجی طوفان سے محفوظ رہ کر اپنا سفر طے کرسکے۔

۳۰ جولائی کی شام کو ہم لوگ ماونٹ آبو پہنچے۔ ماؤنٹ آبو ایک پہاڑی مقام ہے جو ضلع سروہی (راجستھان) میں واقع ہے۔ اس کا تعلق اراولی سلسلہ کوہ سے ہے۔ ماونٹ آبو میں کثرت سے جین مندر اور جین مذہب کی مقدس یادگاریں ہیں۔ یہاں پچھلے دو ہزار سال سے زائرین آتے رہے ہیں۔ ہندستان کے سنسکرت رزمیہ مہابھارت میں بھی اس کا تذکرہ آربودہ کے نام سے موجود ہے جس کے معنی مقام دانش کے ہوتے ہیں۔

ماونٹ آبو ایک مشہور پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ یہاں ایک خاص طرح کا جین مندر ہے

جو پورا سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ بنایا گیا تھا۔
ماؤنٹ آبو کی سیاسی اہمیت اس وقت ہوئی جب انگریزی حکومت کے زمانہ میں "برٹش راجپوتانہ اسٹیٹس ایجنسی" یہاں قائم کی گئی۔ اس کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے۔

ہندستان میں جو مختلف مذہبی اور روحانی تنظیمیں ہیں، ان میں سے ایک تنظیم کا نام برہما کماری ہے۔ اس کے بانی دادا لیکھ راج (وفات ۱۹۶۹) تھے۔ وہ حیدرآباد (سندھ) میں ہیرے کے تاجر تھے۔ ان کے پیرووں کا عقیدہ ہے کہ شیو دیوتا دادا لیکھ راج کے اندر حلول کر گیا۔ اس کے بعد انھوں نے تجارت چھوڑ دی اور مذہبی اور روحانی تبلیغ میں لگ گئے۔

برہما کماری مشن کا ہیڈ کوارٹر ماؤنٹ آبو کی چوٹیوں پر ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس کی ۱۸۰۰ شاخیں قائم ہیں۔ یہ ایشیا کی واحد مذہبی تنظیم ہے جس کو اقوام متحدہ میں مشاورتی درجہ (Consultative Status) دیا گیا ہے۔ برہما کماری مشن سے وابستہ افراد تجرد کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب اور دوسری نشہ کی چیزوں سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔

اس تنظیم کے تصویری میوزیم ۵۲ ملکوں میں قائم ہیں جن کو وہ لوگ خدائی میوزیم (Godly Museum) کہتے ہیں۔ یہاں ہر روز صبح کو راجا یوگا کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ شیو کو پوجتے ہیں۔ ناخوشگوار موسم کے باوجود یہاں کافی چہل پہل نظر آئی۔ ان کے نظریات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے میں نے ان کے اندر ایک زندگی دیکھی جو عام طور پر ہمارے اداروں میں نظر نہیں آتی۔

اس ہیڈ کوارٹر کے تحت ایک اسپریچول یونیورسٹی ہے جس میں دو ہزار طالب علم رہتے ہیں۔ روزانہ تقریباً ایک ہزار آدمی اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ وسیع پیمانہ پر لوگوں کو مفت کھانا کھلانے کا انتظام ہے۔ صاف ستھرے ہالوں میں نہایت صاف ستھرا و بہترین کھانا کھلایا جاتا ہے۔ وسیع رقبہ میں اس کے مختلف شعبے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ کارکنوں کی ایک پوری فوج پورے نشاط اور انہماک کے ساتھ ہر وقت اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ مگر سب کے سب بے معاوضہ ہیں۔ تمام کام مشن کے عورتیں اور مرد رضاکارانہ طور پر انجام دیتے ہیں جو تقریباً سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں۔ اور اکثر خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۳۱ ر

جولائی کو جب میں نے اس مشن کو دیکھا، اس وقت میرے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے۔

برہما کماری مشن کے سنٹر میں میں نے جو کچھ دیکھا اور وہاں کے ذمہ داروں سے جو باتیں ہوئیں، اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی وقت اس کو تحریر کیا جائے گا۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہندستان کی کئی مذہبی تحریکیں، جن میں برہما کماری اور سکھ دھرم شامل ہیں، ہندوازم اور اسلام کے بیچ میں ایک درمیانی راہ نکالنے کی کوشش تھی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ ان کو نہ ہندوازم ملا اور نہ اسلام۔

ٹرین میں ادھیڑ عمر کا ایک ہندو جوڑا تھا۔ بظاہر وہ خوش حال گھرانے کے افراد تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ برہماکماری سے تعلق رکھتے ہیں اور ماونٹ آبو جا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شادی کے بعد وہ لوگ برہماکماری تحریک سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۲۵ سال سے وہ بہن بھائی کی طرح رہ رہے ہیں۔ انھوں نے پھر کبھی ازدواجی تعلق قائم نہیں کیا۔

عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق فطرت کے عین مطابق ہے اور اس کے مقابلہ میں تجرد فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اسلام میں غلو کہا گیا ہے۔ مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان فطری اور معتدل قسم کی مذہبی زندگی کی طرف کم رغبت کرتا ہے۔ اس کے بجائے غلو والی مذہبی زندگی میں اس کے لئے بڑی کشش ہے۔ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، وہ بھی کم از کم ذہنی طور پر اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔

اس کی وجہ حقیقۃً مذہب پسندی نہیں بلکہ ظاہر پسندی ہے۔ غلو ہمیشہ ان چیزوں میں ہوتا ہے جو دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہری اور مقداری چیزوں میں اضافہ ہی کا نام غلو ہے۔ خود مسلمانوں میں فضائل کی موضوع روایتیں اور بزرگوں کے بارہ میں فرضی قصے تمام ترکیباتی چیزوں میں مبالغہ سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ کیفیت والی چیزوں میں مبالغہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ "فارم" کو اہمیت دینے کا نام غلو ہے، اور "اسپرٹ" کو اہمیت دینے کا نام ہی مذہبیت۔

۳۱ جولائی کو ۱۰ بجے ماونٹ آبو کی نکی جھیل دیکھی۔ پہاڑ کے اوپر پانی کے بڑے بڑے ذخیرے جو اکثر بلندیوں پر دکھائی دیتے ہیں، وہ قدرت کا حیرت ناک معجزہ ہیں۔ اس جھیل کے اتر سمت میں ایک پختہ قبر ہے۔ یہ قبر احسان علی صاحب کی ہے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ کے

"غدر" میں وہ یہاں آ گئے۔ اس وقت راجپوتانہ کا انگریز ریزیڈنٹ سرہنری لارنس یہاں رہتا تھا۔ احسان علی صاحب نے لارنس کے لڑکے پر گولی چلا دی۔ مگر گولی اس کے پاؤں میں لگی۔ وہ بچ گیا۔

احسان علی صاحب ایک جھاڑی میں چھپے ہوئے پکڑ لئے گئے۔ انھیں گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد ان کی لاش شاہراہ عام پر لٹکا دی گئی۔ وہ تین روز تک وہاں لٹکی رہی۔ اس کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ یہ قبر آج تک جھیل کے کنارے موجود ہے اور اس پر "احسان علی شاہ" کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ دین وطنیت کی اصطلاح میں وہ ایک فریڈم فائٹر تھے۔ میرے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ان کی قبر پر فریڈم فائٹر کا کتبہ لگایا جائے نہ کہ احسان علی شاہ کا۔

ماؤنٹ آبو پر مجھے ایک بلڈنگ میں لے جایا گیا۔ یہاں ۱۹۸۵ سے "اقبال ہوسٹل" قائم ہے۔ اس میں زیر تعلیم بچوں کے لئے بورڈنگ اور لاجنگ کا انتظام ہے۔ یہ بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور یہاں قیام کرتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کے لئے قرآن (ناظرہ) پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ اردو بھی پڑھانا چاہئے کیونکہ موجودہ حالات میں ان کو دین سے باخبر رکھنے کے لئے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔

میں نے ایک گجراتی طالب علم اسماعیل گھانچی (۱۴ سال) سے بات کی۔ وہ ذہین نظر آیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں۔ اس نے کہا آٹھویں کلاس میں۔ اپنے اسکول کا نام اس نے روٹری اسکول (Roatry Integrated School) بتایا۔ میں نے کہا کہ اس بات کو انگریزی میں کہئے کہ میں آٹھویں درجہ میں پڑھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا:

I am studying in 8th standard

اسی قسم کا ایک واقعہ کسی قدر مختلف شکل میں شیو گنج میں پیش آیا۔ وہاں میری ملاقات ایک مسلمان طالب علم سے ہوئی جو "میونسپل اسکول" میں پڑھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم ہے۔ میں نے کہا کہ اس بات کو انگریزی میں کہئے کہ میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں۔ دیر تک سوچنے کے بعد بچے نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے:

I am 8th class reading.

کتنا فرق ہے ایک اسکول میں اور دوسرے اسکول میں۔

محمد افضل صاحب (۴۸ سال) ماؤنٹ آبو میں انگریزی اسکولوں کے بچوں کا ہوسٹل چلاتے ہیں۔ ان کے کئی اور بھی کام ہیں۔ یہاں پہلی بار ان سے ملاقات اور واقفیت ہوئی۔ وہ نہایت سمجھدار اور بااثر آدمی ہیں۔ معاملات کی تدبیر کرنا بخوبی جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: اگر ہم کسی سے نفرت نہ کریں تو کوئی ہم سے بھی نفرت نہیں کرے گا۔ اس علاقہ کے بعض اختلافی معاملات ان کے سامنے لائے گئے اور انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو ختم کرا دیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ایسا معاملہ نہیں جس کو خوش تدبیری سے حل نہ کیا جاسکے۔

محمد افضل صاحب سے ملاقات کے بعد میری ایک تجویز دوبارہ مجھے یاد آگئی جو برسوں سے میرے ذہن میں ہے۔ یہ تجویز قرآن (النساء ۸۳) پر غور کرنے سے سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ فساد کے معاملہ میں مسلمان ہر جگہ کچھ صاحب فہم اور صاحب اثر افراد کو اپنا ذمہ دار بنالیں۔ جب بھی کسی مقام پر دونوں فرقوں میں تناؤ اور اختلاف کی صورت میں پیدا ہو اور فساد کا اندیشہ ہو تو خود لڑائی چھیڑنے کے بجائے وہ صرف یہ کریں کہ ملاقات یا ٹیلیفون کے ذریعہ فوری طور پر ان ذمہ دار افراد کو اس کی اطلاع دیں۔ اس کے بعد خود کچھ نہ کریں بلکہ معاملہ کو ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ مکمل طور پر خاموش ہو جائیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو یقینی ہے کہ یہ افراد معاملہ کو ختم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جائیں گے۔ اس ملک سے فساد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس سفر میں ایک اور تجربہ ہوا۔ راجستھان میں اگرچہ جگہ جگہ کچھ لوگ فساد کے اسباب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اس امن پسند ریاست میں ہندو مسلم نفرت کا ماحول پیدا ہو جائے۔ مگر میں نے اپنے سفر کے دوران کئی ایسی مثالیں دیکھیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسلمان اگر باہوش ہو جائیں تو فرقہ پرست عناصر کی ہر تخریبی کوشش یقینی طور پر ناکام ثابت ہوگی۔

مثلاً فالنا میں ایک مسلمان ہیں جو ٹیلی ویژن کا کچھ سامان بناتے ہیں۔ ان کا سامان دوسرے بنانے والوں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسروں کے مقابلہ میں وہ اپنی مصنوعات کی قیمت بھی زیادہ لیتے ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ ان کے یہاں خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ہندو ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کو ان سے کوئی شکایت نہیں۔

اسی طرح آبو روڈ میں ایک مسلمان ہیں جن کے یہاں سلائی (ٹیلرنگ) کا کام ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف اچھا کام کرکے دیتے ہیں بلکہ سلوک کے اعتبار سے بھی نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں۔ ان کے گاہکوں میں ۹۵ فیصد تعداد ہندوؤں کی ہوتی ہے۔ مقامی ہندو عام طور پر ان کے ساتھ عزت اور محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

پالی میں چند مسلمان ہیں جو گھروں میں پینٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے لوگ ہیں اور اپنا کام ہمیشہ محنت اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ان کا کام بھی زیادہ تر ہندوؤں کے مکانات میں ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ ان کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں۔

اس طرح کی انفرادی مثالیں ہر شہر اور ہر بستی میں پائی جاتی ہیں۔ ہر جگہ ایسا ہے کہ کچھ مسلمان اپنے کام اور اپنے اخلاق کی وجہ سے ہندوؤں کے درمیان باعزت بنے ہوئے ہیں۔ یہ مثالیں واقعات کی زبان میں بتاتی ہیں کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان اچھے عمل اور اچھے اخلاق والے انسان بن جائیں۔ اس کے بعد ان کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ یہ طریقہ ان کی اپنی ذات کے لئے بھی مفید ہے اور پوری قوم کے لئے بھی۔

یہ ماؤنٹ آبو کے ہوٹل سن راک (Sun Rock) کا کمرہ ہے۔ میں سطح سمندر سے ۴ ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھا ہوں۔ تیز ہوا چل رہی ہے۔ شیشہ کے اُس پار تمام درخت ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سورج گھرے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

یہاں دہلی، بمبئی اور کلکتہ والی کثیف ہوا نہیں۔ پورا ماحول اس برائی سے خالی ہے جس کو فضائی کثافت (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔ تازہ اور صاف ہوا کے جھونکے چاروں طرف آکسیجن بکھیر رہے ہیں۔ مگر ہوٹل کے اندر بند کمرے کی ہوا باہر کی ہوا سے مختلف ہے۔ یہاں وہ فرحت بخش ہوا نہیں جو باہر افراط کے ساتھ موجود ہے۔

ہوٹل کے بند کمرے میں سکون ہے مگر فرحت بخش ہوا کے جھونکے نہیں۔ باہر فرحت بخش ہوا کے جھونکے ہیں مگر وہاں سکون کے لمحات نہیں۔ یہی اس دنیا میں زندگی کا معاملہ ہے۔ اگر آپ تازہ ہوا لینا چاہتے ہیں تو آپ کو طوفان کی زد میں آنا پڑے گا۔ اور اگر آپ طوفان سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو یہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ آپ تازہ ہوا میں سانس لینے سے محروم رہ جائیں۔

ماؤنٹ آبو کی اہمیت کو انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۳۶ میں راجپوتانہ کے انگریز ریزیڈنٹ نے ماؤنٹ آبو کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ اس کے بعد اس علاقے کے تمام راجاؤں نے یہاں اپنی اپنی کوٹھیاں بنانی شروع کر دیں۔

مگر مسلمان دور جدید سے عدم واقفیت کی بنا پر "ماؤنٹ آبو" کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہاں مجھے بتایا گیا کہ ماؤنٹ آبو کی بیشتر زمینیں مسلمانوں کی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے نہایت معمولی قیمتوں پر اپنی زمینیں غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ میں نے بعض زمینیں دیکھیں جو مسلمانوں نے "ہزاروں" روپیہ میں بیچی تھیں وہ آج "کروروں" روپیہ کی ملکیت ہیں۔ کئی مسلمانوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی فضول خرچی کی بنا پر قرضوں میں پھنس گئے اور قرض اتارنے کی خاطر قیمتی زمینوں کو نہایت معمولی دام میں فروخت کر دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ راجستھان کے شہروں اور قصبوں کی دیواروں پر آجکل مسلم مخالف نعرے لکھے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مسلم مخالف نعرے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو ہر جگہ یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

میں ۳۰ جولائی کی شام کو ماؤنٹ آبو پہنچا تو ایک شخص نے کہا کہ یہاں دیکھنے کی سب سے زیادہ خاص تاریخی چیز دیل واڑہ مندر ہے۔ اس کے کاریگروں نے "پتھر کو کاغذ بنا دیا"۔

۳۱ جولائی کو دیل واڑہ مندر دیکھا۔ یہ جینی فرقہ کا مندر ہے۔ ۱۰۳۱ء میں راجہ بھیم دیو (گجرات) کے وزیر اور کمانڈر ویمل شاہ نے اس کو مکمل کرایا۔ اس کی تعمیر میں ۸ کروڑ ۵۳ لاکھ روپیہ کی لاگت آئی۔ ۱۵۰۰ کاریگروں اور ۱۲۰۰ مزدوروں نے ۱۴ سال تک کام کر کے اس کو مکمل کیا۔ یہ معلومات مندر کے دروازہ پر ایک کتبہ میں درج ہیں۔

پورا مندر تصویری نقاشی سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں صناعی کا کمال ضرور ہے مگر اس میں تاج محل والی سادگی نہیں۔ اس سے محظوظ ہونے کے لئے دو میں سے ایک چیز ضروری ہے — تصویر پسندی یا بت پرستی۔ فطری سادگی کا ذوق رکھنے والا آدمی اس سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔

۳۱ جولائی کو عصر کی نماز آبو روڈ کی ایک مسجد میں پڑھی۔ میں نے پوچھا کہ اس مسجد کا نام کیا ہے۔

لوگوں نے بتایا کہ "چھوٹی مسجد" میں نے کہا کہ یہ تو اچھی خاص بڑی مسجد ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے وہ کافی چھوٹی تھی۔ تعمیر ثانی میں اس کی توسیع ہوئی۔ مگر نام وہی "چھوٹی مسجد" باقی رہا۔ اس دنیا کا نظام بھی عجیب ہے۔ یہاں کبھی چھوٹی چیز کو بڑا کہتے ہیں اور کبھی بڑی چیز کا نام چھوٹا رکھ دیتے ہیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۹ کی شام کو آشرم ایکسپریس سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ آبو روڈ میں اپنے ڈبہ میں داخل ہوا تو اس کے اندر دو ہندو موجود تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "آپ کیا کام کرتے ہیں" اس نے جواب دیا میری ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان ہے" دوسرا بولا "اچھا میں تو ریڈی میڈ کپڑے تیار کراتا ہوں" اس کے بعد دونوں میں وزٹنگ کارڈ کا تبادلہ ہوا، اور دونوں کے درمیان اپنے کاروبار کی باتیں ہونے لگیں۔

میں نے سوچا کہ عام لوگوں کے لئے باہم تعلق قائم کرنا بہت آسان ہے۔ کیوں کہ وہ سب ایک دنیا کے مسافر ہیں۔ وہ بہت جلد گفت گو اور تعلق کی مشترک بنیاد پالیتے ہیں، اس کے مقابلے میں ایک سچے مومن اور سچے داعی کے لئے تعلق قائم کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ کیوں کہ وہ لوگوں کے درمیان ایک غریب اجنبی شخص ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں میں کسی خاص کوشش کے بغیر باہم تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب کہ داعی اور مصلح کو تعلق قائم کرنے کے لئے ایک طرفہ طور پر خصوصی اسباب جمع کرنے پڑتے ہیں۔ دوسرے لوگ جس چیز کو کسی غیر معمولی جدوجہد کے بغیر پالیتے ہیں، وہ داعی کو غیر معمولی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اسی کا نام صبر ہے۔

صبر دعوت کی قیمت ہے۔ جو شخص صابر نہ ہو، وہ داعی بھی نہیں بن سکتا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۵۷

۱۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی امریکہ کے ایک اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں ان کا ایک خصوصی لکچر تھا۔ لکچر کا عنوان تھا: اسلام امریکہ میں۔ موصوف نے اس موضوع پر مفصل تقریر کی۔ حاضرین میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔

۲۔ نئی دہلی کے اسوکا مشن (Asoka Mission) کی طرف سے ایک عالمی امن سفر (Pilgrimage for active peace) بنایا گیا۔ اس کے تحت کچھ اعلیٰ تعلیم افراد ایشیا یورپ اور امریکہ کے چھ ملکوں کے دورہ پر یکم ستمبر ۱۹۸۹ کو روانہ ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس امن پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر وہ اس میں عملاً شریک نہ ہو سکے۔ البتہ کچھ متعلقہ انگریزی لٹریچر اس سلسلہ میں انھیں فراہم کردیا گیا جس سے اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہو سکے۔

۳۔ اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والا مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۱۲ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ میں پیغمبر انقلاب (انگریزی) پر پاکستان کے اول انعام کی خبر شائع کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے اسلامی مرکز کا اور اس کے دعوتی کاموں کا مفصل تعارف بھی شائع کیا ہے۔

۴۔ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے ہال میں ۱۵ اگست ۱۹۸۹ کو اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Improving Indo-Bangladesh Relations

صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۵۔ پاکستان کا ایک ادارہ الانصار المسلمون (لاہور) اسلامی مرکز کی کتاب "نار جہنم" بڑی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کر رہا ہے۔ پہلی بار اس نے یہ کتاب اکتوبر ۱۹۸۸ میں چھپوائی تھی۔ دوسری

بار اسس نے اس کو جنوری ۱۹۸۹ میں چھپوایا ہے۔ اس کی کتابت جدید طرز پر کمپوٹر ٹائپ سٹنگ کے ذریعہ کرائی گئی ہے۔

۶۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۲ اگست ۱۹۸۹ کی شام کو ایک پروگرام ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی دعوت کے جدید امکانات کے موضوع پر سوا گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا کیسٹ مرکز میں موجود ہے۔

۷۔ "شتم رسول کا مسئلہ" نامی کتاب ۱۸۶ صفحات پر تیار ہو کر اس وقت پریس میں ہے۔ اس موضوع کے ہر پہلو پر اس میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

۸۔ ویٹیکن کے زیر اہتمام وارسا (پولینڈ) میں ایک کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ۳۱ اگست تا ۶ ستمبر ۱۹۸۹ جاری رہی۔ اسس موقع پر شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو مدعو کیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ زیر بحث موضوع سے متعلق ایک مقالہ انھیں بھیج دیا گیا۔ اس کا عنوان تھا: War and Peace in Islam یہ مقالہ انگریزی الرسالہ میں انشاء اللہ شائع کر دیا جائے گا۔

۹۔ بمبئی میں سیوری کے علاقہ میں ایک چال (بڑی بلڈنگ) ہے جس میں کئی سو آدمی رہتے ہیں اس بلڈنگ کے داخلہ پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ شیخ ابراہیم انجینئر، جو خود اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہ اکثر الرسالہ کا کوئی فقرہ اس بورڈ پر لکھ دیتے ہیں جس کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس سے اثر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ دوسرے مقامات پر بھی دہرایا جانا چاہیے۔

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : الرسالہ کے چند شمارے مرحوم نشتر زکی کی ترغیب پر پڑھے۔ اس سے قبل میں الرسالہ اور آپ کی ذات سے سوء ظن میں مبتلا تھا۔ یہ مولانا عامر عثمانی مرحوم اڈیٹر تجلی کی ان تحریروں سے تھا جب انھوں نے آپ کی کتاب "تعبیر کی غلطی" پر مفصل نقد سنواری تھی میں بغیر آپ کو پڑھے اور بغیر آپ سے ملے محض اس تنقید سے متاثر ہو کر سوء ظن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب جو آپ کو پڑھا تو واللہ پڑھتا ہی چلا گیا۔ آپ کے سارے پرانے شمارے بھی مسلسل زیر مطالعہ ہیں اور اللہ گواہ ہے، کدورت کے سارے بادل چھٹ گیے ہیں۔ بلکہ آپ

عظمت دل پر نقش ہوگئی ہے۔ کاش ایسی عبقری شخصیت سے میں پہلے ہی استفادہ کر لیتا۔
(محمد افضل لادی والا۔ بمبئی)

۱۱۔ مسٹر طارق (کراچی) نے بتایا کہ پاکستان میں الرسالہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ موجودہ حالات کی بنا پر چونکہ وہاں زیادہ تعداد میں الرسالہ نہیں جاسکتا ہے، اس لیے لوگ ایسا کر رہے ہیں کہ زیراکس کے ذریعہ ایک شمارہ کی کئی کئی کاپیاں نکالتے ہیں اور اس طرح اس کو حاصل کر کے پڑھتے ہیں۔ پھر ایک کاپی کو بھی بے شمار لوگ مہینوں تک پڑھتے رہتے ہیں۔

۱۲ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں: کافی پہلے ایک دوست کے توسط سے الرسالہ سے واقف ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ رسالہ اجتماعیت کا نہیں بلکہ انفرادیت کا قائل ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ الرسالہ پڑھا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ رسالہ ہندستان کے مسلمانوں کو بزدلی کا درس دیتا ہے اور اسے حکومت کے ایما پر اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی پر ذہنی طور پر آمادہ کرے۔ اس پہلے تاثر کے بعد میں نے الرسالہ کو دوبارہ نہیں پڑھا۔ ایک دن کتابوں کی ایک دکان پر الرسالہ پر نظر پڑی۔ اس کے بعض جملے دل کو لگے۔ لہذا خرید لیا اور گھر آکر ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ ڈالا۔ میرا سابقہ تاثر فوری طور پر زائل ہو گیا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب تک الرسالہ کا مطالعہ نہ کرلوں چین نہیں آتا۔ (الیاس اختر انصاری، لطیف آباد، حیدرآباد، سندھ)

۱۳۔ الرسالہ اللہ کے فضل سے نہ صرف دینی، اخلاقی، تعمیری پہلو سے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو رہا ہے، بلکہ اور بھی کئی پہلوؤں سے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مسٹر کشن جیونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) اور مسٹر راج تیواری (بھوپال) نے بتایا کہ انھوں نے الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو اردو میں پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھی ہے۔ محترمہ فرزانہ (حیدرآباد) لکھتی ہیں کہ "ایک انگلش میڈیم کی طالبہ ہونے کے باوجود آج میں اردو زبان اچھی طرح لکھنے اور پڑھنے کے قابل جو ہوئی ہوں وہ آپ کی عنایت اور الرسالہ کی بدولت ہے۔ مجھے دین سے اتنی لگن اور محبت الرسالہ کے مطالعہ سے ہوئی۔ میں اب پوری طرح مسلمان ہوں۔ ہر نماز میں آپ کے لیے اور الرسالہ کے لیے دعا کرتی ہوں۔

۱۴۔ ایک نئی کتاب جلد ہی چھپنے والی ہے۔ اس کا نام "راہِ عمل" ہو گا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع

کتاب	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
" جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	40/-
الاسلام	30/-
ظہور اسلام	30/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	50/-
صراط مستقیم	30/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	30/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	15/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	6/-

کتاب	
تبلیغی تحریک	15/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	15/-
تعبیر کی غلطی	40/-
دین کی سیاسی تعبیر	12/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	7/-
تجدید دین	
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	5/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-

کتاب	
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	3/-
دینی تعلیم	5/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

Title	Price
God Arises	Rs. 55/-
Muhammad The Prophet of Revolution	60/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
[illegible]	3/-
[illegible]	5/-